اقبال اور بھوپال

صہبا لکھنوی

اقبال اور بھوپال

اقبال اور بھوپال

صہبا لکھنوی

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN 416 - 248 - 3

اقبال اکادمی پاکستان کی پہلی داؤد ادبی انعام یافتہ کتاب

ناشر ——— محمد سہیل عمر

ناظم اقبال اکادمی پاکستان

اکادمی بلاک، ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: 92-42-6314510

Fax 92-42-6314496

Email: iqbalacd@lhr.comsats.net.pk

Website: www.allamaiqbal.com

طبع اوّل ——— اپریل ۱۹۷۳ء

طبع دوم ——— اکتوبر ۱۹۸۲ء

طبع سوم ——— ۲۰۰۰ء

کتابت ——— انوری بیگم دہلوی۔ عبدالرحیم انصاری

تعداد اشاعت ——— پانچ سو

قیمت ——— ۲۵۰ روپے

مطبع ——— طیب اقبال پرنٹرز

۱۷، بی رائل پارک لاہور

ترتیب

انتساب ۷

تصاویر، قلمی انتسابات، قلمی خطوط ۹

علامہ اقبال۔ نواب حمید اللہ خاں اپنے والد نواب احمد علی خاں کے ساتھ۔ شہزادی عابدہ سلطان۔ راس مسعود۔ بیگم راس مسعود۔ شاہ اسد الرحمٰن قدسی۔ ڈاکٹر سید عبد الباسط۔ مولوی معظم رسول صدیقی۔ ممنون حسن خاں۔ سید عبد الحیٔ۔ محمد احمد سبزواری۔ محمد خلیل اللہ خاں۔ اختر جمال۔ چودھری خاقان حسین۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف۔ مسیح صدیقی۔ جاوید اقبال۔ راحت منزل۔ ریاض منزل۔ شیش محل۔ موتی مسجد۔ یاٹ کلب۔ ضربِ کلیم۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ تقریب رونمائی کی ایک یادگار تصویر۔ اقبال کے دو خطوط کا عکس

دیباچہ طبع سوم ل

دیباچہ طبع ثانی ۲۱

حرفِ آغاز ۴۸

۱۔ بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط ۵۷

۲۔ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں ۷۱

۳۔ بھوپال کا پہلا قیام ۸۹

۴- اقبال اور وظیفہ ۱۱۴
۵- بھوپال کا دوسرا قیام ۱۳۷
۶- جشنِ حالی اور اقبال ۱۵۶
۷- اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط ۱۹۴
۸- بھوپال کا تیسرا قیام ۲۰۸
۹- اقبال ، راس مسعود اور ضربِ کلیم ۲۲۴
۱۰- دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ ۲۵۱
۱۱- ملفوظاتِ قدسی اور نیاز مندانِ بھوپال ۲۶۷
۱۲- اقبال کے تاثرات ۲۱۷
۱۳- اقبال اور قرآنِ مجید کے حواشی ۳۳۱
۱۴- کچھ کتاب کے بارے میں ۳۵۵
کتابیات ۳۹۳
اشاریہ ۳۹۵

والد بزرگوار سیّد محمد علی (مرحوم)

اور

عم محترم پروفیسر سیّد نواب علی (مرحوم)

کے نام

— صہبا

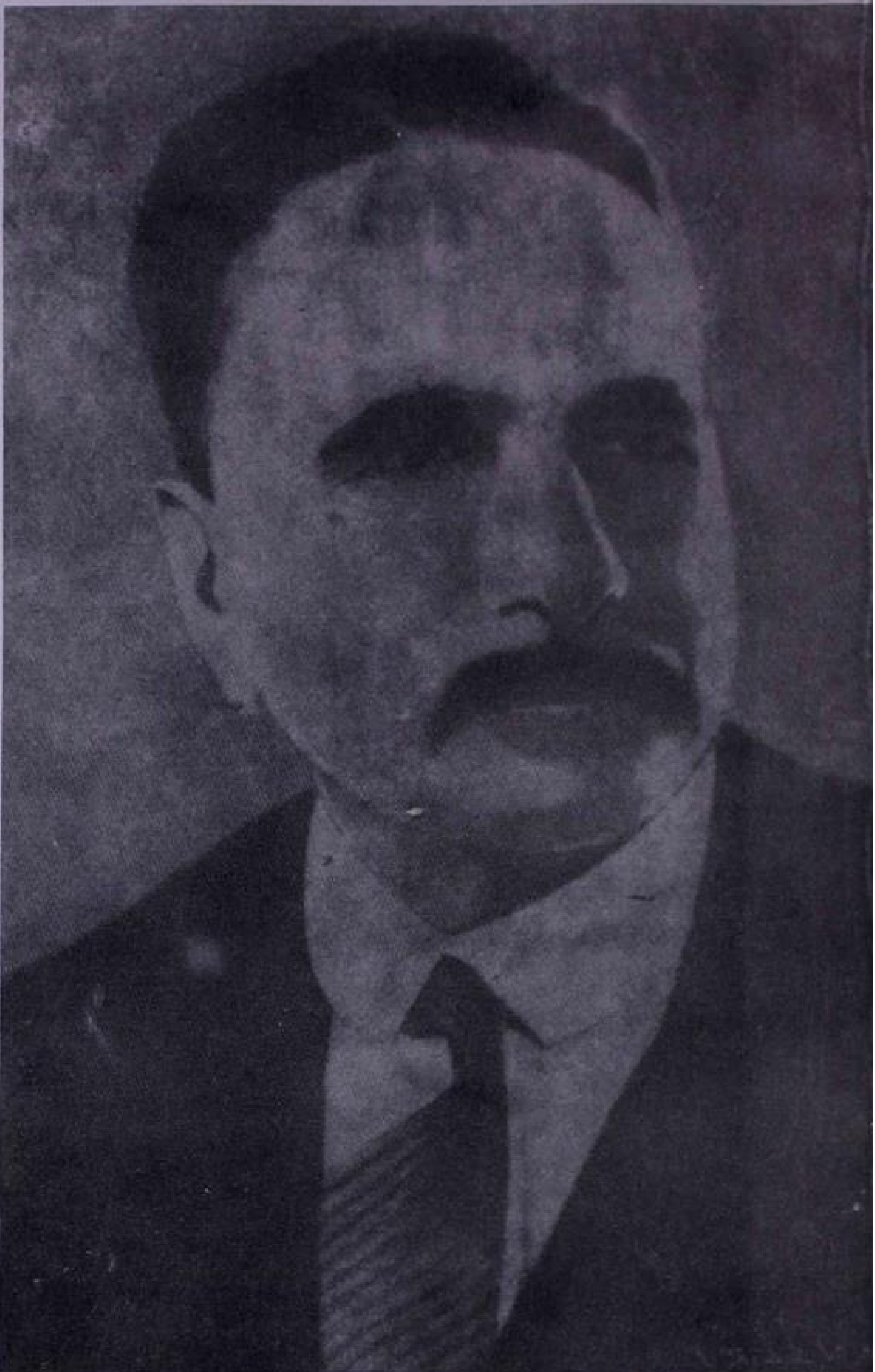

بھوپال کے مشہور آرٹسٹ عبدالحلیم انصاری کی کوئلہ سے بنائی ہوئی علامہ اقبال کی قلمی تصویر

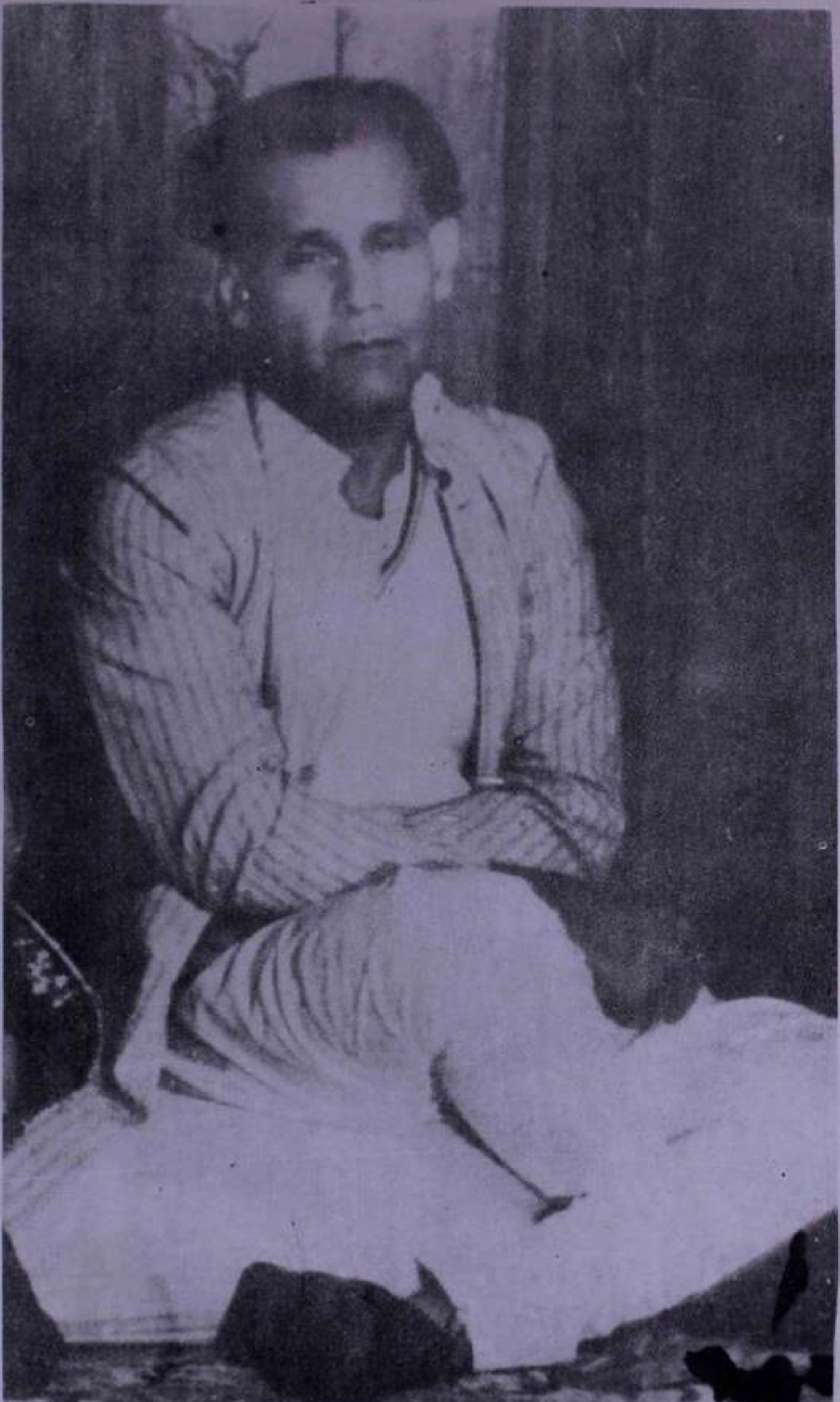

نواب حمید اللہ خان

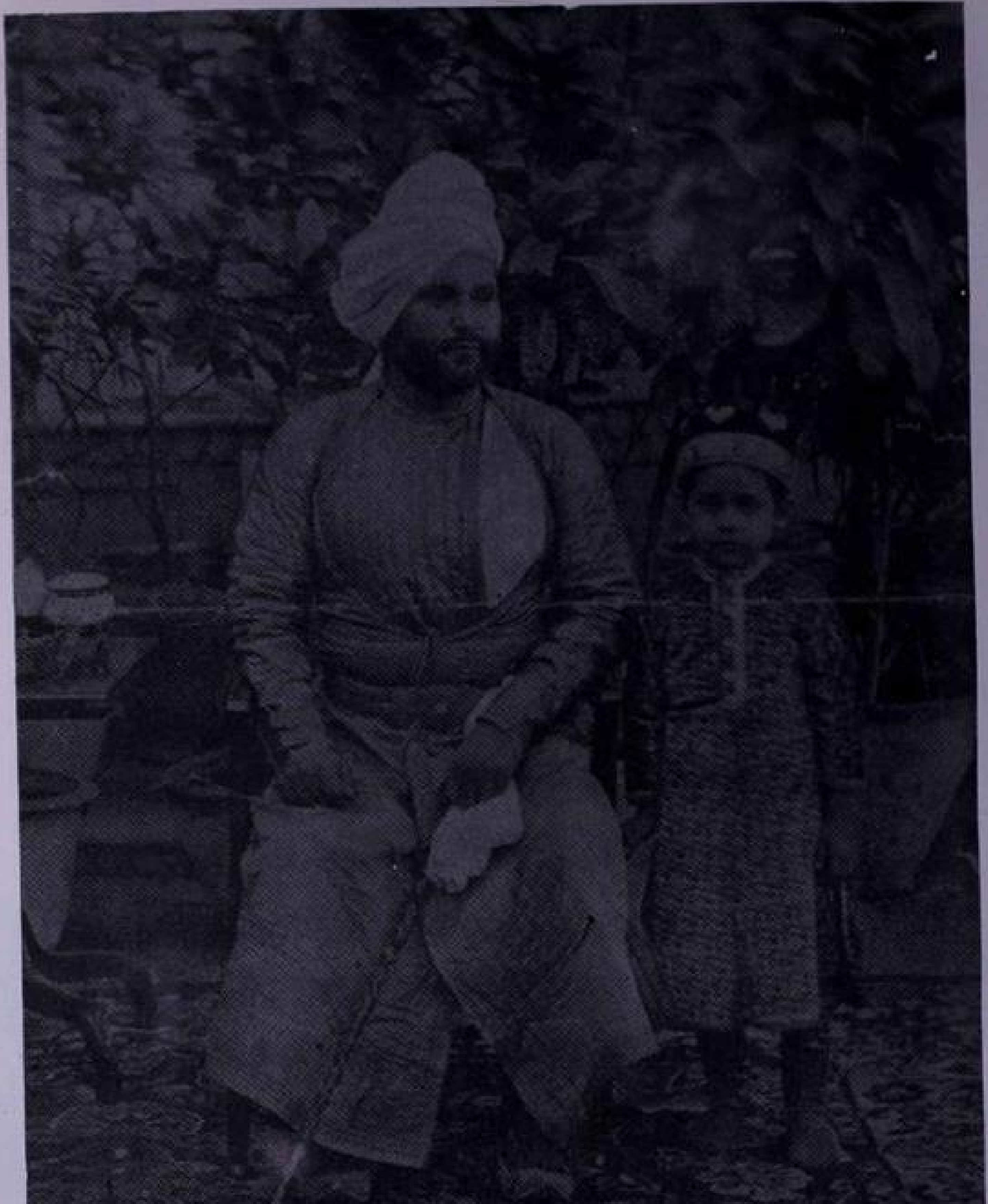

نواب محمد حمید اللہ خاں۔ چار سال کی عمر میں اپنے والد نواب احمد علی خاں عرف سلطان دولہا کے ساتھ۔ آپ قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر (یو۔پی) کے اورکزئی پٹھان اور اوسط درجہ کے زمیندار تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم والیِ بھوپال سے شادی کے بعد آپ کو سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ بھوپال کا مشہور علاقہ جہاں شاہی محلات ہیں اور خاندانِ شاہی کے افراد رہتے ہیں ــ آپ ہی کے نام نامی ــ "احمد آباد" سے موسوم ہے۔ ہم اس یادگار اور نایاب تصویر کے لیے خانوادہ بھوپال کے معروف نوجوان اشتیاق علی خاں کے ممنون ہیں۔

شہزادی
عابدہ سلطان

راس مسعود
اور
بیگم راس مسعود
ریاض منزل" بھوپال کی ایک یادگار تصویر

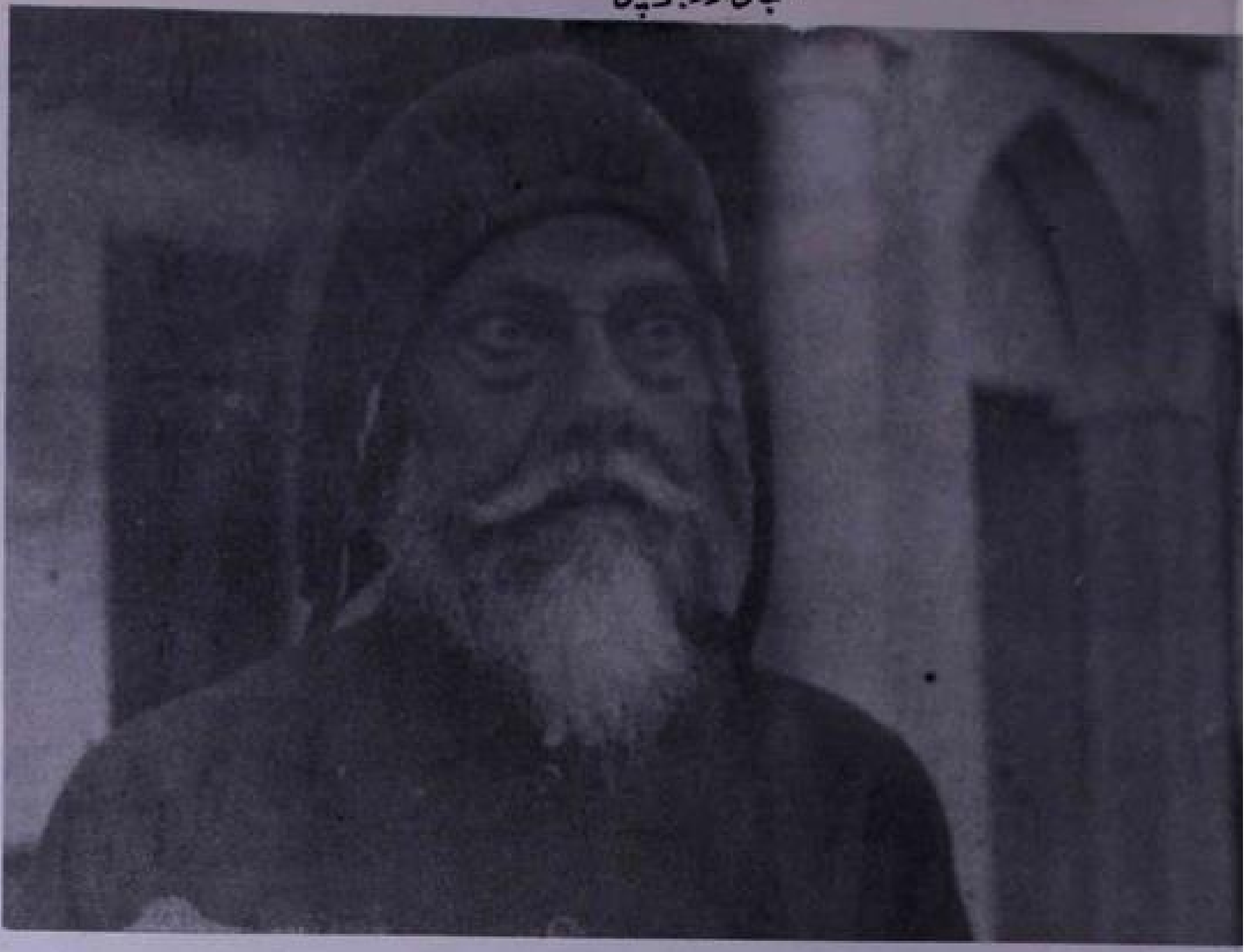

شاہ اسد الرحمٰن قدسی

ڈاکٹر سید عبدالباسط

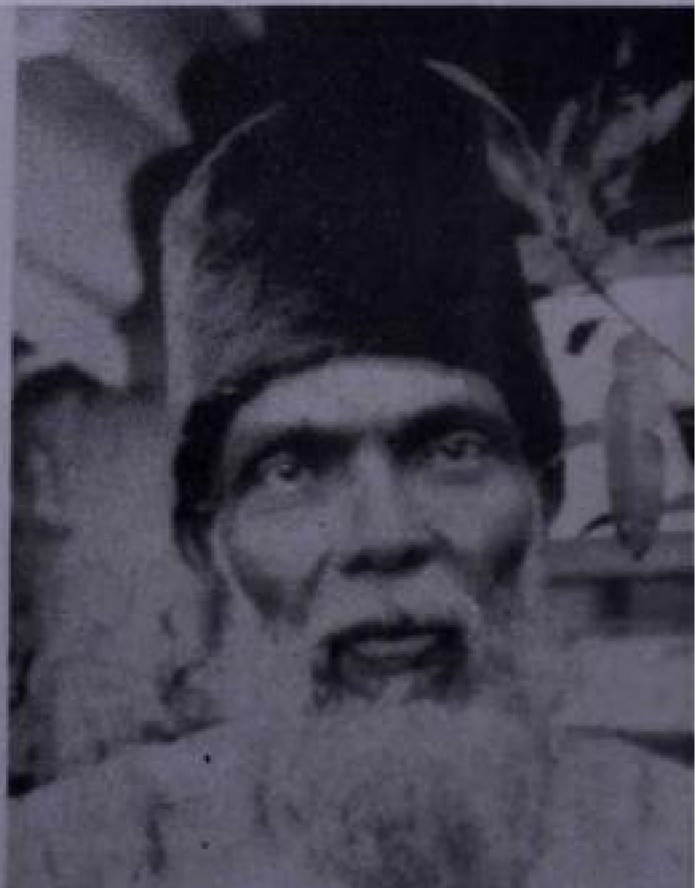

مولوی معظم رسول صدیقی

ممنون حسن خاں

سید عبدالحئی

محمد احمد سبزواری

چودھری خاقان حسین

اختر جمال

محمد خلیل اللہ خان

ڈاکٹر سید محمد یوسف

مسیح صدیقی

جاوید اقبال (بھوپال میں بہ عمر نو سال)

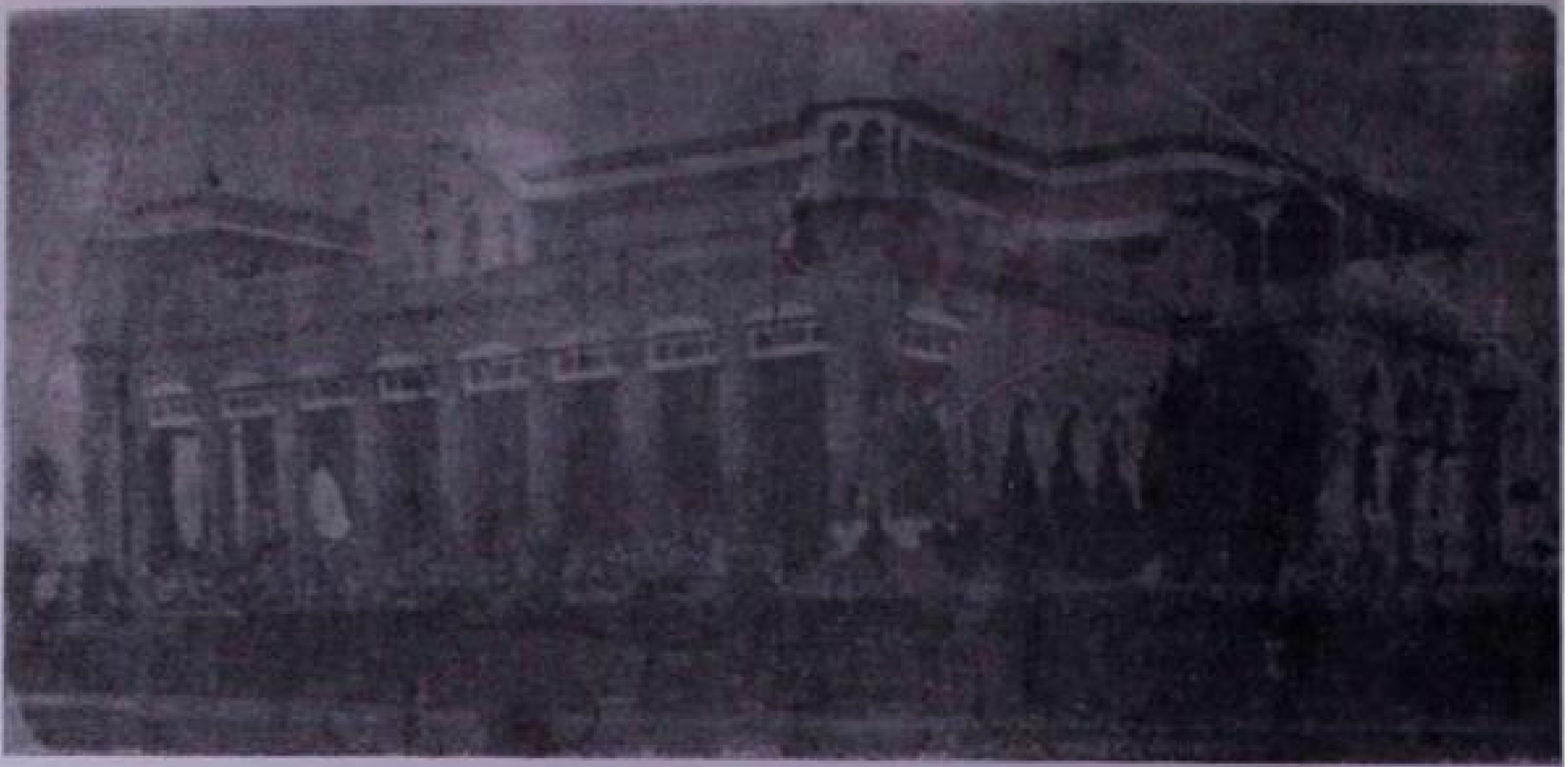

راحت منزل - جہاں علامہ اقبال سنہ ۱۹۳۱ء میں پہلی بار مقیم ہوئے - اب اس عمارت کا وجود نہیں

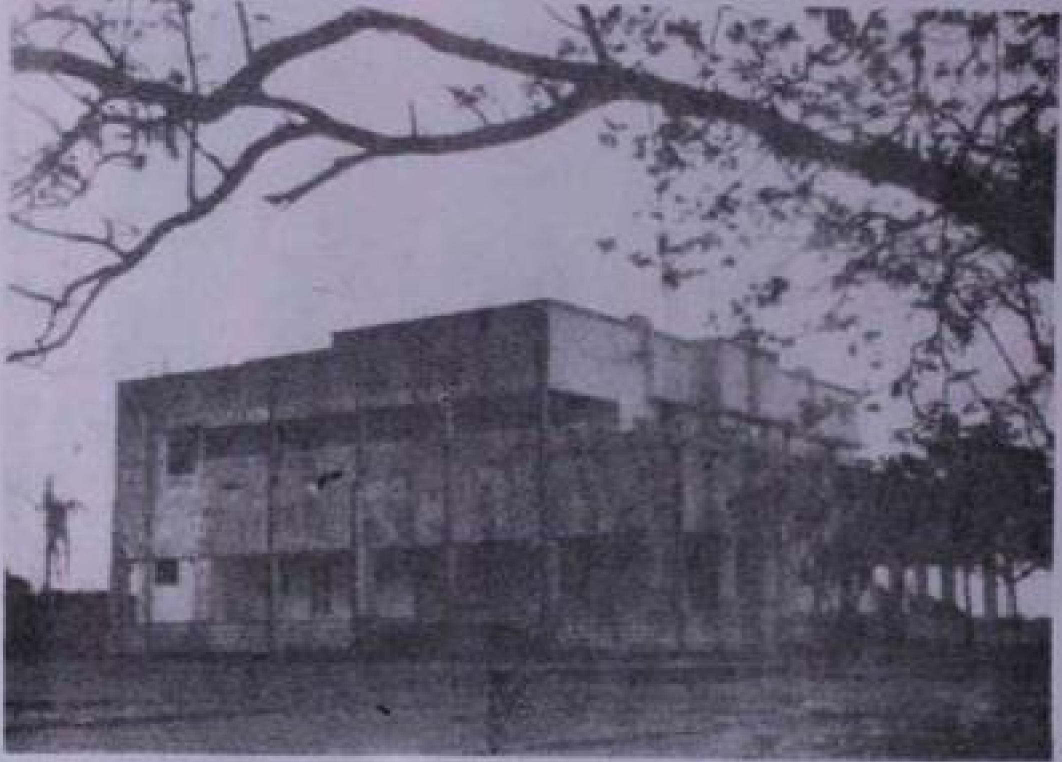

ریاض منزل
(دولت کدۂ راس مسعود)

شیش محل کا ایک عام منظر

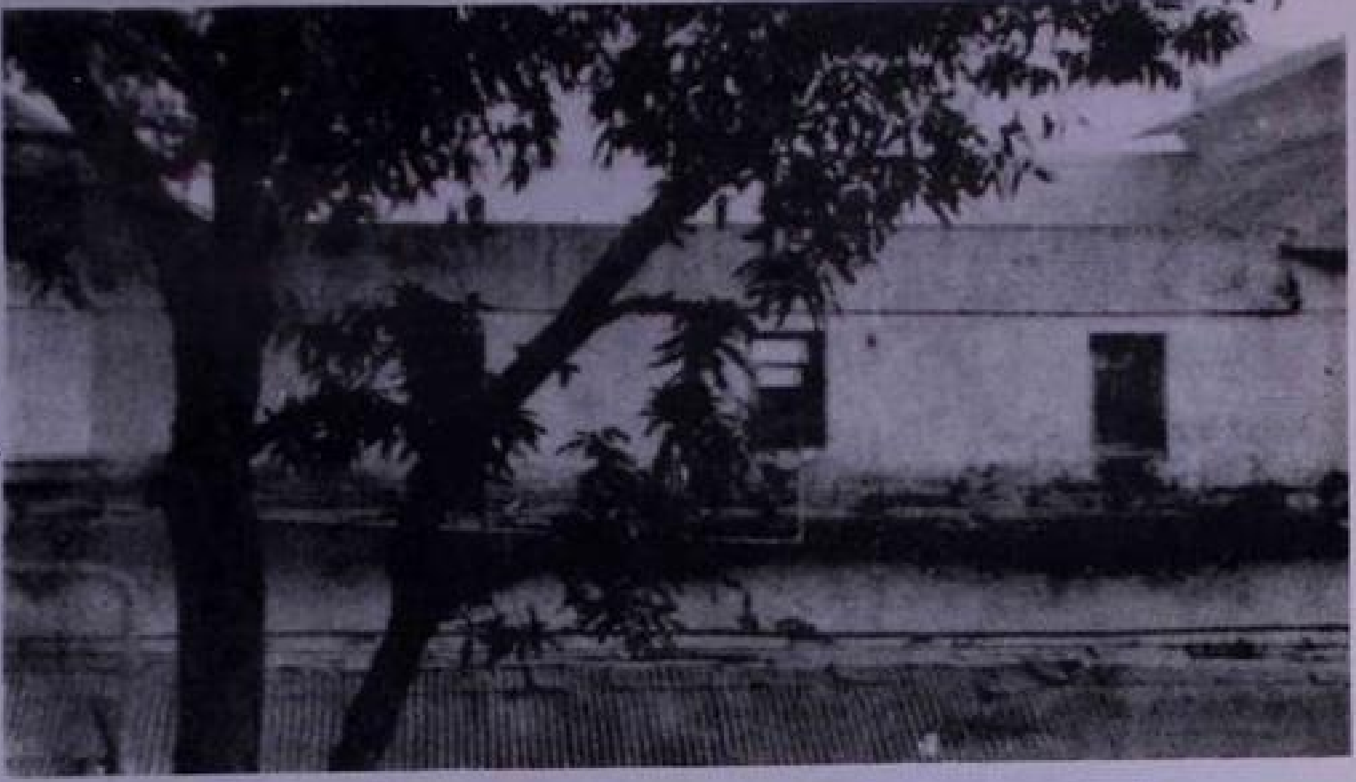

شیش محل کا عقبی حصہ
دو کھڑکیاں نظر آ رہی ہیں
علامہ اقبال اسی کمرے
میں مقیم ہوتے تھے۔
(بشکریہ ممنون حسن خاں
بتوسط فضل تابش)

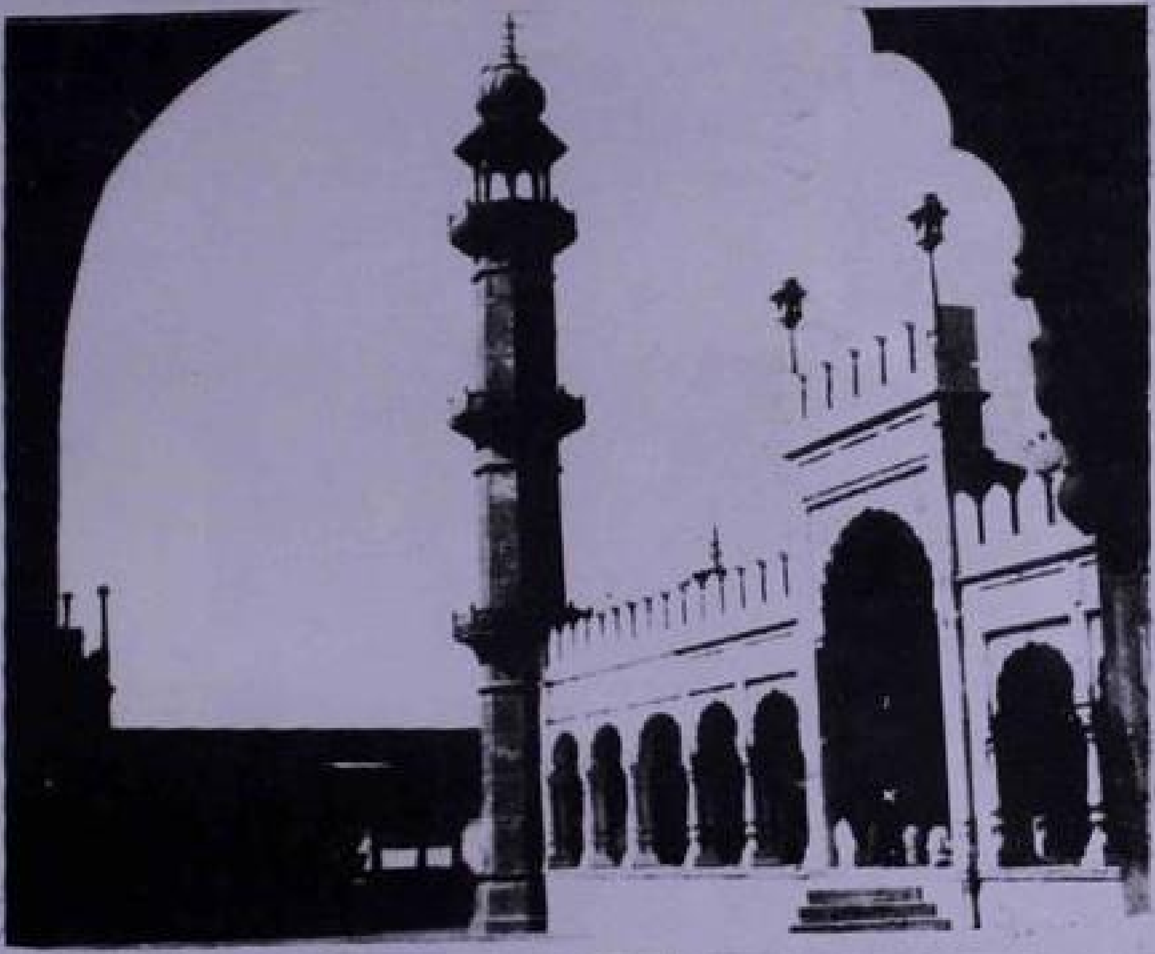

بھوپال کی حسین ترین
موتی مسجد جہاں
علامہ اقبال اکثر
جمعہ کی نماز پڑھتے تھے

بھوپال کی مشہور
تفریح گاہ
"یاٹ کلب"

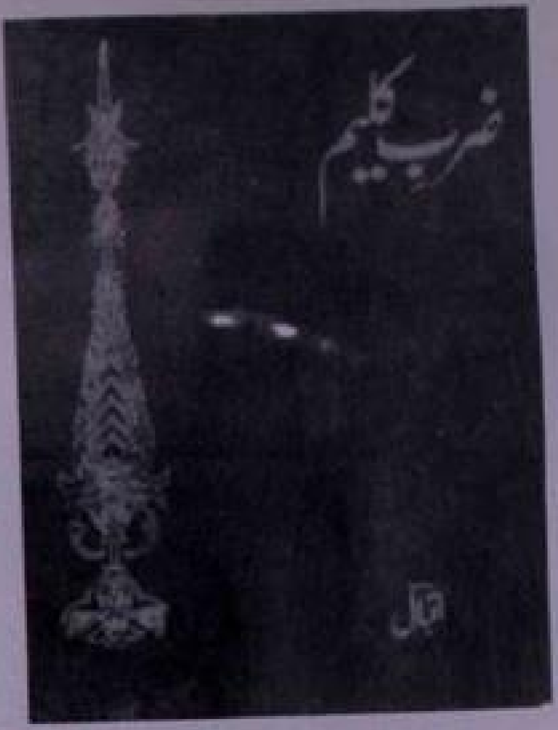

بشکریہ
شہزادی عابدہ سلطان

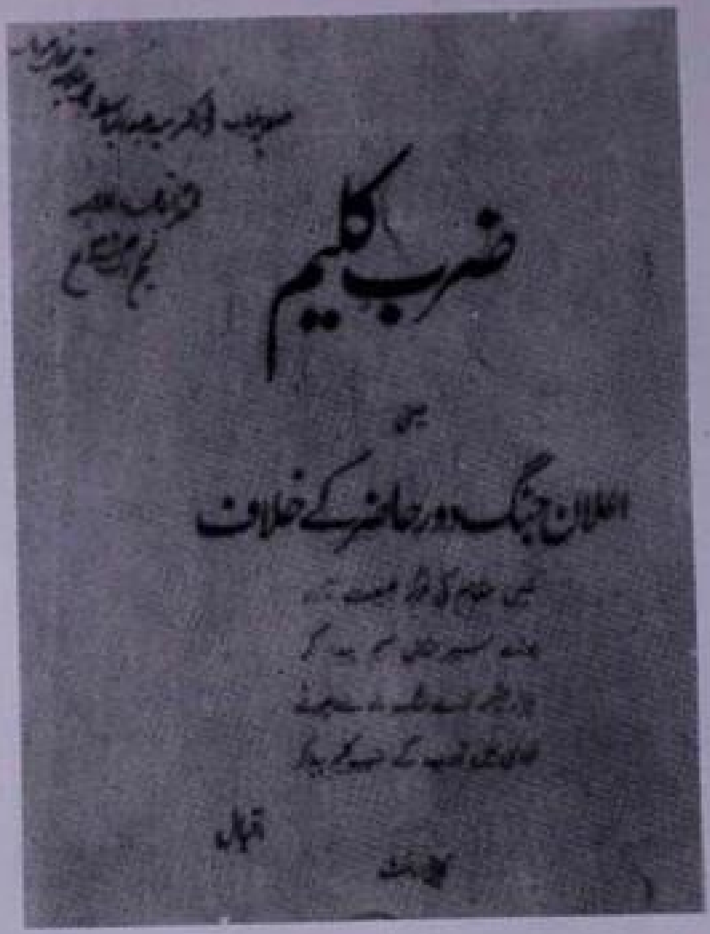

بشکریہ
سید عبدالحق

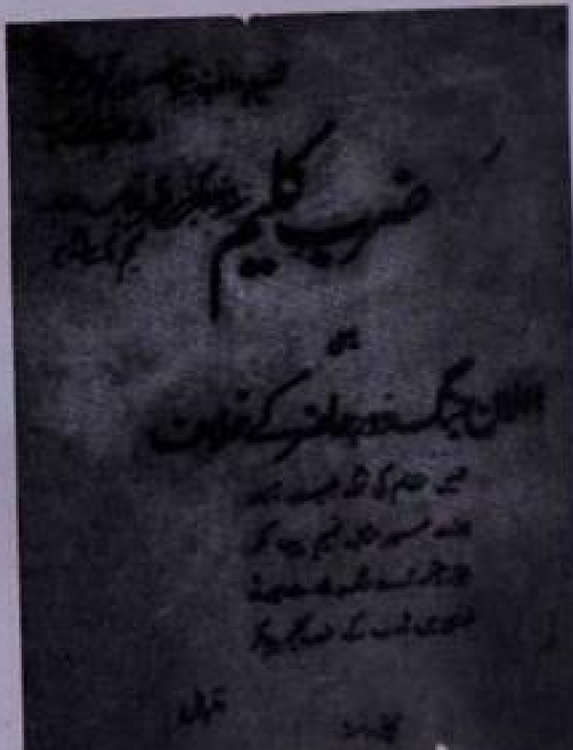

بشکریہ:
شہزادی عابدہ سلطان

۲۵ رمئی ۱۹۷۳ءکو "اقبال اور بھوپال" کی تقریب رونمائی کے موقع پر صہبا لکھنوی ۔ صدر تقریب شہزادی عابدہ سلطان سابق ولی عہد ریاست بھوپال کو کتاب کا نسخہ پیش کر رہے ہیں۔

19

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law.

Lahore

Dated ________ 193

لاہور ۲۰ مارچ ۳۵ء

ڈیر مسعود - ابھی آپ کا تار ملا جس سے اطمینان خاطر ہوا

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے آپ کے خط ملنے سے اس وقت تک میری

طبیعت نہایت پریشان تھی گذشتہ رات بھی بہت دیر تک ان کے لئے

دعا کرتا رہا - دوران قیام بھوپال میں انہوں نے جو توجہ مجھ جیسے معذور کی

پر کی مجھ کو فراموش نہیں ہو سکتا - امید ہے کہ اب وہ جلد صحت کامل حاصل کر لیں گی

اور آپ کی طبیعت کو بھی اطمینان نصیب ہوگا - نیا عہدہ کی خدمت کرنا سوائے اس کے

کہ میری صحت محروم ہے باقی خدا کا شکر ہے کل سے مطلع غبار آلود ہے

میری طرف سے انہیں سلام کہئے اور دعا کہئے

آپ کا محمد اقبال

Replied 9/3/35

(فوٹو کاپی بہ شکریہ مختار مسعود)

ڈیر مسعود - نمونۂ خط سید احمد عطار
آپ جو مدینہ منورہ میں روضۂ حضور رسالتمآب کے
محافظ ہیں پہلے ہی تم سے ان کا ذکر کیا تھا
ہمارے ملک کا سفرنامہ ہندوستان کا لکھ رہے ہیں کہ
عربی زبان کے ادیب ہیں اور شعرائے عرب میں
ان کا خاندان بلند مرتبت ہے - یہ خط زبانی
کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں جو کہ ان کو یہاں تک دیکھ کر
علیگڑھ بھی دیکھنے سے انہوں نے اپنا خط میرے خطاب معروف
کر دیا ہے - اگر آپ حضرت نے ان کو اجازت دی تو
یہاں آئیں گے - یہاں سے انکی بڑی قدر افزائی کی
اور بڑی خاطر و مدارات کی - اگر وہ آئیں
تو تم بھی ان کو دعوت دینا -
اور کرنل راس بھی سے تو مجھے ملاقات ہو گئی تھی
کہ وہ اب یہاں سے چلے جانے والے ہیں - والسلام

محمد اقبال

بھوپال

۱۰ مارچ ۳۶

(فوٹو کاپی بہ شکریہ مختار مسعود)

مُصنّف ــــ ایک نظر میں

- پیدائش ــــــ ۲۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء
- تعلیم ــــــ بی اے تک
- ماہ پارے
- میرے خوابوں کی سرزمین ــــ مشرقی پاکستان ــــ سفرنامہ
- مجاز ایک آہنگ ــــ ترتیب (شخصیت و فن)
- منٹو ــــ ایک کتاب ــــ ترتیب (شخصیت و فن)
- جوش نمبر - فیض نمبر - حفیظ نمبر - ندیم نمبر
  زو بی نمبر - اختر حسین رائے پوری نمبر
  سردار جعفری نمبر اور سات دستاویزی نمبر
  ممتاز اہلِ قلم کی زندگی میں شائع کی گئیں

پتہ: مدیر رسالہ افکار

C/155 نیشنل آٹو پلازہ - مارسٹن روڈ - کراچی

دیباچہ طبع سوم

"اقبال اور بھوپال" کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور خلاف توقع سال کے دوران ہی ختم ہو گیا۔

دوسرا ایڈیشن ـــــ نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد اکتوبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ـــــ اور اب یہ تیسرا ایڈیشن مزید چھان بین اور ترمیم و اضافے کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مجھے صحیح طور پر یہ علم نہیں کہ علامہ اقبال پر شائع ہونے والی تحقیقی کتابوں میں کتنی کتابیں ایسی ہیں جن کے دو یا تین یا زائد ایڈیشن چھپے ہوں ـــــ بہرحال راقم الحروف کے لیے یہ امر باعثِ فخر و مسرت ہے کہ "اقبال اور بھوپال" کو ہمہ گیر مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ حوالے کی ایک اہم کتاب بن گئی اور دوسرا ایڈیشن ختم ہونے کے بعد تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کا امکان پیدا ہوا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ چالیس سال بعد مجھے بھوپال جانے اور دیرینہ رفیقوں، دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ بھوپال کے بیس روزہ قیام میں جن ممتاز اہلِ قلم نے میری پذیرائی اور قدردانی فرمائی ان میں جناب ممنون حسن خاں۔ جناب اختر سعید خاں۔ ڈاکٹر اخلاق اثر۔ ماسٹر اختر۔ جناب فضل تابش۔ جناب ابراہیم یوسف۔ جناب اشتیاق عارف۔ جناب قمر جلالی۔ جناب جہاں قدر چغتائی۔ ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی۔ جناب عشرت قادری۔ ڈاکٹر خلیل بدر جناب عبدالباسط۔ محترمہ شفیقہ فرحت۔ جناب مصطفےٰ تاج۔ برادر خورد ڈاکٹر حنیف فوق۔ جناب شوکت رموزی۔ جناب نعیم کوثر۔ جناب ایم نعمان وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

(بھوپال پہنچ کر جس چیز نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ـــــ وہ "دارالاقبال" ـــــ میں علامہ اقبال کی یادوں اور یادگاروں کو قائم اور محفوظ رکھنے کا عمل تھا جس کے لیے حکومت مدھیہ پردیش، اقبال شناس جناب ممنون حسن خاں اور ان کے رفقائے کار کا ذکر مناسب ہو گا کہ ان سب کی مشترکہ مساعی سے شیش محل ـــــ جہاں علامہ اقبال نے قیام فرمایا تھا ـــــ اس کے سامنے کھڑی والا میدان ـــــ "اقبال میدان" ـــــ سے موسوم ہوا۔ جہاں بھارت کے ایک معروف آرٹسٹ نے اقبال کے شاہین سے اس میدان کو زینت بخشی ہے۔ نیز کل ہند اقبال ادبی مرکز کا قیام) اور ایک لاکھ روپے کے سالانہ اقبال (سمان) اعزاز کی ابتدا ہوئی ـــــ (اب تک جن ممتاز شخصیتوں کو اس اعزاز سے نوازا جا چکا ہے ان میں سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر اور

آئندہ از ملا بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ اب بھوپال کو یہ فخر و امتیاز بھی حاصل ہے کہ برِ صغیر پاک و ہند میں وہ علامہ اقبال کی یادوں اور یادگاروں کا واحد مرکز ہے اور کسی بھی دوسرے شہر کو یہ اعزاز نصیب نہیں — ایک لاکھ روپے سالانہ کا اقبال اعزاز بھی پاک و ہند میں کہیں اور نہیں دیا جاتا۔

میرے بھوپال جانے کا واحد مقصد دیرینہ احباب سے ملاقات کے علاوہ علامہ اقبال سے متعلق نئے مواد کی تلاش، "افکار" کی ابتدائی پانچ سالہ فائل کی دستیابی اور — "اقبال اور بھوپال" — پر بعض اعتراضات کی مزید چھان بین تھا۔ افکار کی فائل کے سلسلے میں برادرم اختر سعید خاں نے بھوپال کے قدیم ترین روزنامہ "ندیم" میں اعلان کرا دیا کہ صہبا لکھنوی کو اپنے رسالہ افکار کی مکمل فائل درکار ہے۔ جو صاحب یا ادارے قیمتاً یا تحفتاً عنایت کر سکیں ان کا خصوصی کرم ہوگا۔ اس اعلان کے نتیجے میں بھوپال کے کئی احباب سے تبادلۂ خیالات ہوا اور اندازہ ہوا کہ مکمل فائل تو شاید ہی دستیاب ہو سکے، البتہ متفرق رسالے مختلف جگہوں سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ میری درخواست پر بھوپال کے احباب نے مجھے ان رسالوں کی فہرست مضامین کی فوٹو کاپیاں مہیا کر دیں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران مجموعی طور پر افکار نے دو خاص نمبر — ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر اور ۱۹۴۹ء میں بھوپال اردو کانفرنس کے علاوہ تقریباً باون رسالے پابندی سے شائع کیے تھے، لیکن کافی تلاش کے بعد مجھے صرف پچیس ۲۵ تیس ۳۰ رسالوں کی فہرستیں مل سکیں، لیکن ۱۹۴۸ء کا لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر کہیں نہ مل سکا۔ افسوس کہ ان فہرستوں میں علامہ اقبال سے متعلق مواد دستیاب نہ ہو سکا۔ اسی طرح روزنامہ "ندیم" اور ہفت روزہ "ندیم" کی مکمل فائلیں بھی کہیں نہ مل سکیں۔ اب میرے لیے لے دے کے جناب ممنون حسن خاں کی ذات تھی جنھیں روزِ اوّل سے ہی میں نے اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے پاس علامہ اقبال کے جو غیر مطبوعہ خطوط ہیں وہ مجھے اُن کی فوٹو کاپیاں عنایت کر دیں تاکہ میرے بھوپال آنے کا سب سے بڑا مقصد پورا ہو سکے اور میں "اقبال اور بھوپال" کے تیسرے ایڈیشن میں کچھ نیا مواد شامل کر سکوں۔ ممنون صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ میری خواہش اور اصرار پر مسکرا کر مجھے تسلی دیتے رہے اور روانگی سے صرف ایک دن پہلے مجھے علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط پتہ لکھے ہوئے لفافہ کے ساتھ عطا کر دیا جس کا اعلان افکار[1] میں شائع کر چکا ہوں۔

علامہ اقبال کا خط اور پتے کا عکس ملاحظہ ہو:۔

JAWID MANZIL

Dr. Sir Mohammad Iqbal ... Lahore (۱۲ اپریل ۱۹۳۸) 193

Private & Confidential

سلام مسنون

ایک مدت سے تمکو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر آنکھوں میں

---

[1] ماہنامہ افکار شمارہ ۲۵۸ ستمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۵۲

موتیابند اتر آیا - اسکی وجہ سے لکھنا پڑھنا محال ہوگیا - یہ خط اپنے دوست
سید نذیر نیازی کے ہاتھوں لکھوا رہا ہوں - معاف کیجے - آنکھ کا آپریشن ستمبر
میں ہوگا ممکن ہے چونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق میری بیماری زیادہ اندیشہ ناک
صورت اختیار کر رہی ہے اس واسطے امید نہیں کہ یہ آپریشن عمل میں بھی آئے -
ممکن ہے کہ میرا یہ خط تمہاری طرف آخری خط ہو اور اس کا مقصد جو کچھ ہے وہ تم
اچھی طرح سے خود ہی معلوم کر سکتے ہو - جاوید اور منیرہ دونوں نابالغ ہیں
ایک کی عمر چودہ سال ہے - لڑکی کی عمر تقریباً ساڑھے سات سال ہے
میری خواہش یہ ہے کہ تمہاری وساطت سے اعلیحضرت میرے بعد ان بچوں کی طرف
توجہ فرمائیں - زیادہ کیا لکھوں - صرف تم کو اور راس مسعود کو ہی حالات معلوم تھے
جو ہمارا تعلق تھا - اب میں صرف تم پر بھروسا کر سکتا ہوں

مخلص
محمد اقبال

یہ خط جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے ——— ۱۶ر اپریل ۱۹۳۶ء کو ذریعے رجسٹری لاہور سے پوسٹ کیا گیا اور پتے کی مہر سے علم ہوتا ہے کہ رجسٹری ۱۸ر اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچ گئی - یہ خط جناب شعیب قریشی کے نام ہے جو اُن دنوں مشیر المہام روبکاری خاص تھے۔

خط میں علامہ اقبال نے تحریر کیا ہے کہ اُن کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا ہے اس لیے وہ یہ خط اپنے دوست نذیر نیازی سے لکھوا رہے ہیں - دوسری اہم بات انھوں نے اپنے دونوں بچّوں یعنی جاوید اور منیرہ سے متعلق لکھی ہے جن کی عمریں چودہ اور ساڑھے سات سال کی ہیں اور خواہش ظاہر کی ہے کہ تمہاری وساطت سے اعلیٰ حضرت ان پر توجہ فرمائیں -

اسی خط میں اپنی علالت کے ذکر کے ساتھ یہ جملہ بھی لکھوا دیا ہے :-

"ممکن ہے میرا یہ خط تمہاری طرف آخری خط ہو"

آخر میں تحریر ہے :-

"صرف تم کو اور راس مسعود کو میرے حالات کا علم ہے ۔ وہ بےچارا تو چل بسا۔
اب میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں"

علامہ اقبال کے آخری ایام کا تحریر کردہ یہ خط اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اپنی علالت، جاوید اور منیرہ کے مستقبل اور نواب صاحب بھوپال کی اُن کے بچّوں پر خصوصی توجہ کے لیے ـــــ جناب شعیب قریشی جو اُن کے خاص نیاز مندوں میں شامل ہیں کتنا اعتماد کرتے تھے ۔ اس خط پر ـــــ "پرائیویٹ اور کونفیڈنشیل" پر بھی خصوصی طور پر لکھا گیا ہے ۔ شکر ہے کہ یہ خط جناب ممنون حسن خاں کے پاس محفوظ رہ گیا اور ۴۵ سال کے بعد پہلی بار شائع ہو رہا ہے ۔ اس خط سے یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ اپنی عمر کے آخری ایّام میں بھی علامہ اقبال کا بھوپال سے رابطہ برقرار رہا اس لیے بھوپال اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے[1]۔

قیام بھوپال کے دوران مجھے "اقبال اور بھوپال" کی دو اہم کوتاہیوں پر بھی مزید تحقیق کا موقع ملا ـــــ جن کی نشان دہی محمد نعمان خاں صاحب اور ماسٹر اختر صاحب نے اپنے تبصروں میں کی تھی ۔ ایک تو مفتی انوار الحق کی وفات سے متعلق، دوسری موتی مسجد کی مطبوعہ تصویر کی صحت سے متعلق ۔

"اقبال اور بھوپال" میں شائع شدہ تقریباً تمام تصاویر مجھے بھوپال سے میرے دیرینہ رفیق کار برادرم رشدی ایڈیٹر روزنامہ "افکار" بھوپال کی وساطت سے دستیاب ہوئی تھیں جن کا ذکر "دیباچہ طبع اوّل" میں کیا گیا ہے ۔ چنانچہ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں موتی مسجد کے بجائے جامع مسجد کی تصویر شائع ہو گئی جس پر مبصرین نے اب توجّہ دلائی ـــــ چنانچہ میں خود بھی جامع مسجد گیا، مغرب کی نماز وہاں ادا کی اور یہ اطمینان ہو گیا کہ رشدی مرحوم نے نادانستگی میں جامع مسجد کی تصویر کو موتی مسجد تحریر کر کے مجھے ارسال کیا تھا اور میں نے ان کی رہبری پر اسی طرح اس تصویر کو شامل کتاب کر لیا ۔ اس نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ۔ موتی مسجد کی جو نئی تصویر میں بھوپال سے لایا ہوں ـــــ وہ تیسرے ایڈیشن میں شامل کر دی ہے ۔

میں نے تو دونوں ایڈیشنوں میں اپنی مجبوری اور بےبضاعتی کا اظہار کیا ہے اور یہی درخواست کی تھی کہ تحقیق ـــــ حرفِ آخر نہیں ہوتی، اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ تین سال کی سعی و کاوش کے بعد دوسرے ایڈیشن کو کئی اغلاط سے پاک کیا تھا ۔ لیکن نشان دہی کے بغیر خامیوں اور کوتاہیوں کو بھلا کیوں کر علم ہو سکتا ہے ۔ بہرحال میں صمیم قلب سے جناب محمد نعمان خاں اور ماسٹر اختر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مفتی انوار الحق سے متعلق

---

[1] اس مستند خط کی دستیابی کے بعد "اقبال اور بھوپال" کے دوسرے ایڈیشن میں صفحہ ۲۵۲ پر مطبوعہ خط جس کو اب تک آخری سمجھا جا رہا تھا ۔ یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کا خط بنام ممنون حسن خاں وہ اب مشتبہ ہو گیا ہے ۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ "اقبال اور بھوپال" کے دوسرے ایڈیشن میں جو "اشاریہ" شامل ہے وہ "اقبال اور بھوپال" کے صرف پہلے ایڈیشن میں تیار کیا گیا تھا اور دوسرے یا تیسرے ایڈیشن میں جو دیباچے شامل ہیں ان کی تفصیلات اس اشاریے میں شامل نہیں ۔

میری تحریر مطبوعہ "اقبال اور بھوپال" صفحہ نمبر ۳۳۶ درست نہیں تھی۔ مفتی صاحب کا انتقال واقعی ۱۹۴۰ء میں ہوا جب کہ میرے ذرائع اطلاع درست نہیں تھے کہ میں نے یہ کتاب کراچی میں بیٹھ کر لکھی تھی اور دس گیارہ سال تک مواد فراہم کرتا رہا تھا۔ بھوپال کے جو رفیق میری رہبری اور مدد کر رہے تھے انھیں کی اطلاع پر میں نے جناب عبدالقوی دسنوی کے کتابچہ "علامہ اقبال بھوپال میں" ـــــ پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ تحریر کیا تھا :۔

"کتابچہ کے صفحہ نمبر ۵ پر انھوں نے اقبال سے ملاقات کرنے والوں کے جو نام شائع کیے ہیں ان میں دو نام محل نظر ہیں۔ مفتی انوار الحق کا اقبال کی بھوپال میں آمد سے بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا"

شکر ہے کہ مفتی صاحب کی وفات کی اطلاع بے بنیاد نکلی اور تیسرے ایڈیشن میں راقم الحروف کو سرخرو ہونے کا موقع مل سکا۔

جہاں تک ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور دیوان غالب کا تعلق ہے میں نے بہت صراحت سے لکھا ہے[۵]۔

"بھوپال کا تنہا یہ ادبی کارنامہ ہی اس کی عظمت کا ہمیشہ امین رہے گا کہ غالب کے دو ابتدائی دیوان بھوپال سے ہی دستیاب ہوئے۔ پہلا دیوان فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا جس کی بابت مشہور ہے کہ مرزا غالب نے ان کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ یہ دیوان مولوی انوار الحق کے زیر اہتمام ـــــ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے معرکہ آرا مقدمہ کے ساتھ ـــــ نواب حمید اللہ خاں کے دور حکومت میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا"

میرا خیال ہے کہ ماسٹر اختر صاحب کی نظر سے کتاب کا یہ صفحہ نہیں گزرا ورنہ وہ "نسخۂ حمیدیہ" سے متعلق معترض نہ ہوتے۔

"اقبال اور بھوپال" کے پہلے ایڈیشن میں صفحہ نمبر ۲۷۴ پر میں نے لکھا ہے :۔

"شاغل فخری کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیتوں نے اقبال کو موضوع بحث بنایا یا اُن کے فکر و فن پر کام کیا ان میں رضیہ فرحت بانو، محمد امین زبیری، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور عبدالقوی دسنوی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا آئندہ صفحات میں احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب "خطبات اقبال" مجھے دستیاب نہ ہو سکی، لیکن یہ کتاب "اقبال لائبریری، بھوپال میں موجود ہے رضیہ فرحت بانو بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں"

بھوپال کے قیام میں ـــــ "اقبال لائبریری" کی مجلس انتظامیہ نے مجھے لائبریری آنے کی دعوت دی۔ میں تو خود لائبریری دیکھنا چاہتا تھا، چنانچہ ایک شام ماسٹر اختر صاحب مجھے لائبریری لے گئے۔ مجلس انتظامیہ کے اراکین نے لائبریری کے دروازے پر میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اندر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے رضیہ فرحت بانو کی کتاب "خطبات اقبال" دیکھنے کی فرمائش کی تو لائق لائبریرین نے چند منٹ میں کتاب مہیا کر دی۔ کتاب دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اُس کے ابتدائی

۵۔ "اقبال اور بھوپال" دوسرا ایڈیشن صفحہ نمبر ۲۳۷

صفحات کی فوٹو کاپیاں حاصل کیں۔ ان کے مطالعے سے علم ہوا کہ "عرضِ مرتب" کے عنوان سے رضیہ فرحت بانو نے دو صفحات تحریر کیے ہیں جس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :۔

> "علامہ (اقبال) موصوف کے ان خطبات کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے میں نے ان کے تمام صدارتی خطبات اس مجموعے میں جمع کر دیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شائقین اقبال اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔"

"خطباتِ اقبال" ـــــ ۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے کُل ایک سو گیارہ (۱۱۱) صفحات ہیں اور اس کی قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال پر شائع ہونے والی دوسری کتاب ہے جسے بھوپال کی ادیبہ نے مرتب کیا۔ اس میں تین اہم خطبات بہ تفصیل ذیل شامل ہیں۔

(۱) خطبۂ صدارت ـــ آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ الہ آباد۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

(۲) خطبۂ صدارت ـــ آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس منعقدہ لاہور۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء

(۳) ملّتِ بیضا پر ایک نظر ـــ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

کتاب کے آغاز میں رضیہ فرحت بانو نے "عرضِ مرتب" تحریر کیا ہے اور "پیش رس" کے عنوان سے جناب (چودھری) غلام احمد پرویز نے علامہ اقبال کی ادبی عظمت اور ان کے شاعرانہ کمالات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور ان خطبات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

"اقبال لائبریری" کی توسیع و ترقی میں سماجی کارکن آصف شاہ میری (مرحوم) نے عملاً سرگرمی سے حصّہ لیا، جس کا تذکرہ "اقبال اور بھوپال" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ کاش "اقبال لائبریری" اس بوسیدہ عمارت سے کسی اچھی اور وسیع عمارت میں منتقل ہو سکے۔ بہرحال منتظمین نے اقبال کی اس یادگار کو بحسن و خوبی محفوظ رکھا ہے۔

بھوپال کی ایک ادبی تقریب میں مجھے جناب اختر سعید خاں کا ایک مختصر لیکن جامع تحقیقی مضمون "شیش محل اور اقبال" سننے کا موقع ملا۔ اس قیمتی مضمون میں علامہ اقبال کے قیام بھوپال کی تیرہ نظموں میں ایک اور نظم کا سراغ لگایا گیا ہے ـــ دلائل کے ساتھ ـــ یہ جامع مضمون افکار[1] میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ آغاز میں لکھتے ہیں :۔

> "شیش محل اور اقبال پر جستہ جستہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں بھی اور ہندوستان کے باہر بھی، لیکن یہاں میں بھوپال سے تعلق رکھنے والے تین صاحبوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ایک پروفیسر عبدالقوی دسنوی جنھوں نے ایک رسالہ ـــ "علامہ اقبال۔ بھوپال میں" کے عنوان سے مرتّب فرمایا۔ دوسرے یادش بخیر جناب صہبا لکھنوی نغمہ بھوپالی۔ مدیر افکار کراچی کی کتاب (اقبال اور بھوپال) جس میں انھوں نے دوسروں کے لیے کچھ کہنے کو باقی نہیں

---

[1] ماہنامہ افکار۔ کراچی۔ شمارہ نمبر ۲۵۲۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ صفحات ۲۳ تا ۲۶

چھوڑا۔ تیسرا مضمون "شیش محل اور اقبال" ــــــ پروفیسر اخلاق اثر کا ہے جس میں ان نظموں کا پس منظر بیان کیا گیا ہے جو علامہ اقبال نے بھوپال میں کہی تھیں۔"

آگے چل کر اختر سعید خاں صاحب نے شیش محل کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے کہ اس محل کی تعمیر کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ سچ پوچھیے تو اس عمارت کو صرف علامہ اقبال کے مختصر قیام سے ہمہ گیر شہرت نصیب ہوئی۔ لکھتے ہیں :-

"یہ عمارت جو شیش محل کے نام سے موسوم ہے اور جس میں علامہ اقبال نے چند روز قیام فرمایا تھا ــــــ کب بنی، کیسے بنی، کس نے بنائی، اس کا تذکرہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے نہ ایسا کوئی کتبہ دریافت ہوا جسے تاریخی استناد کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ گزشتہ چند برسوں سے اس پر ناگرک بنک کا بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں ــــ اس جگہ ایک مے کدہ تھا، کیا ہوا؟ اس عمارت کی جستجو میں صرف ایک صاحب نے جنھوں نے عیسیٰ کی نہیں تو بزرگوں کی آنکھیں ضرور دیکھی تھیں، میری رہنمائی فرمائی۔ انھوں نے بتایا کہ اب سے سوا سو سال پہلے جب بھوپال کی خاتون فرماں روا نواب سکندر جہاں بیگم نے اپنی ولیٔ عہد نواب شاہجہاں بیگم کے لیے ایک عمارت شوکت محل کے نام سے تعمیر کرائی تو یہ عمارت بھی جو مغربی دروازے سے ملحق ہے تعمیر ہوئی اور شیش محل کہلائی۔ اس محل میں پہلے بھوپال کے وزیر اعظم کی رہائش تھی۔ بعد ازاں یہ شاہی مہمان خانہ قرار پائی۔

میں نے عرض کیا قبلہ ــــ اس میں شیش محل والی کون سی بات ہے ــــ بے شک اس کے کمرے اور دالان بہت وسیع ہیں اور کئی حصوں میں بٹے ہوئے ہیں، لیکن اس عمارت میں نہ کوئی تعمیری تناسب ہے نہ صناعی، نہ مجموعی حسن جو دیکھنے والوں کو متاثر کر سکے۔ اگر مغل طرزِ تعمیر کا تین محرابوں والا بلند اور کسی قدر پرشکوہ دروازہ نہ ہوتا تو اسے محل کون کہتا؟

فرمایا ــــ تم ٹھیک کہتے ہو صاحبزادے ــــ مگر یہ مت بھولو کہ بھوپال کی سادگی پسند بیگمات حسن سے زیادہ قوت پر اعتماد کرتی تھیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ سوا سو سال بیت جانے کے باوجود اس عمارت کی کسی میاں نے خم نہیں کھایا۔ اتنا کہہ کر میرے خضرِ راہ تو نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ اس عمارت کے بنانے والے کو کیا معلوم تھا کہ یہ غیر اہم عمارت جس کا ذکر شاہی محلات کے تذکروں میں ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ایک دن اردو ادب کی تاریخ میں نقشِ دوام بن کر ابھرے گی جس نقشِ دوام کی تعبیر علامہ اقبال نے اپنے شعر میں اس طرح فرمائی ہے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

ہر چند کہ شیش محل کو کسی مردِ خدا نے تمام نہیں کیا۔ لیکن ایک مردِ خدا کے قیام نے اس کے نقش میں ثبات بھر دیا اور وہ مردِ خدا ـــــ اقبال کے سوا کوئی اور نہ تھا۔"

جس چودھویں نظم کا جناب اختر سعید خاں نے سراغ لگایا ہے وہ علامہ کے بھوپال میں قیام کے دوران لکھی گئی ہے جیسا کہ اس نظم پر مندرجہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ البتہ نظم کے نیچے ـــــ "شیش محل بھوپال میں لکھی گئی" ـــــ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

ان کا استدلال ہے :۔

"تیرہ نظموں کے علاوہ ضربِ کلیم میں ایک نظم اور ہے جس کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بھوپال کے قیام کے زمانے میں شیش محل میں کہی گئی ہے ـــــ اگرچہ اس نظم پر یہ نوٹ نہیں ہے کہ وہ بھوپال میں کہی گئی۔ تاہم اس پر جو تاریخ درج ہے اس کی رو سے اُن دنوں علامہ شیش محل بھوپال میں مقیم تھے اور شیش محل میں یہاں کا پہلا قیام تھا۔

اس نظم کا عنوان ہے ـــــ ابی سینیا۔ اس نظم کی تاریخ ۱۸/ اگست ۱۹۳۵ء درج ہے جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ہے۔ علامہ تیسری بار ـــــ ۱۷/ جولائی ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لائے تھے اور ۲۸/ اگست ۱۹۳۵ء کو واپس تشریف لے گئے یعنی روانگی سے دس روز قبل یہ نظم کہی گئی۔

اس سلسلے کی دوسری نظم ـــــ مسولینی ہے ـــــ جس پر قطعیت کے ساتھ ضربِ کلیم میں ـــــ "۲۲/ اگست ۱۹۳۵ء بھوپال، شیش محل میں لکھے گئے" درج ہے یعنی روانگی سے چھے روز قبل ـــــ یہ نظم وجود میں آئی۔ ابی سینیا اور مسولینی کی تخلیقات میں صرف پانچ دن کا فصل ہے۔ یہ دونوں نظمیں ذہنی تشکیل کی آئینہ دار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابی سینیا کے عنوان سے یہ نظم کہہ لینے کے بعد بھی ـــــ علامہ کے ذہن میں ایک خلش تھی اور وہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنا چاہتے تھے چنانچہ پانچ دن بعد ہی مسولینی کے عنوان سے انھوں نے جو نظم کہی اُس میں یورپ کی جارحانہ اور ظالمانہ روش پر بڑا تیکھا طنز کیا ہے۔

دونوں نظموں کو ایک ساتھ پڑھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ نظم ابی سینیا میں اگر اطالیہ کے فسطائی نظام کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے تو مسولینی میں اقبال نے یورپ کے دیوِ استبداد کی جمہوری قبا کا پردہ چاک کیا ہے۔ معصرانِ یورپ سے مخاطب ہو کر مسولینی کا یہ کہنا کہ ؎

پردۂ تہذیب میں، غارت گری، آدم کشی !
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

منطقیانہ طریقِ استدلال نہ سہی لیکن نفسیات کے عین مطابق ہے۔ علامہ اقبال نے ڈرامائی انداز میں دو ظالموں کو مدِ مقابل کر کے مسولینی کی زبان سے وہی کہلوایا ہے

جو ایک غاصب دوسرے غاصب سے کہہ سکتا ہے۔ نظم ابی سینیا کی خارجی اور داخلی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ نظم شیش محل کے قیام کے دوران کہی گئی ہے اور اس طرح ایک اور نظم بھوپال کے حصے میں آتی ہے[1]۔

ضرب کلیم ـــــ بقول علامہ اقبال TOPICAL اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ بعض خاص خاص مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار کریں ـــــ شیش محل یا ریاض منزل میں کہی گئی نظمیں اسی زمرے میں آتی ہیں۔"

جناب ممنون حسن خاں، جناب اختر سعید خاں اور ماسٹر اختر صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے ماسٹر اختر صاحب سے ذکر کیا کہ بھوپال کے کئی ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین بھوپال کے جرائد اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں ـــــ علامہ اقبال کے قیام کے دوران بھی اور ان کے جانے کے بعد بھی ـــــ مثلاً مولانا ارشد تھانوی، مولانا مائل نقوی، ملا رموزی وغیرہ۔ کاش ان پر اخبارات اور رسائل کی فائلیں دستیاب ہو جاتیں تو شائع شدہ مضامین کو جمع کر کے شائع کر دیا جاتا۔ اس پر ماسٹر اختر صاحب نے بتایا کہ ملا رموزی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ان کے بیٹے شوکت رموزی کو ملا تھا جسے انھوں نے بھوپال کے معروف شاعر عشرت قادری کو دے دیا اور عشرت قادری نے اس مضمون کو ماہنامہ "عکس" دہلی کو اشاعت کے لیے بھیج دیا اور ماہنامہ "عکس" دہلی نے اپنی جون ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں شائع کر دیا۔ چنانچہ جناب عبدالقوی دسنوی نے اس مضمون کو اپنی کتاب "اقبال اور دار الاقبال" میں "عکس" کے حوالے سے شامل کر لیا۔ ذیل کا مضمون دسنوی صاحب کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے تاکہ ملا رموزی کا یہ نایاب مضمون محفوظ ہو جائے۔

ملا رموزی ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور علامہ اقبال کے بھوپالی نیاز مندوں میں انھیں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علامہ اقبال بھی اُن پر شفقت فرماتے تھے جس کا ثبوت مضمون کے مطالعے سے مل جائے گا۔ ملا رموزی کے مضمون کا عنوان ہے :۔

مقاماتِ اقبال

علامہ اقبال سے ملنے والوں میں ملا رموزی کی ملاقات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ خود لاہور گئے تھے، لیکن لوگوں کے کہنے کے باوجود علامہ اقبال سے ملنے نہیں گئے۔ علامہ جب بھی بھوپال آئے تو لوگ جوق در جوق اُن سے ملنے گئے تو بھی ملا رموزی اُن سے ملاقات کرنے نہیں گئے۔ آخر علامہ اقبال نے سر راس مسعود کے ذریعے بلایا تو ملاقات ہوئی۔

تفصیل ملا رموزی کی زبان سنیے :۔

---

[1] عجیب اتفاق ہے کہ اختر سعید خاں نے جس نظم کی بہ قید تاریخ نشان دہی کی ہے یعنی "مسولینی" اس کا ذکر محمد احمد سبزواری کے مضمون بہ عنوان "نژاد نو" مطبوعہ "اقبال اور بھوپال" دوسرے ایڈیشن کے صفحہ ۲۸ پر موجود ہے جس کا اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"جب پہلی مرتبہ میں اس محفل میں شریک ہوا تو یورپی سیاست موضوع بحث تھی۔ اسی سلسلے میں علامہ نے اپنی ایک تازہ نظم "مسولینی" سنائی۔

علامہ ممدوح بھوپال تشریف لائے۔ لوگ جوق جوق ملنے گئے مگر میں نہ جوق جوق گیا نہ بے جوق جوق گیا۔ خدا گواہ ہے کہ ان کے کلام کو بھی اسی حد تک پڑھتا تھا جتنا کہ اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو کر خود ہی میرے منہ کے سامنے آجاتا تھا۔ اب علامہ سے اتنا دور اور اتنا بے خبر رہ کر کیا دیکھتا ہوں کہ میں علامہ اقبال کی تنہا علالت اور بھوپال میں بغرض علاج تشریف آوری کی خبر سُن کر بے ساختہ آنسو گرانے لگا اور چند منٹ تک میری آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ بے سبب رونے پر میری بیوی اور میری والدہ مغفورہ نے مجھ سے رونے کا سبب دریافت کیا تو مجھے اب تک یاد ہے جو سبب میں نے ان کو بتایا وہ یہ تھا کہ اس بے ساختگی ہی سے میری زبان سے یہ فقرے نکلے کہ ایک سب سے بڑا مسلمان اذیت میں مبتلا ہے یعنی اقبال۔

حیران تھا کہ میرے اس فقرے پر میری بیوی اور میری والدہ بھی رونے لگیں یہ تھا مقال اقبال!!

شرح یہ ہے کہ اقبال کا شرفِ خدمت اور رسوخ مرتبہ ملاحظہ ہو کہ میں آن سے کبھی نہ ملا، ان کے کلام کو کبھی غور سے نہ پڑھا لیکن ان کی اذیت کی تنہا اطلاع ہی پر میرے اعصابِ حیات تک نے اپنی باضابطگی بدل دی۔ حتیٰ کہ اقبال سے یکسر ناواقف میری والدہ اور بیوی کے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ کیا کروڑ پتی انسان کی تکلیف کی اطلاع سے بھی اس قدر جلد اور ایسا تاثر پیدا ہو سکتا ہے؟

علامہ اقبال بھوپال میں مقیم رہے مگر پھر بھی شرف نیاز حاصل کرنے نہیں گیا۔ وہ پھر وطن تشریف لے گئے۔ اب مجھے نہ وہ یاد رہے نہ اپنا آنسو بہانا یاد رہا کہ ایک رات کوئی ۸۔۹ بجے کے درمیان ایک موٹر کار آیا اور مجھے حضرت العالی علامہ راس مسعود رحمۃ اللہ کی کوٹھی پر لے گیا۔ سب دنیا جانتی ہے کہ سید صاحب قبلہ کس درجہ اشراف نواز تھے۔ مجھ مزدور وضع قطع کے ملازم موزی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ایک چادر سی اوڑھے ہوئے اور بے حد مضمحل سے انسان کی طرف کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ "یہ تم کو بہت یاد کرتے ہیں"۔ میں صورت دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ مضمحل سا انسان عہدِ حاضر کا حکیم معرفت اقبال ہے۔ علامہ کو ملاحظہ فرمائیے کہ مجھ ایسے مغرور اور مزدور قماش ...... ناکارہ انسان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ طبعی اور پیدائشی حیثیت سے اس غضب کا مغرور، خود فہم انسان ہوں کہ میرے روز مرہ کے دوست ہی میری حدِ غرور بتا سکتے ہیں، مگر علامہ کے معانقہ فرماتے ہی مجھ پر ایک کیفیت ورقت طاری ہوئی۔ یہ تھا علامہ کا دوسرا مقام خلق و قوم شرف! معانقہ سے متصل ہی میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ــــ اُف ــــ سر راس علیہ رحمۃ بھی اپنے مقام پر صاحب مرتبہ صوفی تھے۔ میرے اُف کہنے پر فرمایا کہ پھر اُن سے ملنے

خود کیوں نہ آئے؟ میرا کمینہ پن ملاحظہ ہو کر میں نے تڑ سے کہا ——— میں خود اپنی جگہ پر اقبال ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ سبحان اللہ کہہ کر علامہ اقبال پھر میری طرف بڑھے اور مجھے دیر تک کلیجے سے لگائے رہے۔ یہ تھا علامہ کا تیسرا مقام فیاضی و مقام شرافت آگاہی ——— !

علامہ اقبال بڑے خوش تھے۔ کوٹھی میں اس وقت ہم تین کے سوا کوئی نہ تھا۔ رسمی الفاظ اور آغاز کلام ہی کے کسی مربوط موقع کے بالکل بیچ میں کافی بدتمیزی سے میں نے سید صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ حضور عالی ——— چائے پیے بغیر مجھ میں جودتِ بیان و ذوقِ سماعت بیدار نہ ہو گا کہ علامہ نے پھر زور سے فرمایا ——— "زندہ باد" ——— یہ تھا علامہ کا چوتھا مقام انسان آگاہ ——— !

ملاحظہ فرمائیے ——— کتنی اونچی تعلیم، کتنی اونچی ذہانت، کتنی اونچی مجلس، کتنے اونچے جلسوں اور کتنی اونچی معاشرتوں سے وابستہ رہنے والا علامہ اقبال میری کتنی نیچے درجے کی باتوں کو کس قابل جامعیت سے معاً اور فی الفور تاڑ جاتا تھا اور ملاقات میں عین اس پست سطح پر خوش خوش اتر آیا تھا۔ جہاں سے مجھ ایسا مغرور، گستاخ، خود فہم اور خود سر انسان اس ایسے صاحب مقام بلکہ صاحب عصر انسان سے ہم کلام تھا۔

اس عرصے میں چائے آگئی۔ میں نے چائے کی حسین پیالیوں کو دیکھ کر سید صاحب قبلہ سے بے ساختہ گستاخی کی اور عرض کیا کہ "پیالیاں بے جوڑ ہیں" سید صاحب غضب کے حساس تھے اس لیے ان کے تیور بدل جانے سے پہلے میں نے یہ شرح پیش کی کہ "بے جوڑ سے مراد یہ نہیں کہ پیالیوں کی ساخت یا رنگ میں فرق ہے بلکہ بے جوڑ سے مراد یہ ہے کہ علمی لوگوں کو نفاست سے نہیں بلکہ شدت کی ٹکر سے کام کی انرجی ملتی ہے کیونکہ اگر وہ نفاست و رنگینی میں کھو جائیں تو پھر کام کون کرے۔ اس جگہ میں نے دیکھا کہ علامہ مجھے ایسی حکیمانہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ بس میں جانتا ہوں۔ سید صاحب قبلہ نے بے ساختہ فرمایا۔ دیکھا بھئی اقبال۔ اقبال صاحب بولے کہ پھر کیا ہو گا۔ میں نے حوصلہ پا کر عرض کیا کہ اگر دماغی لوگوں کو نفاست اور فراغت کا سامان دے دیں تو وہ اس حلقۂ عیش کو توڑ کر باہر نہیں آ سکیں گے کہ ان سے زیادہ اور بہتر طریق پر ان نفاستوں کو دوسرا کون محسوس کر سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ خوش رنگ ماحول کی تحسین و مدحت میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان کے کرنے کا کام پورا نہ ہو سکے گا۔ اسی لیے سرکار گیتی پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عیش کی زندگی کے عوض شدت و تلخی کی زندگی عنایت ہوئی۔

ان جملوں کو سن کر میں کیا لکھوں کہ علامہ اقبال کا کیا حال ہوا۔ بس یہ کہ اس مقام پر پہنچ کر ان کے جھکے ہوئے جسم نے وقار و استغنا اور خود اعتمادی کی

تمام بلند فطرتوں کو روند کر مجھے ایسی داد عطا فرمائی کہ ان کی ایسی شہرت کا ایک انسان بھی مجھ ایسے کمترین انسان کو کبھی نہ دے گا اور نہ دیتا ہے - یہ تھا علامہ کا پانچواں مقام مزاج بلند۔

اب میں اپنے زور میں چٹاخ پٹاخ باتیں بھی کر رہا تھا اور بے پرما چائے پر چائے پیے چلا جا رہا تھا کہ معاذ اللہ علامہ نے میری اس ترکیب کی بھی داد دی تو میں نے عرض کیا کہ قبلہ یہ مقام داد کس طرح قرار پایا - علامہ نے میرے جملے مجھی پر اس طرح دے مارے کہ اور یہ مسلسل چائے کس طرح ؟ میں نے عرض کیا کہ حضور عالی میں اپنے جسم کی اس آتا دافتادسے بقلم خود تنگ ہوں کہ جس چیز کے عوام عادی ہوتے ہیں اُن کی تقلید مجھ سے بن نہیں آتی - لہٰذا میں محفل کا لحاظ کیے بغیر چائے پر چائے پیے جاتا ہوں اور تعزیراتِ ہند سے نہیں ڈرتا - علامہ کے جی کی سی کہہ دی - تڑپ گئے اور فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ گلابی اردو کا لکھنے والا یہ ہے تو اس سے پہلے حاضرِ خدمت ہونے کی کوشش کرتا - ملاحظہ فرمایا کمترین نوازی کا مقام کرم!

اس جگہ سے میں نے علامہ سے شعر کی درخواست کی - برجستہ فرمایا کہ کیا ملا رموزی صاحب تشریف لے گئے - مرا س موصوف کے فقرے پر وجد فرمانے لگے - میں نے اٹھ کر ہاتھ کو بوسہ دیا - بڑی دشواری سے علامہ نے یہ دو شعر سنائے ؎

ستارہ کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکیؑ و درخشانی
تو اے مسافرِ شب، خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

اشعار کو سن کر مجھے مسرت کے عوض ایک عظیم مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو میں آپ کے کلام کے دوسرے سنانے والوں سے بھی کہا کرتا ہوں - وہ یہ کہ ایک ہی شعر اتنے عظیم مطالب اور اصول کلام کا حامل ہوتا ہے کہ گھنٹوں دماغ اسی کے پیچ و خم سے فرصت نہیں پاتا کہ معاً دوسرا شعر سنا دیا جائے تو فرمائیے کہ اتنی جلد جلد داد دینے والا یا تو بے ایمان ہو جائے یا کندۂ ناتراش -

میں کیا کہوں کہ علامہ نے کس درجہ کمال بلندی سے میری ان خرافات کو تحسین و مرحبا کے ساتھ برداشت کیا مگر ایک کرم کا شرف یہ عطا فرمایا کہ جس وقت بھی یکسر تنہا ہوتے مجھے ضرور یاد فرماتے -

اب علامہ کی جس آخری چیز نے اُن کے سب سے برتر مقام کا مجھے پتا دیا وہ یہ

کہ حضرت علامہ سر راس مسعود اور تاجدار بھوپال ایسی عظیم شخصیتیں اُن کی میزبان تھیں۔ عقیدت مندوں کے ہجوم سے کم فرصت پاتے تھے مگر اس پر بھی ہر لمحہ اداس اور خاموش رہتے تھے۔ علامہ کے اس انداز کے مقام تاثر کو میں تاڑ گیا تھا اور جان گیا تھا کہ علامہ جس رُتبے کے حساس ہیں اُس رُتبے کا چونکہ ماحول نہیں ہے۔ پھر بھی مجھے ان کے مقامِ ضبط و علوئے استقامت پر ہمت نہیں ہوئی کہ میں کچھ عرض کرتا۔ البتہ میں نے ان کے اداس تاثر کو دور کرنے کے لیے ایک دن اپنے ظریفانہ رنگ کو اس طرح استعمال کیا کہ میں نے حاضر ہوتے ہی عرض کیا کہ —— مجھے اقرار ہے کہ آپ کے دوسرے مقاماتِ روحانیت کے علاوہ آپ کا مقامِ مرض بھی اتنا بلند ہے کہ مجھے حضور کی عیادت کے لیے حاضر ہونا بھی اب ناممکن محسوس ہوتا ہے۔ جس طرح اچانک اولاد جدا ہونے لگے۔ اس بے چینی سے فرمایا۔ کیوں؟ کیوں؟

میں نے عرض کیا کہ اتنے ناقابلِ برداشت مرض کے لاحق ہونے کی قانونی صورت تو یہ تھی کہ اگر حضور کا یہ مرض مجھے لاحق ہوتا اور اس زمانے میں مَیں حضور کی طرح —— تاجدارِ بھوپال کا مہمان ہوتا تو میں اس طرح رہتا کہ روزانہ مہتمم مہمان خانہ شاہی کو ایک پرچہ لکھ بھیجتا کہ آج مجھے ڈاکٹر نے ذیل کی غذائیں بتائی ہیں —— فراہم کر دیجیے۔

ایک پاؤ طاؤس کے کباب۔ ڈیڑھ چھٹانک بٹیر کے گوشت کا قیمہ۔ تھوڑے سے انگور اور اناس۔ شام کے لیے یہ پرچہ لکھتا کہ ہرن کے گوشت کے خشک قسم کے کوفتے۔ مسلّم مرغابی اور دُرّاج کا آب جوش۔ تھوڑے سے بادام، منقّیٰ، کشمش اور انجیر۔ اس نوع کی غذاؤں کے بعد جب کوئی ملاقات کو آتا تو اس سے اس طرح ملتا کہ خواہ مخواہ دس بارہ سرد و ترکی آہ کی آواز پیدا کرتا اور مرض میں مزید شدت اور اضافے کا یقین دلاتا۔

میں اس طرح کا بیان دے رہا تھا اور علامہ کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ الحاصل میں نے علامہ کے جسم و قویٰ اور مرض کے حالات کا کافی مطالعہ کر کے یہ اندازہ کیا تھا کہ علامہ اپنے پیدائشی مقدرتِ حیات سے کہیں پہلے اس لیے بے روح ہو رہے ہیں کہ قوم کی نجات و رہبری کے جدید و بلند راستے تلاش کرتے میں دماغ جس کمال شدت سے کام کرتا تھا اُس شدت میں جسم کے دوسرے اعضا کی فطری غذا کا حصہ بھی دماغ چھین لیتا تھا اور اعصاب کا وہ تمام خون جو روحِ حیات کو تمام جسم میں منتقل کرتا ہے، دماغ ہی چھین کر جلا دیا کرتا تھا اس لیے علامہ نے گویا قوم اور تحقیق راہ کے بے پناہ انہماک کے باعث غیر طبعی اور قبل از وقت جان دی اور غضب کی عالی حوصلگی سے

اللہ تعالیٰ کے انوار کی بے پناہ بارشیں ان کے مزار پر ہوتی رہیں اور بے نہایت الطاف ان کی اولاد پر اور آنے والی انسانی نسل ان کو یاد کرتی رہے۔[1]

برِ صغیر پاک و ہند میں بھوپال وہ پہلا خوش نصیب شہر ہے جہاں علامہ اقبال کی یادیں آج بھی تازہ ہیں اور ان

کی یادگاریں قائم کی گئی ہیں اور ان کے فکر و فن پر تحقیق کے نئے نئے گوشے دریافت کرنے کی سعی و جہد جاری ہے۔ اقبال اور بھوپال سے متعلق اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے تاکہ اقبال شناسوں کو بجا طور پر یہ علم ہو سکے کہ دارالاقبال بھوپال کے رہنے والے علامہ اقبال سے کس حد تک عقیدت رکھتے ہیں :۔

(۱) علامہ اقبال بھوپال میں ـــــ عبدالقوی دسنوی ـــــ سن اشاعت : ۱۹۶۷ء
(۲) اقبال اور بھوپال ـــــ صہبا لکھنوی ـــــ ” ۱۹۷۳ء پہلا ایڈیشن
” ۱۹۸۲ء دوسرا ایڈیشن
(۳) اقبال اور شیش محل ـــــ ڈاکٹر اخلاق اثر ـــــ ” ۱۹۷۷ء
(۴) اقبال آئینہ خانے میں ـــــ مرتبہ : آفاق احمد ـــــ ” ۱۹۷۹ء
(۵) اقبال نامے ـــــ مرتبہ : ڈاکٹر اخلاق اثر ـــــ ” ۱۹۸۱ء
(۶) اقبال اور دارالاقبال بھوپال ۔ عبدالقوی دسنوی ـــــ ” ۱۹۸۲ء
(۷) اقبال اور ممنون ـــــ ڈاکٹر اخلاق اثر ـــــ ” ۱۹۸۳ء
(۸) ریاست بھوپال اور اقبال ـــــ ماسٹر اختر ـــــ ” ۱۹۸۳ء
(۹) بیاد مجلس اقبال ـــــ مرتبہ : ممنون حسن خاں ـــــ ” ۱۹۹۰ء
(۱۰) اقبال اور ممنون ـــــ ڈاکٹر اخلاق اثر ۔ نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن
سن اشاعت : ۱۹۹۱ء

ماسٹر اختر نے اپنی کتاب ـــــ ” ریاست بھوپال اور اقبال “ کے آخری صفحات میں جس نئی کتاب کی نوید دی ہے اس کا نام ہے ـــــ ” اقبال اور نواب بھوپال “

موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت مسلّم ہے۔ کاش ماسٹر اختر اپنی گوناگوں معروفیات سے وقت نکال کر اس کتاب کو جلد شائع کر سکیں تو اقبال اور نواب بھوپال کے قریبی روابط کے بارے میں دنیائے ادب کو نئی معلومات فراہم ہو جائیں گی۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ” اقبال اور بھوپال “ کے دوسرے ایڈیشن میں جو ” اشاریہ “ شامل ہے وہ ” اقبال اور بھوپال “ کے صرف پہلے ایڈیشن میں تیار کیا گیا تھا اور دوسرے یا تیسرے ایڈیشن میں جو دیباچے شامل ہیں ان کی تفصیلات اس ” اشاریے “ میں شامل نہیں۔

صہبا لکھنوی

کراچی ۔ ۱۶ / اپریل ۱۹۹۶ء

دیباچہ طبع ثانی

"اقبال اور بھوپال" کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور خلافِ توقع سال کے دوران ہی ختم ہوگیا۔

مئی ۱۹۷۳ء میں اس کتاب کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت شہزادی عابدہ سلطان (سابق ولیعہد ریاست بھوپال) نے فرمائی۔ شہزادی صاحبہ کے علاوہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر انجم اعظمی اور محمد احمد سبزواری نے کتاب کے بارے میں نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا اور ملک بھر کے مقتدر اخبارات و رسائل، ریڈیو پاکستان کے مبصرین اور ادب کے ناقدین نے سیر حاصل تبصرے اور تنقیدیں کیں جن کا تفصیلی احاطہ اس دیباچہ میں تو ممکن نہیں البتہ اقبال شناسوں کی دلچسپی کے پیشِ نظر یہ تمام مضامین اور تبصرے کتاب کے آخری باب میں محفوظ کر دیے گئے ہیں ـــــ پھر بھی یہاں چند اہم آرا کا تذکرہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر ممتاز حسن (مرحوم) سابق نائب صدر اقبال اکیڈمی پاکستان نے جن کی تحریک و خواہش پر میں نے یہ کتاب لکھی تھی ـــــ کھل کر اعتراف فرمایا:

> "مجھے اس پر دلی مسرت ہے کہ اقبال اور بھوپال کے متعلق جس قسم کی تحقیقی کتاب میں چاہتا تھا ـــــ آپ نے اپنی محنت اور جستجو سے اُسے مہیا کر دیا۔ آپ کی تصنیف اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور میری توقعات سے زیادہ ہے۔"[۱]

اسی دوران یہ کتاب کسی طرح بھوپال پہنچ گئی اور علامہ اقبال کے خاص نیاز مند ممنون حسن خاں کی نظر سے گزری تو انھوں نے ڈاک کی آمد و رفت بند ہونے کے باوجود ایک تفصیلی خط مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء کسی ذریعہ سے مجھے ارسال فرمایا جو کافی عرصہ کے بعد مجھ تک پہنچا ـــــ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس خط کو 'افکار' میں محفوظ کر دوں۔ بعد میں اسے نظر ثانی کے وقت شامل کتاب کر لوں گا۔

اس خط کے جستہ جستہ اقتباسات کے مطالعہ سے کئی ایسے واقعات کا علم ہوا جن کے بارے میں اقبال شناس اور اردو دنیا قطعی لاعلم تھی۔ ممنون حسن خاں کا یہ خط افکار کے شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء میں دو دیگر خطوط کے ساتھ ـــــ "تین شہر تین داستانیں"

۱؎ ذاتی خط بنام راقم الحروف۔ مطبوعہ افکار۔ شمارہ ۴۴۔ نومبر ۱۹۷۳ء

کے عنوان سے جس ذیلی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔۔ اس کا اقتباس پیش ہے :

" ذیل کے تینوں خط یقین ہے دلچسپی سے پڑھے جائیں گے ۔ جناب ممنون حسن خاں کا تفصیلی گرامی نامہ بطور خاص قابلِ ذکر ہے جنھوں نے بارہ سال کے بعد " اقبال اور بھوپال " ایک نظر دیکھنے کے بعد مجھے تحریر کیا ہے ۔ علامہ اقبال کے بھوپالی نیازمندوں میں جناب ممنون حسن خاں ۔۔ سب سے بزرگ و محترم اور مستند و معتبر شخصیت ہیں ۔ ان کے نام علامہ کا آخری خط جو وفات سے صرف دو دن پہلے یعنی ۱۹ / اپریل ۱۹۳۸ء کو تحریر کیا گیا تھا ۔۔ اقبالنامہ میں شامل ہے ۔۔ جناب ممنون حسن خاں نے میری کتاب کے جن گوشوں کی وضاحت کی ہے ان کی اہمیت مسلّم ہے ۔

ہمایوں منزل ۔۔ بھوپال

۳۰ / ستمبر سنہ ۱۹۷۳ء

برادر محترم ۔ سلام مسنون

آپ کی لاجواب کتاب " اقبال اور بھوپال " اختر سعید خاں صاحب نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے عطا فرمائی اور اس طرح مجھے اس کو بہت عجلت میں پڑھنے کا موقع ملا ۔ آپ کی ہمت عالی کی داد دیتا ہوں اور آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس قدر مشکل حالات میں آپ نے اس قدر معلومات جمع فرمائیں اور ان کو اس قدر بہتر طریقے سے کتاب کی شکل میں پیش کیا ۔ آپ نے کتاب میں جگہ جگہ مجھ ناچیز کا تذکرہ کیا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ میں کہاں اس قابل ہوں کہ حضرت علامہ کے نام نامی کے ساتھ میرا نام بھی لیا جائے ۔ حقیقتاً میں تو اُن کے جوتوں کے بند بھی کھولنے کے لائق نہیں تھا ۔

اس وقت آپ کی خدمت میں اس عریضے کو پیش کرنے کا اچھا موقع ہے ۔ میری ایک شاگرد عزیزہ بیگم فرحت نور خاں جو ایر مارشل نور خاں کی اہلیہ ہیں ، یہاں اپنی پھوپھی صاحبہ ، بیگم شاہ بانو میمونہ سلطانہ صاحبہ سے ملنے آئی ہوئی تھیں ، ان ہی کے ذریعہ یہ خط کراچی تک بھیج رہا ہوں جہاں سے وہ یہ خط آپ کو پوسٹ کر دیں گی ۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں تو اس وقت آپ مجھ سے ضرور خط و کتابت فرمائیں ۔۔ میں جو بھی خدمت ہو گی اس کو بجا لاؤں گا اور اس وقت آپ اپنی کتاب کی ایک یا دو جلدیں ضرور میرے پاس ارسال فرمادیجیے گا میں کسی نہ کسی طرح ان کی قیمت آپ تک ضرور پہنچا دوں گا ۔[1]

یہ طویل خط کا مختصر اقتباس ہے ۔ جن دیگر اہم مسائل پر ممنون حسن خاں نے روشنی ڈالی ہے وہ آئندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے ۔

۱۹۷۳ ہی کے دوران ممتاز ادیب و صحافی اقبال احمد صدیقی (رکن ادارۂ جنگ) مجھ سے ملے اور کہا کہ علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ۔۔ اس کتاب کے سلسلے میں ملنے کے خواہش مند ہیں ۔ چنانچہ پہلی فرصت میں اقبال احمد صدیقی کی معیت

---

[1] افکار ۔ شمارہ ۴۶ ۔ جنوری ۱۹۷۴ء ۔ ص ۳۹ ۔ ۴۰

میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ میرے کام کی تعریف کی اور میرا حوصلہ بڑھایا — ساتھ ہی "اقبالنامہ" کا ایک نسخہ دکھایا جس میں میری کتاب میں مشمولہ بعض خطوط یا ان کے کچھ حصے حذف تھے یا ان میں تحریف کی گئی تھی۔ چنانچہ طے پایا کہ کسی روز میں اپنا نسخہ (اقبالنامہ) لے آؤں تاکہ دونوں نسخوں کا موازنہ کر کے اصل صورت حال کا پتہ چلایا جا سکے۔

دوسری ملاقات میں — شیخ صاحب نے اور میں نے — اقبال احمد صدیقی کی موجودگی میں اقبالنامہ کے نسخوں کا موازنہ کیا تو واقعی ان میں کئی تبدیلیاں نظر آئیں — یہ انکشاف جہاں شیخ صاحب کے لیے باعث حیرت تھا وہیں میرے لیے بھی حیرانی بلکہ پریشانی کا باعث تھا — کیونکہ جگہ جگہ میں نے اپنی کتاب میں اقبالنامہ کے پہلے ایڈیشن کی نایابی کا ذکر کیا ہے اور اس وقت وہی پہلا ایڈیشن میرے پاس تھا اور تحریف شدہ ایڈیشن شیخ صاحب کے قبضے میں تھا۔ موازنے سے پتہ چلا کہ ایک خط تو پورا حذف کر دیا گیا ہے۔ تحریف شدہ ایڈیشن میں دو مختلف رنگ کے کاغذ شامل ہیں۔ اصلی اور تحریف شدہ ایڈیشن کے صفحات کے نمبروں میں فرق ہے۔ کچھ عبارتیں حذف کی گئی ہیں وغیرہ۔ شیخ صاحب نے دونوں نسخوں کا موازنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر آپ کی کتاب "اقبال اور بھوپال" شائع نہ ہوتی تو علامہ کے خطوط میں تحریف و ردوبدل کا شاید ہی کسی کو علم ہوتا۔

میں نے عرض کیا کہ اقبال نامہ کے ناشر شیخ محمد اشرف[لے] سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ یہ نسخہ بھی میں نے انھیں سے حاصل کیا تھا — میں انھیں خط لکھ کر صحیح واقعات کا پتہ چلاؤں گا اور نتیجہ سے آپ کو بھی مطلع کروں گا۔

اسی ملاقات کے دوران شیخ اعجاز احمد نے کتاب کے بعض واقعات کی صحت پر عدم اطمینان کا اظہار فرمایا تو میں نے انھیں اپنی مشکلات اور اس کتاب کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں چند در چند دشواریوں کا مختصر احوال سنایا اور عرض کیا کہ آپ اپنا اطمینان فرمانے کے بعد ان واقعات کی نشان دہی فرما دیں تو مجھ پر بھی اور اردو ادب پر بھی احسان ہوگا — کیونکہ میں ذاتی طور پر کسی بھی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے تحریری تفصیلات کی فراہمی کا وعدہ فرما لیا اور تقریباً ایک سال کی کوشش و کاوش کے بعد بعض واقعات کی درستی فرمائی۔ آپ کی تحریر کے اقتباسات آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔

عبدالواحد معینی[لے] — سابق نائب صدر اقبال اکیڈیمی پاکستان نے جن کی نگرانی میں یہ کتاب چھپی تھی — کتاب کی اشاعت کے تقریباً آٹھ ماہ بعد از رہِ شفقت تفصیلی تبصرہ — "اقبال ریویو" شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء (جلد ۱۴۔ شمارہ ۴) میں صفحات ۶۰ تا ۷۷، شائع فرمایا — ساتھ ہی اس تبصرے کو علٰحدہ بھی شائع کر کے تقسیم کیا اور اس طرح اقبال اکیڈیمی میں ایک نئی روایت کی طرح ڈالی۔ اس تبصرے کی تفصیلات سے قطع نظر انھوں نے جس فراخ حوصلگی سے میری سعی و کاوش کو سراہا ہے وہ میرے لیے بہر طور باعث امتیاز ہے۔ لکھتے ہیں:

> "علامہ کے علاج کی غرض سے تین بار قیام اور ان کا تفصیلی حال جو تین ابواب میں دیا ہے کتاب کی جان ہے۔ گو ہر پڑھنے والا یہ چاہے گا کہ یہ حالات اور مفصل ہوتے تو بہت اچھا ہوتا مگر شاید زیادہ تفصیلات کا حاصل کرنا قابل مصنف کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان تین ابواب کے علاوہ یعنی تیسرے باب، پانچویں باب اور آٹھویں باب کے علاوہ کتاب کے کچھ اور ابواب بھی ہیں جن میں بہت دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔ مثلاً دوسرا باب علامہ اور نواب حمید اللہ خاں بہادر کے خصوصی روابط پر روشنی ڈالتا ہے۔ چوتھا باب اقبال کے وظیفہ اور اس کے پس منظر کی تفصیلات دیتا ہے۔ چھٹے باب میں جشنِ حالی کا مستند احوال پیش

[لے] افسوس کہ یہ دونوں شخصیتیں سنہ ۱۹۸۰ء کے دوران ہم سے جدا ہوگئیں۔

کیا گیا ہے اور بلاشک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس باب کی تفصیلات بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کی ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر اور زیادہ مفصل حال کسی دوسری جگہ ملنا محال ہے اور قابل مصنف اپنی محنت کے لیے قابلِ مبارک باد ہیں۔ ساتواں باب علامہ اور ان کے خصوصی معالج ڈاکٹر عبدالباسط سے خط وکتابت پر مشتمل ہے۔ اس باب میں علامہ کے وہ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں جو علامہ نے ڈاکٹر عبدالباسط کو تحریر کیے تھے۔[۱]

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے بارے میں "اقبال اور بھوپال" کے صفحہ ۲۰ اور "اقبال اور حیدر آباد" کے صفحہ ۲۳۱ پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ عبدالواحد معینی نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

"یہ ضروری ہے کہ اس کا ذکر کر دوں کہ لمعہ صاحب کے (نام) علامہ کے خطوط بیشتر جعلی ہیں اور خود عطاء اللہ صاحب (مرحوم) اس کے معترف تھے۔[۲] اس لحاظ سے لمعہ صاحب کا ذکر ہی اس سلسلہ میں غیر ضروری ہے اور یہ سراسر غلط ہے کہ علامہ لمعہ صاحب کی "شاعرانہ صلاحیتوں کے دل سے معترف تھے"۔ اتنا بڑا جعل اردو ادب کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی سرزد ہوا ہوگا۔[۳]

عجب اتفاق ہے کہ لمعہ کے جعلی خطوط کے بارے میں ــــ "اقبال اور بھوپال" کی اشاعت سے پہلے کبھی کسی نے اظہار رائے کی ضرورت نہیں سمجھی ــــ بہر طور میرے لیے معینی صاحب اور بعض دیگر معترضین کے پیدا کردہ نئے مسائل کی چھان بین ضروری تھی، چنانچہ جب "اقبال اور بھوپال" کا آخری نسخہ بھی فروخت ہوگیا تو ۱۹۷۶ء کے دوران اقبال اکیڈیمی کی مجلسِ انتظامیہ نے اس کی دوبارہ اشاعت کا فیصلہ کیا اور مجھے اطلاع دی۔ چنانچہ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس دوران شائع ہونے والے تبصروں اور مشوروں کی روشنی میں بعض اہم امور کی مزید تحقیق بھی دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دوں اور وہ نیا مواد بھی جو اس دوران مجھے دستیاب ہوا۔ چنانچہ تین سال کی سعی وجہد کے بعد دوسرا ایڈیشن اس امید اور توقع کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ آپ ترمیم و اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اسے پہلے سے زیادہ مفید پائیں گے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال سے متعلق بعض ضعیف اور مشتبہ روایات کی صحت و درستی ہوجائے اور جو نیا مواد شامل ہو رہا ہے اس سے کتاب کی قدر و اہمیت میں کچھ اور اضافہ ممکن ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال ایسی نابغہء روزگار شخصیت کے بارے میں نئے گوشوں اور معلومات کے نئے اضافوں کے ابھی وسیع امکانات ہیں۔ اقبال یقیناً ان عظیم شاعروں میں شامل ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں تک زندہ رہتے ہیں اور ہر زمانے کی نئی نسل اُن کے فن، ان کی زندگی اور شخصیت سے فیضان حاصل کرتی ہے۔

مجھے اپنی کوتاہیوں کا پہلے کی طرح اب بھی اعتراف ہے۔ میں نے پوری توجہ، احتیاط اور عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب پر نظر ثانی کی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی واقعہ خلافِ حقیقت آپ کو نظر آئے تو میری رہبری فرمائیں ــــ شاید

۱۔ اقبال ریویو۔ جنوری ۱۹۷۴ء۔ صفحہ ۶۷

۲۔ یہ اعتراف زبانی تھا یا تحریری۔ اور اگر تحریری تھا تو کب اور کہاں اشاعت پذیر ہوا۔ معینی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔

۳۔ اقبال ریویو۔ جنوری ۱۹۷۴ء۔ صفحہ ۴۷

کبھی تیسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح بھی ممکن ہو سکے۔

دیباچہ کے دوسرے حصے میں نئے مواد کی تفصیلات اور وہ تمام واقعات وحقائق شامل ہیں جو انتہائی کدوکاوش اور پوری ذمہ داری سے فراہم کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ممنون حسن خاں، شیخ اعجاز احمد، بیگم چھتاری،[1] اور جلیل قدوائی کا بطورِ خاص ممنون ہوں جن کے تعاون سے دوسرے ایڈیشن میں قابلِ قدر اضافہ اور صحت و درستی ممکن ہو سکی۔

دوسرے ایڈیشن کا نیا مواد

گزشتہ تین سال کے دوران اس کتاب پر نظرثانی کے دوران سعی وکاوش سے جو نیا مواد دستیاب ہوا، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱ اقبالنامہ میں تحریف ورد وبدل کا انکشاف۔

۲ بعض واقعات کے سلسلے میں شیخ اعجاز کی توضیحات اور تحقیقِ مزید۔

۳ ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال کانفرنس کا انعقاد۔ اقبال کا بیان مطبوعہ "انقلاب" لاہور۔

۴ راس مسعود کے چھ نادر خطوط بنام اقبال بتواریخ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء، ۳۱ مارچ ۱۹۳۵ء، ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء، ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء، ۹ مئی ۱۹۳۵ء اور ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء اور ایک خط بنام حفیظ جالندھری بلاتاریخ جس میں جشن حالی منعقدہ پانی پت میں پڑھی جانے والی نظم پر دلچسپ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اقبال کے دو خطوط کی فوٹو کاپیاں۔

۵ اقبال کے وظیفہ سے متعلق نواب حمید اللہ خاں کی جانب سے بھیجی جانے والی ایک قیمتی یادداشت۔

۶ اقبال کا ایک یادگار خط خواجہ حسن نظامی کے نام جس میں "خواجہ نمبر" کے سلسلے میں انھوں نے بطور جج پروفیسر سید نواب علی کے مضمون کو بہترین قرار دیا۔

۷ اقبال کی وفات پر باسط بھوپالی، اختر سعید خاں اور احسن علی خاں کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ مرثیے۔

۸ ممنون حسن خاں کے چند اہم انکشافات۔

۹ اقبال کے احکام وظیفہ کی فوٹو کاپی جس سے وظیفہ کے غیر مشروط ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۰ مولانا محمد علی کو ولایت کے سفر کے سلسلے میں اور عبدالرحمٰن چغتائی کو ــــ اقبال اور راس مسعود کی سفارش پر "نقشِ چغتائی" کے لیے کثیر رقم ریاست بھوپال نے عطا کی تھی۔

۱۱ قرآن مجید کا خاکہ اقبال نے تیار کر دیا تھا جسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے مصر ارسال کیا تھا۔

۱۲ اقبال کا ایک نایاب خط ڈاکٹر تاثیر کے نام جس سے پہلی بار یہ علم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے حواشی سے متعلق کتاب کا نام انھوں نے "مقدمۃ القرآن" رکھا تھا۔ اسی خط میں انھوں نے بھوپال کے وظیفہ کو "لٹریری پنشن" سے موسوم کیا ہے۔

۱۳ آخری باب ـــ "کتاب کے بارے میں" ـــ ان مضامین اور تبصروں پر مشتمل ہے جو پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد قومی پریس میں شائع ہوئے۔

۱۴ نواب محمد حمید اللہ خاں کی بچپن کی نایاب تصویر اپنے والد کے ساتھ۔

---

[1] افسوس کہ بیگم راحت سعید چھتاری (سابق لیڈی مسعود) کا مارچ ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوگیا۔

'اقبالنامہ' میں تحریف ورد و بدل

شیخ اعجاز احمد سے دوسری ملاقات کے فوراً بعد میں نے 'اقبالنامہ' کے ناشر شیخ محمد اشرف کو تفصیلی خط لاہور لکھ دیا تھا جس کا جواب کافی تاخیر سے ملا۔ انھوں نے جو واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان سے قطعی نئی صورتِ حال سامنے آئی۔ سب سے پہلے خط کا متن ملاحظہ ہو:

۷، کشمیری بازار، لاہور
۳ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

مکرمی جناب صہبا صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوگیا تھا۔ موسمِ سرما کی وجہ سے میں پہاڑ وغیرہ پر جاتا رہا ہوں اور آپ کے خط کا جواب دفتر والے نہیں دے سکتے تھے اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مکاتیبِ اقبال کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ میں طبع ہوا تھا۔ (شیخ عطاء اللہ کے لائق فرزند مختار مسعود نے بتایا کہ 'اقبالنامہ' کی پہلی جلد ۱۹۴۴ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی) جس وقت یہ کتاب (پہلی جلد) چھپ کر بازار میں آئی اس وقت چوہدری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے۔ چوہدری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور PAPER CONTROLLER بھی تھے۔ میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔

علامہ اقبال نے ایک خط[1] سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چوہدری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چند اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً وہ خط حذف کیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہوگئے ان میں وہ خط شامل ہوگا۔ (اور اتفاق دیکھیے کہ راقم کے پاس وہی نسخہ ہے جو چوہدری صاحب مرحوم کی قطع و برید سے محفوظ رہ گیا) بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ (یہ نسخہ شیخ اعجاز احمد کے پاس میں نے دیکھا) یہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے واپس نہیں کیے تھے۔ غالباً ان کے صاحبزادے مختار مسعود کے پاس محفوظ ہوں گے۔

آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے کہ بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں۔ چونکہ ایک بہت اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس کی وجہ سے صفحات اور عبارت میں فرق ہونا لازم تھا۔ امید ہے آپ کی اُلجھن دور ہوگئی ہوگی۔ اگر مزید ضرورت

۱۔ مشمولہ اقبال اور بھوپال۔ صفحہ ۸۷۔ ۸۸ (خط بنام راس مسعود مورخہ ۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء)

ہو تو آپ ہر وقت دریافت کرسکتے ہیں۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اشرف۔"

اس خط کے مندرجات سے جہاں "اقبالنامہ" کی پہلی جلد میں تحریف و ردوبدل کے اسباب کا علم ہوتا ہے وہیں پہلی بار یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم نے علامہ اقبال پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے جس کی ادبی تاریخ میں مثال ملنا ممکن نہیں۔ اس ناروا اقدام سے وہ شخصیتیں بھی مجروح ہوئیں جن سے علامہ اقبال کے نہایت قریبی اور مخلصانہ رابطے تھے اور علامہ ایسی بلند مرتبت شخصیت کے ذاتی خطوط کی دیانت پر بھی حرف آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ــــ چودھری صاحب مرحوم کے ایسے بے جا اور نازیبا اقدام کو ادبی مورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

چودھری محمد حسین مرحوم نے اقبال کے صرف اسی ایک خط کو حذف کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض دیگر خطوط میں بھی ترمیمات سے دریغ نہیں کیا جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

شیخ اعجاز احمد کی توضیحات

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کرچکا ہوں ــــ علامہ اقبال کے لائق بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے اس کتاب کے سلسلے میں میری دو تفصیلی ملاقاتیں ہوئی تھیں ــــ اقبالنامہ کے بعض خطوط میں ردوبدل کے انکشاف کے علاوہ بعض روایات و واقعات پر شیخ صاحب نے شک و شبہ کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے گزارش کی تھی کہ آپ مزید تحقیق فرما کر نتیجہ سے مجھے مطلع فرما دیں تاکہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں آپ کے تحقیقی نتائج شامل کروں۔ اس طرح واقعات و روایات کی صحت و درستی بھی ہوجائے گی اور آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہیں رہے گا۔

شیخ صاحب نے ازرہِ اقبال شناسی یہ ذمہ داری قبول فرمالی ــــ تقریباً ایک سال تک انھوں نے تمام ممکنہ ذرائع سے بعض واقعات کی چھان بین فرمائی اور مجھے تحریری طور پر تفصیلات مہیا فرمادیں جن کا سلسلہ وار تذکرہ پیشِ خدمت ہے:

"۲۱۳۔ بی۔ فریر اسٹریٹ

کراچی۔ ۴

۴ راکتوبر ۱۹۷۵ء

مکرمی محترمی صہبا صاحب۔ السلام علیکم

پچھلی دو ملاقاتوں میں آپ کی تصنیف "اقبال اور بھوپال" کے متعلق آپ کے ساتھ تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ اس موضوع پر بکھرے ہوئے مواد کو آپ نے جس کاوش اور لگن سے یکجا کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اقبالیات میں اس گراں قدر اضافہ پر جہاں میں نے آپ کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا وہاں یہ عرض کرنے کی جسارت بھی کی تھی کہ علامہ اقبال کے متعلق بعض ایسی روایات کو بھی آپ نے "معتبر و مستند" سمجھ کر اور انھیں "نئے، اچھوتے اور منفرد واقعات جن کا آج تک کسی کو علم نہ تھا" قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے جو میری دانست میں اگر "رہ افسانہ زدند" کی ذیل میں نہیں آتے تو کم از کم تاحال تشنۂ تحقیق ضرور ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" کی چند ایسی ضعیف روایات کی نشان دہی

کرتے ہوئے میں نے اُن کے متعلق مزید چھان بین کا مشورہ دیا تھا۔ آپ سے یہ معلوم ہوکر اطمینان ہوا کہ آپ نے کچھ مزید معلومات حاصل کی ہیں جن سے میری معروضات کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنی معروضات کو اس تحریر میں قلمبند کر کے پیش کرتا ہوں:

محمد عباس علی خاں لمعہ

اقبال نامہ حصہ اول میں علامہ اقبال کے کچھ خطوط ایک صاحب محمد عباس علی خاں لمعہ[۱] کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا میں ان صاحب کے علامہ کے ساتھ تعلقات پر روشنی ڈال سکتا ہوں کیونکہ بعض حلقے ان خطوط کی اصلیت کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ خطوط کے تو بغیر اصل خطوط کو دیکھے حتمی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے لیکن حسبِ ذیل قرائن سے مجھے یہ خطوط اصلی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اولاً ایک خط کا عکس[۲] "اقبال نامہ" حصہ اوّل میں شامل ہے جس کی تحریر کو میں پہچانتا ہوں کہ چچا جان کی ہی ہے۔ دوئم ان خطوط کا طرزِ تحریر بھی انھیں جیسا ہے۔ سوئم آخر عمر میں آنکھوں میں موتیا اُتر آنے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ اُن ایام میں خطوں کا جواب کسی اور سے لکھواتے۔ عام طور پر یہ کام مشہور صحافی "م۔ ش" صاحب (جناب محمد شفیع صاحب ایم اے) کے سپرد تھا۔ بعض اوقات چچا جان کی ہدایت پر شفیع صاحب ہی جواب لکھ دیتے تھے۔ چنانچہ "اقبالنامہ" میں شائع ہونے والے خطوط بنام لمعہ صاحب کا آخری خط[۳] محررہ ۳۱ اگست ۱۹۳۷ء شفیع صاحب کی طرف سے ہے۔ اس میں دیوانِ غالب کا ایک نسخہ چچا جان کی خدمت میں بھیجنے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دیوان غالب کا ایک پاکٹ سائز نسخہ مطبوعہ مطبع آفتاب۔ برلن لمعہ صاحب کی طرف سے علامہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اس کی نہایت دیدہ زیب جلد بندی دکن کی مشہور "محبوبیہ بک بائنڈنگ فیکٹری (جو اب کراچی میں ہے) کی تیار کردہ ہے۔ لمعہ صاحب نے اس نسخہ پر حسبِ ذیل شعر تحریر کیا ہوا ہے:

اقبال تو سراپا اسرار ایزدی ہے
افسون تیرا تکلم تو شعر کا نبی ہے

محمد عباس علی خاں لمعہ
۲۷ اگست ۱۹۳۷ء

(میں نے "افسون" (نون میں نقطہ کے ساتھ) ویسے ہی لکھ دیا ہے جیسے لمعہ صاحب نے لکھا ہوا ہے ورنہ شعر کے لحاظ سے "افسوں" ہونا چاہیے۔ شاید لمعہ صاحب نے غلطی

---

[۱] اقبال اور بھوپال۔ صفحہ ۲۰

[۲] اقبالنامہ۔ (جلد اول)۔ صفحہ ۲۷۱ [۳] ایضاً۔ صفحہ ۲۹۸

سے نون میں نقطہ ڈال دیا۔ واللہ اعلم)۔ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ علامہ اقبال نے اپنے بڑے بھائی یعنی میرے والد صاحب کو دے دیا تھا، چنانچہ والد صاحب کے دستخط اس پر موجود رہیں۔ والد صاحب سے دیوان غالب کا یہ نسخہ مجھے ملا اور اب میرے قبضہ میں ہے۔ لمعہ کے نام اقبالنامہ میں شائع ہونے والے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ لمعہ صاحب گاہے گاہے علامہ کی خدمت میں کتابیں پیش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی پیش کی ہوئی ایک اور کتاب "ارمغانِ عزیز" کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر جلد دوم بھی میرے پاس ہے جو لمعہ صاحب نے ۱۷ اگست ۱۹۳۷ء کو علامہ کی خدمت میں بھیجی۔

سرورق پر حسب ذیل عبارت رقم ہے:

بخدمت شریف، عالی جناب حضرت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب مدظلہٗ

بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور۔ از محمد عباس علی خاں لمعہ۔ ۱۷ اگست ۱۹۳۷ء

یہ کتاب چچا جان نے مجھے عطا فرمائی۔ یہ سب قرائن خطوط متذکرہ بالا کے اصلی ہونے کی تائید کرتے ہیں۔"

لمعہ کی فرضی شخصیت اور جعلی خطوط کے سلسلے میں راقم الحروف نے مختار مسعود سے بھی معلومات حاصل کی۔ ایک ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ والد صاحب کی لمعہ سے خط و کتابت رہی ہے۔ ان کے کچھ خطوط اب بھی ان کے پاس محفوظ ہیں لہٰذا ان کی فرضی شخصیت کا اعتراض بے معنی ہے۔ ان کے تمام تر خطوط جعلی ہیں — یہ بات تحقیق طلب ہے — بہر حال وہ جلد ہی اقبالنامہ کی دونوں جلدیں یکجا — "شیخ و بیگم عطاء اللہ ٹرسٹ" کے زیر اہتمام فوٹو آفسٹ پر شائع کر رہے ہیں — اس میں وہ "ابتدائیہ" لکھیں گے اور مزید چھان بین کے بعد لمعہ کے جعلی خطوط اور دیگر خطوط پر اظہار رائے کریں گے۔ فی الوقت حتمی طور پر وہ کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔

جناب جمیل نقوی صاحب کی روایت

شیخ اعجاز احمد نے اس سلسلے میں جو تحقیق فرمائی ہے وہ اُن کی زبانی سنیے:

اقبال اور بھوپال" کے صفحات ۱۱۷ تا ۱۲۲ پر آپ نے جمیل نقوی صاحب کی ایک یادداشت نقل کی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ماہانہ وظیفہ سے قبل راس مسعود صاحب کی مساعی سے ڈاکٹر اقبال کو یکمشت بھی کئی ہزار کی رقم نواب صاحب بھوپال نے عطا کی تھی تاکہ وہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے کتب کی خریداری کر سکیں۔"

اپنے اس بیان کے ثبوت میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس رقم کا حوالہ جناب ممنون حسن خاں کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے جو "اقبالنامہ" کے "پہلے ایڈیشن" میں شامل تھا — بعد میں اسے بعض وجوہ کی بنا پر "پہلے ایڈیشن" سے خارج کر دیا گیا۔"

جمیل صاحب نے جو کچھ اپنے بیان کے ثبوت میں فرمایا ہے وہ واقعات کے خلاف ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا "اقبال نامہ" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی تو ابھی نوبت ہی نہیں آئی۔ آپ سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد اشرف صاحب ناشر کتاب مذکور نے آپ کے استفسار کے جواب میں اس بات کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ "اقبال نامہ" چھپ چکنے کے بعد جناب چودھری محمد حسین صاحب کو جو علامہ کے دوست اور اُن دنوں پریس برانچ کے افسر اعلیٰ تھے۔ "اقبال نامہ" میں شامل بعض خطوط کی اشاعت پر اعتراض ہوا اور ان کے کہنے کے بموجب دو ایک خطوط میں ان کو طبع شدہ کتاب میں ردّوبدل کرنا پڑا۔ (جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا۔ یہ ردّوبدل ممنون حسن خاں صاحب کے نام جو خطوط شامل اقبال نامہ میں ان میں نہیں کیا گیا۔)

میں نے بھی اپنے طور پر اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ جو لاہور میں مقیم ہیں۔ شیخ محمد اشرف صاحب سے اس واقعہ کے متعلق صورت حال دریافت کرائی تھی۔ میرے بھائی کا جو جواب آیا ہے اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں:

> "میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ "اقبالنامہ" کے بارے میں انھوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کتاب کی قریباً ۱۰۰ کاپیاں جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ چودھری صاحب چھ ماہ بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ چودھری صاحب لڑائی کے زمانے میں پیپر کنٹرولر بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے۔ انھیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزار دیے جائیں۔ اُن کے ریٹائر ہونے کے بعد فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کی ملازمت میں دو سال کی توسیع ہو گئی۔ میں مجبور ہو گیا۔ کتاب کی چار ہزار کاپیاں چھپی تھیں۔ ان کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس سے مجھے کافی نقصان ہوا۔"

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ خود آپ کے پاس "اقبالنامہ" حصہ اول کی جو کاپی ہے اور جس سے آپ نے علامہ کے خطوط بنام سید راس مسعود صاحب و ممنون حسن خاں صاحب "اقبال اور بھوپال" میں نقل کیے ہیں انھیں چند کاپیوں میں سے ایک ہے جو چودھری محمد حسین صاحب کی دست برد سے محفوظ رہ گئی۔ اس کے متعلق آپ نے اپنی کاپی کا مقابلہ ردّوبدل شدہ کاپی سے کر کے اپنا اطمینان کر لیا ہے کہ یہ وہی "پہلا ایڈیشن" ہے جس کے متعلق جمیل نقوی صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"مجھے معلوم نہیں اب پہلا ایڈیشن کہاں ملے گا۔" (اقبال اور بھوپال۔ صفحہ ۱۲۱) اور آپ نے لکھا ہے۔ "کوشش کے باوجود اقبال نامہ کا پہلا ایڈیشن کہیں دستیاب نہ ہو سکا۔ جس سے یکمشت ادائی کی تصدیق ہو سکتی۔" (اقبال اور بھوپال، صفحہ ۱۲۲)۔ اسے کہتے ہیں "لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔"

"اقبالنامہ" کی جو کاپی آپ کے پاس ہے اس میں ممنون حسن خاں صاحب کے نام دس خط درج ہیں اور وہ دسوں کے دسوں ان کاپیوں میں بھی موجود ہیں جن میں چودھری محمد حسین صاحب کے ایما پر ردّوبدل کیا گیا۔ کوئی ایک خط بھی ایسا نہیں جو یا جس کا کوئی حصہ ردّوبدل شدہ کاپیوں میں حذف کیا گیا ہو۔ اور آپ والی کاپی کے کسی خط میں "کئی ہزار" کی مبینہ رقم کا ذکر نہیں۔ آپ کے پاس والی "اقبالنامہ" کی کاپی کا مقابلہ ان کاپیوں سے کیا جائے جس میں ردّوبدل کیا گیا تو جمیل صاحب کے اس بیان کی واضح طور پر تردید ہوتی ہے کہ "کئی ہزار کی مبینہ رقم کا ذکر علامہ اقبال نے ممنون حسن خاں صاحب کے نام ایک خط

ہیں کیا جو "اقبالنامہ" میں شائع ہوا لیکن بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر خارج کر دیا گیا۔" چوہدری محمد حسین صاحب کی سنسر اینہ قینچی صرف سید راس مسعود صاحب کے نام تین خطوں پر چلی معلوم ہوتی ہے۔ اول خط محررہ ۳۰ مئی ۳۵ء کا کچھ حصہ حذف کرایا گیا — دوئم خط محررہ ۱۱ دسمبر ۳۵ء سارے کا سارا حذف ہوا۔ سوئم خط محررہ ۱۰ جون ۳۷ء کا کچھ حصہ حذف کرادیا گیا۔ "اقبالنامہ" کی جو کاپیاں رد و بدل سے پہلے فروخت ہو چکی تھیں (جن میں آپ کی کاپی بھی شامل ہے) ان میں یہ تینوں خطوط مع حذف شدہ حصوں کے موجود ہیں۔

سید راس مسعود صاحب کے نام خط محررہ ۳۰ مئی ۳۵ء ("اقبال اور بھوپال" — صفحہ ۸۷) کا کچھ حصہ اور خط محررہ ۱۱ دسمبر ۳۵ء ("اقبال اور بھوپال" — صفحہ ۱۵۰) سارے کا سارا حذف کرانے میں چوہدری محمد حسین صاحب کی کیا مصلحت تھی یہ انھیں ہی معلوم ہوگی۔ مجھے تو ان کے شائع ہو جانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اس تحریر میں طوالت کے خوف سے اس بارے میں تفصیلی جائزہ ترک کرتا ہوں۔ سید صاحب موصوف کے نام خط محررہ ۱۰ جون ۳۷ء ("اقبال اور بھوپال" — صفحہ ۱۸۹) کا جو حصہ چوہدری صاحب نے "اقبالنامہ" حصہ اول کے طبع ہو جانے کے بعد حذف کرایا اس تحریف کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ اگر اصل خط جو "اقبال اور بھوپال" کے صفحہ ۱۸۹ پر شائع ہوا ہے کا مقابلہ تحریف شدہ خط سے کیا جائے۔ آپ کے قارئین کی سہولت کے لیے ذیل میں اصل خط اور تحریف شدہ خط کے اقتباس نقل کرتا ہوں :

1	2
اقتباس اصلی خط محررہ ۱۰ جون ۳۷ء جو "اقبالنامہ" حصہ اول میں پہلے شائع ہوا اور "اقبال اور بھوپال" کے صفحہ ۱۸۹ پر نقل ہے۔	اقتباس خط محررہ ۱۰ جون ۳۷ء جو چوہدری محمد حسین صاحب کے ایما پر بعض حصے حذف کرنے کے بعد "اقبالنامہ" حصہ اول میں شائع ہوا۔
"میں نے جاوید اور منیرہ کے چار GUARDIAN مقرر کیے تھے۔ یہ از روئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں : (۱) شیخ طاہر الدین : یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (۲) چوہدری محمد حسین ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سب جج دہلی۔ (۴) عبدالغنی (مرحوم)	"میں نے جاوید اور منیرہ کے چار GUARDIAN مقرر کیے تھے۔ یہ از روئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں : (۱) شیخ طاہر الدین : یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (۲) چوہدری محمد حسین۔ ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (۳) شیخ اعجاز احمد۔ بی اے۔ ایل۔ ایل بی۔ سب جج دہلی۔ (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بے چارے کے متعلق میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں ۔ (اس کی جگہ خاں صاحب میاں امیرالدین سب جج (ر) لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر (۳) شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو GUARDIAN مقرر کردوں ... وغیرہ وغیرہ	عبدالغنی بے چارے کے متعلق میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو GUARDIAN مقرر کر دوں ... وغیرہ وغیرہ

کالم ۱ میں خط کشیدہ حصہ حذف کرانے سے ایک تیر سے دو شکار کیے گئے۔ ایک تو یہ خاکسار جس کے متعلق چچا جان نے ازرہِ شفقت فرمایا — "میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔" یہ صالحیت کا سرٹیفیکٹ اگرچہ اس حسنِ ظن کا مرہونِ منت تھا جو بزرگ عام طور پر اپنے عزیزوں کے متعلق رکھتے ہیں لیکن اس کی اشاعت چوہدری محمد حسین صاحب کی "سیاست" کو گوارا نہ ہوئی، لہٰذا ان الفاظ کو حذف کرا دیا گیا اگرچہ ایسا کرنے سے خط کا مفہوم بالکل بدل گیا۔ مذکورہ بالا تحریف کے تیر کے دوسرے شکار جناب میاں امیرالدین صاحب ہوئے ۔ اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے سے یہ تحریر طویل ہو جائے گی لہٰذا اسے ترک کرتا ہوں ۔ اس "سیاست بازی" کے متعلق میں کچھ مزید کہنا نہیں چاہتا۔ چوہدری صاحب اپنے خالق کے پاس پہنچ چکے ہیں اور ان کا معاملہ اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

سید راس مسعود صاحب کے نام علامہ کے تمام خطوط جو "اقبالنامہ" میں شائع ہوئے ہیں بشمول ان کے جن میں بعد میں پورا یا کوئی حصہ حذف کرایا گیا پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کسی ایک خط میں بھی جمیل نقوی صاحب کی بیان کردہ "کئی ہزار کی رقم" کا ذکر یا اشارہ تک نہیں ۔ اگر سید صاحب (مرحوم) کی مساعی سے کئی ہزار کی رقم عطا ہوئی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ علامہ اُن کے نام کسی خط میں بھی اس خطیر رقم کا ذکر نواب صاحب کی شکر گزاری کے طور پر نہ کرتے جیسا کہ انھوں نے ماہانہ وظیفہ عطا ہونے پر سید صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ۳۰ رمئی — ۲۴ رجون اور ۱۸ رستمبر ۳۵ء کے خطوط میں بار بار کیا۔ علامہ کو اعترافِ احسان میں کبھی دریغ نہیں ہوا ۔ نواب صاحب نے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تو فوراً سید نذیر نیازی صاحب کے نام اپنے خط محررہ یکم جون ۳۵ء میں اپنی احسان مندی کا ذکر کیا لیکن اس "کئی ہزار کی رقم" کا ذکر نہ کبھی گھر میں ہوا نہ احباب میں سے کسی کے ساتھ۔ میں نے احتیاطاً سید نذیر نیازی صاحب سے جو ان دنوں چچا جان کے بہت قریب تھے، اس روایت کے متعلق دریافت کیا ہے — وہ فرماتے ہیں — :

"جمیل نقوی صاحب کی روایت بھی "تصنیف بندہ" ہے اور کچھ نہیں ۔" اگر سید راس مسعود صاحب کی مساعی سے "کئی ہزار کی رقم" نواب صاحب نے عطا کی ہوتی تو حسبِ ذیل تین زندہ ہستیوں کو اس کا ضرور علم ہوتا ۔ اول سید راس مسعود صاحب کی بیگم صاحبہ جنھیں علامہ سے گہری عقیدت تھی ۔ دوسرے نواب صاحب کی کابینہ کے ایک ممتاز رکن جناب علی حیدر عباسی صاحب[۵۱]۔

[۵۱] افسوس کہ علی حیدر عباسی کا [illegible] میں انتقال ہوگیا۔

سابق مشیر المہام صیغۂ سیاسیہ بھوپال جنھوں نے ماہانہ وظیفہ کی منظوری میں عملاً حصّہ لیا۔ ("اقبال اور بھوپال"، صفحہ ۵۹ - ۲۴۰ تا ۲۴۲) اور تیسرے شہزادی عابدہ سلطان صاحبہ۔ ولی عہد ریاست بھوپال جن کے دستخطوں سے ماہانہ وظیفہ کا پہلا چیک جاری ہوا۔ ("اقبال اور بھوپال"، صفحہ ۲۲۹)

جہاں تک مجھے علم ہے اوّل الذکر کراچی میں ہی مقیم ہیں۔ آپ کی کتاب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ نے ان سے رابطہ قایم کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟[۱] دوسری دونوں ہستیوں سے آپ ملے اور اُن کے ساتھ اپنی گفتگوؤں کا بالتفصیل ذکر فرمایا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی مبینہ کئی ہزار کی رقم دیے جانے کا ذکر نہیں فرمایا۔ جناب علی حیدر عباسی صاحب کے ساتھ آپ کی گفتگو میں تو قرآن مجید کے حواشی کا ذکر بھی آیا کہ آخری قیام بھوپال کے دوران میں علامہ کی تمام تر توجہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے پر مبذول تھی جس کے لیے نواب صاحب نے ان سے درخواست کی تھی۔ اس سلسلے میں کئی ہزار کی رقم اگر عطا کی گئی ہوتی تو علی حیدر عباسی صاحب اس کا ذکر ضرور فرماتے۔

اب اس "ہر لحاظ سے معتبر، مستند اور قابلِ اعتماد" روایت کے ثبوت میں لے دے کے ایک جناب جمیل نقوی صاحب کا زبانی بیان رہ جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی روایت کی تائید میں جس تحریری ثبوت کا ذکر فرمایا ہے (یعنی علامہ کا خط بنام ممنون حسن خاں۔ مندرجہ "اقبال نامہ") اس کا کہیں وجود نہیں۔ آپ نے "اقبال اور بھوپال" کے صفحات ۲۹۱ تا ۲۹۴ پر علامہ اقبال کے ایک معاند مولوی محمد امین زبیری صاحب کا ذکر فرماتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ انھیں علامہ سے کچھ اسی نوعیت کا للّٰہی بغض تھا جیسا انھیں مولانا شبلی سے تھا اور اس کے نتیجہ میں آخری عمر میں انھوں نے علامہ کے خلاف "خدوخال اقبال" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھ ڈالی جس کا مقصد ان کے بیان کے بموجب علامہ کی سیرت کے دوسرے رُخ کو اجاگر کرنا تھا۔ ان معاند مولوی صاحب نے علامہ کی مخالفت میں غلط بیانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اپنے مضمون "بھوپال کا علمی جائزہ" میں لکھتے ہیں —

"ہز ہائینس نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک مستقل تصنیف کی درخواست پر افکار حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے ۵۰۰ روپے ماہانہ کی امداد مقرر کی۔" حالانکہ ۵۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا نہ کہ قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے امداد لیکن ایسے معاند نے بھی اس کام کے لیے کتب خریدنے کی خاطر کئی ہزار کی رقم عطا ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ بات تو جمیل نقوی صاحب نے خود تسلیم کی ہے کہ "اقبال نامہ" کے بقول ان کے "پہلے ایڈیشن" کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا جو انھوں نے "خدوخال اقبال" کی تدوین کے سلسلے میں جناب زبیری صاحب کو دے دیا۔ ("اقبال اور بھوپال"، صفحہ ۱۲۱)

---

[۱] بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) کتاب کی اشاعت کے وقت پاکستان سے باہر تھیں۔

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جمیل نقوی صاحب زبیری صاحب کے ہم خیالوں میں ہیں۔ انھیں علامہ اقبال کے متعلق اچھی یا بُری رائے رکھنے کا حق تو ہے لیکن اگر وہ زبیری صاحب کے ہم خیالوں میں ہیں تو پھر اصولِ شہادت کے مطابق ان کی بیان کردہ زبانی روایت کو بغیر معتبر اور مستند ثبوت کے قبول نہیں کیا جاسکتا اور ایسی کوئی شہادت ابھی تک سامنے نہیں آئی۔"

کئی ہزار کی رقم اور تحقیق مزید

شیخ اعجاز احمد نے کئی ہزار کی رقم کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی اہمیت اور صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جیسا کہ خود شیخ صاحب نے ایک ملاقات کے دوران اظہار فرمایا تھا کہ اگر "اقبال اور بھوپال" شائع نہ ہوتی تو نہ اقبالنامہ کے نسخوں میں تحریف ورد و بدل کا کسی کو علم ہوتا، نہ اس کتاب کے بعض واقعات کی صحت و درستی کی نوبت آتی۔ نہ اقبال اور بھوپال سے متعلق کتنے ہی تاریخ ساز حقائق کا انکشاف ہوتا اور مزید تحقیق کی راہیں کھلتیں۔ چنانچہ واقعات کی صحت و درستی اور تحقیق کی دیانت کے پیش نظر راقم الحروف نے سب سے پہلے ممنون حسن خاں سے قلمی رابطہ پیدا کیا اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ انھوں نے پہلی فرصت میں توجہ فرمائی اور مجھے تحریری طور پر "کئی ہزار کی رقم" کے سلسلے میں نہایت تسلی بخش جواب سے نواز دیا۔ ان کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"۱۹ اکتوبر ۷۵ء

ہمایوں منزل۔ متصل فائر اسٹیشن

نزد صدر منزل۔ بھوپال۔ ایم۔ پی

عزیز گرامی صہبا صاحب۔ سلام مسنون

آپ کا دوسرا گرامی نامہ مورخہ ۱۱ اکتوبر ۷۵ء مجھے ابھی ابھی ملا ہے جس کے لیے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس گرامی نامہ میں عزیز محترم اظہر میاں (اظہر سعید خاں) کی تحریر بھی شامل ہے۔ آپ میری طرف سے ان کی خدمت میں میری دعا پہنچا دیجیے اور یادآوری کے لیے شکریہ بھی۔

علامہ کے بھانجے صاحب (بھتیجے) شیخ اعجاز احمد صاحب کی خدمت گرامی میں آپ میرا سلام پہنچا دیں۔ کاش مجھے ان کی قدم بوسی کی عزت حاصل ہوتی۔ خداوند کریم ان کو اور عزیز گرامی جاوید سلمہٗ اور عزیزہ منیرہ سلمہا کو خوش و خرم اور تندرست رکھے۔ جاوید تو بھوپال بھی آئے تھے۔ اس وقت وہ بہت کم سن تھے اور میں اور علامہ ان کے ساتھ کیرم کھیلا کرتے تھے۔

وظیفہ کے علاوہ نواب صاحب کے یہاں سے اور کوئی رقم علامہ کی خدمت میں نہیں پیش کی گئی۔ اس کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ اگر کوئی اور رقم دی جاتی تو سر راس مسعود مرحوم کو اور مجھے ضرور ضرور معلوم ہوتا۔ شیخ اعجاز صاحب کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔

اقبال نامہ کے سب سے پہلے ایڈیشن میں میرے نام ایسا کوئی مکتوب اس رقم کے بارے میں نہیں ہے۔ حیدرآباد سے اکبر حیدری نے ضرور ایک حقیر رقم کا چیک علامہ کی خدمت

گرامی میں ارسال کیا تھا جس کو علامہ نے فوراً واپس کر دیا تھا۔ اس کے متعلق ایک قطعہ بھی علامہ نے لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ علامہ نے مجھے لکھا تھا کہ ایک چیک حیدری صاحب نے ارسال کیا تھا جس کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

آپ کو شاید میں لکھ چکا ہوں کہ وظیفہ بھی علامہ نے بڑی مشکل سے منظور فرمایا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ جو کتاب قرآن حکیم کے متعلق وہ شائع فرمائیں گے اس کے جملہ حقوق نواب صاحب کے نام کر دیں گے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے بھی علامہ سے فرمایا تھا کہ کم از کم کتاب لکھنے میں آسانی کی وجہ سے وہ نواب صاحب کا وظیفہ منظور فرما لیں۔ سید راس مسعود صاحب نے تو ساری کوشش اس سلسلے میں کی ہی تھی۔ اگر کتاب مدنظر نہ ہوتی تو آپ یقین فرمائیں کہ علامہ اس حقیر وظیفہ کو بھی منظور نہ فرماتے۔ حقیقت میں نواب صاحب کا وظیفہ قبول فرما کر علامہ نے نواب صاحب پر احسان فرمایا تھا اور اس طرح نواب صاحب کو وہ درجہ دے دیا جو گوئٹے نے پرنس آف ویمر کو دیا تھا۔ یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے "ضرب کلیم" نواب صاحب کے نام معنون کر دی اور اس طرح نواب صاحب کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

ممکن ہے کہ اس رقم کے سلسلے میں غلط فہمی ہو رہی ہو — کیونکہ علامہ اقبال اور سید راس مسعود کی سفارش پر نواب حمید اللہ خاں صاحب مرحوم نے چغتائی صاحب مرحوم کو "نقش چغتائی" کے لیے ایک کثیر رقم میرے توسط سے ضرور مرحمت فرمائی تھی اور اس سلسلے میں چغتائی مرحوم بھوپال تشریف بھی لائے تھے۔ اس کا ذکر جہاں تک مجھے یاد ہے سید راس مسعود نے اپنے کسی خط میں بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اور سید راس مسعود کے کہنے پر حالی سنٹینری کے موقع پر پانی پت میں نواب صاحب مرحوم نے ایک بڑی رقم حالی میموریل ہائی اسکول کے لیے اور مسدس کے سنٹینری ایڈیشن کے لیے بھی عطا فرمائی تھی۔ مسدس کا سنٹینری ایڈیشن اس رقم کی مدد سے شائع ہوا تھا۔ اس کا FOREWORD سر راس مسعود نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا۔ پھر علامہ کی سفارش پر اور سید راس مسعود کے کہنے سے نواب صاحب نے ایک بڑی رقم (Muhammad Asad[1]) Dr. LEOPOLD WEISS کو صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے عطا فرمائی۔ اس طرح ان نیک کاموں میں علامہ اور سید راس مسعود کی مساعی شامل رہیں لیکن علامہ نے کبھی بھی اپنے لیے کوئی درخواست نواب صاحب سے نہیں کی اور نہ کوئی رقم وظیفہ کے علاوہ قرآن حکیم سے متعلق کتاب لکھنے کے لیے نواب صاحب کے یہاں سے ان کو دی گئی۔

یہ ضرور ہے کہ علامہ کتاب لکھنے کے سلسلے میں کچھ MSS قلمی کتب کو دیکھنے کے لیے مشرق وسطیٰ اور یورپ اور کیمبرج جانا چاہتے تھے بلکہ لارڈ لوتھین نے ان کو کیمبرج میں لکچرس

---

[1] مصنف ISLAM AT THE CROSS ROADS شائع کردہ شیخ محمد اشرف - لاہور

کے لیے مدعو بھی کیا تھا لیکن خداوند کریم کو یہ منظور نہ تھا۔"

ممنون حسن خاں ایسی معتبر و مستند شخصیت کے اس اظہار کے بعد چنداں ضرورت نہ تھی کہ میں کسی اور قریبی شخصیت سے اس سلسلے میں مزید دریافت کرتا پھر بھی تحقیق کا تقاضا تھا کہ شہزادی عابدہ سلطان اور بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) سے بھی معلومات حاصل کروں۔ چنانچہ کافی سعی وجہد کے بعد ان معزز شخصیتوں سے میں نے رابطہ قایم کیا اور دونوں نے بہ یک زبان فرمایا کہ وظیفہ کے علاوہ اقبال کو کوئی رقم نہیں دی گئی اور اس طرح یہ اطمینان ہوگیا کہ جمیل نقوی کی بیان کردہ "کئی ہزار کی رقم" کی روایت غلط فہمی یا لاعلمی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور یکسر بے بنیاد ہے۔

مولوی عبدالحق، حالی اور مضمون کی گمشدگی

جشنِ حالی اور اقبال کے باب (صفحہ ۱۰۹ تا ۱۴۲) میں جتنی تفصیلات راقم الحروف نے کئی سال کی سعی وکاوش کے بعد فراہم کیں اتنی اس سے پہلے شاید ہی کہیں اور مل سکیں۔ پھر بھی دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن کے دوران ابوالاثر حفیظ جالندھری کی نایاب نظمیں دستیاب ہوگئیں اور اب دوسرے ایڈیشن کے دوران مولوی عبدالحق کے طویل اور قیمتی مضمون کی گمشدگی کا علم مجھے اردو کے بلند پایہ ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زبانی ہوا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اُن دنوں جب جشن حالی ہوا ہے بابائے اردو کے ساتھ حیدرآباد دکن سے پانی پت گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جشن کی تیاری بہت پہلے سے ہورہی تھی۔ راس مسعود کی خواہش پر مولوی صاحب نے حالی پر نہایت تفصیلی مضمون کئی ہفتوں کی محنتِ شاقہ کے بعد لکھا تھا۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران ان کے ہاتھ پر ورم بھی آگیا تھا اس کے باوجود انھوں نے ہاتھ پر پٹیاں بندھوا کر مضمون کو مکمل کیا تھا۔ یہ مضمون فل اسکیپ کے ۶۰ - ۷۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور اس میں انھوں نے حالی کے عہد ساز کارناموں کا ہر جہتی مطالعہ پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اور بابائے اردو جشن میں شرکت کے لیے حیدرآباد دکن سے دہلی پہنچے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام کیا۔ دوسرے روز پانی پت پہنچے۔

جشن کے دن پانی پت میں میلہ کا سماں تھا۔ نواب صاحب بھوپال کی آمد کے بعد ہی کوئی دس بجے دن کو جلسہ کا آغاز ہوا۔ ڈائس پر نواب حمید اللہ خاں، علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری وغیرہ فروکش تھے۔ جب مولوی عبدالحق صاحب کا نام پکارا گیا تو وہ ڈائس پر گئے اور اپنے طویل مضمون کے خاص خاص حصے تقریباً پون گھنٹے تک پڑھتے رہے۔ اُن کا مضمون کافی مبسوط اور جامع تھا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔

اسی روز شام کو بابائے اُردو اور ڈاکٹر صاحب سر اکبر حیدری کے سیلون میں پانی پت سے دہلی پہنچے اور اسٹیشن سے تانگہ میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوگئے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کا سامان مختصر تھا۔ بستر کے علاوہ ان کے ساتھ چمڑے کا ایک بیگ اور ایک سوٹ کیس تھا۔ بیگ میں تولیہ، صابن، منجن، کچھ کتابیں اور جشنِ حالی میں پڑھا جانے والا طویل مضمون رکھا تھا۔ اسٹیشن پر قلی نے بستر اور سوٹ کیس تو اگلی نشست پر اور مولوی صاحب کا بیگ پائیدان کے نیچے رکھ دیا۔ جب تانگہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی واقع مٹ دریا گنج پہنچا تو ڈاکٹر انصاری کے ملازم نے بستر اور سوٹ کیس تو اُتار لیا۔ پائیدان کے نیچے رکھے ہوئے بیگ پر اس کی نظر نہیں گئی ـــــ اسی دوران ملازم نے اسے پیسے دیے اور تانگہ والا روانہ ہوگیا۔ سامان جب اندر پہنچا اور مولوی عبدالحق صاحب نے اپنا بیگ موجود نہ پایا تو شور مچایا ـــــ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کے دو تین ملازم

تانگہ والے کی تلاش میں دوڑ پڑے ——— ایک ملازم سائیکل پر نکل کھڑا ہوا ——— لیکن تانگہ والے کا نہ ملنا تھا نہ ملا اور یوں مولوی صاحب کا وہ قیمتی مضمون ضائع ہوگیا۔

اس طویل مضمون کی گمشدگی کا مولوی صاحب کو ہمیشہ قلق رہا اور جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بتایا وہ دوبارہ اُسے نہیں لکھ سکے۔

جنوری سنہ [illegible]ء کے دوران مجھے علم ہوا کہ انجمن ترقی اردو پاکستان حالی پر بابائے اُردو کے متعدد مضامین کا مجموعہ ——— "افکارِ حالی" کے عنوان سے شائع کر رہی ہے ——— چنانچہ میں نے شبیر علی کاظمی سکریٹری انجمن ترقی اُردو سے رابطہ قائم کرکے "افکارِ حالی" کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو دکھایا۔ انھوں نے تمام مضامین پر نظر ڈالنے کے بعد فرمایا کہ جو مضمون بابائے اردو نے پانی پت میں پڑھا تھا۔ وہ اس میں شامل نہیں۔ البتہ جو نامکمل مضمون "حالی کا جشن صد سالہ" کے عنوان سے اس میں شامل ہے۔ وہ ایک نامکمل مسودہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جس کا ثبوت مرتبین کے ذیلی نوٹ سے بھی ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کا مضمون "حالی کا جشن صد سالہ"، 'افکارِ حالی' کے صفحات ۶۶ تا ۶۸ تک پھیلا ہوا ہے اور اس نوٹ پر ختم ہوتا ہے:

> "مولوی صاحب مرحوم کی یہ تحریر یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب حالی مرحوم کی سیرت اور ادبی و ملی خدمات کے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ اگرچہ اس کتاب میں شامل ان کی دوسری تحریروں میں بھی زیرِ بحث آچکے ہیں لیکن مولوی صاحب ہی کے قلم سے یہ تحریر بھی تکمیل کو پہنچتی تو یہ حکایت دل فریب ایک ادب پارہ بھی ہوتا۔"

"افکارِ حالی" ——— میں کوئی مضمون بھی پندرہ بیس صفحات سے زیادہ پر مشتمل نہیں اور یہ تمام مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ جشن حالی پر صرف تین صفحات کی ایک ادھوری تحریر ہے اور بس ——— اس سے یہ بات واضح ہے کہ جشن حالی میں پڑھا جانے والا مضمون دوبارہ قلمبند نہ ہو سکا اور ایک اتفاقی حادثے کی نذر ہو گیا۔

صوفی خدا بخش کی روایات

"جوابِ شکوہ" کے سلسلے میں صوفی خدا بخش نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ ان کے بارے میں شیخ اعجاز احمد کی توضیحات ملاحظہ ہوں:

> "کتاب کے صفحات ۲۱۲ تا ۲۲۲ (ملفوظاتِ قدسی اور نیازمندانِ بھوپال) پر آپ نے حضرت شاہ اسد الرحمٰن صاحب قدسی[1] کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے مرید خدا بخش کی بیان کردہ روایت کی بنا پر آپ نے اپنی کتاب کے اُن "نئے، اچھوتے اور منفرد واقعات جن کا آج تک کسی کو علم نہ تھا" میں یہ روایت بھی شامل کی ہے کہ "شکوہ" کے بعد "جوابِ شکوہ" علامہ نے محض حضرت قدسی کی تحریک اور آپ کی خواہش کے احترام میں لکھا تھا۔"

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ علامہ کی نظم "شکوہ" اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کے جلسۂ انجمن حمایت اسلام۔ لاہور میں پڑھی گئی تھی اور "جوابِ شکوہ" نومبر سنہ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ حضرت قدسی کے جو حالات آپ نے کتاب کے صفحہ ۲۱۲ پر لکھے ہیں ان کے مطابق "وہ سنہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو آئندہ تعلیم کے لیے لاہور بھیج

---

[1] افسوس کہ سنہ ۱۹۷۹ء میں آپ انتقال فرما گئے۔

دیے گئے۔ سات سال بعد بھوپال لوٹے۔ آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہو چکا تھا اس لیے آپ خاندانی سلسلۂ رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ چار پانچ برس تک صحراؤں، پہاڑوں اور ریاضت شاقہ میں بسر کیے۔ آخر میں بھوپال کی مشہور ٹیکری "منوا بھانڈ" پر چلہ کشی فرمائی۔" اگر "سنِ شعور کو پہنچنے کی عمر" ۱۶ سال سمجھی جائے تو قدسی صاحب ۱۹۰۵ء میں لاہور بھیجے گئے۔ چونکہ وہ سات سال بعد لوٹ کر سلسلۂ رشد و ہدایت پر فائز ہوئے لہٰذا "شکوہ" کی اشاعت کے وقت وہ ابھی سلسلۂ رشد و ہدایت پر فائز نہ تھے اور غالباً ابھی لاہور میں ہی تعلیم پا رہے تھے۔ ان حالات میں — "جواب شکوہ" کا پس منظر بیان کردہ صوفی خدا بخش صاحب ایک داستان معلوم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت صاحب نے یہ بات بیان نہیں فرمائی کہ ان کے تقدس کے نقطۂ نظر سے کچھ وزن رکھتی ہیں نے نذیر نیازی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا علامہ نے ان سے یا ان کے علم میں کسی اور سے "جواب شکوہ" کا یہ پس منظر بیان فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں:

> "میں نے حضرت علامہ سے نہ کبھی شاہ اسد الرحمٰن صاحب کا نام سنا نہ ان کا کچھ ذکر آیا۔ یہ ساری روایت خانہ سازہ ہے۔"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض "اقبالیوں" کا یہ نظریہ بھی ہے کہ علامہ دراصل اپنی قوم سے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جو "جواب شکوہ" میں کہا گیا ہے اور وہ کچھ کہنے کے لیے "شکوہ" کی نظم کہی گئی۔ گویا ان حضرات کے نظریہ کے مطابق "شکوہ" اور اس کا جواب ایک ہی وقت میں شاعر کے ذہن میں آئے۔ واللہ اعلم۔

اس روایت کے سلسلے میں راقم کے استصواب پر ممنون حسن خاں نے جو وضاحت فرمائی ہے اس سے بھی شیخ اعجاز احمد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "نہ تو علامہ نے اور نہ سید راس مسعود مرحوم نے کبھی یہ فرمایا کہ علامہ نے قدسی صاحب کے ایما پر "جواب شکوہ" لکھا تھا۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ "شکوہ" کے بعد "جواب شکوہ" کا لکھا جانا یقینی امر تھا۔ کسی کے ایما پر نہیں لکھا گیا۔ یہ ایسی بات ہوئی کہ ملٹن نے کسی کے ایما پر PARADISE REGAINED لکھی تھی۔ میرے خیال میں علامہ نے شاعری کے سلسلے میں اگر کسی شخص کی بات مانی تھی تو وہ تھے سر شیخ عبد القادر مرحوم۔ لیکن "جواب شکوہ" ان کے ایما پر بھی نہیں لکھا گیا۔"[۵۷]

چودھری خاقان حسین صاحب کی روایات

شیخ اعجاز احمد نے چودھری خاقان حسین کے بیان کردہ بعض واقعات کے سلسلے میں جو توضیحات فرمائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

> "کتاب کے صفحہ ۲۴۳ پر چودھری خاقان حسین صاحب بھوپال میں علامہ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک بار کھانے کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا کہ مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کے دوران جیسا کھانا راجہ صاحب محمود آباد نے کھلایا ہے ایسا تو شاید ہی پھر نصیب ہو۔ سر ڈیلیگیٹ کے لیے مختلف اور لذیذ ترین کھانوں کے چھ خوان دونوں وقت

---

۵۷ اقتباس خط بنام راقم الحروف مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء

آتے تھے۔"

لکھنؤ میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا تو دوسرا ۱۹۳۶ء میں۔ علامہ اقبال ان دونوں میں سے کسی میں شریک نہیں ہوئے۔ واللہ اعلم خاقان حسین صاحب مسلم لیگ کے کس اجلاس کا ذکر فرما رہے ہیں۔

خاقان حسین صاحب مزید فرماتے ہیں — "ایک شب آپ نے فرمایا کہ جب تک میں نے عربی زبان پر عبور حاصل نہیں کیا تھا میرا علم ناقص تھا۔ عربی سیکھنے کے دوران میری ملاقات دہلی میں مقیم عرب سفیر سے ہوگئی اور انھوں نے اپنی لائبریری کی تمام عربی کتب مجھے استفادہ کے لیے عنایت کر دیں جن سے میں نے بہت کچھ علم حاصل کیا۔" معلوم نہیں خاقان حسین صاحب نے کس زمانے کے متعلق یہ روایت بیان کی ہے۔ علامہ کے عربی سیکھنے کا زمانہ تو ان کے کالج میں تعلیم پانے کا زمانہ تھا۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور عربی میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے پر انھیں میڈل دیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے اورینٹل کالج لاہور میں عربی کی تعلیم دیتے رہے۔ پھر ۱۹۰۷ء میں لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قایم مقام کی حیثیت سے شعبۂ عربی کے پروفیسر رہے۔ "عربی سیکھنے کے دوران دہلی میں مقیم عرب کے سفیر" سے ملاقات کی بات سمجھ میں نہیں آتی اور ان کے عربی سیکھنے کے زمانے میں دہلی میں کوئی عرب کا سفیر متعین بھی نہ تھا۔

چودھری خاقان حسین صاحب کی روایت کی بنا پر آپ نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ اسپین کا سفر علامہ اقبال نے نواب صاحب بھوپال کی ذاتی خواہش اور عملی اعانت سے کیا۔ یہ سفر علامہ نے جنوری ۱۹۳۲ء میں میڈرڈ یونیورسٹی کی دعوت پر تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہوئے کیا تھا اور یونیورسٹی مذکور میں "ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقا" کے عنوان سے ایک لکچر بھی دیا تھا۔ ان کے قیام لندن کے دوران میں پاکستان کے سابق وزیر خزانہ سید امجد علی صاحب بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں موجود تھے اور علامہ کے ساتھ لاہور سے لندن گئے تھے۔ علامہ کے سید صاحب کے خاندان سے گہرے مراسم تھے۔ میں نے ان سے خاقان حسین صاحب کی بیان کردہ روایت کے متعلق دریافت کیا ہے۔ انھیں اس کا کوئی علم نہیں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوتا تو علامہ سید امجد علی صاحب سے ضرور اس کا ذکر فرماتے۔ میں نے سید نذیر نیازی صاحب سے جو علامہ کے قریبی احباب میں سے اور علامہ کے آخری سالوں میں قریباً روز کے آنے والوں میں سے تھے۔ خاقان حسین صاحب کی روایات کے متعلق دریافت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"یہ روایات محض روایات ہیں۔ ان میں حقیقت نام کو نہیں۔ حضرت علامہ نے اسپین کا سفر تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر کیا تھا۔ نواب صاحب بھوپال کی مالی اعانت کا اس سفر سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی مالی اعانت کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ حضرت علامہ کی عربی دانی کے بارے میں بھی خاقان حسین صاحب نے جو کچھ فرمایا خالی از حقیقت ہے۔" اگر اسپین کا سفر نواب صاحب بھوپال کی ذاتی خواہش اور مالی اعانت سے ہوا ہوتا تو علامہ اس کا ذکر اپنے قریبی احباب سے ضرور کرتے۔

جمیل نقوی صاحب اور خاقان حسین صاحب کی روایات جو نواب صاحب بھوپال کی مالی امداد کے متعلق ہیں ان پر میری معروضات کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کی طرف سے علامہ کی مالی اعانت کو تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی تامل ہے۔ نواب صاحب نے علامہ کے لیے بھوپال میں علاج کا انتظام فرما کر اور پھر ان کا تاحیات ماہوار وظیفہ مقرر کر کے جملہ متعلقین و معتقدینِ علامہ پر جو احسان فرمایا اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ خود علامہ نے سید راس مسعود کے نام اپنے خطوط میں بار بار اپنی شکر گزاری کا اظہار فرمایا ہے۔ ماہانہ وظیفہ کے علاوہ بھی اگر نواب صاحب نے کوئی مزید مالی اعانت کی ہو تو ان کی اس عقیدت سے بعید نہیں جو انھیں علامہ سے تھی۔ ان معروضات کا مطلب صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کے ادعا کے مطابق "اقبال اور بھوپال" ایک ایسی تحقیقی کتاب ہے جس میں جتنا کچھ مواد مہیا کیا گیا ہے پوری ذمہ داری سے تحقیق کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔" لیکن تحقیق کے جو اصول

آپ نے خود بیان فرمائے ہیں۔ یہ روایات اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ صرف ایک صاحب کے زبانی بیان پر کسی روایت کو "معتبر و مستند" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ روایت کی صداقت کو پرکھنے کے لیے جو اور ذرائع موجود ہوں ان سے روایت کے ہر پہلو سے چھان بین کریں تبھی تحقیق کا حق ادا ہوگا۔"

اسی سلسلے میں راقم نے ممنون حسن خاں سے بھی استصواب ضروری سمجھا کہ اس کتاب کی پہلی بار اشاعت کے دوران اُن سے کسی طور رابطہ قایم نہ ہو سکا تھا۔ اقبال، راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ممنون حسن خاں کی شخصیت سب سے زیادہ معتبر اور مستند قرار دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ان کے جواب سے جہاں سفر اسپین اور لکھنؤ اجلاس سے متعلق صراحت ہوتی ہے وہیں ایک بالکل نئے واقعہ کا علم ہوتا ہے جس کا تعلق راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے سفر انگلستان سے ہے۔ لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ میری رائے میں یہ ادنیٰ سیاست کی باتیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کو ادنیٰ سیاست سے وابستہ نہیں کرنا چاہیے۔"

مجھے اس بات کا مطلق کوئی علم نہیں کہ نواب صاحب نے اسپین کے سفر کے سلسلے میں علامہ کی خدمت گرامی میں کوئی رقم پیش کی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ علامہ ROUND TABLE CONFERENCE میں شرکت کے لیے ولایت تشریف لے گئے تھے اور نواب صاحب بھی وہاں اسی سلسلے میں گئے تھے۔ اگر کوئی رقم دی گئی تھی تو وہ یا تو شعیب صاحب کے ذریعہ یا پھر عباسی صاحب مرحوم کے ذریعہ دی گئی ہوگی لیکن علامہ نے یا سر راس مسعود نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں فرمایا۔ میرے عزیز بھائی اور دوست خاقان میاں (چودھری خاقان حسین) کو زیادہ معلوم ہوگا۔ بہر حال میں اس سلسلے میں اس سے زیادہ اور کچھ عرض نہیں کر سکتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب نے مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی کچھ مدد ولایت کے سفر کے لیے کی تھی اور مولانا صاحب بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

مجھے یہ اس لیے معلوم ہے کہ ان دنوں مولانا علیل ہو کر بھوپال تشریف لائے تھے اور میں ان کی خدمت میں برابر حاضر رہتا تھا کیونکہ میں کالج کی تعطیلات میں لکھنؤ سے اپنے بھانجے کے پاس بھوپال آیا ہوا تھا اور مولانا صاحب کی جملہ خط و کتابت کا ایک طرح انچارج تھا کیونکہ مولانا سے ہمارے خاندان کے بہت گہرے تعلقات تھے اور مولانا مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت فرماتے تھے۔ اسی رشتے سے گلنار بی بی مجھے اپنا بھائی مانتی تھیں اور بیگم محمد علی اپنا بیٹا تصور فرماتی تھیں اور یہ رشتے آخر تک قایم رہے۔ مجھے یہ سب باتیں اچھی طرح یاد ہیں اس لیے بھی کہ میں مولانا کے خطوط لکھنے میں غلطیاں کرتا تھا اور میری اچھی طرح گوشمالی کی جاتی تھی۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ مولانا صاحب نے ان دنوں بہت سے تاریخی مکتوب مجھے ہی DICTATE کرائے تھے۔"[۱]

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ان واقعات کی ایک اور عینی شاہد بیگم راحت سعید چھتاری (سابق لیڈی مسعود) سے ۲۱ر جون ۱۹۷۵ء کو پی ای سی ایچ سوسائٹی۔ کراچی میں ان کی قیام گاہ پر جلیل قدوائی کی معیت میں ملاقات کا موقع میسر آگیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت وہ اپنے شوہر کے ساتھ اردن میں مقیم تھیں۔

چودھری خاقان حسین کے بیان کردہ واقعات کے سلسلے میں بیگم چھتاری نے بیان کیا کہ جہاں تک چودھری خاقان حسین کی ذات و صفات کا تعلق ہے وہ ہر شبہہ سے بالاتر ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کے فرد اور نہایت ذمہ دار انسان ہیں۔

---

[۱] اقتباس خط بنام راقم الحروف مورخہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

ان سے ہمارے خاندانی تعلقات ہیں۔ وہ برابر ہمارے گھر آتے جاتے تھے اور علامہ اقبال خاقان صاحب سے بے حد شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اور اکثر عباسی صاحب کے گھر سے انھیں بلوا بھیجتے تھے۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتی کہ انھوں نے لکھنؤ اجلاس کا جو واقعہ لکھا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ اجلاس کے دوران رنگا رنگ کھانوں کی تفصیل علامہ نے انھیں بطور واقعہ سنائی ہو جسے انھوں نے شرکت سے تعبیر کر دیا۔ لیکن میری حقیر رائے میں اس دلچسپ واقعہ سے علامہ کی شخصیت کسی طور مجروح نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے حسنِ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

یہی صورت اسپین کے سفر سے متعلق ہے۔ یہ واقعہ دو حضرات کے درمیان گفتگو سے عبارت ہے۔ نہ اب اس دنیا میں نواب صاحب موجود ہیں نہ علامہ اقبال جو اس واقعہ کی تصدیق ہو سکے۔ نہ وہ اخبار دستیاب ہے جس میں سکریٹری کی ضرورت کا اشتہار چھپا تھا نہ سکریٹری کا نام کسی کو معلوم ہے۔ خود چودھری خاقان حسین اپنی مسلسل اور شدید علالت کے سبب اس قابل نہیں کہ ان واقعات کے سلسلے میں مزید کچھ وضاحت کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بیان کردہ روایات میں واقعات کا دروبست صحیح پس منظر میں انھیں یاد نہ رہا ہو، ویسے میں یہ کسی طور تسلیم نہیں کر سکتی کہ انھوں نے دانستہ کسی واقعہ کو علامہ سے غلط منسوب کیا ہوگا۔ سننے، سمجھنے اور اظہار کرنے میں بھول چوک ممکن ہے۔

ایک سوال کے جواب میں بیگم چھتاری نے بتایا کہ علامہ اقبال ــــ قیامِ بھوپال کے دوران اکثر و بیشتر راس مسعود کی معیت میں نواب صاحب سے ملاقاتیں فرماتے تھے اور گھنٹوں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر اور مشورے کرتے تھے۔ نواب صاحب کو علامہ سے بے حد عقیدت اور محبت تھی ــــ اسی طرح علامہ نواب صاحب کو اسلام اور مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ تصور کرتے تھے۔ یہ سب کچھ راس مسعود کی مخلصانہ مساعی کا نتیجہ تھا کہ علامہ نے "ضربِ کلیم" ان کے نام معنون کر کے انھیں حیاتِ دوام عطا کی۔

ایک نام، دو شخصیتیں، تحقیق کی ستم ظریفی

"اقبال اور بھوپال" کے صفحہ ۲۷۴ پر راقم الحروف نے یہ عبارت لکھی ہے:

"شاغل فخری کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیتوں نے اقبال کو موضوعِ بحث بنایا یا اُن کے فکر و فن پر کام کیا۔ ان میں رضیہ فرحت بانو، محمد احمد خاں، محمد امین زبیری، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور عبد القوی دسنوی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا آئندہ صفحات میں احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب "خطباتِ اقبال" مجھے دستیاب نہ ہو سکی لیکن یہ کتاب "اقبال لائبریری" بھوپال میں موجود ہے۔ رضیہ فرحت بانو ــــ بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں۔

"تصوراتِ اقبال" کی طرح ایک اور اہم کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ہے جسے محمد احمد خاںؒ ایم۔اے ایل ایل بی نے تالیف فرمایا ہے۔ یہ کتاب کاروانِ ادب۔ کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا انتساب ہے:

"اس شاہین زادہ کے نام
جو پاکستان کے قالب کو اسلام
کی روح سے ہمکنار کر دے۔"

محمد احمد خاں عرصۂ دراز تک بھوپال میں رہے۔ رر آپ نے ابتداً جج ہائی کورٹ بعدہٗ چیف جسٹس کی حیثیت سے ریاست بھوپال کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سر راس مسعود بھوپال آگئے تھے اور اقبال کی بھوپال میں آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ آپ پاکستان آگئے اور یہیں انتقال فرمایا۔"

اس اقتباس میں مَیں نے جن محمد احمد خاں کے نام نامی سے ـــ " ایک اہم کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" کا بھوپال سے متعلق تذکرہ کیا ہے واقعتاً وہ محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس بھوپال کی نہیں تھی جس کا انکشاف پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد ہوا اور پتہ چلا کہ اس کے مؤلف محمد احمد خاں بھی ایم۔اے ایل ایل بی ہیں اور ان کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ چنانچہ محمد احمد سبزواری کے ہمراہ میں کتاب کے حقیقی مؤلف محمد احمد خاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دلی معذرت کی اور دو یکساں ناموں سے جو مغالطہ ہوا تھا اس کی تفصیلات انھیں بتائیں اور درخواست کی کہ وہ اپنے بارے میں مختصراً معلومات بہم پہنچا دیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ممکن ہو سکے۔ چنانچہ ان کے خط کا متن پیش خدمت ہے:

" ۲۴۹۔ بہادر آباد۔
کراچی
۱۸/اپریل ۱۹۷۴ء

مکرمی۔ سلام علیکم

آپ سے ملاقات کے بعد مجھے یاد ہی نہ رہا۔ حسنِ اتفاق سے آج آپ کا دیا ہوا لفافہ ملا تو یاد آیا کہ میں نے آپ سے "خودستائی" کا وعدہ کیا تھا۔ ایفائے وعدہ ضروری ہے اس لیے گزارشات ذیل پیش خدمت ہیں۔

میں نے جامعہ عثمانیہ سے ام۔اے اور علی گڑھ سے ال ال بی کیا۔ میری حسبِ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

(۱) ہندوستان کی معیشت اور جنگ (۲) ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات (۳) ہندوستان کا قومی قرضہ اور جنگ (۴) انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے (۵) ہمارا قائد (نواب بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی)

مَیں مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آیا اور کراچی میں ہی مستقل رہائش رہی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں مَیں نے "اقبال کا سیاسی کارنامہ" لکھا۔ ادارۂ کاروان ادب نے اس کتاب کو شائع کیا۔ یہ ادارہ حیدر آباد ٹرسٹ کے تحت کام کرتا تھا۔ .....

کراچی آنے کے بعد مَیں نے یہ کتاب لکھی اور اس کے بعد زیادہ تر معاشی الجھنوں کے باعث تصنیف و تالیف کا سلسلہ چھوٹ گیا۔ البتہ کبھی کبھار اخبار جنگ میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے۔ . . .

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

محمد احمد خاں "

"اقبال کا سیاسی کارنامہ" کے اصل مؤلف کی تحریر کے بعد اب تحقیق کی ستم ظریفی بھی ملاحظہ ہو۔

مولویوں کو "اقبال اور بھوپال" کے پہلے ایڈیشن کے دوران مسلم ضیائی کی معیت میں، میں محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس بھوپال سے ملنے گیا۔ ان کی طبیعت ناساز تھی۔ مختصر سی ملاقات کے دوران میں نے اپنے کام کی مشکلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ نہ بھوپال کے اہلِ قلم سے مدد مل رہی ہے نہ یہاں متعلقہ کتابیں دستیاب ہیں۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" میں بھوپال سے متعلق سنا ہے۔ کچھ تذکرہ ہے — وہ بھی نہیں مل رہی ہے۔ یہ سن کر محمد احمد خاں اندر گئے اور کچھ دیر کے بعد کتاب لاکر دے دی اور کہا کہ اسے دیکھ لیجیے۔

میں نے صفحہ الٹ کر دیکھا۔ کتاب پر "محمد احمد خاں" درج تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اور مسلم ضیائی ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئے۔ روانگی سے قبل نہ انھوں نے یہ بتایا کہ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ان کی اپنی تالیف نہیں ہے نہ میں نے نام دیکھنے کے بعد دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی اور بات آئی گئی ہوگی — میں خوش اور مطمئن کہ بھوپال سے متعلق ایک اور قیمتی کتاب دستیاب ہوگئی۔ اُسے پڑھا تو ایک دو جگہ بھوپال اور اقبال سے متعلق اقتباسات بھی نظر سے گزرے اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ کتاب محمد احمد خاں — سابق چیف جسٹس بھوپال کی تحریر کردہ ہے — چنانچہ صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۸ — راقم الحروف نے اس کتاب کے جگہ جگہ حوالے دے کر اس کی قدر و اہمیت پر روشنی ڈالی۔

لیکن جو بات وہم و گمان میں بھی اس وقت نہ آسکتی تھی — دوسرے محمد احمد خاں کو موجود پاکر حقیقی مسرت میں تبدیل ہوگئی۔ محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہوگیا جیسا کہ اقتباس میں بھی آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا لیکن "اقبال کا سیاسی کارنامہ" کے اصلی مؤلف محمد احمد خاں کو زندہ و سلامت پاکر — کم از کم میں تو تحقیق کی ستم ظریفی کا قایل ہی نہیں گھایل بھی ہوا اور یہ سطور لکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک نام کی دو شخصیتوں سے انسان کس کس طرح مغالطہ کھا سکتا ہے؟ شکر ہے کہ اصلی محمد احمد خاں مؤلف "اقبال کا سیاسی کارنامہ" نے میری معذرت قبول کر کے مجھے تحقیق کی رسوائی سے بچالیا۔

چونکہ یہ کتاب بھوپال کے کسی اہلِ قلم کی نہیں تھی اس لیے صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۸ کی عبارت حذف کردی گئی ہے۔

ممنون حسن خاں کے انکشافات

"قرآن مجید کے حواشی" کا باب صفحہ ۲۸۹ سے شروع ہوکر صفحہ ۳۰۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس باب میں اقبال کے وظیفہ، محمد امین زبیری کے بعض اعتراضات، قرآن مجید کے حواشی کی عدم تکمیل وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جب اشاعت کے بعد ممنون حسن خاں تک پہنچی تو انھوں نے راقم الحروف کے نام ایک ذاتی خط میں نہ صرف محمد امین زبیری مرحوم کے بیان کی تردید فرمائی بلکہ وظیفہ کے احکام کی نقل بھی عطا فرمادی جس سے یہ ثابت ہوا کہ نواب صاحب بھوپال کا وظیفہ غیر مشروط تھا۔ پھر اسی خط سے یہ بھی پہلی بار منکشف ہوا کہ اقبال نے قرآن مجید کے حواشی کا خاکہ تیار کر دیا تھا جسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مصر بھیجا تھا — ان کے خط کا متن ملاحظہ ہو:

> "اپنی کتاب میں آپ نے حضرت علامہ اقبالؒ کے وظیفے کے متعلق مولوی محمد امین زبیری مرحوم کے کسی مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم میرے بھی بزرگ تھے اور اس لیے ان کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کروں گا لیکن میں آپ کی خدمت میں اس حکم کی ایک نقل ارسال کر رہا ہوں جو سید راس مسعود مرحوم نے میرے ذریعہ مفتی انوار الحق صاحب مرحوم کے پاس ارسال کرایا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوجائے گا کہ وظیفہ کے لیے کوئی شرط

نواب صاحب مرحوم نے نہیں عاید فرمائی تھی۔ اس سے زیادہ اس سلسلے میں اب مجھے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

Copy No 9.P

Bhopal C.I.
June 18, 1935

My dear Mufti Saheb

As you no doubt know, His Highness has been graciously pleased to sanction a life Pension of Rs 500/- per mensem for Sir Mohd Iqbal. This Pension is to date from 1st of June 1935. Will you therefore very kindly take necessary steps to see that the first payment is made to him [illegible] the 1st week of July 1935. His address:

Sir Mohd Iqbal Kt.
Bar-at-Law
Lahore

[illegible]

Yours Sincerely
(Sd) S.R. Masood.

To The Hon'ble Rafi-ul-Qadr
Zia-ul-Uloom Mufti
Mohd Anwar ul Haq Saheb,
Secretary Finance
Dept. Govt of Bhopal
Bhopal

True Copy
M. H. Khan
Private Secretary to Nawab
Sir Syed Ross Masood
Minister of Education
Govt of Bhopal
Bhopal

علامہ اقبال کے پانچ سو روپے ماہانہ
وظیفے کے احکام کی نقل ہے [illegible]
ممنون حسن خاں [illegible] وظیفہ غیر مشروط

نوٹ: [illegible]

تقابل

یہ بھی درست نہیں کہ تین سال کے عرصے میں حضرت علامہ نے کوئی نوٹس NOTES نہیں لکھے یا نامکمل کتاب کا کوئی مسودہ تیار نہیں کیا۔ اول تو اس سارے زمانے میں حضرت علامہ شدید علیل رہے اور بچوں کی وجہ سے بے حد پریشان رہے۔ دوسرے کچھ کتابیں ایسی تھیں جو ہندوستان میں موجود نہیں تھیں اور جن کو دیکھنے کے لیے وہ ولایت جانے کا قصد کر رہے تھے۔ پھر بھی انھوں نے جو بھی نوٹس لکھے تھے یا جو بھی خاکہ تیار فرمایا تھا اس کو میری اطلاع کے مطابق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے مصر بھیجا تھا — مصطفےٰ المراغی مرحوم کے پاس جو اس وقت ازہر کے CHANCELLOR تھے۔ مقصد یہ تھا کہ علماء مصر ان نوٹس کو دیکھ کر یہ کوشش کریں کہ کیا علامہ نے جہاں سے یہ کام چھوڑا تھا وہاں سے وہ اس کو شروع کر کے کتاب مکمل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اُن NOTES پر عالموں اور بڑے بڑے پروفیسر صاحبان نے کئی ماہ تک غور کیا اور متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کتاب کو اس طرح مکمل کرنا جس طرح کہ علامہ چاہتے تھے ان سب کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ اُن میں وہ VISION، وہ نظر، وہ بصیرت، نہیں تھی جو حضرت علامہ کو باری تعالیٰ نے قرآن حکیم کے متعلق خاص طور سے عطا فرمائی تھی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ اُن NOTES کا کیا حشر ہوا۔ ذاکر بھائی مرحوم ہو گئے۔ میرے دوست سید ین اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ پروفیسر مجیب مدت سے بے ہوش ہیں[۵۱]۔ اعزاز الدین صاحب کو کچھ معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ جامعہ میں نہیں تھے۔ حیات بھائی اور شعیب قریشی صاحب بھی مرحوم ہو گئے۔ اب کس سے دریافت کروں۔ بہرحال کوشش کروں گا اور اگر کچھ معلوم ہوا تو انشاء اللہ مطلع کروں گا۔

یہ جناب عزیز احمد صاحب کون بزرگ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے "آشفتہ مغز" اور "آشفتہ ہو" ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اقبال کا مقامِ بلند معلوم کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ میری رائے میں ایسے لوگوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ جواب تو عقل کی بات کا دیا جاتا ہے۔ "کوچہ گرد وں" کی باتوں کا سنجیدہ لوگ کیونکر جواب دے سکتے ہیں۔ رہا اقبال کو سمجھنا تو حضرت گرامی مرحوم کا یہ شعر بات صاف کر دیتا ہے:

ترا چناں کہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدر ہمت خود می کنند استدراک

میری رائے میں جس آدمی میں ایمان نہیں ہوگا وہ اقبال کو بالکل نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اعتراض کرنا تو بہت آسان ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے کو خود اپنا مقام معلوم ہونا چاہیے۔

اقبال اور ممنون حسن خاں

آپ نے کتاب میں کسی جگہ میرے نامکمل مضامین کا تذکرہ کیا ہے[۵۲]۔ برادرم میں کیا اور میرے مضامین کیا۔ سالہا سال سے اقبال کے کلام کو وظیفہ جان کر پڑھ رہا ہوں لیکن سچ جانیے اب تک الف بے بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ حقیقت ہے۔ یقین فرمائیں۔ بہرحال اگر زندگی ہے اور اللہ پاک نے ہمت عطا فرمائی تو ان اشعار کے متعلق ضرور کچھ پیش کروں گا جو حضرت علامہ نے یہاں بھوپال میں فرمائے تھے اور جن پر میری اور سید راس مسعود مرحوم کی اُن سے اکثر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح اُن کے وہ مطالب جو خود علامہ نے بتلائے تھے شاید میں پیش کر سکوں۔ لیکن یہ سب اللہ پاک کے حکم پر منحصر ہے۔ ویسے اقبال پر کیا کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے اور کیا کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ آج دنیا میں کون سی بڑی یونیورسٹی ہے جہاں اقبال پر CHAIR قایم نہ کی گئی ہو اور ویسے پاکستان میں کیا کچھ کام ہو رہا ہے۔ میرے لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

---

۵۱ افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

۵۲ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸۴ (اقبال اور بھوپال)

یہ ضرور ہے کہ دورانِ قیامِ بھوپال میں نے اُن کے ساتھ وہ کام انجام دیا تھا جو اکریاں نے گوئٹے کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ریمارک میرا نہیں سید راس مسعود مرحوم کا ہے۔

جس خواب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے [۵۱] اُس کو صبح کو مجھ ناچیز سے بیان کیا گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب آنکھ کھلی ان کی زبان پر یہ شعر تھا جو انھوں نے نہ تو عالمِ بیداری میں کہا تھا اور نہ عالمِ خواب میں۔ شعر یہ تھا:

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

حضور سرورِ کائنات کی خدمت میں جو عرض داشت پیش کی گئی تھی انھوں نے مجھے ہی لکھانا شروع کی تھی۔ اللہ اللہ کیا عشقِ رسولؐ تھا۔ جب آپ سے ملاقات ہوگی تو سارا قصہ عرض کروں گا۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ یہ تو میرے عشق کی داستان ہے۔ دفتر میں کس طرح سما سکتی ہے ـــ بقول حسن:

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

اور یہی وجہ تھی کہ میں باوجود کوشش کے اپنے مضامین کو اب تک مکمل نہیں کر سکا ہوں۔ بالکل افکار پریشاں ہیں۔ ان کو کون چھاپے گا میرے بھائی۔!

شعری بھوپالی کے پاس جو کتاب علامہ کی ہے اور جو حضرت علامہ نے نواب صاحب کو دی تھی ـــ وہ اُن کے پاس کس طرح آئی؟ [۵۲] جب آپ سارا قصہ سنیں گے تو سر پیٹ لیں گے۔

یوں تو ریڈیو پر میں حضرت علامہ کے متعلق کئی بار چھوٹی چھوٹی تقاریر کر چکا ہوں اور کالجوں میں میرے لکچر ہو چکے ہیں لیکن میں کیا اور میرا علم کیا۔؟

اگر خلیل اللہ خاں صاحب، میاں خاقان (چودھری خاقان حسین)، میاں عبدالحئی اور اظہر سعید خاں صاحب مل جائیں تو ان سب کی خدمت میں میرا اسلام ضرور پہنچا دیں۔ میں ان سب کا ادنیٰ نیاز مند ہوں۔ خدا ان سب سے خیریت کے ساتھ جلد ملائے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ گزشتہ سال ماہِ اگست میں میری رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔ جب سے میں چلتی پھرتی لاش ہوں۔ وقت بھی میرے سینے کے زخموں کو اب تک نہ بھر سکا۔ اب علامہؒ ہی کی طرح بچوں کے لیے زندہ ہوں۔

نوٹ:

آپ نے اپنی کتاب میں ان چند خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جن کو میں نے کسی کو نہیں دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ خطوط نجی ہیں اور علامہؒ نے اپنے قلم سے اُن پر Private and Confidential لکھ دیا ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ میں اس امانت کو کس طرح منظرِ عام پر لاؤں [۵۳]"

شیش محل ـــ یادگارِ اقبال

ممنون حسن خاں نے اپنے دوسرے خط میں شیش محل ـــ قیام گاہِ اقبال سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے

---

۵۱ اقبال اور بھوپال۔ صفحہ ۱۶۵ ۵۲ ایضاً۔ صفحہ ۲۴۷

۵۳ افکار۔ شمارہ ۴۶۔ جنوری ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۳۹-۴۰

ان کی اقبال شناسی اور بے پناہ جذبۂ عقیدت کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"زیادہ کیا عرض کروں — کوشش کر رہا ہوں کہ شیش محل کا وہ حصہ جہاں علامہ نے قیام فرمایا تھا حکومت کی طرف سے اقبال کی یادگار کو قایم رکھنے کے لیے PRESERVE کر دیا جائے اور وہاں اقبال اکادمی قایم کی جائے۔ شاید میری ناچیز کوشش بار آور ہو۔ دعا فرمائیں۔

حکومتِ ہند از راہِ علم و ادب نوازی اقبال سینٹیزی کے سال میں کثیر رقم خرچ کر کے کئی سیمینار کرا رہی ہے۔ پہلا سیمینار حیدرآباد میں ہوا۔ دوسرا کشمیر میں ۱۹۷۷ء میں آخری سیمینار دہلی میں ہوگا جس میں ساری دنیا کے عالم فاضل شرکت کریں گے۔ ہماری حکومت کا یہ اقدام ہر طرح قابلِ تعریف ہے اور ہم سب حکومت ہند کے بہت زیادہ احسان مند اور شکر گزار ہیں۔ عالمی سیمینار میں خاکسار بھی شرکت کر رہا ہے اور شاید ایک PAPER بھی پڑھے گا۔

جواب سے شکر گزار فرمائیے۔ کارِ لایقہ کے لیے حکم دیجیے۔

والسلام — آپ کا بھائی

ممنون
(ممنون حسن خاں)

کفش بردار علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ"

ان معروضات و توضیحات کے بعد آخر میں مجھے اتنا ہی اور کہنا ہے کہ اقبال کی شخصیت — سچ پوچھیے تو روشنی کا ایک ایسا ہالہ ہے جس کے گرد اس عہد کی دیگر شخصیتیں سیاروں کی مانند گردش کر رہی ہیں اور چراغ سے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔

اب یہی دیکھیے کہ نظر حیدرآبادی (مرحوم) نے "اقبال اور حیدرآباد" لکھی تو خود بخود میرے ذہن میں "اقبال اور بھوپال" کا خاکہ مرتب ہو گیا اور پہلی اشاعت کے بعد دوسری اشاعت کی نوبت آنے تک کتنے ہی اور نئے پہلو سامنے آ گئے، چنانچہ نظرِ ثانی کے دوران جہاں بعض واقعات کی صحت و درستی کا مرحلہ سر ہوا وہیں بعض نادر و نایاب خطوط، اقبال کے مرثیے، قلمی خطوط کے عکس وغیرہ بھی دستیاب ہو گئے — یہی نہیں بلکہ یہ اطلاع بھی ملی کہ "اقبال اور بھوپال" کے بعد راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچرل سوسائٹی آف پاکستان — "اقبال اور راس مسعود" کے موضوع پر اور بھوپال میں ڈاکٹر اخلاق اثر "اقبال اور ممنون" کے عنوان سے کتابیں لکھ رہے ہیں۔

ظاہر ہے یہ سب موضوعات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ایک ہی شخصیت اقبال کے گرد گھومتی ہے اور جب یہ کتابیں شائع ہوں گی تو یقیناً اقبال کی فنی اور شخصی عظمت کے کچھ اور پہلو ہمارے سامنے آئیں گے۔

دوسرے ایڈیشن کا مسودہ ۱۹۷۷ء کی ابتدا میں مکمل کر کے اقبال اکادمی پاکستان کو بھیج دیا تھا لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت ۱۹۸۰ء سے قبل ممکن نہ ہو سکی چنانچہ پورے مسودے پر پھر ایک بار نظر ڈالنے کے بعد اس کتاب سے متعلق جو شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں ان کے اندراجات کر دیے ہیں اور ضروری اضافے بھی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن کو پہلے سے زیادہ مفید پائیں گے۔

صہبا لکھنوی

۱۶ر جنوری ۱۹۸۰ء

لہ اقتباس خط بنام راقم الحروف۔ مورخہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

حرفِ آغاز

تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع بھی ہے اور بسیط بھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے فن میں "حرفِ آخر"۔ "حرفِ غلط" ہے اور اسی وجہ سے ہمیں جلد بازی میں حکم لگانے اور تاریخ کے تعین میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔

(ایک نقاد اور محقق کی رائے)

۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء کی ایک شام کا ذکر ہے۔ کٹرک ہال کراچی میں ڈپٹی نذیر احمد کی یاد میں ادارۂ مصنفین پاکستان کے زیر اہتمام جلسہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت ملک کے مشہور دانشور ممتاز حسن نے فرمائی۔ مجمع بہت تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ کوئی دو گھنٹے تک مختلف شخصیتوں نے ڈپٹی صاحب کی تاریخ ساز شخصیت، اُن کی مثالی زندگی اور اُن کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد حاضرین "گوشۂ نمائش" میں جمع ہو گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تقریباً تمام تصانیف کٹرک ہال کے باہر کھلے برآمدے میں سلیقہ سے آراستہ تھیں۔ میں بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میرے گرد ممتاز حسن، مسلم ضیائی اور شاہد احمد دہلوی (مرحوم) یک جا ہو گئے۔ اسی عرصہ میں نظر حیدرآبادی (مرحوم) بھی ہم میں آ ملے۔ ممتاز حسن نے نظر کو دیکھتے ہی دریافت کیا کہ اُن کی کتاب "اقبال اور حیدرآباد" تیاری کی کس منزل میں ہے؟ نظر (مرحوم) نے بتایا کہ کتاب چھپ رہی ہے۔ یہ سُن کر یک لخت میرے ذہن میں "اقبال اور بھوپال" کا تصور گھوم گیا اور میں نے ممتاز حسن سے عرض کیا کہ "اقبال اور حیدرآباد" کے بعد اگر "اقبال اور بھوپال" پر بھی کچھ کام ہو سکے تو علامہ اقبال کی زندگی کا یہ نیا رُخ بھی دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ ممتاز حسن میرا یہ مشورہ سُن کر بے حد خوش ہوئے اور برجستہ کہا "تو یہ کام آپ کر ڈالیے"۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ جلسہ کے بعد گھر آیا تو یہ موضوع اور اس کتاب کے امکانات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ موضوع کی افادیت مسلّم تھی لیکن اس کی تمام تر تفصیلات پر جب میں نے غور کیا تو مجھے اس کام کی تکمیل مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن نظر آئی۔ مجھے بھوپال چھوڑے ہوئے دس سال بیت گئے تھے۔ کتاب کا سرسری ساخاکہ جو میں نے تیار کیا۔ اس کی تکمیل بھوپال جائے بغیر ممکن نہ تھی۔ آخر کار میں نے اپنے چند خاص دوستوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور اپنا تحریری خاکہ اُنھیں دکھایا تو سب نے بیک زبان اس موضوع کو پسند کیا اور کہا کہ یہ قطعی اچھوتا پہلو ہے۔ اس پر ضرور کام کیجیے۔ کیونکہ اقبال کے فلسفہ، اُن کی فکر اور اُن کے کلام پر مبنی تشریحات اور کتابیں تو کثرت اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی ذاتی صفات، ان کی شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں اور اُن کی زندگی کے مستند واقعات پر بہت کم مواد ملتا

چنانچہ احباب کی ہمت افزائی پر میں نے تہیہ کر لیا کہ مواد کی فراہمی کی کوشش تو کر دیکھوں ۔ شاید کچھ کام بن جائے ۔ "اقبال اور بھوپال" کے موضوع پر جب کتابوں کو تلاش کیا تو صرف دو تین کتابیں مجھے سہولت سے مل گئیں۔ نذیر نیازی کی "مکتوباتِ اقبال" اور شیخ عطاء اللہ کی مرتبہ "اقبال نامہ" کی دو جلدیں میں نے اول تا آخر پڑھ ڈالیں ۔ ان کتابوں میں بھوپال سے متعلق چند خطوط میری نظر سے گزرے ۔ میں نے تمام مکتوبات کو نقل کر لیا اور تاریخی تسلسل کے ساتھ یکجا کر کے بھوپال کے چند مخلص دوستوں کو خطوط لکھ ڈالے ۔ لیکن وہاں سے قابلِ اعتماد مواد بہت کم مل سکا ۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور چند دوسری کتابوں کی تلاش شروع کر دی ۔ اور یہ سلسلہ کوئی دو سال تک جاری رہا ۔

اُسی زمانے میں فقیر وحیدالدین (مرحوم) کی مشہور کتابیں "روزگار فقیر" جلد اول اور دوم مجھے دیکھنے کو مل گئیں ۔ ان میں بھوپال اور اقبال سے متعلق تھوڑا بہت مواد موجود تھا اسے بھی میں نے نقل کر کے محفوظ کر لیا ۔ کام کچھ آگے بڑھ گیا تو میں نے مزید سعی و جہد کر کے چند دوسری کتابیں بھی حاصل کر لیں ۔

کتاب سے متعلق ۔ بھوپال کی کئی بزرگ و ممتاز شخصیتوں سے میں نے قلمی رابطہ پیدا کیا ۔ کئی احباب اور جواں سال ادیبوں نے بظاہر بڑے خوش کن جوابات دیے ۔ ان خطوط میں اس موضوع سے متعلق مواد بھیجنے کی بشارت بھی تھی ۔ وعدے وعید بھی کیے گئے تھے ۔ لیکن تقریباً دو سال تک یاددہانیوں کے باوجود نہ مطلوبہ مواد مل سکا نہ دیگر تفصیلات فراہم ہو سکیں ۔ صرف تین حضرات مرحوم یوسف قیصر بھوپالی، رشدی ۔ (مدیر روزنامہ افکار بھوپال) اور شمیم احمد نے (جو ان دنوں اورنگ آباد کے ایک کالج میں لکچرر ہیں) تھوڑی بہت مدد ضرور کی ۔ بھوپال کے دیگر احباب نے تو جواب تک دینے کی زحمت نہ اٹھائی ۔ رشدی کے علاوہ شمیم احمد نے جب تک وہ بھوپال میں رہے ۔ میرے استفسارات کے جواب بھی دیے اور کچھ قابلِ اعتبار مواد بھی بھیج دیا ۔ لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود ہفت روزہ "ندیم" کی (جو اب روزنامہ ہے) فائلیں دستیاب نہ ہو سکیں ۔ اسی عرصہ میں شمیم احمد لکچرر ہو کر بھوپال سے باہر چلے گئے اور اس طرح بھوپال سے رابطہ کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا ۔

مواد کے سلسلہ میں مزید جستجو سے پتہ چلا کہ بھوپال کے ایک بزرگ و محترم ادیب، صوفی شاعر، شاہ اسدالرحمٰن قدسی بھون (ضلع جہلم) میں قیام فرما ہیں جہاں خاندانی سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہے ۔ چنانچہ میں نے شاہ صاحب سے قلمی رابطہ پیدا کیا تو انھوں نے فوراً جواب سے نوازا اور علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی عطا کر دیا ۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے کام کی مشکلات کا تذکرہ کیا اور درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد اور رہنمائی فرمائیں تاکہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں ۔ میری اس گذارش پر موصوف نے نہ صرف اپنی یادداشتوں سے اہم غیر مطبوعہ اور منفرد مواد بھیج دیا بلکہ اپنے تمام مریدین اور معتقدین کو بھی ہدایت فرمادی کہ "اقبال اور بھوپال" کے ناتے میری ہر ممکن اعانت کی جائے ۔ انھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے پر مجھے دعائیں بھی دیں ۔ چنانچہ کئی نادر و نایاب چیزیں شاہ صاحب قبلہ کے توسط سے مجھے دستیاب ہو گئیں ۔

اب کام کچھ آگے بڑھ گیا تھا ۔ کراچی کی ادبی تقریبات میں جب بھی ممتاز حسن سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ "اقبال اور بھوپال" سے متعلق کتنا کام کر چکے ہیں ؟ میں نے صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا کہ یہ کام کافی دقت طلب ہے ۔ میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں تاکہ معتبر مواد فراہم ہو جائے ۔ ممتاز صاحب کی ہدایت پر میں نے اس کتاب کے بارے میں اقبال اکیڈمی کو خط لکھ دیا تھا ۔ چنانچہ ہر چوتھے پانچویں مہینے وہاں سے یاددہانیاں آنے لگیں ۔ اور میں بھی جواب دیتا رہا کہ کتاب لکھ رہا ہوں ۔ اور مواد کی تلاش جاری ہے ۔ انشاء اللہ مکمل ہوتے ہی کتاب کا مسودہ

پیش کردوں گا۔

——— اور آج تقریباً گیارہ سال کے بعد جب میں اپنی بے نام سی جد وجہد اور لگاتار سعی و کوشش کا جائزہ لیتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ کراچی میں بیٹھے بیٹھے اتنا قیمتی، اچھوتا اور اہم مواد مجھے کیسے مل گیا جس کا دس گیارہ سال پہلے تصور بھی ممکن نہ تھا —!

اس کتاب میں جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے حسب ذیل نئی چیزیں شامل ہیں ۔چھ غیر مطبوعہ خط، چار ایسے خط جو مکتوبات کے کسی مجموعہ میں نہیں چھپے، دو غیر مطبوعہ مرثیے جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ کئی نادر و نایاب کتابیں جو علامہ کی شاعری، سیاست اور اُن کی فکر کے وسیع گوشوں پر محیط ہیں۔ تین ایسی کتابوں کے انتسابات جو شہزادی عابدہ سلطان اور خصوصی معالج ڈاکٹر عبدالباسط کو بھوپال بھیجی گئی تھیں، نواب حمید اللہ خاں کے وہ تاریخی خطبے جو مرحوم نے "جشن حالی" کے موقع پر پانی پت میں پڑھے تھے۔ اقبال کے پہلے قیام بھوپال سے متعلق شاہ اسد الرحمن قدسی کے مرید اقبال حسین خاں ۔ندیم خاص فرماں روائے بھوپال کے اچھوتے واقعات، بھوپال کی تاریخی عمارات راحت منزل، ریاض منزل اور شیش محل کی تصاویر۔ بھوپال کی ایک نہایت حسین موتی مسجد کی تصویر جہاں علامہ اکثر جمعہ کی نماز کے لیے جاتے تھے۔ جاوید اقبال کے بچپن کی تصویر جب وہ بھوپال گئے تھے، نیز کتاب سے متعلق کئی اور تصویریں، خطوط، خاکے اور عمارتوں کے نقشے وغیرہ اور اب یہ کتاب تقریباً گیارہ سال بعد — میری دیوانہ وار اور ان تھک کوششوں کا حاصل — آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ذرا پھر ایک بار ابتدائی اقتباس پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ "تحقیق کی دنیا واقعی امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع ہی نہیں بسیط بھی ہے"۔ علاوہ ازیں اس صداقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "تحقیق کے فن میں "حرفِ آخر" "حرفِ غلط" ہے"۔ میری دانست میں تحقیق کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ معتبر و مستند مواد فراہم کیا جائے۔ تحقیق کے ہر پہلو کی چھان بین کی جائے ۔واقعات کی صداقت کو پرکھا جائے تبھی تحقیق کا تھوڑا بہت حق ادا ہوسکتا ہے۔ میں نے انھیں اصولوں کو سامنے رکھکر جتنا کچھ مواد اس کتاب میں مہیا کیا ہے —— پوری ذمہ داری سے کیا ہے —بغیر حوالہ کے کوئی واقعہ پیش نہیں کیا ہے—— اس کتاب میں اول تا آخر یا تو مستند کتابوں کے حوالے آپ کی نظر سے گزریں گے یا مشہور، ممتاز اور سر برآوردہ شخصیتوں کے بیانات — ایک اہم بات یہ بھی عرض کردوں کہ میری تحقیق علامہ اقبال کے بھوپال سے ربط و تعلق تک محدود ہے جسے اکثر خطوں میں علامہ نے "دار الاقبال" لکھا ہے ۔اس طرح تحقیق کے کسی امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا ہے اب یہ فیصلہ آپ کریں گے کہ تحقیق کا حق ادا ہوسکا کہ نہیں —!

اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بھوپال سے روابط کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا اور یہ روابط وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک برابر قایم رہے۔ چنانچہ میں نے ابتدا سے انتہا تک حالات و واقعات کا تاریخی تسلسل برقرار رکھا ہے —اسی طرح میں اپنے موضوع سے انصاف کرسکتا تھا۔ اس تاریخی تسلسل کی روشنی میں علامہ اقبالؒ کی بھوپال سے ذہنی وابستگی کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سچ پوچھیے تو یہ کام نہایت پیچیدہ اور صبر آزما تھا۔ تیس پینتیس سال پہلے کے صحیح واقعات کی چھان بین اور علامہ اقبالؒ کے خطوط کا پس منظر تلاش کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن میں نے چند در چند مشکلات کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا اور بہ کوشش صرف اُسی مواد کو کتاب میں شامل کیا جسے میں نے ہر لحاظ سے معتبر، مستند اور قابل اعتماد سمجھا۔

"اقبال اور بھوپال" —— بظاہر ایک محدود سا موضوع ہے۔ اس موضوع کا تفصیلی احاطہ کرنے کی کسی نے کوشش بھی نہیں کی —— البتہ ایک مختصر سا مقالہ — عبد القوی دسنوی —— صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال نے تحریر کیا

حوصلہ کیا۔ دسنوی صاحب نے اپنے مقالہ کو بعد میں کتابچہ کی صورت میں بھی شایع کیا اور مجھے بھی ایک کاپی عنایت کی۔ میں نے اسے پڑھا تو افسوس ہوا کہ دسنوی صاحب اپنے مقالہ "علامہ اقبال بھوپال میں" کے ساتھ انصاف نہیں کرسکے پھر بھی میں نے انھیں مبارک باد دی اور یہ لکھا کہ جن نظموں یا مرثیوں، تصاویر اور دیگر مواد کو آپ فراہم نہیں کرسکے اور صرف تذکرہ پر اکتفا کیا ہے۔ براہِ کرم وہ مجھے مہیا کردیں۔ انھوں نے وعدے ضرور کیے لیکن وفا نہ کرسکے۔ ایک خط میں انھوں نے یہ بھی اعتراف کرلیا کہ اسے انھوں نے بہت عجلت میں لکھا ہے۔ حالانکہ عجلت کی ضرورت نہیں تھی۔ ادیب و محقق کو اپنے موضوع سے پورا انصاف کرنا چاہیئے۔ میری مبارک باد پر دسنوی صاحب نے جو خط مجھے بھیجا۔ اُس کا حوالہ اور مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:۔

"صدر شعبۂ اردو۔ سیفیہ کالج۔ بھوپال

۲ر جون ۷۶ء

محترمی صہبا صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا۔ اطمینان ہوا کہ "علامہ اقبال بھوپال میں" پسند فرمایا۔۔۔۔ میں نے یہ کام بڑی عجلت میں کیا ہے اب اسے آپ مکمل کیجیۓ۔ انشاءاللہ آپ کی فرمایش جلد پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں کام کرنے میں بڑی دشواریاں ہیں۔ تصویروں کے لیے کئی صاحبوں نے وعدے کیے ہیں لیکن ہنوز وعدہ ہی (کی) کے منزل میں ہیں۔

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ اپنی یادوں میں اس ناچیز کو بھی یاد رکھیے ۔۔۔۔ آپ کا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبدالقوی دسنوی"

اس خط کے بعد میں نے دسنوی صاحب کو کئی عریضے بھیجے لیکن بات "کوشش" اور "وعدہ" سے آگے نہ بڑھ سکی۔ تب میں نے اپنے ہی ذرایع اور وسایل پر تمام تر توجہ مبذول کردی اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ علامہ کے کئی بھوپالی نیازمند مجھے کراچی میں مل گئے جن کے بیان کردہ واقعات آپ آیندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس ضمن میں ماہرِ غالبیات اور ماہرِ اقبالیات مولانا غلام رسول مہر (مرحوم) کی خصوصی توجہ اور عنایتِ خاص کا ذکر بھی ضروری ہے۔

۱۹۶۹ء میں غالب صدی کی تقریبات میں شرکت کے لیے مولانا مہر (مرحوم) کراچی تشریف لائے تو میں نے اُن کی قیام گاہ پر اُن سے شرفِ نیاز حاصل کیا اور عرض کیا کہ "اقبال اور بھوپال" کے آٹھ ابواب میں لکھ چکا ہوں۔ ازرہِ شفقت آپ انھیں ایک نظر دیکھ لیں اور مشوروں سے نوازدیں۔ نیز مناسب سمجھیں تو اس کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ بھی تحریر فرمادیں۔ مولانا (مرحوم) نے فوراً آمادگی ظاہر کردی اور دوسرے روز میں آٹھ ابواب پر مشتمل مسودہ انھیں دے آیا۔

لاہور پہنچ کر انھوں نے پہلی فرصت میں میرا مسودہ پڑھ ڈالا اور مجھے بڑی محبت سے خط لکھا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیۓ۔

"۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مسودہ جتنا بھی دیکھا۔ معلوم ہوگیا کہ آپ نے حالات بڑے ہی مناسب انداز میں مرتب فرمائے ہیں اور کوئی قابلِ ذکر ماخذ جو دسترس میں آسکتا تھا نظر انداز نہیں کیا ہے۔"

اس عرصہ میں میں نے کتاب کے دو باب اور لکھ ڈالے اور اُن کو رجسٹری سے مولانا مہر (مرحوم) کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں نے یہ گزارش بھی کی کہ ان دس ابواب سے کتاب کا تہائی حصہ مکمل ہوجاتا ہے اگر آپ مسودہ کو کسی قابل سمجھیں تو مقدمہ یا

دیباچہ تحریر فرمادیں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اب صرف تین یا چار ابواب اور لکھنا ہیں اُن ابواب کے عنوانات مسودہ میں شامل ہیں۔

اس درخواست پر انھوں نے فوراً توجہ مبذول فرمائی اور مجھے لکھا:-

"آپ باقی ابواب کب بھیجیں گے تاکہ انھیں دیکھ کر ایک دیباچہ یا مقدمہ لکھ دوں ۔۔۔۔

اگرچہ میرا احساس یہ ہے کہ آپ کی کتاب ایسے اچھے اور دل پذیر انداز میں لکھی گئی ہے کہ اس کے لیے میرا مقدمہ نہ محض موزوں نہ ہوگا بلکہ کسی بھی مقدمہ کی ضرورت نہیں۔"

بقیہ چار ابواب میں اپنی خرابیٔ صحت اور "افکار" کی چند در چند مصروفیات کے سبب لکھنے سے قاصر رہا۔ اسی دوران اقبال اکیڈیمی سے عبدالواحد معینی کا خط آگیا کہ "اقبال اور بھوپال" کا مسودہ جلد اکیڈیمی کو بھجوادیں تاکہ انتظامیہ کمیٹی اس کی اشاعت پر غور کرسکے۔ چنانچہ میں نے اپنا مسودہ معینی صاحب کی خدمت میں پیش کردیا۔ معینی صاحب کو میں نے بتایا کہ دس ابواب تیار ہیں۔ ان پر مولانا مہر (مرحوم) نظر ڈال چکے ہیں۔ آپ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اگر کتاب اشاعت کے لیے منظور کرلی گئی تو باقی تین یا چار باب۔ انشاء اللہ ایک دو مہینے میں مکمل کردوں گا۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء سے مئی ۱۹۷۱ء تک میری کتاب کا مسودہ اقبال اکیڈیمی میں رہا۔ عبدالواحد صاحب نے بڑی شفقت اور توجہ سے میرا مسودہ ملاحظہ کیا اور اپنی سفارش کے ساتھ کمیٹی کے سامنے پیش کردیا۔ کمیٹی نے اس مسودہ کو اشاعت کے لیے منتخب کرلیا اور ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء کو مجھے تحریری اطلاع مل گئی۔ چنانچہ میں نے سب کام چھوڑ کر باقی ابواب پر کام شروع کردیا اور شبانہ روز جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو اکیڈیمی جاکر بقیہ حصہ ڈائرکٹر صاحب اقبال اکیڈیمی کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس کتاب کو مکمل کرکے جتنی ذہنی آسودگی اور مسرت مجھے نصیب ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں "اقبال اور بھوپال" بظاہر محدود سا موضوع ہے لیکن جب میں نے اسے لکھنا شروع کیا تو نئے سے نیا مواد مجھے دستیاب ہوگیا اور اس طرح یہ موضوع پھیل کر سمندر بن گیا۔ ایک نظر فہرست مضامین پر ڈالیے تو بآسانی اس امر کا اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے کتاب کے تقریباً ہر باب میں نئی معلومات فراہم کی ہیں اور تمام تر اس بات کی کوشش کی ہے کہ علامہ مرحوم کے ذہنی اور قلبی رشتوں اور بھوپال سے "دارالاقبال" سے اُن کی خصوصی وابستگی کو تاریخی تسلسل کے ساتھ اس کتاب میں محفوظ کردوں۔ میں نے حقائق کی تلاش و تحقیق میں پوری دیانت، سچائی اور خلوص سے کام لیا ہے اور اپنی طرف سے بہت کم فیصلہ یا حکم لگایا ہے۔

ایک باب میں میں نے بڑی جستجو اور محنت کے بعد اقبال سے نواب حمیداللہ خاں کے ذاتی روابط کی نشان دہی کی ہے۔ میں نے خود سے یہ سوال پوچھا کہ ان دونوں میں کیا قدر مشترک تھی کہ علامہ دم تک بھوپال سے ذہنی رشتہ قایم رکھ سکے۔ ایک نواب اور ایک قناعت پسند، عزلت گزیں اور فقیر منش انسان۔ چنانچہ میں نے اُن محرکات کا جائزہ لیا۔ بھوپال کے کئی نیازمندوں سے معلومات حاصل کیں۔ اپنے طور پر غور و فکر کیا تو پتہ چلا کہ امیر اور فقیر کا قریبی ربط و تعلق دراصل ایک نصب العین کے اشتراک کا نتیجہ تھا، کیونکہ مسلمانوں کے دورِ زریں اور اُن کی نشاۃ ثانیہ کے جذبے دونوں میں مشترک تھے۔ نواب صاحب کی طرف سے اقبال کا حد درجہ احترام اور اُن کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادگی۔ دوسری جانب اقبال کے دل پر یہ اثر کہ نواب صاحب والیٔ ریاست ہونے کے باوصف عوامی اندازِ فکر رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی سود و بہبود سے اُنھیں خصوصی دلچسپی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے اور یہ دو متضاد اور مختلف النوع زندگی بسر کرنے والے اکابر تاحیات سچے اور اچھے دوست رہے۔

اب آیئے ایک نظر کتاب کے ابواب پر بھی ڈال لیں :-

پہلا باب ـــــ علامہ اقبال کے بھوپال سے روابط کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا دستاویزی ثبوت "آئینہ مشاعرہ" سے ملتا ہے۔ یہ انتخاب غزلیات ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ آئینۂ مشاعرہ کا عکس شامل کتاب ہے۔ اسی میں علامہ اقبال کی غزل بھی شامل ہے جو غالب کی زمین میں کہی گئی ہے اور ان کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں۔

دوسرا باب ـــــ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی روابط اور خصوصی مراسم پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی باب میں علامہ کی اصلاح شدہ غزل بھی شامل ہے جسے اقبال حسین خاں۔ ندیمِ خاص فرماں روائے بھوپال نے علامہ کے اصرار پر سنایا تھا۔

تیسرا باب ـــــ علامہ اقبال کی بھوپال میں آمد و قیام پر محیط ہے۔ اسی باب میں اُن کے علاج کے سارے انتظامات کا علم ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال اور راس مسعود کی ذاتی توجہ سے کیے گئے تھے۔

چوتھا باب ـــــ اقبال کے وظیفہ اور اس کے پس منظر کا تفصیلی احاطہ کرتا ہے۔

پانچواں باب ـــــ بھوپال کے دوسرے قیام سے متعلق ہے۔ ان میں وہ یادگار نظمیں بھی شامل ہیں جو بھوپال میں قیام کے دوران علامہ نے لکھیں۔

چھٹا باب ـــــ اس میں جشن حالی کا مستند احوال پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں نواب صاحب کے وہ تاریخی خطبات بھی شامل ہیں جو چار سال کی کوششوں کے بعد دستیاب ہو سکے۔ یہ خطبات پانی پت میں پڑھے گئے تھے۔

ساتواں باب ـــــ اقبال اور اُن کے خصوصی معالج ڈاکٹر عبدالباسط سے خط وکتابت پر مشتمل ہے۔ اسی باب میں وہ پانچ غیر مطبوعہ خط بھی شامل ہیں جو علامہ نے ڈاکٹر باسط کو تحریر کیے تھے۔ علامہ اقبال کے یہ خط نہایت سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں اگرچہ ان میں تمام تر نقرس کی تفصیل اور دوا کھانے کا تذکرہ ہے۔

علامہ اقبال کے جتنے بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط میری نظر سے گزرے ہیں اُن میں بڑی روانی، سادگی و پُرکاری ہے اور شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ خطوط نویسی کے سلسلہ میں منیر احمد شیخ کا ایک اقتباس قابلِ توجہ ہے :-

> ـــــ "ذاتی خطوط کو اس لحاظ سے اہم جاننا چاہیے کہ اُن میں لکھنے والے کی ذات کا عکس بے حد نمایاں اور بے داغ ہوتا ہے۔
>
> ہم میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی میں کئی ایک خطوط لکھے ہوں گے۔ بعض ایسے خطوط جہاں دل کا حال کھُل کر بیان کیا۔ ایسا حال کہ شاید کسی مضمون یا افسانے میں بھی کھپ نہ سکے۔
>
> خط لکھنے میں اہم بات یہ ہوتی ہے کہ یہ لکھا کس کو گیا ہے۔ وہ خطوط جو محبوبہ کو لکھے جاتے ہیں ـــ اُن میں شخصیت کے جذباتی پہلو کئی رنگوں میں سامنے آتے ہیں۔ یہ خطوط انسانی زندگی کی سب سے اہم تحریری دستاویز ہوتے ہیں کہ ان میں افراد کی شخصی کمزوریاں، اعترافات، حرفِ مدعا کا بیان، اظہار کی بے ساختگی اور تصورات کی اڑان اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ذات کے تجزیہ کے لیے عشقیہ خطوط سے بڑھ کر کوئی شے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اپنی بیوی کو خط لکھتے وقت بھی اپنی ذات کو اُس کے سامنے اس طرح نہیں کھولتا جیسے وہ اپنے محبوب یا بے حد عزیز دوست کے سامنے خوف و خدشہ کے بغیر اپنی قلبی و ذہنی کیفیات کو بیان کر دیتا ہے۔

تمام زبانوں کے ادب میں خطوط کے ایسے سرمائے بے شمار ملیں گے جہاں خط ایک خالصۃً ذاتی تحریر سے آگے نکل کر ادب بن جاتا ہے[1]۔

علامہ اقبال کے خطوط بھی معیار کے مندرجہ بالا اقتباس پر پورے اُترتے ہیں۔

آٹھواں باب ـــ بھوپال کے تیسرے قیام کی تفصیلات پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو اس قیام کے دوران علامہ نے لکھیں۔ اسی باب میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا بھی ذکر ہے جو انھوں نے بھوپال میں لکھی۔ اس سلسلے میں خواب کی حقیقتوں کا سُراغ اور اس کا پس منظر شاید پہلی مرتبہ شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ اہلِ نظر سے دادِ تحسین حاصل کرے گا۔

نواں باب ـــ اقبال، راس مسعود اور ضربِ کلیم کی اشاعت سے متعلق ہے۔ اس باب میں بھی کئی نئی باتیں آپ کے ملاحظہ سے گزریں گی۔

دسواں باب ـــ اقبال کی وفات اور بھوپال میں اُس کے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں وہ مرثیے بھی شریک ہیں جو اُن کی وفات پر لکھے گئے اور آج تک غیر مطبوعہ تھے۔

گیارھواں باب ـــ اُن اثرات کو ظاہر کرتا ہے جو علامہ کے بھوپال میں قیام کے سبب بھوپال کے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں وغیرہ نے قبول کیے۔ اس باب میں بھی کئی نئے گوشے اجاگر کیے گئے ہیں۔

بارھواں باب ـــ ملفوظاتِ قدسی اور نیاز مندانِ بھوپال پر محیط ہے۔ اس میں مستند حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ باب بھی تمام تر نئی معلومات پر مبنی ہے اور پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

تیرھواں اور آخری باب ـــ قرآن مجید کے حواشی سے متعلق ہے۔ یہ وہی کتاب تھی جس کی فرمائش نواب صاحب بھوپال نے علامہ سے کی تھی اور جس کی تیاری وہ زندگی کی آخری سانس تک کرتے رہے۔ افسوس کہ علامہ اقبال کی رحلت نے اس عظیم کتاب کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

اور سب سے آخر میں کتابیات اور اشاریہ ہے۔

یہ ہے سرسری سا خاکہ جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اب ایک نظر اُن نئے، اچھوتے اور منفرد واقعات پر بھی ڈال لیجیے جن کا آج تک کسی کو علم نہیں تھا:ـــ

(۱) انیسویں صدی کے آغاز سے آخری دم تک علامہ اقبال کا بھوپال سے ذہنی، قلبی اور عملی تعلق برقرار رہا ـــ بھوپال کی جن گراں قدر شخصیتوں سے اُن کی خط و کتابت رہی، اُن میں محمد امین زبیری، شاہ اسد الرحمٰن قدسی، راس مسعود، خاتون ارشد (بیگم ارشد تھانوی)، ممنون حسن خاں، ڈاکٹر عبد الباسط وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۲) اِن ابواب میں اُن نظموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو علامہ نے ریاض منزل اور شیش محل میں قیام کے دوران لکھیں۔ اس طرح ان نظموں کی صحیح تاریخوں کا علم ہو جاتا ہے۔ ضربِ کلیم میں جو نظم علامہ نے حمید اللہ خاں ـ والئ ریاست بھوپال کی ذات و صفات سے متعلق لکھی تھی وہ بھی شامل ہے۔

(۳) علامہ اقبال توجہ دلانے پر اپنے کلام کی خود ہی اصلاح کر لیتے تھے جیسا کہ خاتون ارشد کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ "نقوش"۔ جون ـ جولائی ۱۹۶۸ء ـ صفحہ ۱۴۴ ـ ۱۴۵

(۴) علامہ اقبال بھوپال کے ممتاز شاعروں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شاعروں کے کلام پر بھی اصلاح دیتے تھے اور مشورے بھی۔ اس کا ثبوت "لمعہ" کے نام خطوط سے مل جاتا ہے۔ وہ دیگر شعراء کا کلام بھی سنتے تھے اور داد دیتے تھے۔

(۵) "شکوہ" لکھنے کے بعد "جواب شکوہ" علامہ نے محض شاہ اسدالرحمٰن قدسی کی تحریک اور اُن کی خواہش کے احترام میں لکھا تھا۔[۱]

(۶) علامہ کے نیازمندوں کا ہندستان گیر حلقہ تھا۔ چنانچہ قیام بھوپال کے دوران جب کہ وہ علیل تھے۔ بڑی پابندی سے اپنے دوستوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کو خطوط لکھتے تھے۔ اُن کے خطوط کی زبان نہایت سادہ و دل نشیں ہے۔

(۷) اسپین وغیرہ کا سفر اُنھوں نے نواب حمیداللہ خاں کی ذاتی خواہش اور عملی اعانت سے کیا تھا۔[۲]

اسی نوع کے اور بھی اَن گنت اچھوتے واقعات جو قطعی نئی معلومات پر مبنی ہیں۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ کی نظر سے گزریں گے۔ ان کا اعادہ لاحاصل ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بفضلِ خدا دیر سویر مکمل ہوگئی ہے پھر بھی مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے "خونِ جگر" صرف ہونے میں اب بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ علامہ اقبال کے یہ دو مصرعے، میرے جذبات، احساسات اور خیالات کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے ؎

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

آخر میں اُن بزرگوں، رفیقوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے ہر مرحلہ میں میری مدد کی، قیمتی مشوروں سے نوازا اور میرا حوصلہ بڑھایا تاکہ میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ ان حضرات کی فہرست بہت طویل ہے۔ پھر بھی چند ایک کا ذکر ضروری ہے۔ سب سے پہلے عبدالواحد معینی اور محمد احمد سبزواری کے نام آتے ہیں جنھوں نے علیحدہ علیحدہ میری کتاب کے مسودہ پر نظرِ ثانی کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہایت قیمتی مشوروں سے نوازا۔ دیگر حضرات میں مولانا غلام رسول مہر، شاہ اسدالرحمٰن قدسی، نذیر نیازی، اسمٰعیل پانی پتی، سید محمد یوسف قیصر بھوپالی، شمیم احمد، عبدالحیٔ، شہزادی عابدہ سلطان، شریف الدین پیرزادہ، علی حیدر عباسی، محمد خلیل اللہ خاں، جمیل نقوی، اقبال حسین خاں۔ رشدی (ایڈیٹر روزنامہ افکار۔ بھوپال) چودھری خاقان حسین، مسیح الدین مسیح صدیقی، عبدالحمید کمالی، مسلم ضیائی، اظہر سعید خاں، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خواجہ آشفتہ حسین، عبداللہ قریشی، ڈاکٹر سید محمد یوسف، انجم اعظمی، ڈاکٹر حنیف فوق، احسن علی خاں، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، سید فیضی، اختر جمال، محمد علی صدیقی، محسن بھوپالی، سحر انصاری، سید احمد علی، الور حارث، مسعود احمد برکاتی اور احمد طاہر بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

۱-۲ ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی

صہبا لکھنوی
۱۶ فروری ۱۹۷۳ء

بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط

برصغیر کی آزادی سے قبل ہندوستان کی جن اسلامی ریاستوں کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، اُن میں ریاست حیدر آباد کے بعد ریاست بھوپال کا نام سرِفہرست ہے۔

یوں تو ریاست بھوپال کے قیام سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ہر فرماں روا کے دور میں ہمیں کئی مشہور و ممتاز شخصیتیں ملتی ہیں جو ریاست بھوپال یا دربار بھوپال سے وابستہ رہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ ریاست کی آخری دو حکمراں خواتین، یعنی نواب شاہجہاں بیگم (۱۸۶۸ء۔ ۱۹۰۱ء) اور نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۰۱ء۔ ۱۹۲۶ء) کا دورِ حکومت بلاشبہ سنہری دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ حکمراں خواتین جو خود علم و فضل کی حامل تھیں اور تصنیف و تالیف ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا اپنے اَب و جد کی طرح اس بات کی بھی شایق تھیں کہ اُن کی ریاست میں زیادہ سے زیادہ اہلِ علم و اہلِ کمال جمع ہو جائیں اور ہر طرف علم و تعلیم کا چرچا ہو۔ خود ان کے محل پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے شعراء کو انعامات اور خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔ ریاست میں امن اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ حکمرانِ وقت کی ذاتی دلچسپی کے باعث تعلیمِ نسواں اور خواتین کی سود و بہبود پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ مدارس کھُل رہے تھے۔ عمارتیں بن رہی تھیں، خواتین کے لیے کلب، لائبریریاں قایم ہو چکی تھیں اور ریاست بھر میں اردو کا سرکاری عمل دخل تھا۔ قوانین اردو میں نافذ کیے گئے تھے اور سرکاری ملازمتوں میں اردو کی قابلیت لازمی قرار دی گئی تھی۔ اور بقول مولانا اسلم جیراجپوری مؤلف "تاریخ الامت"

"بھوپال کی حیثیت اس وقت بغداد الہند کی تھی"[۱]

علم و ادب کی اشاعت کے لیے آٹھ سرکاری مطابع تھے جو دن رات کتابیں چھاپتے رہتے تھے اور تقریباً دو سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر ہر سال ان مطابع سے شائع ہو کر مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔

شاہجہاں بیگم نے جب قنوج کے ایک جید عالم مولوی سید صدیق حسن سے عقد ثانی کر لیا تو ریاست کے علمی اور فکری سرمایے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ عربی و فارسی کے منتہی اور تقریباً ڈھائی سو کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے جن میں سے ڈیڑھ سو کے قریب عربی و فارسی میں تھیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی خاصی مقبول ہوئیں۔ شاہ سعود اول نے آپ کی بعض تصانیف کو نہایت اہتمام سے شائع کیا اور یہ کتابیں آج بھی عرب ممالک میں الشیخ صدیق القنوجی والبخاری کے نام سے مشہور اور علم و بصیرت کا منبع ہیں۔ علامہ جمال الدین افغانی، مصر کے مفتی عبدہٗ اور سید احمد شہید کے

---

[۱] مقالات اسلم۔ صفحہ ۲۱۵

رفقائے کار سے آپ کا قریبی ربط و تعلق تھا اور آپ پان اسلامزم کی تحریک کے بڑے حامی تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر برطانوی حکومت نے آپ کا نوابی کا خطاب واپس لے لیا تھا اور آپ کو کچھ عرصہ تک نظر بند رکھا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم کے دورِ حکومت ہی میں سر سید احمد خاں علی گڑھ کالج کے لیے چندہ لینے بھوپال آئے تھے۔ لندن کی ووکنگ مسجد شاہجہانی بھی آپ ہی کے نام سے معنون ہے جس کی تعمیر کے لیے آپ نے گرانقدر عطیہ دیا تھا۔ بعض نادر کتابوں کی اشاعت بھی نواب شاہجہاں بیگم ہی کے عطیہ سے ہوئی۔ مثلاً صحیح بخاری کی شہرۂ آفاق شرح۔ فتح الباری جو آج کل تیرہ جلدوں میں ملتی ہے۔ متعدد کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو شاہجہاں بیگم نے فتح الباری کی اشاعت پر ایک لاکھ سے زیادہ رقم صرف کی تھی۔

نواب سلطان جہاں بیگم خود بھی صاحبِ علم، بیدار مغز اور علم دوست خاتون تھیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں آپ نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آپ پہلی چانسلر تھیں اور اس حیثیت سے آپ نے یونیورسٹی کی توسیع و ترقی میں گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ دیوبند، ندوہ، دارالمصنفین، مکہ معظمہ کے مدرسہ صولتیہ، لندن کے اسلامی اور بے شمار تعلیمی اور رفاہی ادارے آپ کی امداد و سرپرستی سے فیض یاب ہوتے تھے۔ علامہ شبلیؒ کی "سیرۃ النبی" مولوی عبدالرزاق کی "البرامکہ" اور منشی افتخار عالم مارہروی کی "حیات النذیر" کے لیے بھی آپ نے خصوصی مالی اعانت فراہم کی۔ بھوپال میں از سرِ نو دفترِ تاریخ قایم کیا۔ جس میں محمد امین زبیری، علامہ نیاز فتح پوری، علامہ محوی — سید محمد یوسف قیصر، مانی جائسی، محمد مہدی، مولوی عبدالرزاق ایسی بلند پایہ شخصیتیں شامل تھیں۔ دو بار آپ یورپ گئیں اور ایک مرتبہ فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ حمیدیہ لائبریری کا قیام، رسالہ "الحجاب"[۱] اور رسالہ "ظل السلطان"[۲] کا اجرا، مسائلِ نسواں پر آپ کی قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت وہ چند تاریخی اور ادبی کارنامے ہیں جو تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم کے دورِ حکومت میں متعدد شخصیتیں بھوپال آ کر آباد ہو گئیں اور بھوپال میں رہ کر انھوں نے زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور علم و فن کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ جن مشاہیر کا بھوپال سے کسی نہ کسی عنوان ربط و تعلق رہا۔ یا وہ یہاں کچھ عرصہ کے لیے مقیم رہے۔ اُن کی آمد و رفت کا سلسلہ رہا یا انھیں ریاست سے وظیفہ و امداد دی گئی اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ پھر بھی ذیل کے چند مشاہیر کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ ان کے ذکر کے بغیر بھوپال کی ادبی عظمت، بھوپال کی نیک نامی اور شہرت اور تاریخ ادب میں بھوپال کی نمایاں حیثیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم خود بھی شعر کہتی تھیں۔ آپ کے دو دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔ تخلص شیریں اور تاجور تھا۔ آپ کے بلند مرتبت شوہر نواب صدیق حسن المتخلص بہ توفیق کے علاوہ جمیل احمد جمیل سہسوانی۔ سید امجد علی اشہری داامجد۔ حکیم معشوق علی خاں جوہر، مولوی شکر اللہ سہیل۔ فرانسیسی نسل کے بھوپالی شعرا جیمز بیٹیسٹ نفیس۔ حکیم فرانسس فطرت۔ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) مرزا شاغل فخری، محمد عباس رفعت۔ خان محمد خاں شہیر۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی ذکا۔ مولانا اسلم جیراجپوری، مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی، مولوی احسن اللہ خاں۔ ثاقب بدایونی۔ امیر مینائیؔ (جو دو بار بھوپال تشریف لائے اور شاہجہاں بیگم نے اُنھیں باغ فرحت افزا میں مہمان رکھا) محمد ہادی رسوا۔ احمد علی شوق قدوائی۔ رشید احمد ارشد تھانوی۔ مولانا محمد حسین محوی لکھنوی۔ علامہ نیاز فتحپوری کلب احمد مانی جائسی۔

---

[۱] زیر ادارت سید محمد یوسف قیصر ۱۹۱۱ء [۲] زیر ادارت محمد امین زبیری ۱۹۱۵ء

مضطر خیرآبادی، قاضی ولی محمد، مفتی انوار الحق۔ مولوی محمد مہدی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ مولوی افتخار عالم مارہروی۔ مولوی عبدالرزاق۔ علامہ شبلی۔ محمد امین زبیری۔ سر راس مسعود۔ علامہ اقبال۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ جگر مرادآبادی۔ پروفیسر سید نواب علی (جو بھوپال میں مستقل طور پر کبھی نہیں رہے لیکن بھوپال سے خصوصی روابط کی بنا پر اکثر و بیشتر بھوپال تشریف لاکر قیام کرتے تھے) حفیظ جالندھری۔ کوثر چاندپوری۔ مولوی منظر احمد ادیبی اور جاں نثار اختر کے علاوہ اسی عرصہ میں خود ریاست بھوپال کے جن مشاہیر نے بیرونی مشاہیر کے دوش بدوش اردو زبان کی گراں مایہ خدمات انجام دے کر ہندوستان گیر شہرت حاصل کی یا جن کی ذاتِ گرامی سے بھوپال کی ادبی عظمت اور علم و فن میں اضافہ ہوا اُن میں سراج میر خاں سحر بھوپالی، امراؤ علی عیش (شاگرد داغ) منشی انوار علی انور بھوپالی (شاگرد داغ) عبدالشکور اخلاص (شاگرد امیر مینائی) حافظ سلیمان خاں خالص۔ سید محمد میاں شہید۔ محمد کریم ذکی وارثی۔ شاہ اسدالرحمٰن قدسی۔ منیرالدین منیر بھوپالی۔ میاں ارجمند محمد خاں۔ عبدالجلیل مائل نقوی۔ شریف محمد خاں فکری۔ سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ ممتاز احمد سہا مجددی۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ سید محمود اعظم فہمی بھوپالی۔ محمد اسمٰعیل رمزی ترمذی۔ منشی لچھمی نرائن افسر۔ شمبھو دیال سخن۔ گوبند پرشاد آفتاب۔ صالحہ خانم عاجز۔ نواب سلطان جہاں بیگم (جو ۴۰ سے زائد کتابوں کی مصنفہ تھیں) ہر ہائی نس نواب میمونہ سلطان معروف بہ شاہ بانو بیگم۔ علامہ میاں خالد۔ علامہ خلیل عرب۔ حامد سعید خاں حامد بھوپالی۔ باسط بھوپالی۔ شعری بھوپالی۔ ملا رموزی۔ حامد رضوی۔ ابو سعید بزمی۔ عبدالحلیم آرٹسٹ۔ قدوس صہبائی۔ شاغل فخری اور محمد احمد سبزواری وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے آخری فرماں روا نواب حمیداللہ خاں کے دورِ حکومت تک علم و ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔

اسی دور میں بھوپال کے شعراء کی تخلیقات بھوپال سے باہر کے مشہور رسائل میں بھی شائع ہونے لگیں۔ خود بھوپال سے کئی اخبارات و رسائل جاری ہوئے جن میں خصوصیت سے "الحجاب" (ایڈیٹر سید محمد یوسف قیصر) "ظل السلطان" (ایڈیٹر محمد امین زبیری۔ سید محمد یوسف قیصر) "نگار" (ایڈیٹر نیاز فتح پوری) "زرنگار" (ایڈیٹر منشی عبدالقدیر آزاد) "مالوہ ریویو" (ایڈیٹر سید محمد یوسف قیصر۔ کامدار عبدالمتین)۔ "محسن الملک" (ایڈیٹر حامد سعید خاں) "آفتاب نسواں" (ایڈیٹر سرور جہاں۔ انور جہاں) "ندیم" "منصور" (ایڈیٹر محمود الحسن صدیقی) "افکار" (ایڈیٹر صہبا لکھنوی۔ اے۔ آر۔ رشدی) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کے جن نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے بھوپال میں فکری انقلاب کی داغ بیل ڈالی اور خود کو منظم کر کے اقبال اور دوسرے معاصر شعراء کے مقصدی، تعمیری، اور اصلاحی رجحانات کو عام کیا اُن میں "سبعہ سیارہ" کے ارکین جو محمد حسین محوی لکھنوی (اصلاً بھوپالی) سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ ارشد تھانوی۔ حضور احمد حضور نعیمی۔ خورشید علی مہر دہلوی۔ عبدالحلیم صدیقی ذکا بھوپالی۔ معین الدین احسن دہلوی۔ سرور قادری بدایونی۔ عصمت اللہ بیگ دہلوی۔ (برادر مرزا فرحت اللہ بیگ) پر مشتمل تھے۔ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اسی ادبی انجمن نے سہا مجددی۔ محمود اعظم فہمی، اور محمد حسین محوی ایسے باکمال فن کار پیدا کیے اور شعر و ادب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات کو عام کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ ہندوستان کے مشہور رسائل، مثلاً "دکن ریویو" "الناظر" "پنجاب ریویو" "تنویر" "الشرق"، "ادیب"، "تمدن"، "العصر"، "تہذیبِ نسواں" وغیرہ میں جدید نسل کا کلام امتیازی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد "سبعہ سیارہ" کا شیرازہ بکھر گیا تو انھیں حضرات نے "دائرہ ادبیہ" کے نام سے ایک اور انجمن بنالی اور جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ادب و فن کی خدمت کا فریضہ جاری رکھا۔

۱۔ افسوس کہ ۱۹۷۷ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مشاعرے بھوپال کی ادبی و تہذیبی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ چنانچہ آل انڈیا مشاعرے بھوپال میں بھی ہونے لگے۔ اور طرحی مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسی سلسلے میں پہلی بار ہمیں اقبال سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔

"آئینہ مشاعرہ" یعنی مشاعرۂ بھوپال منعقدہ ۱۲ ارشعبان المعظم ۱۳۲۸ھ (مطابق) ۱۸ راگست ۱۹۱۰ء مرتبہ سرور قادری سچ پوچھیے تو وہ پہلی ادبی دستاویز ہے جسے ہم اقبال اور بھوپال کے ادبی و ذہنی رشتے کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تخلیق یا کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے اقبال کا بھوپال سے کسی عنوان ربط و تعلق ثابت کیا جا سکے۔ "آئینہ مشاعرہ" ۵۶ صفحات کا ایک مختصر سا انتخاب کلام ہے جس میں اُس عہد کے کئی باکمال اور بلند پایہ شعراء کی طرحی غزلیں جو غالب کی زمین میں ہیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے شائع ہوئی ہیں۔ انتخاب مشاعرہ کے پہلے صفحہ کا عکس حسبِ ذیل ہے۔

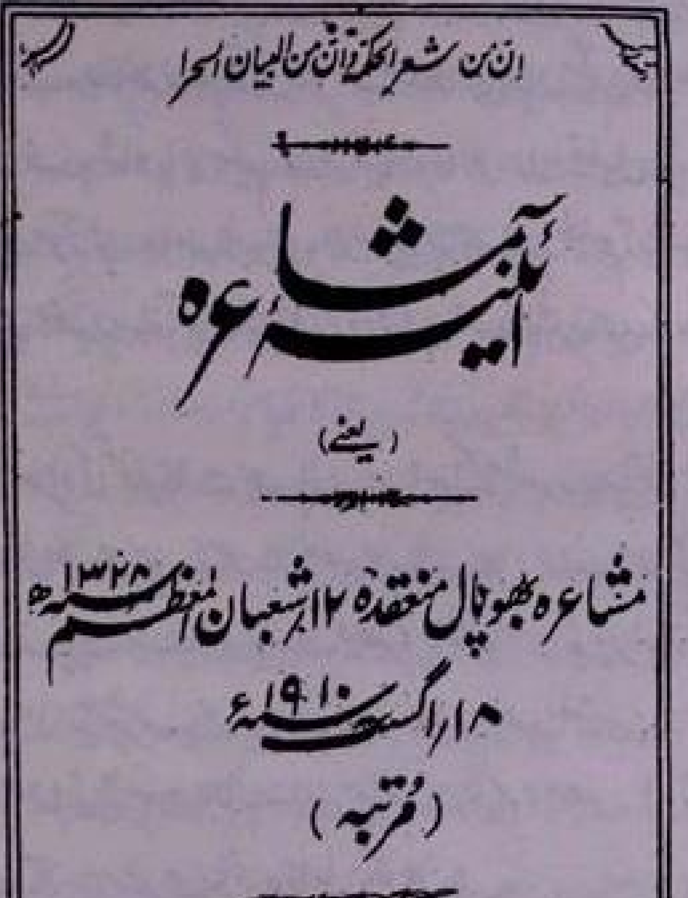
ان من الشعر الحکمۃ وان من البیان السحرا

آئینہ مشاعرہ

(یعنی)

مشاعرہ بھوپال منعقدہ ۱۲ ارشعبان المعظم ۱۳۲۸ھ
۱۸ راگست ۱۹۱۰ء

(مرتبہ)

سرور قادری

باہتمام منشی عبدالعزیز خان عزیزی پریس آگرہ میں چھپا

صفحہ ۲ پر بعنوان "نذر" جو عبارت درج ہے اُس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لکھا ہے:۔

"ــــــ یہ مجموعہ غزلیات جس میں ہندوستان کے مشہور اور مستند سخن نگاروں کے پاکیزہ اور نفیس خیالات شامل ہیں انتہائے جوشِ عقیدت مندی سے شاعرِ عرش آشیاں نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام یار جنگ بہادر اعلی اللہ مقامہ کے نام نامی و اسمِ گرامی پر نذر کیا جاتا ہے۔

محض اس غرض سے کہ اُس روحِ مقدس کو یہ معلوم کرکے مسرت ہو کہ اُس نے جن پودوں کو خونِ جگر سے سینچا تھا وہ آج بڑے تناور درخت ہو کر شاہراہِ علم و ادب کے مسافروں پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ محض اس غرض سے اُس پاک روح کو یہ امر موجب نشاط ہو کہ اُس نے جس خارزار کو ہموار اور صاف راستہ بنانے میں بے شمار مصائب اٹھائے ہیں اُس پر آج ہزاروں راہگیر اُس کے نام پر درود و تحیات بھیجتے ہوئے منزلِ مقصود کو پہنچ رہے ہیں۔ محض اس غرض سے کہ اُس خلد مکاں کے لیے یہ خبر باعث ابتہاج ہو کہ اُس کے بتلائے ہوئے راستہ پر آج سیکڑوں چل رہے ہیں اور ہزاروں کمرِ ہمت باندھے بیٹھے ہیں۔

درحقیقت میرزا غالب برد اللہ مضجعہ و نور اللہ مرقدہٗ ایک خضرِ طریق یا بالفاظ دیگر امت شعراء کے ایک مسلمہ لیڈر اور ایک برحق پیغمبر تھے جن کی حقیقی مدح سرائی میں ابدالآباد تک زبان و قلم دونوں قاصر رہیں گے۔

نیاز مند مع اپنے احباب کے اُس کے مشہدِ مقدس پر نہایت خلوص کے ساتھ گلہائے بوقلموں کا سحر طراز گلدستہ پیش کرتا ہے۔ خدا اُس کے مزارِ مطہر کو پھولوں سے بھرے۔ آمین

"سیکریٹری مشاعرہ"

صفحہ ۳ پر "تعارف" ہے جس کی عبارت یوں شروع ہوتی ہے :-

"بزمِ شعراء میں جن باکمال حضرات نے شرکت فرمائی یا اپنے لاجواب کلام سے سرفرازی کا موقع دیا اُن میں سے چند قابل الذکر حضرات کا مختصر حال اس طریق سے لکھا جاتا ہے کہ پبلک اُن کا کلام دیکھنے سے پہلے اُن سے تعارف کرے۔"

اس عبارت کے بعد حروف تہجی کے لحاظ سے جن شعراء کا تعارف کرایا گیا ہے اُن کی تعداد ۲۸ ہے۔ پہلا نام سید علی حسن صاحب احسن مارہروی کا ہے۔ اُس کے بعد امیر احمد صاحب امیر بدایونی، سید معین الدین حسن صاحب احسن، حکیم علی محسن خاں صاحب اکبر کے نام آتے ہیں اور پانچویں نمبر پر اقبال کا تعارف ہے جس کی عبارت یہ ہے :-

"اقبال — پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا صوبہ پنجاب کے قابلِ فخر انشا پردازوں میں (ہیں[1]) اور تعلیم یافتہ سوسائٹی کے مایۂ ناز (فرزند[2]) ہیں۔"

اقبال کے بعد منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی، سید مہدی حسن صاحب احسن، مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبر آبادی، حافظ سلیمان صاحب خالص، سید محمد عالم صاحب خنجر، سید امیر حسن صاحب دلیر، سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی، منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی، سید بادشاہ حسین صاحب رعنا، ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی، منشی چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی، راقم الدولہ سید ظہیر الدین خاں صاحب ظہیر دہلوی، مولوی مرزا ہادی عزیز لکھنوی، سید ابن علی صاحب عالی صفی پوری، بابو عطا محمد صاحب عطا، سید امداد علی صاحب عیش بھوپالی، سید محمد یوسف قیصر صاحب قیصر بھوپالی، حکیم سید مہدی حسن صاحب کمال لکھنوی، مفتی اکرام احمد صاحب لطف، سید کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی، مرزا محمد ہادی صاحب مرزا اور میر غلام بھیک نیرنگ کے اسمائے گرامی

---

[1]، [2] سہو کتابت ہے۔

مع تعارف جو زیادہ سے زیادہ سات سطروں پر اور کم سے کم دو سطروں پر مشتمل ہے، پیش کیے گئے ہیں۔ تعارف ص۳ سے شروع ہو کر ص۶ پر ختم ہوتا ہے۔ ص۷ پر "رودادِ مشاعرہ" کے عنوان سے اس مشاعرہ کی نوعیت، غرض و غایت، تفصیلات مقامی اور بیرونی شعراء کا شکریہ، انتخاب غزلیات اور ممبرانِ کمیٹی کا نام بہ نام تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ روداد ص۷ اور ص۸ پر مشتمل ہے اور اس اعتبار سے اہم اور قابلِ مطالعہ ہے کہ اس میں آج سے باسٹھ ۶۲ سال پہلے کی ادبی محفلوں اور بزم آرائیوں کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں بھوپال کے اس عہد کی سماجی، ثقافتی اور مجلسی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے اور وہاں کی وہ چند علمی و ادبی شخصیتیں بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں زبان و ادب کے ارتقا میں نمایاں حصہ لیا۔ "روئداد مشاعرہ" کی تفصیلات یہ ہیں:—

"۱۸ اگست ۱۹۱۰ء شب پنجشنبہ کو دس بجے کے وقت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب[1] کے مکان کے ایک بڑے ہال میں یہ مشاعرہ ہوا۔ نو بجے شرکاء مشاعرہ کی آمد شروع ہوئی۔ معززین شہر و عمائدین ملک و شائقین و سامعین سے دس بجے تک ہزار آٹھ سو سے زیادہ جمع ہو گئے۔ دس بج کے ۴۳ منٹ پر شمع کو گردش دی گئی۔ باہر کی آئی ہوئی غزلیں سنانے کے واسطے نیاز مند سکریٹری اور سید معین الدین حسن صاحب دہلوی تجویز کیے گئے۔ جنھوں نے نہایت مستعدی سے اپنے کام کو انجام دیا۔

کثرت سے لوگوں کا خیال تھا اس زمین میں غزل لکھنا بالکل عبث ہے۔ اساتذہ سلف خصوص مرزا غالب کی ہم لڑائی کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے مگر جیسا کہ غزلوں سے ثابت ہوگا شعراء نے اپنی زورِ طبع سے وہ گُل کترے کہ حاضرین جھوم جھوم اٹھے اور یہ زمین[2] گلستاں بن گئی۔

باہر کی آئی ہوئی غزلیں نہایت دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ سُنی گئیں اور ہر ہر شعر پر خوب ہی داد دی گئی۔ اور خلاف اُمید اس مشاعرہ کو کامیابی ہوئی۔ جن بزرگوں کے نام سلسلۂ انٹروڈکشن میں ملاحظہ فرمائے گئے ہیں ان کی غزلیں چوٹی کی غزلیں ہیں جنھوں نے مشاعرہ کو چار چاند لگائے اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں حضرات کی بدولت محفلِ سخن چمک اٹھی اور بقول بعض شرفاء بھوپال یہ مشاعرہ اپنے رنگ ڈھنگ کا پہلا مشاعرہ تھا۔ ساڑھے پانچ بجے صبح یہ محفل برخاست ہوئی۔

چونکہ بہت سے حضرات کی غزلیں باقی رہ گئی تھیں اور یہ امر قرین انصاف نہ تھا کہ اُن حضرات کے کلام کو جنھوں نے دلوں غور و فکر کرکے آج کے واسطے کانی ذخیرہ فراہم کیا تھا، نہ سنا جائے اس لیے مشاعرے کے تیسرے دن پھر ایک مشاعرہ کیا گیا جس میں ان شاعروں کی گُل فشانی کے علاوہ کچھ کلام غیر طرحی بھی شامل تھا اور دس بجے شام سے صبح کے دس بجے تک نہایت دلچسپی سے گذری اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ محفل بہ نسبت اور مشاعروں بھوپال کے نہایت تہذیب و شائستگی سے رہی۔

---

[1] مولوی سید محمد اسمٰعیل دلسیوی، نواب سکندر بیگم کے زمانے میں وارد بھوپال ہوئے اور ریاستی سرکاری میں ملازم ہو گئے۔ عہد شاہجہانی میں تحصیل دار بنا دیے گئے۔ علم و ادب سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ آپ کی مشہور تصانیف میں "تاریخ طلسم بکاؤلی" اور "تاریخ بھوپال" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جو نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں شائع ہوئیں۔ آپ کے دولت کدہ پر اکثر ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔

[2] یہ طرحی مشاعرہ غالب کی مشہور غزل کے اتباع میں ہوا تھا جس کا مصرعہ ہے۔ ع قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔

منشی محمود علی صاحب، شہزادہ سلطان عالم صاحب، منشی احمد رضا صاحب ہیڈ کلرک، منشی عبدالحئی صاحب رجسٹرار، سید حسن صاحب ستید، سید معین الدین حسن صاحب دھلوی اسسٹنٹ پرائیویٹ سکریٹری فرماں روائے بھوپال، جناب ارشد تھانوی اسسٹنٹ کورٹ انسپکٹر دربار بھوپال، جناب قیصر صاحب ایڈیٹر الحجاب و مالوہ ریویو کے حسنِ انتظام سے بزمِ شعر بہت ہی پُررونق رہی۔ میں ان حضرات کی کارگذاری کا مشکور ہوں۔

سخت ناسپاسی ہوگی اگر میں ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے مہربانی فرماکر اور اپنے بہت سے کام ہرج کرکے محض اس مشاعرہ کے واسطے غزلیں لکھیں اور روانہ کیں۔

ڈاکٹر، پروفیسر اقبال صاحب۔ میر نیرنگ صاحب۔ جناب ریاض صاحب۔ جناب آبر صاحب لکھنوی جناب احسن صاحب مارہروی حضرت ظہیر صاحب دہلوی مدظلہٗ۔ جناب کمال صاحب لکھنوی۔ جناب امیر صاحب بدایونی۔ جناب عطا صاحب بدایونی۔ وغیرہ وغیرہ اور جس قدر حضرات نے ازراہِ نوازش وہمدردی مجھے مرہونِ منت بنایا۔ جب تک میرے منہ میں زبان ہے میں ان کے اس احسان اور منت پذیری میں ہمیشہ ہمیشہ رطب اللساں رہوں گا اور مجھے پورے طور پر یقین ہے کہ اگر پھر کبھی یارانِ ہم مشرب کی ترغیب سے اس قسم کی تکلیف دہی کا موقع ہاتھ آیا تو یہ بزرگوار مجھے پھر ادائے شکر میں ترانہ سنج پائیں گے اور اس حقیر بے بضاعت کو دل سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

اپنی اس تحریر کو ختم کرنے سے پہلے مجھے ممبران کمیٹی انتخاب غزلیات، یعنی ابن علی صاحب عالی و جناب سید حسن صاحب ستید و جناب سید معین الدین حسن صاحب احسن دھلوی و جناب سید بادشاہ صاحب رعنا لکھنوی و جناب حافظ سلیمان صاحب خالق و جناب منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی و جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر ایڈیٹر "الحجاب و مالوہ ریویو" کا سپاس گذار ہونا ضروری ہے جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے غزلوں کا انتخاب کرکے اس گلدستہ کو ایسا گلدستہ بنادیا کہ جس کے مضامین کی مہک اہلِ سخن کے دماغوں کو ہمیشہ معطر کرتی رہے گی۔" آپ کا مرہونِ منت

عبدالصمد سرور قادری بدایونی

اس گلدستۂ انتخاب کا آغاز صفحہ ۱۲ سے ہوتا ہے۔ لوح پر بسم اللہ الرحمن الرحیم درج ہے اس کے نیچے خوبصورت بیل بوٹوں میں "آئینہ مشاعرہ" درج ہے۔ روئداد مشاعرہ صفحہ ۸ پر ختم ہوتی ہے اور انتخاب صفحہ ۱۲ سے شروع ہوتا ہے۔ درمیانی صفحوں یعنی ۹ تا ۱۱ پر سید محمد یوسف قیصر بھوپالی کا مضمون بعنوان "شاعری" چھپا ہے جس کی ذیلی سُرخیاں یہ ہیں:-

شاعری کی ابتدا۔ ہندی شاعری۔ عربی شاعری۔ انگریزی شاعری۔ اُردو شاعری۔ آغاز۔ گذشتہ دور۔ موجودہ دور۔ قدیم وجدید شاعری۔ ایک مفید مشورہ۔

اس مضمون کے فوراً بعد شعراء کی غزلیات حروف تہجی کے مطابق یوں شروع ہوتی ہیں۔

احسن۔ جناب سید علی احسن صاحب احسن مارہروی فصیح الملک

اور یہ التزام آخر تک برقرار رہا ہے۔ پہلے تخلص۔ پھر پورا نام۔ بعض حضرات کے نام کے آگے تلمیذ، بعض کے آگے تعارفی عبارت اور بعض کے ساتھ "مقیم بھوپال" لکھا گیا ہے۔ گلدستہ میں بحیثیت مجموعی ۶۸ غزلیات ہیں۔ صفحہ ۲۳ پر اقبال کی طرحی غزل اس طرح درج ہے:۔

اقبال ــــ جناب ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔بیرسٹرایٹ لا

حلقۂ زنجیر کا ہر جوہر پنہاں نکلا　　آئینہ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا
ہم گراں جان کے لائے تھے عدم سے بلبل　　باغِ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا
وسعت افزائیِ آشفتگیٔ شوق نہ پوچھ　　خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیاباں نکلا

غالب کی زمین میں اقبال کے یہ تین شعر اُن کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں تھے۔ حالانکہ اُن کی وفات کے بعد ان کا کافی منتشر اور متفرق کلام اُن کے تین مجموعوں "رخت سفر" "باقیات اقبال" (پہلی اشاعت واضافہ شدہ اشاعت ثانی) اور "سرودِ رفتہ" میں شائع ہوگیا۔ ان مجموعوں میں بہت سا کلام مشترک بھی ہے۔ لیکن اقبال کے لائق بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے جو مزید غیر مطبوعہ اور متفرق کلام بڑی جستجو اور سعی بلیغ کے بعد جمع کیا اُسے اُنھوں نے فقیر وحید الدین صاحب کو اشاعت کے لیے دیدیا۔ جو روزگار فقیر جلد دوم (سن اشاعت ۱۹۶۴) میں "کلام اقبال" کے عنوان سے (صفحہ ۲۱۵ تا ۳۹۵) شائع ہوا ہے۔ اسی کتاب میں یہ تین اشعار بھی صفحہ ۳۰۹ پر زیر عنوان "برائے مشاعرہ بھوپال" شامل ہیں۔

اقبال کے بھوپال سے ذہنی ربط وتعلق کا آغاز جیساکہ "آئینہ مشاعرہ" سے ظاہر ہے، سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوا جسے ہم بلاخوفِ تردید بھوپال سے ربط وتعارف کی پہلی کڑی قرار دے سکتے ہیں۔

کچھ مدت کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ ریاست کے ایما پر بھوپال سے رسالہ "ظل السلطان" سنہ ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تو مولوی محمد امین زبیری اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ قومی، اصلاحی، اخلاقی اور خواتین کے مسائل پر مضامین شائع کرتا تھا۔ چنانچہ اقبال نامہ میں اقبال کا ایک خط شائع ہوا ہے جو محمد امین زبیری ایڈیٹر "ظل السلطان" بھوپال کے نام ہے۔ خط کا متن یہ ہے:۔

"لاہور ــــ ۲۹ راپریل سنہ ۱۹۱۷ء

مخدومی ــ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ میری رائے میں اس بحث پر سب سے بہتر کتاب قرآن کریم ہے۔ تدبر شرط ہے۔ اس میں تمام باتیں موجود ہیں بلکہ
کے تمام مسائل بھی اس میں موجود ہیں۔ زمانۂ حال کی سفرجٹ[1] عورتوں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک کتاب　　میری نظر سے گذری ہے کسی عورت کی لکھی ہوئی ہے مگر افسوس ہے کہ مصنف کا نام ذہن میں محفوظ نہیں۔ جان سٹورٹ مل نے بھی

---

[1] مراد ہے حقِ رائے دہی کی خواستگار خاتون۔

اس پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔" مخلص محمد اقبال[1]

یہ خط اقبال اور بھوپال کے ربط و تعلق کی دوسری کڑی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بھوپال کی سرکردہ شخصیتیں بھی اقبال کی علمیت اور عظمت فن کی قائل تھیں اور اُن سے استفادہ کرنے میں فخر و عزت محسوس کرتی تھیں جیسا کہ اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے بھوپال کی علمی و ادبی شخصیتوں سے قلمی ربط و تعلق کے دو دستاویزی ثبوت مزید دستیاب ہوئے۔ ان میں پہلی خاتون ارشد (بیگم مولانا ارشد تھانوی) ہیں اور دوسرے مولانا شاہ اسد الرحمٰن قدسی۔

خاتون ارشد۔ اپنے نامور شوہر کے دوش بدوش بھوپال میں رہ کر اصلاحی اور تعمیری مضامین لکھتی تھیں بہ ۱۹۲۳ء میں آپ نے رسالہ "بانو" بھی جاری کیا جو خواتین کے محبوب اور پسندیدہ رسالہ کی حیثیت سے عرصہ تک جاری رہا۔ ان دنوں آپ کراچی میں ہیں۔[2] آپ بھی اقبال کی گرویدہ و شیدا تھیں چنانچہ ایک ملاقات کے دوران آپ نے بتایا کہ غالباً ۱۹۱۸ء میں جب علامہ اقبال کا "جوابِ شکوہ" شائع ہو چکا تھا تو اُس کے ایک بند پر میں نے اعتراض کرتے ہوئے علامہ کو توجہ دلائی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب علامہ نے نہ صرف میرے خط کا جواب عنایت فرمایا بلکہ زیرِ بحث بند میں تبدیلی بھی کر دی۔ اس واقعہ سے میرے دل میں علامہ کی عقیدت و عظمت دوچند ہو گئی۔ اس واقعہ کو انھوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان "شاعرِ ملت" میں بھی لکھا ہے جو کیتا امر دہوی کی مرتبہ کتاب "اقبال۔ خواتین کی نظر میں" شامل ہے۔ خاتون ارشد لکھتی ہیں:۔

"جب جوابِ شکوہ ابتداً اخبارات و رسائل میں شائع ہوا تو اس کا ایک بند یہ تھا ؎

قیس منت کشِ تنہائیٔ صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے جنگل میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلیٰ نہ رہے
شوق تحریر مضامیں میں کھُلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

میں نے اس بند کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب کو نہایت مؤدبانہ خط لکھا کہ جناب "والا رُخِ لیلیٰ" کا بے حجاب ہونا یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن اس کا انشا پردازی میں حصہ لینا۔ مضمون نگاری کرنا بھی کیا آپ جائز نہیں رکھتے۔ اگر عورت کے تحریرِ مضامین کو آپ بے حجابی تصور کرتے ہیں (تو) عہدِ رسالت کی ان خواتین کے بارے میں کیا رائے ہے جن سے آئمۂ کرام نے حدیثوں کا درس حاصل کیا۔ اور اسلام کی بہت سی مقدس مستورات ایسی گذری ہیں کہ جنھوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ (کچھ) اور غلط یا صحیح استدلال پیش کیے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ بھی نہ کریں گے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی اخلاق آمیز مختصر جواب بھیجا جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس بند کے آخری شعر کو تبدیل کر دیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ تہذیب اور انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔

چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "بانگِ درا" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں تو اس میں

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۵۴
[2] افسوس کہ ۱۹۷۸ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

یہ آخری شعر نکال کر بجائے اس کے دوسرا شعر درج کر دیا گیا تھا اب مطبوعہ صورت میں کہیں بھی وہ سابقہ شعر ؎

شوقِ تحریر مضامیں میں کھُلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

موجود نہیں ہے[۱]۔"

"بانگِ درا[۲]" میں یہ شعر اقبال نے ردّوبدل کے بعد اس طرح کر دیا ہے ؎

گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو[۳]

اس ایک واقعہ سے جہاں ایک طرف اقبال کی وسعتِ نظر، کشادہ قلبی، اپنے سے چھوٹوں کے اعتراضات کو ٹھنڈے دل سے سننے کے بعد خود اصلاحی کی اعلیٰ روایت کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ بھوپال کے اہلِ علم اقبال سے قلبی ربط و تعلق رکھتے تھے اور ان کی شاعری، اُن کے فلسفہ اور ان کے افکار و خیالات سے بھرپور استفادہ بھی کر رہے تھے۔

مولانا شاہ اسد الرحمٰن قدسی بھوپالی — اسی دور کے ایک بزرگ، صوفیٔ پاک باز اور عالم باعمل ہیں جن سے اقبال کی خط و کتابت رہی ہے۔ قدسی صاحب کی ساری عمر عبادت و ریاضت میں بسر ہوئی ہے۔ نظم و نثر دونوں پر قوتِ تامہ آپ کو حاصل ہے۔ آپ کے ارادت مندوں کا وسیع حلقہ بھوپال میں آج بھی موجود ہے۔ آزادی کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور ان دنوں بھون (ضلع جہلم) میں آپ کا آستانہ فیوض و برکات کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ شاعری کے دو مجموعے "آیاتِ قدسی" اور "نغمات" کے علاوہ سلوک و طریقت پر آپ کی سات کتابیں "الحبیب" (۱۹۱۵ء) "ستردین نامہ" (۱۹۱۵ء) "نامۂ قدسی"۔ "اطمینان قلب"۔ "کشکول قلندری"۔ "الکلام" اور "حفظ البحر" لاہور۔ لکھنؤ اور دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں جب میں نے آپ سے رابطہ قایم کیا تو آپ نے از رہِ شفقت اقبال کا ایک مختصر سا کارڈ جو ہجرت کے دوران محفوظ رہ گیا تھا مجھے عطا فرما دیا جس کا عکس پیشِ خدمت ہے:-

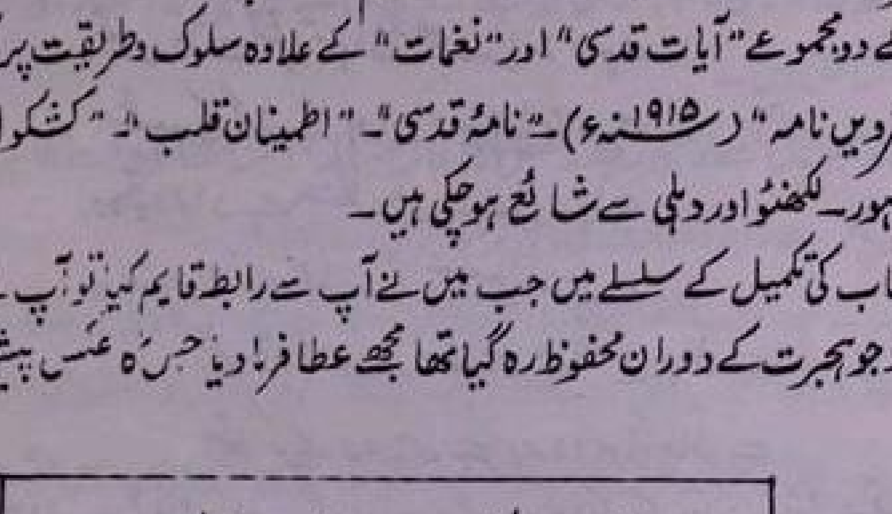
بھوپال گوہر محل
جناب قدسی سلمہ خط کریں

۱؎ اقبال خواتین کی نظر میں۔ صفحہ ۸۰-۸۱۔

۲؎ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

۳؎ بانگ درا۔ صفحہ ۲۲۸۔

مکرم بندہ السلام علیکم

گل حسن شاہ صاحب قریباً ایک سال ہوا رحلت فرما گئے

محمد اقبال

۲۴/ستمبر ۲۰ء لاہور

اس غیر مطبوعہ تحریر سے جہاں اقبال کے قدسی صاحب سے ربط و تعلق کا علم ہوتا ہے وہیں اُن کے صوفیانہ مزاج اور مسلک قلندری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قدسی صاحب نے اپنی ذاتی یادداشتوں سے اقبال کے متعلق چند نہایت دلچسپ اور اچھوتے واقعات بھی ارسال فرما دیے جن کا اُردو دنیا کو شاید ہی علم ہو۔ یہ تمام واقعات آیندہ صفحات میں شامل ہیں۔

قدسی صاحب کے پاس اقبال کے بے شمار خطوط تھے جو ہجرت کے دوران ضائع ہو گئے۔ صرف یہی ایک خط جس کا عکس اوپر پیش کیا گیا ہے ——— اتفاق سے محفوظ رہ گیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد ۱۹۲۷ء میں اقبال نے میر سید غلام بھیک نیرنگ کے نام اپنے ایک مکتوب میں جو کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنے کے بارے میں اُنھیں لکھا ہے۔ اس میں بھوپال اور روائے بھوپال کا تذکرہ ملتا ہے جس سے ان کے تعلق خاطر کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"لاہور ——— ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء

ڈیر میر صاحب ——— السلام علیکم

. . . . اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی تو والیٔ بھوپال سے مدد کی التجا کرنا بہتر ہوگا۔

——————— محمد اقبال[۲]"

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دیگر علمی و ادبی مرکزوں کی طرح ریاست بھوپال بھی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک

---

[۱] اقبال کو حضرت گل حسن شاہ قلندرؒ سے دلی عقیدت تھی۔ آپ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے خلیفہ و جانشین اور بڑے عارفِ کامل بزرگ تھے۔ "تذکرۂ غوثیہ" آپ کی مشہور و مقبول تالیف ہے۔

[۲] اقبال نامہ، جلد اول، صفحہ ۲۰۹

ایک وسیع مرکز بن چکی تھی۔ یہ اگرچہ حیدر آباد کے بعد دوسری بڑی اسلامی ریاست تھی لیکن ریاست کے حکمرانوں کی علم دوستی، ادب نوازی اور خود حکمرانوں کے علم و ادب سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کے سبب اس کا ادبی مرتبہ کافی بلند اور وقیع تھا اور یہ مرتبہ دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں اس حد تک قابلِ قدر تھا کہ اقبال تک اس کے حکمراں سے "مدد کی التجا کرنا" مناسب سمجھتے تھے جیسا کہ اقتباس سے ظاہر ہے۔

اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ ریاست بھوپال نے ہمیشہ برصغیر کی مایۂ ناز شخصیتوں کی ہر دور میں قدر دانی اور حوصلہ افزائی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور وقت پڑنے پر فراخ حوصلگی سے اہلِ علم کی مالی اعانت بھی کی۔ چنانچہ بھوپال سے اقبال کی ذہنی وابستگی کے یہی رشتے آگے چل کر قریبی تعلق میں تبدیل ہو گئے اور انھیں نواب حمید اللہ خاں کی ذاتی دوستی اور قربت کا شرف حاصل ہو گیا۔

اسی سلسلے میں" اقبال کے چار مطبوعہ خطوط کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو اقبال نے قاضی تلمذ حسین کے نام تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک خط میں واضح طور پر اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی اہلِ علم کی قدردانی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ایک خط انھوں نے بھوپال کے قیام کے دوران لکھا ہے۔

یہ چار خطوط جو اب تک غیر مطبوعہ تھے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے قاضی تلمذ حسین کے ایک عزیز محمد حامد علی سے حاصل کر کے نگار۔ رام پور میں شائع کیے ہیں۔ قاضی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے لکھا ہے:۔

> "حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرِ فہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی لیکن انھوں نے جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اُس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے۔ اس لیے اُنھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دل دادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اُنھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔"

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں۔ لسان العصر، ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کی ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں[1]۔"

---

[1] نگار۔ رامپور۔ اپریل ١٩٦٣ء۔ صفحہ ٢٩۔

(۱)

اب ان خطوط کا متن ملاحظہ ہو:-

"لاہور — ۳ر جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من — تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے - افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں - گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے -

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب[1] کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہو گی - ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے - اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے -

بھاولپور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدرداں ضرور ہیں - آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں - میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو - افسوس کہ ان کے گرد وپیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوش گوار تبدیلی اُن کے مصاحبین میں ہو جائے - اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو -

اس کے علاوہ آپ سر راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں - اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہلِ علم کے قدرداں ہیں - ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے - سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے -

والسلام — محمد اقبال - لاہور"[2]

(۲)

"جناب من — السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے - آپ اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے - آٹھ، دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں - ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہو گی - یورپ جانے کا قصد نہیں ہے -

محمد اقبال — لاہور

۱۷ر جنوری ۱۹۳۵ء"[3]

(۳)

"بھوپال — ۸ر مارچ ۳۶ء

جناب قاضی صاحب — السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں - اس وقت بھاولپور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے - موقع موزوں نہیں تاہم اگر مرآۃ المثنوی

---

[1] مراد ہے مرآۃ المثنوی - (ڈاکٹر محمود الٰہی)

[2,3] نگار - رامپور - اپریل ۱۹۶۳ء - صفحہ ۲۹ - ۳۰

وہاں بھیجنا چاہیں تو عرض داشت کرنل مقبول حسن قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے اُن کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرض داشت کے ہمراہ بھیجیے۔

والسلام

محمد اقبال [1]"

(۴)

ذیل کا خط اگرچہ اس کتاب سے متعلق نہیں لیکن ایک غیر مطبوعہ خط کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ سے اقبال کی عام صحت اور مولانا رومیؒ سے متعلق ایک غلط اطلاع کی تردید کا ہمیں علم ہوتا ہے اس لیے اس کی شمولیت ضروری سمجھی گئی۔ لکھتے ہیں:۔

"جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میری صحت عامہ تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ر جولائی ۱۹۳۶ء [2]"

---

[1] ماہنامہ نگار۔ رام پور۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۳۰۔

اقبال اور نواب حمید اللہ خاں

نواب سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کی چوتھی اور آخری خاتون حکمراں تھیں۔ اُن کے تین صاحب زادے تھے۔ نواب نصر اللہ خاں ولی عہد ریاست، نواب کرنل حافظ عبید اللہ خاں اور نواب حمید اللہ خاں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دو بیٹوں کی موجودگی میں نواب حمید اللہ خاں ریاست کے حکمراں ہو سکیں گے چنانچہ انھوں نے حمید اللہ خاں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ جہاں سے انھوں نے بی۔ اے پاس کر لیا اور قانون میں داخلہ لیا ـــ لیکن بوجوہ تکمیل نہ کر سکے۔ بھوپال واپس آنے کے بعد اُن کی والدہ نے یہ کوشش کی کہ وہ ایک اچھے سیاسی لیڈر، مدبر اور با اثر شخصیت کی حیثیت سے ہندوستان میں اپنی جگہ بنا لیں۔ چنانچہ بھوپال آنے والی سیاسی شخصیتوں سے انھیں متعارف کرایا گیا ـــ علمی مجالس کی صدارت انھیں سونپی گئی اور ان گنت تقریبات میں انھیں صدارتی خطبات پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں جب رابندر ناتھ ٹیگور بھوپال آئے اور میوزیم ہال میں ایک تقریر کی تو اس جلسہ کے صدر بھی نواب حمید اللہ خاں تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب خواجہ کمال الدین جولندن میں تبلیغ کا کام کرتے تھے بھوپال آئے اور جلسۂ عام سے خطاب کیا تو اس کی صدارت بھی حمید اللہ خاں نے فرمائی[1]

ـــ جس زمانہ میں اُن کی والدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی چانسلر تھیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم بھی شروع کی، متعدد شہروں کا دورہ کیا اور مختلف رئیسوں سے ملاقات کی جن میں نظام حیدر آباد بھی شامل تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحقیقات کے سلسلے میں جو کمیٹی بنی تھی اس میں بھی حمید اللہ خاں شامل تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھوپال آکر شاہی مہمان ہوتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی مولانا حسرت موہانی۔ سر آغا خاں۔ مسز سروجنی نائیڈو اور دیگر سیاسی لیڈروں کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا جن سے حمید اللہ خاں نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ذاتی روابط بھی پیدا کر لیے۔ علماء و فضلا میں علامہ شبلی، مولوی عبد الحق، خواجہ حسن نظامی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، ـــ اور عطیہ فیضی کا بھی بھوپال سے ربط و تعلق تھا۔ حمید اللہ خاں کو ان تمام شخصیتوں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے خصوصی مواقع حاصل تھے۔

---

[1] نواب حمید اللہ خاں کے لکچر اور خطباتِ صدارت کتابی صورت میں بھوپال کے سرکاری مطبع نے شائع کیے تھے جو اب نایاب ہیں۔

اس کے علاوہ حمید اللہ خاں بہت اچھے اسپورٹسمین بھی تھے۔ یوں تو انھیں ہاکی، کرکٹ اور ٹینس سے بھی دلچسپی تھی لیکن وہ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ جب ڈیوک آف ونڈسر نے پرنس آف ویلز کی حیثیت سے برطانوی ہند کا دورہ کیا تو بھوپال میں حمید اللہ خاں کی ٹیم ہی سے پولو کا میچ کھیلا۔ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سید وزیر علی کافی عرصہ بھوپال کی فوج سے وابستہ رہے۔ سابق نواب پٹودی[1] بھی برابر بھوپال آتے رہتے تھے۔ غرض کہ حمید اللہ خاں سیاسی، علمی، ادبی میدانوں اور کھلاڑیوں کے حلقوں میں یکساں مقبول ہو چکے تھے اور جب یکے بعد دیگرے ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا انتقال ہو گیا تو نواب سلطان جہاں بیگم ۱۹۲۶ء میں اپنے لائق فرزند نواب حمید اللہ خاں کے حق میں دست بردار ہو گئیں اور زمام حکومت ان کے سپرد کر دی۔ نواب سلطان جہاں بیگم دستبرداری کے بعد تصنیف و تالیف اور یاد الٰہی میں مصروف ہو گئیں اور بالآخر ۱۹۳۰ء میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

نواب محمد حمید اللہ خاں عنانِ حکومت سنبھالتے ہی برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی سے حصہ لینے لگے۔ پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر اور دو مرتبہ ایوانِ رؤسائے ہند کے چانسلر منتخب ہوئے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اب ان کے تعلقات کچھ اور وسیع ہو گئے تھے۔ قائد اعظم۔ گاندھی جی۔ چودھری خلیق الزماں۔ مولانا حسرت موہانی۔ سر فیروز خاں نون۔ اور دوسرے اکابر بھوپال آکر اُن سے ملاقات کرتے تھے۔ کانگرس اور خلافت تحریک کے کئی ممتاز حضرات نواب صاحب کے ایما پر ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی کے داماد شعیب قریشی، نواب حمید اللہ خاں کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ شعیب قریشی نے ابتداً گاندھی جی کے رفیق اور "ینگ انڈیا" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ کچھ عرصہ پنڈت نہرو کے ساتھ انڈین نیشنل کانگرس کے سکریٹری رہے۔ بعد میں تحریک خلافت سے وابستہ ہو گئے اور خلافت کے طبی وفد میں شامل ہو کر ترکی کا دورہ کیا۔ آپ کے علاوہ مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر انصاری (جو نواب صاحب کے طبی مشیر اور اکثر و بیشتر بھوپال آتے تھے) کے اسسٹنٹ ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن اور حسن محمد حیات بھی بھوپال آگئے اور ریاست بھوپال کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن جو عام طور پر ڈاکٹر رحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں علامہ اقبال کے نگراں معالج مقرر ہوئے جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ نواب حمید اللہ خاں نہایت روشن خیال، عالی دماغ، بالغ نظر اور صاحب بصیرت حکمراں تھے۔ انھوں نے اپنے اسلاف کی اعلیٰ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں آگے بھی بڑھایا۔ انھوں نے ریاست کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا۔ بلاشبہ اُن کا دورِ حکومت ریاست بھوپال کے آخری زمانروا کی حیثیت سے ایک یادگار دور ہے جو ۱۹۲۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۹ء پر ختم ہو گیا جب برصغیر کی تقسیم کے بعد ریاست بھوپال کا وجود ختم ہوا اور اسے ہند یونین میں ضم ہونا پڑا۔ لیکن ۲۲ سال کا یہ زمانہ اہم سیاسی، سماجی، تعلیمی، ادبی اور فکری انقلابات کا زمانہ ہے جس کے چند عوامل کو مستقبل کا مؤرخ کبھی نظرانداز نہیں کرے گا۔ مثلاً برصغیر میں برطانوی اقتدار کے خلاف آزادی کی کشمکش، کانگرس اور مسلم لیگ کی عوامی حیثیت اور سیاسی سرگرمیاں، ترقی پسند تحریک کا آغاز، ادب اور شاعری میں انقلابی رجحانات اور ان کے اثرات، مسلمانوں کی تنظیم نو کے لیے اقبال کی مفکرانہ رہنمائی، اور نواب حمید اللہ خاں کی مسلم معاشرہ میں عزت و تکریم اور ان کی رہنمائی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد،

---

[1] کچھ عرصہ بعد آپ نواب حمید اللہ خاں کے داماد بھی بن گئے۔

برصغیر کے سماجی، اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی وغیرہ۔

اقبال بھی نواب حمیداللہ خاں کے مداحوں میں شامل تھے اور انھیں یہ علم تھا کہ نواب صاحب اپنی گوناگوں خصوصیات وصفات کی بنا پر نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ اقبال اگرچہ خود عملی سیاست میں نمایاں حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن حقیقتاً ان کی تمام تر ساعی مسلمانوں کی تنظیم اور اتحاد ملت کے لیے وقف تھیں اور وہ بساط بھر اپنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

نواب حمیداللہ خاں سے اقبال کے ذاتی روابط کا آغاز کب ہوا۔ اس کا ۱۹۳۱ء سے پہلے ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بارے میں خطوط اور آرا ضرور ملتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ والیٔ ریاست کے فکروتدبر کے معترف اور دیگر والیانِ ریاست کے مقابلہ میں نواب حمیداللہ خاں کی سیاسی بصیرت، بالغ نظری اور سوجھ بوجھ کے قایل تھے۔ چنانچہ نواب صاحب سے اقبال کی پہلی ملاقات کا دستاویزی ثبوت بھی ہمیں اقبال کے ایک خط سے ہی ملتا ہے جو، رمئی ۱۹۳۱ء کو انھوں نے نذیر نیازی کو لکھا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ ۱۹۳۱ء میں ہی اقبال کا نواب صاحب سے پہلی بار ربط وتعلق قایم ہوا درست نہیں۔ کیونکہ ۱۹۳۱ء کی مشاورتی ملاقات تو دراصل گول میز کانفرنس کے سلسلے کی ایک کڑی تھی جس کے پس منظر میں تحریک آزادی بھی تھی ــــ کانگرس کی مستحکم تنظیم بھی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی بھی ــ مسلمانوں کے فکری اتحاد کے سلسلے میں اقبال کے واضح نظریات، خطبۂ الہٰ آباد اور نواب بھوپال کی سیاسی بصیرت وہ عوامل تھے جنھوں نے اُس عہد کی ان دو عظیم شخصیتوں کو ذہنی اور فکری طور پر ایک دوسرے سے قریب اور وابستہ کردیا تھا ــــ اور یہ قربت ووابستگی یقیناً ۱۹۳۱ء سے بہت پہلے کی ہے جس کے نتیجہ میں اقبال نے پہلی بار بھوپال جاکر نواب صاحب سے بالمشافہ ملاقات اور مشاورت کو ضروری سمجھا۔

اقبال نے نذیر نیازی کو جو خط لکھا ہے اُس کا اقتباس اور پس منظر اس استدلال کو مزید تقویت دیتا ہے۔ لکھتے ہیں :ــــ

"لاہور ــــ ، رمئی ۱۹۳۱ء

ڈیر نیازی صاحب ــــ السلام علیکم

میں آپ کو آج خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا خط پہنچا۔ آپ کے بھائی کی علالت کا افسوس ہے۔ خدا تعالیٰ اُسے صحت مرحمت فرمائے۔ کتاب[1] کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے دُرست ہے۔ میں اُس سے اتفاق کرتا ہوں۔ غالباً میں نے بھی آپ کو اس سے پہلے یہی لکھا تھا کہ کتابت، طباعت، کاغذ، کمیشن وغیرہ منہا کر کے باقی روپیہ ادا کردیا جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے ــــ (۱) کہ پہلے سے یہ بتایا جائے کہ خرچ کُل کس قدر ہوگا؟ (۲) کیا میں نے جو کمیشن لکھی تھی وہ اُنھیں منظور ہے؟ (۳) کتاب کے تیار ہونے پر روپیہ پیشگی ادا کرنا ہوگا۔ ان تمام امور سے آگاہی کی جائے۔ نیز یہ بھی لکھیں کہ جامعہ کی طرف سے یہ معاہدہ کون کرے گا تاکہ یہ تمام خط[2] اُنھیں صاحب سے ہو۔

۱ــ اقبال کے خطبات کا ترجمہ جامعہ ملیہ شائع کرنا چاہتی تھی۔ یہ استصواب اسی سلسلے میں کیا گیا ہے۔

۲ــ "کتابت" کا لفظ سہواً رہ گیا ہے۔ (نذیر نیازی)

میں پرسوں بھوپال جارہا ہوں۔ دو چار روز وہاں قیام رہے گا۔ اگر قومی سرمایہ مسلمان جمع کرسکیں تو میرا یہ اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادۂ قربانی اور اپنے حقوق کے لیے ایجی ٹیشن کرنے کی ہمت و جرأت موجود ہے ——— والسلام

محمد اقبال ——— لاہور[1]

اس خط کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نذیر نیازی لکھتے ہیں:۔

"——— حضرت علامہ بھوپال جارہے تھے اور تقریب وہی سیاسی گفت و شنید ——— مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ واقعی ایسا تھا کہ انھیں اپنے حقوق یا دوسرے لفظوں میں ملی تحفظ کے لیے مل کر آواز اٹھانی اور قلمے، درمے، سخنے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حضرت علامہ کی اس رائے سے بھی شاید کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت قربانی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس خوبی سے فائدہ کس نے اٹھایا ہے"

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال مولانا غلام رسول کی معیت میں ۹ رمئی کو لاہور سے روانہ ہو کر ۱۰ رکو بھوپال پہنچے۔ جہاں نواب صاحب کے ندیم خاص راے۔ ڈی۔ سی) اقبال حسین خاں۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ اعلیٰ ریاستی افسران، عمائد شہر اور شعیب قریشی مشیر المہام روبکاری خاص نے ان کا استقبال کیا اور انھیں سرکاری قیام گاہ (گیسٹ ہاؤس) "قصر راحت منزل"[2] میں ٹھہرایا۔

اقبال کے پہلی بار بھوپال جانے، نواب صاحب سے ملاقات کرنے اور جن امور پر دونوں کے درمیان تبادلۂ خیالات ہوا اُن کے بارے میں کسی کو آج تک علم نہیں تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ تلاش و تجسس کے بعد اس ملاقات کی تفصیلات مجھے قدسی صاحب کی معرفت اقبال کی پیشوائی کرنے والے اُن کے ہم نام اقبال حسین خاں ندیم خاص سے دستیاب ہوگئیں جن کا مطالعہ اقبالیات کے سلسلے میں اہم انکشافات کی حیثیت رکھتا ہے۔

تفصیلی حالات اقبال حسین خاں کی زبانی سنیے:۔

بھوپال میں پہلی مرتبہ اقبال کے آنے کا سبب

"انگلستان اور ہندوستان کے مدبر جب لندن میں گول میز کے آس پاس بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو ہندوستان کے لیڈروں میں آپس میں بڑے فکر کے ساتھ اسی بات پر تبادلۂ خیال کا آغاز ہوا کہ ہندوستان کے کیا کیا معاملات، کس انداز میں اس میز پر رکھے جائیں اور یہ کہ اس کوشش میں ہندوستان کو کس بڑی حد تک آزادی کی راہ پر آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ملک کے جو رہنما اس غور و خوض میں منہمک تھے ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال بھی اُن سے علیحدہ نہ تھے۔

نواب صاحب تدبر کے ایسے عالی مقام پر فائز تھے جس کا اندازہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کے سوانح حیات کا

---

[1] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۶۷۔ ۶۸ [2] قصر راحت منزل جس کا فوٹو شامل کتاب ہے بیرونی مہمانوں کے قیام کے لیے مخصوص تھی اور بطور گیسٹ ہاؤس عرصہ تک استعمال ہوتی رہی۔ اب اس عمارت کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

بغور مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ نواب صاحب اس زمانہ میں چیمبر آف پرنسز کے چانسلر بھی تھے؛ اس لیے اُن کا دامن ہندوستان کے سیاسی حالات سے ایسا ہی وابستہ تھا جیسا ملک کے دوسرے قومی لیڈروں کا۔

ہندوستان کا نقطۂ نظر، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں پیش کرنے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لیے ملک کے بڑے بڑے رہنما، مسٹر جناح (قائدِ اعظم) گاندھی جی، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری وغیرہ سب ہی بھوپال آئے، علامہ اقبال بھی اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں دو مرتبہ بھوپال آئے۔

علامہ اقبال سے میری ملاقات

اس وقت ہز ہائینس کے پرسنل اسٹاف میں سے ایک اے۔ ڈی۔ سی یا ایک ندیم خاص باری باری سے ایک ایک دن "اے۔ ڈی۔ سی اِن ویٹنگ" کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا اور ایک اے۔ ڈی۔ سی یا ندیم خاص گیسٹ ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ یہ حسنِ اتفاق ہی تھا کہ دونوں موقعوں پر میں ہی گیسٹ ڈیوٹی کے لیے نامزد کیا گیا اور اس طرح مجھے علامہ سے قریب ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔

پہلی مرتبہ علامہ اقبال دو دن بھوپال ٹھہرے[1] جب گاڑی ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو صبح کا وقت تھا۔ میں پیشوائی کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھا۔ مہر صاحب بھی علامہ کے ساتھ تھے۔ جب علامہ ریل سے اُترے میں نے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا نام اور عہدہ بتایا۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے "خوب" کہا اور کچھ اپنائیت کی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے مصافحہ میں بھی یہی اپنائیت محسوس کی۔ میں کیا بتاؤں میرے دل کو کس قدر مسرت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد علامہ، مہر صاحب اور میں سرکاری کار میں قصر راحت منزل، احمد آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔

علامہ اقبال سے میری گفتگو اور شعر و شاعری کا تذکرہ

جب ہم لوگ کار میں ریلوے اسٹیشن سے احمد آباد روانہ ہوئے تو راستہ میں علامہ اقبال بھوپال کے بابت مختلف باتیں دریافت کرتے رہے اور اسی دوران میں یہ بھی فرمایا کہ بھئی ہمارے خیال سے تو "کشمیر" نواب صاحب بھوپال کو دے دی جائے اور بھوپال مہاراجہ کشمیر کو، وہاں مسلمانوں کی کثرت ہے اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی اقبال کے پیشِ نظر کیا کیا مصالح تھے اور وہ دو قومی نظریہ سے متعلق اپنے ذہن میں ہندوستان کا کیا نقشہ بنا رہے تھے۔

قصر راحت منزل پہنچ کر مہمانوں نے تھوڑی دیر اپنے اپنے کمروں میں آرام کیا، پھر ٹھیک ۸ بجے ناشتہ کی میز پر آگئے۔ اس وقت بھی ہم تینوں ہی تھے۔ ناشتہ شروع ہوا لیکن اس دوران میں علامہ جس شفقت سے مجھ سے گفتگو فرماتے تھے اس سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا گویا مجھے عرصہ سے علامہ کی خدمت میں شرف نیاز حاصل ہے اس کی ایک وجہ اُن کا اور میرا

---

[1] اس قیام کی تصدیق علامہ اقبال کے ایک مکتوب بنام مولوی صالح محمد سے بھی ہوتی ہے۔ ۹ رمئی ۱۹۳۱ء کو آپ بھوپال پہنچے اور ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور پہنچ کر یہ خط لکھا۔

"میں ابھی صبح بھوپال سے واپس آیا اور آپ کا خط ملا۔ ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب کی دعوت پر میں اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کر کے ان کو ایک مرکز پر متحد کیا جائے معاملہ امید افزا ہے مگر افسوس ہے کہ چونکہ ہر روز قریباً دو بجے رات تک کام کرنا اور جاگنا پڑا میں وہیں بیمار ہوگیا۔ آج صبح واپس آیا ہوں" (اقبال نامہ۔ جلد دوم صفحہ ۳۰۸ - ۳۰۹)

ہم نام ہوتا تھا جیسا میں نے شروع ہی میں محسوس کر لیا تھا اور دوسری وجہ، علامہ کی وسعتِ قلب اور اخلاق کریمانہ۔ مجھے اس بات پر اتنا اعتماد ہے کہ میں بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ سے ہر ملنے والا یہی خیال لے کر اٹھتا ہوگا کہ اقبال میرے خاص کرم فرما ہیں۔ اس کا راز وہی جذبۂ اخوت ہے جس میں اقبال چُور ہو رہے تھے اور جو ان کے کلام کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے علامہ نے مجھ سے پوچھا، کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟ میں نے کہا اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ کبھی کبھی تُک بندی کر لیتا ہوں۔ شاعر نہیں ہوں، اور نہ میرا کوئی اُستاد ہے۔ فرمایا اُستاد تو ہمارا بھی کوئی نہیں —— نالہ پابندِ نَے نہیں ہے۔ سناؤ —— میں نے چھوٹی بحر کی ایک غزل پیش کی جو حسبِ ذیل ہے:-

دل بنا، دل کا ایک راز بنا — سامنے اک رہِ نیاز بنا
اک تجلّی سے کر ہی دے مدہوش — مجھ کو اک منکرِ نماز بنا
تیرے وعدے پہ اضطراب مرا — نغمۂ خامشی کا ساز بنا
سر قلم کر کے زیرِ پا رکھ دے — کر کے سجدہ سرِ نیاز بنا
چشمِ دل سے نہ چھپ سکے گا کوئی — بس حقیقت کا اک مجاز بنا
خونِ دل چشمِ تر سے بہہ نکلا — کیوں نہ طورِ ادائے ناز بنا

کر کے اقبال سمتِ منزل گم
عشق کی راہ کچھ دراز بنا

اس دوران میں علامہ کبھی، خوب خوب فرما دیتے جس سے میرا دل بڑھتا رہا اور پڑھنے کا انداز بھی بدلتا رہا۔ آخر میں ارشاد ہوا واہ بھائی کچھ اور سناؤ، میں نے ایک غزل اور پیش کی جس کو میں تقریباً بھول چکا ہوں صرف تین شعر یاد ہیں اور وہ حسبِ ذیل درج ہیں:-

کوئی تمنّا بھری نظر سے چھپے بھلا کیوں نقاب کیسا؟
ضیاءِ الفت اگر سلامت حجاب کیسا، حجاب کیسا؟
نکل گئیں کیوں یہ بہکی باتیں، قدم مرے کیسے لڑکھڑائے؟
نسیم کوچے سے کس کے آئی، بہک رہا ہے گلاب کیسا؟
کسی کی مست انکھڑیوں میں واعظ جھلک تلطف کی میں نے پائی
تجھے مبارک تری نصیحت، مری خطا کا حساب کیسا؟

اس دوران میں اقبال میری طرف زیادہ متوجہ رہے اور آخری شعر کے پہلے مصرع کے بعد جب میں نے دوسرے مصرع کے دو لفظ "تجھے مبارک" کہے، تو علامہ نے بڑی زور سے "آہاہا" کہا اور باقی کے الفاظ میرے کہنے سے پہلے خود ہی ادا فرما دیے۔ اس کے بعد وہ کچھ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر تک اُن پر ایک کیفیت سی طاری رہی پھر فرمایا آپ نے اپنی غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات ادا کی ہے غزل کا مطلع لکھیے — میں قلم نکال کر لکھنے پر تیار ہوا تو ارشاد ہوا۔

نگاہ بے پردہ سوز میری، نقاب کیسا حجاب کیسا؟
تمھاری ان پردہ بندیوں کا، ملا ہے تم کو جواب کیسا؟

میں خوشی کے مارے اُچھل پڑا اور کھڑے ہوکر ادب سے عرض کیا،
علامہ مجھے آپ کی خدمت میں اب شرفِ شاگردی حاصل ہوگیا۔ علامہ نے مجھے بڑے پیار کی نظروں سے دیکھا اور مسکرا دیے اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ علامہ کی شفقت مجھ پر اور بڑھ گئی۔

نواب حمید اللہ خاں سے علامہ کی ملاقات

اور نواب صاحب کے متعلق علامہ کے تاثرات

اُسی دن گیارہ بجے نواب حمید اللہ خاں سے علامہ کی ملاقات کا پروگرام تھا۔ میں علامہ کو قصرِ راحت منزل سے قصرِ سلطانی لے گیا۔ نواب صاحب کو اطلاع پیشتر کی گئی اور علامہ "آڈینس ہال" میں نواب صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ میں اے ڈی سی روم میں علامہ کی واپسی کا منتظر رہا۔ ایک گھنٹہ یہ ملاقات جاری رہی، جب علامہ واپس آئے تو چہرہ سے کچھ تھکاوٹ کے آثار معلوم ہوتے تھے لیکن اُس کے ساتھ کچھ مسرور بھی تھے۔ ارشاد فرمایا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کا ایک والیٔ ریاست ایسا عالی دماغ بھی ہوسکتا ہے۔ نواب صاحب قوم و ملک کی ایک قابلِ فخر ہستی ہیں۔

دوسری مرتبہ اقبال کی بھوپال میں آمد

اقبال دوسری مرتبہ بھی اسی سلسلے میں بھوپال تشریف لائے۔ صبح ہی کا وقت تھا اس وقت بھی قہر صاحب علامہ کے ساتھ تھے۔ اسٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا، میرے سلام کا جواب دے کر علامہ نے بڑی شفقت سے مصافحہ کیا اور ذرا دیر تک میرے ہاتھ کو دبائے رہے اُسی دن نواب صاحب سے ملاقات ہوئی اور دوسرے دن علامہ واپس تشریف لے گئے۔

علامہ کی فقیر دوستی اور قلندری جذبہ

دوسری مرتبہ بھوپال آنے پر جب واپسی ہورہی تھی اس وقت علامہ نے مجھ سے فرمایا۔ "آپ نے یہاں کے کسی بزرگ کا ذکر ہی نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کو درویشوں سے بھی لگاؤ ہے۔" فرمایا۔ "واہ بھئی قلندر کے پاس اس کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے، اصل چیز تو یہی ہے اور باقی مصروفیات تو زندگی کے لوازم ہونے کی وجہ سے دامن سے بندھی ہوئی ہیں۔" میں نے حضور عالی[1] کا ذکر کیا تو اقبال کچھ چونک سے پڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ پہلے سے حضور کو جانتے ہوں۔ کہا۔ "افسوس آپ نے ایسے وقت تذکرہ کیا کہ اسی وقت حاضری نہیں دے سکتا۔ اگر زندگی ہے تو کسی وقت ضرور شرف نیاز حاصل کروں گا۔" اس کے بعد ہم لوگ اسٹیشن کے واسطے روانہ ہوگئے اور میں نے علامہ کو ریل میں سوار کرادیا۔ چلتے چلتے پھر علامہ مجھ پر ایک شفقت بھری نظر ڈال گئے۔"

اقبال حسین خاں کی یہ تحریر کافی واضح ہے۔ لیکن تحریر کے آغاز میں اُنھوں نے یہ لکھ کر:-

"علامہ اقبال اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں دو مرتبہ بھوپال آئے"۔

مزید تحقیق کی راہیں کھول دیں۔ دوسری مرتبہ بھوپال جانے کا کوئی ثبوت اقبال کے کسی خط سے مجھے نہیں مل سکا۔ چنانچہ میں نے مولانا غلام رسول قہر کو لاہور خط لکھا کہ مئی ۱۹۳۱ء اور پھر شاید ستمبر ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال دوسری بار

---

[1] قدسی صاحب قبلہ کی جانب اشارا ہے جن کے حلقۂ ارادت میں اقبال حسین خان بھی شامل ہیں۔

بھوپال تشریف لے گئے تھے اور سرکاری قیام گاہ راحت منزل میں قیام کیا تھا۔ آپ اُن کے ساتھ تھے جس کا تذکرہ نواب صاحب کے ندیم خاص اقبال حسین خاں نے اپنے تحریری بیان میں کیا ہے۔ مئی ۱۹۳۱ء کا تذکرہ تو مکتوبات اقبال ۔ مرتبہ نذیر نیازی میں صفحہ ۶۸ پر موجود ہے۔ دوسری بار بھوپال جانے کا واضح تذکرہ کہیں نہیں۔ البتہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں وہ دہلی گئے، ہیل ڈ فرنٹیر میل سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ وہ اسی سفر کے دوران بھوپال میں ٹھہرے ہوں گے جس کی تصدیق آپ کے گرامی نامہ سے ہی ہو سکے گی۔

چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنے خط مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۷ء میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"حضرت علامہ مرحوم مئی میں یقیناً بھوپال گئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں ساتھ تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر دو مسئلے پیش نظر تھے۔ اول مسلمانان ہند کے مطالبات۔ دوم مسلمانانِ کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم اور مہاراجہ ہری سنگھ والیٔ کشمیر کے درمیان گہرے دوستانہ روابط تھے۔ غالباً مہاراجہ نے نواب صاحب سے کہا تھا کہ کوئی صورت تصفیے کی پیدا کر دیجیے۔ انہی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔

جس حد تک مجھے یاد ہے۔ دوسری مرتبہ علامہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں بھوپال نہیں گئے —— بلکہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میں اُن کے ساتھ ولایت نہیں گیا تھا۔ کیونکہ وہ گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے یہی مناسب سمجھتے تھے کہ حکومت کے انتظاماتِ سفر قبول فرمالیں۔ چنانچہ وہ پی اینڈ او کمپنی کے جہاز میں جا رہے تھے، میں زیادہ آزاد فضا میں جانے کا خواہاں تھا۔ وہ مجھ سے کم و بیش ایک ہفتہ پیشتر چلے گئے۔ میں بعد میں بمبئی پہنچا اور اطالوی جہاز "جینوا" میں گیا۔

میں نیپلز میں جہاز سے اُترا، پھر روم اور میلان ٹھہرتا ہوا پیرس پہنچا جہاں چند روز گزارے۔ پھر لندن گیا البتہ وہاں حضرت علامہ کے ساتھ رہا۔ لندن ہی میں حضرت علامہ کو اٹلی سے دعوت نامہ مل گیا تھا اور وہ اس شرط پر دعوت قبول کر چکے تھے کہ میں بھی اُن کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے منظوری کے بعد اُنھوں نے اطلاع دی اس وجہ سے ہسپانیہ دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ علاوہ بریں موتمر عالم اسلامی کی طرف سے ہم دونوں کو دعوت نامہ مل گیا تھا اور اس سلسلے میں یروشلم جانا لازم تھا۔ بہرحال واپسی میں حضرت علامہ کے ساتھ رہا۔ چھ سات روز روم میں ٹھہرے، پھر نیپلز ہوتے ہوئے برنڈسی سے اطالوی جہاز پر اسکندریہ پہنچے۔ وہاں سے قاہرہ گئے۔ آٹھ روز وہاں گذارے پھر ٹرین کے ذریعہ یروشلم گئے۔ وہاں بھی موتمر کے اختتام تک ٹھہرے۔ بعد ازاں پورٹ سعید سے اطالوی جہاز پر سوار ہو کر بمبئی آئے۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں بمبئی کا سفر یورپ کے لیے تھا۔ کشمیر کے سلسلے میں نواب صاحب مرحوم کی طرف سے ایک دعوت سفر یورپ سے واپسی کے بعد بھی آئی تھی جب نواب صاحب دہلی میں تھے۔ حضرت علامہ تیار تھے مگر عزیزی جاوید کی علالت کے باعث جا نہ سکے اور میں تنہا دہلی گیا۔"

اس وضاحت کے بعد میں نے اقبال حسین خاں سے ربط و تعلق قائم کرنے کی سعی و جہد کی لیکن ان کی شدید علالت کے باعث مجھے اقبال کے دوسری بار بھوپال جانے کی صحیح تاریخ کی تصدیق نہ ہو سکی چنانچہ میں نے پھر مولانا غلام رسول مہر سے

رجوع کیا اور انھیں تفصیلی واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ۱۹۳۱ء کے بعد یا اس سے پہلے اقبال کے بھوپال جانے کے بارے میں کچھ روشنی ڈال سکیں تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

میرے دوسرے عریضہ کے جواب میں مولانا مہر نے ازرہِ شفقت جو وضاحت کی ہے اُس سے کسی حد تک اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اقبال اور نواب حمیداللہ خاں کی مئی ۱۹۳۱ء سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ خط کا اقتباس یہ ہے:۔

"یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حمیداللہ خاں مرحوم نے بعض مسلم اکابر کو بھوپال بلایا تھا اور مقصود یہی تھا کہ سیاسی امور کے متعلق ان کے درمیان نیز کانگرس و لیگ کے درمیان مفاہمت کرا دیں۔ یہاں سے سر شفیع مرحوم یقیناً گئے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید حضرت علامہ مرحوم بھی گئے ہوں۔ لیکن یہ اُس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس میں مجھے ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی[1] ایسا آدمی ذہن میں نہیں آتا جو ان حالات سے واقف ہو اور حافظے کے مدھم سے نقوش میں تازگی پیدا کر سکے۔

میں جس سفر میں حضرت علامہ کے ساتھ تھا اس میں دو ہی مسئلے تھے۔ اول مسلمانوں کے مطالبات کا مسئلہ دوم مسلمانانِ کشمیر کا مسئلہ۔ نواب حمیداللہ خاں مرحوم کے ذاتی روابط کانگرسیوں سے بھی بہت گہرے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ کانگرس اور لیگ (یا اس زمانے میں مسلم کانفرنس) کے درمیان مفاہمت کرا دیں۔

کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی نواب صاحب مرحوم کو مصالحت و مفاہمت کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس بارے میں بھی گفتگو ہوئی تھی۔ پھر یہ گفتگو دہلی میں ملاقات پر موقوف رکھی گئی تھی۔ نواب صاحب دہلی آئے تو اس سے پیشتر مجھے اطلاع دے دی تھی کہ حضرت علامہ کو ساتھ لے کر دہلی پہنچوں۔ لیکن وہ نہ جا سکے میں گیا اور تین چار روز وہاں رہا۔ اور لوگ بھی اس سلسلے میں بلائے گئے تھے۔ ان سے صرف شعیب مرحوم نے گفتگو کی تھی۔

پھر نواب صاحب کشمیر گئے۔ اس سلسلے میں بھی مجھے شعیب صاحب نے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ ہمارا اسیلون فلاں گاڑی کے ساتھ آئے گا۔ کسی کو اطلاع نہ ہو۔ حضرت علامہ کو ساتھ لے کر اسٹیشن پر آجانا۔ چنانچہ ہم گئے اور نواب صاحب سے مل کر واپس چلے آئے۔

اس زمانے میں نواب صاحب چیمبر آف پرنسز کے صدر تھے اس لیے انھیں عام مفاہمت کرا دینے کا خاص خیال تھا"

اسی خط میں مولانا غلام رسول مہر نے خود اپنے کئی بار بھوپال جانے کا تذکرہ کیا ہے جس سے اُس دور کی عام سیاسی فضا۔ نواب حمیداللہ خاں کے اثر و رسوخ اور ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے اُن سے قریبی اور خصوصی روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

---

[1] مولانا غلام رسول مہر نے راقم الحروف کے نام یکم ستمبر ۶۰ء کے ایک گرامی نامہ میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ علامہ اقبال سفرِ یورپ سے کوئی دو ہفتے قبل نواب حمیداللہ خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال تشریف لے گئے تھے۔

"---- خود میں ۱۹۳۱ء میں نیز اس کے بعد کئی مرتبہ بھوپال گیا۔ مثلاً ایک مرتبہ بمبئی سے مولانا شوکت علی مرحوم نے بلوا لیا۔ اُس وقت بھی نواب صاحب نے متعدد لیڈروں کو بلوا رکھا تھا۔ مثلاً تصدق احمد خاں شروانی (مرحوم) مولانا شفیع داؤدی (مرحوم) اس زمانے میں ہم احمد آباد میں ٹھہرے تھے۔ پھر ایک مرتبہ گیا تو وہیں ٹھہرا۔ ایک مرتبہ یہاں سے چند ایسے آدمیوں کو لے کر گیا جو بھوپال میں آبادکاری کے خواہاں تھے۔ (اس کا تفصیلی تذکرہ آیندہ صفحات میں شامل ہے) اور بہت بڑے قطعات لے کر کاشتکاری کرانا چاہتے تھے نیز کاشتکاروں کو لے جانے کے لیے تیار تھے۔ اس مرتبہ جہانگیر آباد میں قیام کیا تھا۔

پھر ۱۹۳۲ء میں غازی رؤف بے (مرحوم) سے ملنے کے لیے گیا۔ اس مرتبہ بھی احمد آباد میں ٹھہر تھا۔ شعیب صاحب سے تعلقات بہت گہرے تھے اس لیے وہ بعض اوقات ضروری کاموں کے سلسلے میں بلوا لیتے تھے۔"

گزشتہ صفحات میں ۱۹۳۱ء کے دوران اقبال کے بھوپال جانے کے بارے میں جن مقتدر شخصیتوں نے اظہار خیال کیا ہے ان میں نذیر نیازی، اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ خود اقبال کے دو مکتوبات بنام نذیر نیازی اور مولوی محمد صالح ان کے سفر بھوپال کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ البتہ دوسری بار بھوپال جانے کا علم ہمیں صرف اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے تحریری بیانات سے ہوتا ہے۔ کوئی اور شہادت تادم تحریر نہیں مل سکی۔

دوسرے ایڈیشن کی تکمیل کے دوران خوش نصیبی سے اقبال کا ایک ایسا بیان مطبوعہ روزنامہ انقلاب۔ لاہور دستیاب ہوا جس سے نہ صرف بھوپال جانے کی غرض و غایت کا پہلی بار علم ہوا بلکہ اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے بیان کردہ بعض واقعات بھی مشتبہ ہو گئے۔

بھوپال کانفرنس پر اقبال کے اس بیان سے ایک قطعی نئی صورتِ حال سامنے آئی ہے اس لیے تحقیقی دیانت کا تقاضا ہے کہ گزشتہ صفحات میں اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے تاکہ واقعات کا صحیح پس منظر روشنی میں آ سکے۔

اقبال کا یہ بیان محمد رفیق افضل کی مرتبہ کتاب "گفتارِ اقبال" میں شامل ہے۔ اس کتاب میں جو مواد ترتیب دیا گیا ہے وہ کسی اور مجموعہ میں شامل نہیں تھا۔ یہ سب کا سب لاہور کے دو روزناموں 'زمیندار' اور 'انقلاب' کی صرف ان جلدوں سے لیا گیا ہے جو ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ تقاریر، بیانات، مکاتیب کا یہ مجموعہ تاریخ وار ترتیب دیا گیا ہے سوائے آخر کی دو روئدادوں کے جن کا مواد بعد میں دست یاب ہوا۔ اس بیان کے سلسلے میں "گفتارِ اقبال" کے مقدمہ میں محمد رفیق افضل لکھتے ہیں:

"۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے مختلف الخیال حلقوں کو متحد کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ مئی ۱۹۳۱ء میں نواب بھوپال کی دعوت پر جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے حامی مسلمانوں کی ایک کانفرنس بھوپال میں ہوئی۔ دیگر راہنماؤں کے علاوہ علامہ اقبال نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ کانفرنس کے اندر مختلف فارمولے پیش ہوئے۔ آپ کو امید تھی کہ ان تجویزوں کی بنیاد پر ہونے والی مفاہمت کی صورت میں ---- "مسلمان متحد ہو کر ملک کی سیاسی ترقی اور نشوونما میں حصہ لے سکیں گے۔" مخلوط انتخاب

کے حامی بجائے اس کے کہ اُسے مسلمانوں کا داخلی معاملہ سمجھتے وہ ان تجاویز کو منظوری سے پہلے گاندھی جی کے پاس لے گئے جس کی وجہ سے گفت و شنید کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔"

ذیل میں اقبال کے تین بیانات جو دراصل بھوپال کانفرنس سے ہی تعلق رکھتے ہیں — اور دو مختلف تواریخ میں چھپے ہیں ملاحظہ ہوں:

بھوپال کانفرنس پر بیان

نواب بھوپال کی دعوت پر جداگانہ طریقِ انتخاب اور مخلوط طریقِ انتخاب کے حامی مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس بھوپال میں ۱۰ ر مئی کو منعقد ہوئی۔ کوشش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے صورتِ حال کے تمام پہلوؤں کی چھان بین کی جائے۔ متعدد فارمولے تیار کیے گئے اور فیصلہ ہوا کہ تمام ارکان ان فارمولوں کو اپنی اپنی جماعت کے سامنے پیش کریں۔ دوسرا اجلاس یکم جون کو قرار پایا۔ ۱۲ ر مئی کو علامہ سر محمد اقبال، سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور مسٹر شروانی کے دستخطوں سے درج ذیل بیان شائع ہوا:

"ہم ۱۰ ر مئی کو بھوپال میں ایک غیر رسمی جلسہ میں جمع ہوئے تاکہ اختلافات کو مٹائیں جن کی بنا پر مسلمان اس وقت دو سیاسی طبقوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ہندو مسلم سوال کے حل کرنے میں آسانیاں پیدا کرنا تھا۔ ہماری متفقہ رائے ہے کہ اس منزل پر بحث وتمحیص کی تفصیلات شائع کرنا مفادِ عامہ کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ہم خوشی سے بیان کرتے ہیں کہ طرفین کے درمیان انتہائی خوش گوار اور دوستانہ جذبات میں گفتگو ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو یہ امر عیاں تھا کہ حاضرین میں سے ہر ایک کی یہی آرزو اور خواہش ہے کہ ایسے فیصلے پر پہنچ جائیں جو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ بن جائے اور انھیں اس قابل بنادے کہ وہ متحد ہو کر ملک کی سیاسی ترقی اور نشو و ارتقا میں حصہ لے سکیں۔ جون کا پہلا ہفتہ گفت و شنید کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس وقت آخری اور تسلی بخش فیصلہ ہو جائے گا۔"[1]

---

۱۳ ر مئی کو سر محمد اقبال اور نواب محمد اسمٰعیل خاں بھوپال سے واپس آتے ہوئے دہلی سے گزرے۔ ریلوے اسٹیشن پر نمایندہ "اسٹیٹسمین" سے ایک ملاقات کے دوران انھوں نے فرمایا:

"بھوپال کانفرنس کے متعلق اخبارات میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں وہ اصول اساسی کے اعتبار سے درست ہیں۔ لیکن ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بیان صحیح نہیں کہ ہم دونوں مولانا شوکت علی اور سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر جداگانہ نیابت کے موید رہے اور ڈاکٹر انصاری اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مخلوط نیابت کی حمایت پر اڑے رہے۔ ہم چاروں دہلی کی قراردادوں کے موید تھے۔ لیکن ہم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جد و جہد نہیں کر رہے تھے۔

---

[1] انقلاب: ۱۵ ر مئی ۱۹۳۱ء۔ بحوالہ گفتار اقبال۔ صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹

جب واقعات کا سامنا ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں میں بہت تھوڑا اختلاف رائے ہے۔ ہمیں یقین ہے، جس طریق پر یہ کام شروع ہوا ہے اس طرح یہ خفیف اختلاف بھی جاتا رہے گا۔

ہم تفصیلات میں نہیں جا سکتے البتہ ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اتحاد المسلمین کی طرف تسلی بخش ترقی ہوئی ہے۔ اب گفت وشنید ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ ہم انفرادی حیثیت سے اُسے جاری نہیں رکھ سکتے تھے، اس لیے ہمیں اپنی اپنی مجلسِ عاملہ کی طرف منظوری اور رہنمائی کے لیے رجوع کرنا پڑا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب جون کے پہلے ہفتہ میں کانفرنس کا اجلاس دوبارہ ہوگا تو اس وقت تک کوئی ایسا اصول تیار ہو جائے گا جو سب مسلمانوں کو قبول ہوگا اور موجودہ خفیف اختلاف بھی معدوم ہو جائے گا۔"[1]

بھوپال کانفرنس کے فیصلوں کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے ایک بیان مورخہ ۱۵ر مئی میں فرمایا:

"شملہ سے ایسوشی ایٹڈ پریس کا ایک پیغام[2] بدیں مضمون شائع ہوا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب قریشی شملہ پہنچتے ہی گاندھی جی کے مکان پر گئے اور انھیں اطلاع دی کہ ہز ہائنس والیِ بھوپال نے جن اصحاب کو مدعو کیا تھا انھوں نے ایک عارضی میثاق مرتب کر لیا ہے۔ اس پیغام میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میثاق میں جو فارمولا پیش کیا گیا ہے اس میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب والوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اور تقریباً دس سال تک نافذ رہے گا اور اس کے بعد ہر جگہ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے گا۔ چونکہ میں بھی مدعو تھا، اس لیے میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انھوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ انھوں نے گفت وشنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی ہیں اسے کامل طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عارضی میثاق کی قسم کی کوئی چیز حاضرینِ جلسہ کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس جلسہ میں اس سے زیادہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلم نیشنلسٹوں کو انتخاب کے متعلق آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلوں کے قریب ترلانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں تاکہ یہ لوگ پھر کامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں، جس نے جداگانہ انتخاب کے بدستور بحال رکھنے کا ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جس میں کسی قسم کے مغالطہ کی گنجایش باقی

---

[1] انقلاب: ۱۷ر مئی ۱۹۳۱ء بحوالہ گفتارِ اقبال۔ صفحہ ۱۱۹-۱۲۰
[2] سہو کتابت ہے —"بیان" ہونا چاہیے۔

نہیں رہتی۔ اس جلسے میں ان تجاویز پر عمداً کوئی بحث نہیں کی گئی کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان تجاویز کے رد یا قبول کرنے کے لیے مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کی مجالس عاملہ کے روبرو انھیں پیش کیا جائے۔ ایسی تجاویز کو گاندھی جی کے پاس بھاگے بھاگے لے جانے، جن پر کسی قسم کی بحث بھی نہیں ہوئی اور انھیں عارضی میثاق کے نام سے تعبیر کرنے سے شبہ ہوتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو مجھے کامل یقین ہے کہ بھوپال یا شملہ میں دوسرا جلسہ کرنا نہ صرف مفید نہ ہوگا بلکہ لازمی طور پر مسلمانانِ ہند کے مفاد کے لیے ضرر رساں ہوگا۔"[۱]

اقبال کے مندرجہ بالا بیان سے جن حقایق کا پہلی بار انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ بھوپال کے غیر رسمی اجلاس کو "بھوپال کانفرنس" کا نام دیا گیا۔

۲۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء کا بیان اگرچہ صرف علامہ اقبال، سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور تصدق احمد خاں شروانی کے دستخطوں سے پریس میں شایع ہوا لیکن اس کانفرنس میں ان حضرات کے علاوہ ڈاکٹر انصاری، نواب محمد اسمٰعیل خاں، شعیب قریشی اور نواب حمید اللہ خاں شریک تھے۔

۳۔ اس کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد مسلم اتحاد کو مستحکم کرنا اور جداگانہ اور مخلوط طریقِ انتخاب کے سلسلے میں کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنا تھا۔

۴۔ اس بیان کی رو سے کانفرنس کا دوسرا اجلاس یکم جون ۱۹۳۱ء کو ہونا طے پایا تھا لیکن منعقد نہ ہو سکا۔

اب ان حقایق کا اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہرؔ کے بیان کردہ واقعات سے موازنہ کیجیے تو قطعی مختلف صورت حال سامنے آتی ہے۔ اقبال حسین خاں بیان کرتے ہیں:

"ہندوستان کا نقطۂ نظر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں پیش کرنے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لیے ملک کے بڑے بڑے رہنما مسٹر جناح (قائدِ اعظم)، گاندھی جی، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری وغیرہ سب ہی بھوپال آئے۔ علامہ اقبال بھی اسی سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں دو مرتبہ بھوپال آئے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"پہلی مرتبہ علامہ اقبال دو دن بھوپال ٹھہرے۔ جب گاڑی ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو صبح کا وقت تھا۔ میں پیشوائی کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھا۔ مہر صاحب بھی علامہ کے ساتھ تھے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں:

---

[۱] انقلاب: ۱۷ مئی ۱۹۳۱ء۔ بحوالہ گفتارِ اقبال۔ صفحہ ۱۲۰-۱۲۱

"اقبال دوسری مرتبہ بھی اسی سلسلے میں بھوپال تشریف لائے۔ صبح ہی کا وقت تھا۔ اس وقت بھی مہر صاحب علامہ کے ساتھ تھے۔"

اب مولانا غلام رسول مہر کا بیان سنیے:

"حضرت علامہ مرحوم مئی میں یقیناً بھوپال گئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں ساتھ تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر دو مسئلے پیش نظر تھے۔ اوّل مسلمانانِ ہند کے مطالبات۔ دوم مسلمانانِ کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم اور مہاراجہ ہری سنگھ والیِ کشمیر کے درمیان گہرے دوستانہ روابط تھے۔ غالباً مہاراجہ نے نواب صاحب سے کہا تھا کہ کوئی صورت تصفیے کی پیدا کر دیجیے۔ انہی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔ جس حد تک مجھے یاد ہے۔ دوسری مرتبہ علامہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں بھوپال نہیں گئے تھے بلکہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ولایت نہیں گیا تھا۔"

یہ اقتباس راقم الحروف کے نام مولانا مہر کے مکتوب مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کا ہے۔ اب ایک اور اقتباس ان کے مکتوب مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۱ء کا ملاحظہ ہو:

"یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم نے بعض مسلم اکابر کو بھوپال بلایا تھا اور مقصود یہی تھا کہ سیاسی امور کے متعلق ان کے درمیان نیز کانگرس و لیگ کے درمیان مفاہمت کرا دیں۔ یہاں سے سر شفیع مرحوم یقیناً گئے تھے۔ خیال ہوتا ہے شاید حضرت علامہ مرحوم بھی گئے ہوں۔ لیکن یہ اس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی ایسا آدمی ذہن میں نہیں آتا جو ان حالات سے واقف ہو اور حافظے کے مدہم سے نقوش میں تازگی پیدا کر سکے۔"

اسی مکتوب کے حاشیے میں انھوں نے اس امر کی تصدیق فرمائی:

"علامہ اقبال سفرِ یورپ سے کوئی دو ہفتے قبل نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال تشریف لے گئے۔"

بھوپال کانفرنس پر اقبال کے بیان سے اقبال حسین خاں اور مولانا غلام رسول مہر کے بیانات کا موازنہ کیجیے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کے بارے میں دونوں حضرات قطعی لاعلم تھے۔ اقبال حسین خاں اقبال کی بھوپال میں آمد کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں صلاح و مشورہ قرار دیتے ہیں جبکہ مولانا مہر — اسے مسلمانانِ ہند کے مطالبات اور مسلمانانِ کشمیر کے متعلق بہتر سیاسی و ملکی حقوق کا انتظام تصور کرتے ہیں حالانکہ اقبال کے واضح بیان سے ان واقعات کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی مشکوک ہو گیا ہے کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ دوبارہ بھوپال گئے تھے جیساکہ اقبال حسین خاں بیان کرتے ہیں۔ مولانا مہر — اقبال کے ساتھ ایک بار بھوپال جانے کا اقرار کرتے ہیں۔ (بروئے خط مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۶ء) لیکن دوسری بار اقبال کے بھوپال جانے کو "شاید علامہ مرحوم بھی گئے ہوں" کہہ کر یہ اظہار فرماتے ہیں:

"لیکن یہ اس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔" اصل واقعات ان مختلف اور متضاد بیانات سے پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ "سر شفیع مرحوم یقیناً گئے تھے" کا ٹکڑا نہایت معنی خیز ہے اور اسی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کی جس بھوپال کانفرنس میں سر شفیع اور دیگر اکابر شریک ہوئے تھے اس کانفرنس میں مولانا مہر لازماً اقبال کے ساتھ بھوپال نہیں گئے تھے ورنہ خود مولانا مہر یہ کیوں لکھتے کہ یہ "اس سفر سے پیشتر کا واقعہ ہونا چاہیے جس میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔"

بلاشبہ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء کے دونوں مکتوبات مہر میں کوئی بڑا وقفہ نہیں ہے پھر بھی یہ امر واضح ہے کہ مولانا مہر ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو منعقدہ کانفرنس میں اقبال کے ہمراہ نہیں تھے۔

۱۹۷۰ء کے مکتوب میں مولانا مہر کا یہ لکھنا کہ (ستمبر ۱۹۳۱ء میں) "سفر یورپ سے کوئی دو ہفتے قبل نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات کے لیے بھوپال تشریف لے گئے تھے" اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اس سفر میں بھی اقبال کے ہمراہ نہیں گئے تھے۔ ان حالات میں یہی گمان کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ یا تو مئی ۱۹۳۱ء سے پہلے یا بعد کے کسی سفر میں گئے ہوں گے جس کا دستاویزی ثبوت شاید آیندہ کبھی بھوپال کانفرنس کے بیان کی طرح دستیاب ہو جائے۔ بصورت موجودہ اقبال حسین خاں اور خود مولانا مہر کے دونوں بیانات کی صداقت مشتبہ ہو گئی ہے۔

اس سے قطع نظر کہ مولانا مہر اقبال کے ہمراہ کب بھوپال گئے تھے یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ خود ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران کئی بار بھوپال تشریف لے گئے جیسا کہ اُن کے یکم ستمبر ۱۹۷۰ء کے خط کے حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> "خود میں ۱۹۳۱ء میں نیز اس کے بعد کئی مرتبہ بھوپال گیا۔ مثلاً ایک مرتبہ بمبئی سے مولانا شوکت علی مرحوم نے بلوا لیا۔ اس وقت بھی نواب صاحب نے متعدد لیڈروں کو بلوا رکھا تھا۔ مثلاً تصدق احمد خاں شروانی (مرحوم)، مولانا شفیع داؤدی (مرحوم)۔ اس زمانے میں ہم احمد آباد میں ٹھہرے تھے۔ پھر ایک مرتبہ گیا تو وہیں ٹھہرا۔ ایک مرتبہ یہاں سے چند ایسے آدمیوں کو لے کر گیا جو بھوپال میں آبادکاری کے خواہاں تھے...
>
> پھر ۱۹۳۲ء میں غازی رؤف بے (مرحوم) سے ملنے کے لیے گیا تھا......
>
> شعیب صاحب سے تعلقات بہت گہرے تھے اس لیے وہ بعض اوقات ضروری کاموں کے سلسلے میں بلوا لیتے تھے۔"

اسی سلسلے میں سید نذیر نیازی کے ایک ذاتی خط کا حوالہ بھی پیش خدمت ہے جو اقبال اور بھوپال کے ربط و تعلق پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا مہرؔ اور نذیر نیازی کی شخصیتیں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ دونوں حضرات اقبال کے خصوصی نیازمندوں میں شامل رہے ہیں اور ان کے بیشتر لمحے اقبال کی معیت اور رفاقت میں گزرے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اقبال کے ہمیشہ قریب رہے اور انھیں اقبال سے استفادہ کے تمام مواقع نصیب تھے۔ لہٰذا یہ حضرات جو اقبال کے مزاج داں بھی تھے۔ اقبال کے بارے میں جو کچھ اب تک لکھ چکے ہیں۔ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری خوش نصیبی کہ مجھے ان دونوں بزرگوں سے اس کتاب کے سلسلے میں استفادہ کا موقع مل گیا۔ دونوں حضرات نے کمال شفقت و مہربانی سے مجھے بھوپال سے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھ بھیجیں جن کا علم کسی کو نہیں تھا۔ چنانچہ نذیر نیازی صاحب نے میرے عریضہ کے جواب میں مختصراً جو باتیں لکھی ہیں اُن کا اقتباس حاضر خدمت ہے۔ یہ خط ۱۲ جنوری ۱۹۶۷ء کا ہے:-

——— "اقبال کو نواب صاحب مرحوم سے جو ارادت تھی اس کا اندازہ 'مکتوبات'۔ اور 'ضرب کلیم' سے ہو گیا ہو گا۔ دراصل اقبال کو اسلام کے عہد ماضی کی ہر یادگار سے دلی تعلق تھا۔ اس کا حال کچھ بھی ہو وہ اس میں ماضی کی جھلک دیکھتے اور یوں اُن کا ذہن اس کے اصل الاصول کی طرف منتقل ہو جاتا یعنی حضور رسالت مآب صلعم کی دعوت کی طرف جس نے تاریخ عالم کا رُخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا اور انسان کے فکر و نظر میں بحیثیت انسان وہ انقلاب پیدا کیا جس سے اس کا مستقبل وابستہ ہے۔ لہٰذا انھیں اُن یادگاروں سے دلی محبت تھی اور اُن کا جی چاہتا تھا کہ ان افسردہ چنگاریوں میں پھر سے زندگی کی وہ آگ بھڑک اٹھے جس کی روشنی سے کبھی دنیا جگمگا اٹھی تھی۔ ان کے کم نظر ناقدین (بالخصوص خلیفہ عبدالحکیم مرحوم) ان باتوں کو اُن کی جاہ پرستی سے تعبیر کرتے اور نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اسی حال میں ماضی اور ماضی میں مستقبل کی تصویر دیکھ رہے ہیں۔

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور بھوپال 'دارالاقبال' (جس کا اقبال بالآخر ختم ہو گیا) کی وہ شام میرے سامنے ہے جب ۱۹۲۲ء میں جناب امین زبیری کے در دولت پر بیٹھا محلات شاہی کے در و دیوار دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کس قدر تکلیف دہ ہے کہ اس بھوپال کا نام بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا جس نے انتہائی زوال اور محکومی (عالم اسلام کے زوال اور محکومی) کے باوجود ماضی سے اپنا رشتہ نہیں توڑا بمقابلہ اس کے آج کا عالم اسلامی ہے تو آزاد اور خود مختار، لیکن ماضی سے بے تعلق۔"

اقبال حسین خاں۔ مولانا غلام رسول مہرؔ اور نذیر نیازی کی ان تحریری شہادتوں سے جہاں اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے قریبی اور خصوصی روابط کی نشان دہی ہوتی ہے وہیں ان دو عظیم شخصیتوں کی زندگی کے کئی نئے گوشے بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور یہ باور کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ نواب حمید اللہ خاں اقبال کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں اکابر کی صفِ اول میں شمار کرتے ہوئے سیاسی مسائل اور خصوصاً مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلے میں اُن سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے اور ان کی ملاقاتیں بھوپال کے علاوہ دہلی میں بھی ہوتی تھیں جہاں نواب صاحب چیمبر آف پرنسز کی صدارت کے لیے اکثر و بیشتر جاتے رہتے تھے۔ جیسا کہ مولانا مہرؔ نے بھی لکھا ہے۔ ان تینوں حضرات کی تحریروں سے جو واقعات روشنی میں آئے ہیں۔ گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں ان کا کسی کو علم تک نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے ذاتی روابط اور تعلقات کی اصل و بنیاد کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ورنہ چالیس سال کا

وغیرہ بڑا عرصہ نہیں کہ اس دور کے واقعات وحقائق کا احاطہ ممکن نہ ہوتا۔
نواب حمیداللہ خاں سے اقبال کی پہلی ملاقات کا یہ تاثر جیسا کہ اقبال حسین خاں نے بیان کیا ہے۔ یقیناً گہری معنویت
کا حامل ہے۔ اُن کا یہ کہنا:-

"میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کا ایک والیٔ ریاست ایسا عالی دماغ بھی ہوسکتا ہے۔
نواب صاحب تو قوم وملک کی ایک قابل فخر ہستی ہیں۔"

اس بات کا غماز ہے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں نواب صاحب کے گرویدہ وشیدا ہوگئے تھے۔ یہ اظہار کسی معمولی
شخصیت کا نہیں اقبال کا ہے جو خود اُس عہد کی ایک بلند مرتبت شخصیت تھے۔ ان کی یہ برملا تعریف اس حقیقت کی ترجمانی
بھی کرتی ہے کہ وہ حق گو اور حق پسند تھے اور نواب صاحب کی روشن خیالی اور عالی دماغی نے اُنھیں ذہنی طور پر اُن کے
قریب کر دیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ اقبال ــ ایک مردِ قلندر تھے اور حمیداللہ خاں ایک ریاست کے حکمراں ــ لیکن
سیاست، تاریخ اور تہذیب کے جن رشتوں نے دو متضاد شخصیتوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے مصدقہ کُلیوں
کی نفی کی ہے۔ اُنھیں میں اقبال اور نواب حمیداللہ خاں کے ذاتی روابط بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اقبال نے
زندگی کے کسی دور میں کسی حکمراں یا جاگیردار یا کسی بڑی شخصیت کا کبھی کوئی اثر قبول نہیں کیا چہ جائیکہ ایک چھوٹی سی اسلامی
ریاست کا حکمراں جس سے اقبال اس حد تک متاثر ہوئے کہ بے اختیار کہہ دیا ؎

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند

بات صرف اتنی ہے کہ ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا جو سودا اقبال کے سر میں تھا اُسی جنوں میں نواب
حمیداللہ خاں بھی مبتلا تھے۔ اس لیے دونوں کے درمیان پہلی ملاقات کے دوران ہی "عظیم مقاصد" کے حصول
کے سلسلے میں ذہنی رشتہ قایم ہوگیا اور دونوں میں قریبی اور گہرے روابط پیدا ہوگئے۔ سچ پوچھیے تو یہی ہم آہنگی

ادبی تاریخ کا ایک ایسا موڑ ہے جس کے اثرات اقبال نے بھی قبول کیے۔ نواب حمیداللہ خاں نے بھی اور بھوپال کی ادبی فضا
اقبال بھی مسلمانوں کے جداگانہ وجود کے داعی تھے' نواب بھوپال بھی اس کے ہم نوا تھے۔ نواب صاحب اپنے
اعلیٰ تدبر، سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کے ایک رہنما کی حیثیت سے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں نمایاں مقام پر فائز تھے۔
اور یہ فخر ومنزلت اُس دور کے کسی راجہ یا نواب کو نصیب نہیں تھی۔ اقبال نے اسلامی ریاست کا جو تصور الہ آباد میں
پیش کیا تھا وہ بظاہر تو خواب کی سی حیثیت رکھتا تھا اور اُسے کانگریس اور خود مسلمان عام طور پر نظرانداز کر کے متحدہ قومیت
کے تصور کو فروغ دینے کی سعی وجہد کر رہے تھے۔ سیاسی فضا نہایت اُلجھی ہوئی تھی۔ مسلمان ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔
ان حالات میں نواب بھوپال کا دم غنیمت تھا جنھیں ہندوؤں اور مسلمانوں' دونوں کا کامل اعتماد حاصل تھا اور جو
تحریک آزادی میں مفاہمانہ کردار ادا کرنے کی تمام تر صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اقبال ان حقائق سے آگاہ تھے چنانچہ نواب صاحب
سے ملاقاتوں کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ نواب بھوپال کے تعاون سے ملّتِ اسلامیہ کا اتحاد اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی
کے تمام امکانات موجود ہیں اور یہی وہ قدر مشترک تھی جس نے ان دو رہنماؤں کو ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا جس کا
سلسلہ آخر عمر تک قایم رہا۔

۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں اقبال بیشتر بلاد اسلامیہ اور یورپی ملکوں کے سفر میں رہے اور ۱۹۳۴ء میں دفعتاً شدید بیمار پڑ گئے جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ دراصل اقبال اپنی صحت و تندرستی پر بہت کم توجہ دیتے تھے۔ اُنھیں گلے کی تکلیف بہت پُرانی تھی۔ اکثر زور زور سے گلا کھنکارتے اور پھر نزلہ زکام میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں نقرس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی تو عرصہ تک آپ نے دلّی کے مشہور طبیب حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری کا علاج کیا اور اس علاج معالجہ کے سلسلے میں نذیر نیازی اقبال کی ہر ممکن خدمت کرتے رہے خطوط کے ذریعہ اقبال اپنا حال نذیر نیازی کو دلی لکھ بھیجتے۔ وہ سارا حال حکیم نابینا کو جا جا کر سناتے۔ دوائیں حاصل کرتے اور ذریعہ پارسل لاہور روانہ کر دیتے۔ مکتوبات اقبال کے وہ خطوط جو ۱۹۳۴ء (صفحہ ۱۲۵ تا ۱۳۶) پر مشتمل ہیں۔ اقبال کی اسی علالت، علاج و معالجہ اور کیفیتِ مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ اوائل ۱۹۳۵ء میں نواب بھوپال اور راس مسعود کی خواہش پر بھوپال آئے اور بجلی کے ذریعہ نقرس کا علاج شروع کرایا۔ علاج کے سلسلے میں وہ تین بار بھوپال آئے جس کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء تا ۷ر مارچ ۱۹۳۵ء

۲۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۳۵ء تا ۲۸ر اگست ۱۹۳۵ء

۳۔ ۲ر مارچ ۱۹۳۶ء تا ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء

بھوپال میں اُن کی آمد اور اُن کے قیام کا تفصیلی حال آئندہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے کیونکہ یہ قیام اگرچہ علاج کے سلسلے میں تھا لیکن اس کے علاوہ بھی دیگر اہم نتائج کا حامل تھا اور اُن روابط کے استحکام کا سبب بھی جو اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے درمیان راس مسعود کے بھوپال آنے کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔

علاج کے سلسلے میں اقبال کے تین بار قیام بھوپال کی مدت اگرچہ تقریباً چار ماہ ہے لیکن سچ پوچھیے تو ریاست بھوپال، راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں سے اُن کی ذہنی، فکری اور عملی وابستگی کی مدت تقریباً سات سال پر محیط ہے جس کی ابتدا بھوپال کے پہلے سفر (۹ر مئی ۱۹۳۱ء) سے ہوئی اور آخر دم (وفات ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء) تک قایم رہی۔ میں نے اس کتاب کے ذریعہ تاریخ کے ان گم شدہ، نامعلوم، اچھوتے اور بکھرے ہوئے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے تاکہ اقبال کی زندگی کے آخری دور کا احاطہ ہو جائے اور ان فراموش کردہ اوراق سے نئی نسل درس تپش حاصل کر سکے۔

بھوپال کا پہلا قیام

(۳۱؍جنوری تا ۷؍مارچ ۱۹۳۵ء)

(۲)

۱۹۳۴ء میں حکیم نابینا کے علاج سے اقبال کی عام صحت تو بحال ہو گئی لیکن گلے کی تکلیف میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسی عرصہ میں ڈاکٹر لمعہ[۱] اور کئی احباب نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ بھوپال جا کر بجلی کا علاج کرائیں۔ بجلی کا علاج اُس وقت جدید ترین اور کامیاب ترین علاج سمجھا جاتا تھا اور بھوپال کے حمیدیہ اسپتال[۲] میں اس کی قیمتی مشینیں لگ چکی تھیں۔ ماہر ڈاکٹر موجود تھے جن میں ڈاکٹر عبدالباسط ریڈیالوجسٹ کا نام نامی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے جنھیں علامہ کے خصوصی معالج کا شرف حاصل ہوا۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں نواب صاحب کی خواہش کے احترام میں جب راس مسعود بھوپال آ گئے اور انھوں نے علی گڑھ کے ناتے نواب صاحب کے ایک شریک کار کی حیثیت سے وزارتِ تعلیم وصحت و امورِ عامہ کا قلمدان سنبھال لیا تو بھوپال کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی۔ یہ اُن کی زندگی کا آخری اور زرّین دور تھا۔ حیدرآباد کی طویل ترین

---

[۱] عباس علی خاں لمعہ اقبال کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں میں سے تھے۔ اقبال نامہ میں کئی خط ڈاکٹر لمعہ کے نام شامل ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مکرمی بندہ۔

تسلیم — آپ کا گرامی نامہ مل گیا ہے۔ میری طبیعت بحمد اللہ اب اچھی ہے۔ حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں۔ فرق ضرور ہے مگر عام طور پر گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جناب کی گرانقدر رائے کا شکریہ۔ انشاء اللہ ضرور بھوپال جاؤں گا اور بجلی کے علاج سے بھی استفادہ حاصل کروں گا۔

میں نے صحت کی مجبوریوں کے باعث ولایت جانے کا قصد ترک کر دیا ہے۔"

(اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۸۱ - ۲۸۲)

[۲] اس کا نام پہلے "پرنس آف ویلز اسپتال" تھا جسے بعد میں تبدیل کر کے "حمیدیہ اسپتال" رکھا گیا۔ وسط شہر میں یہ وسیع و عریض اسپتال قائم تھا جہاں جدید ترین ڈاکٹری علاج کی سہولتیں بھوپال کے عوام کو حاصل تھیں۔ ریاست بھوپال کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں انگریزی اور دیسی علاج مفت ہوتا تھا۔ خود شہر بھوپال میں حمیدیہ اسپتال کے علاوہ پانچ دوسرے انگریزی شفاخانے، تین یونانی شفاخانے اور ایک خواتین کا اسپتال قائم تھے۔

ملازمت کے بعد علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں انھوں نے جس خلوص، لگن، دیانت اور محنت سے اپنے اب وجد کی اس امانت کے لیے کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی دور میں انھوں نے مادر علمی کو نہ صرف اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا بلکہ اُس کی بنیادوں کو بھی مالی اور فنی لحاظ سے مستحکم کر دیا۔ شبانہ روز جدوجہد کے نتیجہ میں اُن کی صحت کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ اس عالم میں بھی انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا لیکن جب سازشیوں نے اُن کے تاریخ ساز اور عہد آفریں کارناموں کو نظر انداز کر کے انھیں دل برداشتہ کر دیا تو وہ مستعفی ہو گئے، چنانچہ نواب صاحب بھوپال نے جو عرصۂ دراز سے انھیں ریاست میں اعلیٰ عہدہ کی پیش کش کا منصوبہ رکھتے تھے اُن کے مستعفی ہوتے ہی انھیں بھوپال آنے کی دعوت دی۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں وہ بھوپال گئے اور نواب صاحب سے تبادلۂ خیالات کے بعد ریاست کی خدمت پر تیار ہو گئے۔

اقبال اور راس مسعود کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۲۹ء میں ریاست حیدرآباد میں ہوئی تھی جب راس مسعود ناظم تعلیمات تھے اور اقبال توسیعی لکچروں کے سلسلے میں وہاں دوسری بار گئے تھے۔ یہ روابط رفتہ رفتہ دوستی اور محبت میں تبدیل ہو گئے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں اقبال۔ راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ افغانستان کے سفر پر گئے جہاں یہ رشتے اور مستحکم ہو گئے۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں بھوپال آنے کے بعد راس مسعود کو اقبال کی علالت کا علم ہو چکا تھا۔ دیگر نیازمندوں کی طرح انھیں بھی اقبال کی مسلسل علالت سے پریشانی تھی۔ حمیدیہ اسپتال کے ماہر ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد انھوں نے اقبال سے بھوپال آکر علاج کرانے پر اصرار کیا۔ نواب صاحب بھوپال بھی اقبال کی علالت سے فکرمند تھے۔ اور اُن کی خواہش بھی یہی تھی کہ اقبال بھوپال آکر اپنا علاج کرائیں۔ راس مسعود اور اقبال کے درمیان نومبر اور دسمبر ۱۹۳۴ء کے دوران مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی۔ بالآخر اقبال نے بھوپال جانے کا قصد کر لیا لیکن کوشش کے باوجود وہ ۳۱ رجنوری ۱۹۳۵ء سے پہلے بھوپال نہ پہنچ سکے۔ اگرچہ اس سے قبل بھوپال جانے کے بارے میں وہ سید نذیر نیازی کو برابر لکھتے رہے تھے جن کا تاریخ وار تذکرہ ہمیں "مکتوبات اقبال" میں ملتا ہے اور جو اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ نواب صاحب کی خواہش اور راس مسعود کے اصرار کے نتیجے میں انھوں نے بھوپال جا کر قیام کرنے اور علاج کرانے کا قصد کر لیا تھا۔

ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"لاہور ۔ ۵ رجنوری ۱۹۳۵ء ڈیر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم

اس سے پہلے خط لکھ چکا ہوں۔ یہ کارڈ اس امر کی اطلاع کے لیے لکھتا ہوں کہ آج سات روز کی دوا باقی ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ آواز بدستور ہے۔ شانوں کے درمیان رات کو درد ہوتا ہے جس سے نیند میں خلل واقع ہوتا ہے... ...... میں یہاں سے اس ماہ کے آخر میں بھوپال جاؤں گا۔ آپ کو پہلے سے مطلع کر دوں گا تاکہ آپ دوا لے کر مجھے اسٹیشن پر مل جائیں [1]۔"

---

[1] مکتوبات اقبال ۔ صفحہ ۲۴۰۔

"لاہور — ۶ر جنوری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

. . . . بھوپال انشاء اللہ جنوری کے آخیر تک جاؤں گا۔ اس بارے میں آپ کو پھر خط لکھوں گا۔[1]"

"لاہور — ۹ر جنوری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

. . . . میں غالباً ۲۹ر جنوری کو بھوپال جاؤں گا۔[2]"

"لاہور — ۱۲ر جنوری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

. . . . بھوپال جاتے ہوئے ممکن ہوا تو ایک آدھ روز ٹھہر جاؤں گا۔[3]"

"لاہور — ۱۷ر جنوری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

. . . . خالدہ ادیبہ خانم کے لکچر سننے کا میں خود مشتاق تھا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بہرحال میں ان سے انشاء اللہ ضرور ملوں گا یا بھوپال جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے۔[4]"

"لاہور — ۳۰ر جنوری ۱۹۳۵ء[5]

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

. . . . بھوپال کے متعلق مفصل اطلاع دوں گا مگر ایک دو روز میں جو اطلاع وہاں سے آئے گی اگر اس کی رو سے لکچر کی صدارت ممکن ہوئی تو اس سے بھی مجھے انکار نہیں بشرطیکہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ میں بولنے سے قاصر ہوں۔ یہی بات میں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو بھی لکھی تھی اور کوئی امر مانع نہ تھا۔ دہلی ٹھہر سکا تو افغان کونسل خانہ میں ہی ٹھہروں گا۔[6]"

---

[1] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۴۱ [2] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۴۴

[3] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۴۵ [4] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۴۷

[5] یہ خط دراصل ۳۰ر جنوری ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے جو "مکتوبات اقبال" میں سہو کتابت سے "۳۰ر جنوری ۱۹۳۶ء" شائع ہوا ہے۔ خط کی تاریخ کا راقم الحروف نے باغ جناح میوزیم کراچی میں اقبال کے اصل خط سے موازنہ کر لیا ہے۔

[6] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۵۰ — ۲۵۱

"لاہور — ۲۶ر جنوری ۱۹۳۵ء

"ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم

.... میں ۲۹ر جنوری کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ر کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹیر میل سے سفر کروں گا۔ جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں کونسل خانے میں قیام کروں گا۔ افسوس کہ خالدہ خانم کے کسی لکچر کی صدارت کرنا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ دہلی صرف ایک روز ٹھہرنے کا موقع ہوگا۔ باقی خیریت ہے۔ دوا بھی میرے پاس ہے، مزید دوا کے لیے اسٹیشن پر گفتگو ہوگی۔ پھر آپ اسے بھوپال (معرفت سر راس مسعود۔ ریاض منزل) ارسال کردیں[۱]"

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال ۲۹ر جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ ۳۰ر کو صبح دہلی پہنچے۔ قیام زیادہ تر افغان قونصل خانے میں سردار صلاح الدین سلجوقی کے ساتھ رہا جو آپ کے دیرینہ عقیدت مندوں میں تھے۔ شام کو آپ ڈاکٹر انصاری کی خواہش پر جامعہ تشریف لے گئے اور خالدہ ادیب[۲] خانم کے ایک جلسے کی صدارت فرمائی اور رات کی گاڑی سے روانہ ہو کر ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال پہنچے۔

بھوپال پہنچنے پر راس مسعود، اُن کے پرسنل سکریٹری ممنون حسن خاں اور نواب صاحب بھوپال کے ملٹری سکریٹری کرنل اقبال محمد خاں (سی۔ آئی۔ ای) نے اسٹیشن پر اُن کا استقبال کیا جس کی تفصیلی روداد ممنون حسن خاں کی زبانی سنیے:۔

——— "ڈاکٹر اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی، جب وہ سر راس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں اُن کی صحت اچھی نہیں تھی۔ گلے کی تکلیف کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ سر راس مسعود نے انھیں بلانے کے لیے تار وغیرہ میرے ہی ذریعہ بھجوائے تھے۔ جس گاڑی سے علامہ اقبال بھوپال آ رہے تھے وہ رات کے وقت یہاں پہنچتی تھی۔ انھیں لینے کے لیے میں اور سر راس اسٹیشن گئے تھے۔ نواب صاحب نے ملٹری سکریٹری کرنل اقبال محمد خاں کو بطور اپنے نمایندے کے بھیجا تھا حالانکہ وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے تشریف نہیں لا رہے تھے۔ اسٹیشن پر ہم لوگ پنجاب میل کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے سر راس مسعود بڑی بے چینی سے علاّمہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو۔ جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اُترے۔ سر راس کی نظر ان پر پڑی تو اس طرف تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے منہ کے اس قدر بوسے لیے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے ہی کھڑا عجیب نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جلد ہی سر راس مسعود میری طرف متوجہ ہوئے اور علاّمہ اقبال سے کہا، اس لڑکے سے ملو۔ یہ میرا سکریٹری ہے اور تمھارے کلام کا عاشق۔ اسے تم سے زیادہ تمھارا کلام یاد ہے۔ میں فرطِ مسرت سے آگے بڑھا۔ جھک کر سلام کیا اور انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

---

[۱] مکتوباتِ اقبال۔ صفحہ ۲۵۳

[۲] حضرت علامہ ادیب کے بجائے ہمیشہ ادیبہ لکھتے تھے۔ (نیازی)

——— اس کے بعد کرنل اقبال محمد خاں آگے بڑھے اور کہا نواب صاحب نے سلام کے بعد یہ کہلوایا ہے کہ اگر آپ اور سر راس مسعود صاحب اجازت دیں تو شاہی مہمان خانے میں قیام کا انتظام کیا جائے۔ آپ کے وہاں قیام سے نواب صاحب کو بے حد خوشی ہوگی علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ میں تو اس وقت اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ نواب صاحب سے ضرور ملوں گا۔ ان کو میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیجیے گا۔

علامہ اقبال کے پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس کی گاڑی کے پیچھے ہی آگیا۔ سامان اٹھانے والی گاڑی اگرچہ آئی تھی لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی اور وہ خالی واپس گئی۔

——— علامہ اقبال کا قیام "ریاض منزل" میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال کے مشہور تالاب "بڑے تال" کے کنارے ہے۔ بھوپال کا یہ مقام بڑا حسین اور دل فریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سرزمین کے لیے قدرت کا یہ ایک حسین عطیہ ہے۔ اس مکان کے بالائی حصے میں سر راس نے ایک کمرہ بنوایا تھا۔ اسی میں انھیں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر اقبال نے اپنی نظم "نگاہ" تخلیق کی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی ریاض منزل پہنچے بیگم مسعود نے علامہ کا خیر مقدم کیا۔ علامہ اقبال اُن سے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ملے۔

——— چونکہ سر راس مسعود کے کہنے پر نواب صاحب نے مجھے خاص طور سے ڈاکٹر صاحب کی چیتی میں مقرر کر دیا تھا۔ اور میری دفتر کی حاضری معاف فرما دی گئی تھی۔ اس لیے صبح سے میں بجائے سر راس مسعود کے سکریٹری ہونے کے اقبال کا خادم ہو کر کام کرنے لگا تھا۔ سر راس نے علامہ کو بتا دیا تھا کہ انھیں جس بات کی ضرورت ہو اس کی اطلاع ممنون حسن خاں کو دیں۔ یہ اس کی تعمیل کریں گے۔

رات کے کھانے کا انتظام سر راس مسعود نے خاص طور سے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے سر راس مسعود کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں کھانا کھایا۔ کھانے کے درمیان ہی علامہ اقبال نے کہا کہ میرا کھانا سادہ ہونا چاہیے اور ڈائننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں اس لیے اگر میں ڈائننگ روم میں نہ آسکوں تو بُرا نہ مانیے گا۔ مجھے جس وقت بھوک لگے گی کھا لوں گا۔ کھانے کے بعد میں علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لیے بچھوایا تھا اُسے اُن کے ملازم[1] نے اٹھا دیا تھا اور اُس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر ہی پر سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوانِ غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے قریب ہی ایک پنجابی حقّہ رکھا ہوا تھا۔

——— دوسرے دن علامہ اقبال نے فرمایا کہ نواب صاحب سے ملنے کا وقت لے لیا جائے۔ چنانچہ ملنے کا وقت مقرر کر لیا گیا۔ ٹھیک وقت پر سر راس علامہ اقبال کے ساتھ نواب صاحب سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔ میں بھی بحیثیت خادم اُن کے ساتھ تھا۔ یہاں سے پہلے ہی ٹیلیفون

---

[1] علی بخش۔ اقبال کا دیرینہ خادم جو سفر میں اکثر اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ افسوس کہ گزشتہ دنوں علی بخش کا بھی انتقال ہوگیا۔

کر دیا گیا تھا کہ "قصر سلطانی" کے لیے ہم لوگ فلاں راستے سے آرہے ہیں۔ جیسے ہی گاڑی محل میں آکر رکی ہم لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب نیچے کی سیڑھی پر علامہ اقبال سے ملنے کھڑے ہیں۔ نواب صاحب بڑے احترام اور محبت کے ساتھ علامہ سے ملے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں سے مل رہے ہیں۔ پھر نواب صاحب علامہ کو اپنے کمرے میں لے گئے جہاں صرف ہم چار آدمی تھے میں سب سے پیچھے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلد ہی کافی کا دور چلا ۔ نواب صاحب نے دریافت کیا۔ کہ اقبال صاحب آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے جس پر علامہ نے کہا، کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں ہے ۔نواب صاحب نے صحت کے بارے میں پوچھا تو علامہ نے بیماری اور تمام علاج کی تفصیل بتائی ۔ اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نواب صاحب نے An Interpretation of Holy Quran in the light of modern philosophy کے بارے میں دریافت کیا۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے ، کچھ تیار بھی کیا ہے، لیکن کچھ کتابیں بیرونِ ملک میں ہیں انھیں دیکھ لینا چاہتا ہوں مجھے آکسفورڈ اور کیمبرج میں Extension lecture کے لیے بلایا جارہا ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو ان کتابوں کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو ساری ملتِ اسلامیہ بلکہ ساری دنیا کے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور آپ نے مجھے جو تحفے دیے ہیں ان میں سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔ اگر اس میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو جیسا کہ میں نے مسعود سے کہا ہے ہر طرح کی امداد کے لیے تیار ہوں۔ پھر دوسری باتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد نواب صاحب سے علامہ اقبال نے جانے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ آپ مصروف ہیں اس لیے جانے کی اجازت دیجیے۔ نواب صاحب گاڑی تک پہنچانے آئے۔ سر راس مسعود اور علامہ اقبال پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی "ریاض منزل" کے لیے روانہ ہوئی۔

—— علامہ اقبال چونکہ بیمار تھے اس لیے روزانہ کافی خطوط ایسے آتے تھے جن میں صحت کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا۔ اس لیے علامہ کے خطوط کے لیے سر راس مسعود کی طرح الگ [illegible] جاتا تھا۔ تمام خطوط وہ اپنے پاس رکھتے تھے صبح کے وقت تمام خطوط علامہ کو سُنا دیے جاتے تھے اور پھر خطوط کے جو کچھ وہ جواب لکھاتے تھے۔ پہلے پنسل سے لکھ لیے جاتے تھے پھر صاف کرکے یا ٹائپ کرکے ان کے پاس دستخط کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ یہ خطوط نوجوانوں سے لے کر والیانِ ریاست تک کے ہوتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کے خطوط زیادہ آتے تھے جو دریافت صحت کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ بیرونِ ملک سے بھی اسی سلسلے میں زیادہ تر خطوط آتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے علامہ کی صحت کے بارے میں خبریں نشر ہوتی تھیں[1]۔"

---

[1] علامہ اقبال بھوپال میں۔ صفحہ ۱۱ تا ۱۳

جن حضرات کو ریاست بھوپال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ وسطِ ہند کی اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کے حکمرانوں میں علم و ادب سے جتنا گہرا شغف پایا جاتا تھا اُتنا ہی فنِ تعمیر سے بھی اُنھیں خاص لگاؤ تھا جس کے نتیجے میں وہاں ایک نہیں متعدد و بلند و بالا، پُرشکوہ اور قابلِ دید عمارتیں اور محلات تعمیر کیے گئے، جو زبانِ حال سے مغل فنِ تعمیر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قصرِ سلطانی (نواب بھوپال کی قیام گاہ) شملہ پہاڑی کے محلات (جہاں نواب صاحب کے بھتیجے سعید الظفر خاں اور رشید الظفر خاں رہتے تھے) عید گاہ کوٹھی اور ملحقہ محلات ــ صدر منزل شیش محل۔ موتی محل۔ ہوا محل ۔قصرِ راحت منزل (سرکاری مہمان خانہ) گوہر محل۔ ریاض منزل اور قدسیہ محل وغیرہ وہ چند مشہور عمارات ہیں جن کے در و دیوار آج بھی شاہانہ عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ ان شاہی عمارتوں کے مکین والیانِ ریاست کے عزیز و اقارب بھی تھے، شہر کے عمائد اور معززین بھی اور اعلیٰ سرکاری عہدے دار اور افسر بھی ــ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے سرکاری عمارتیں وزرائے حکومت اور عہدے دارانِ ریاست کے تصرف میں رہتی تھیں جن کی تمام تر نگرانی اور دیکھ بھال ریاست کی ذمہ داری تھی۔

"ریاض منزل"[1] ــ جہاں اقبال پہلی بار مقیم ہوئے۔ شہر سے دور ایک وسیع و پرشکوہ دو منزلہ عمارت تھی جو چہار جانب خوبصورت پہاڑیوں اور تالاب سے گھری ہوئی تھی ــ اس کے عالی شان کمرے۔ دالان ۔کمپاؤنڈ ــ اردگرد کے حسین و دل کش مناظر اور راس مسعود ایسے جاں نثار دوست کی قربت میں اقبال یہاں آکر کافی مسرور و مطمئن ہوئے اور اُن کی عام صحت پر بھوپال کے حسین مناظر کا (جس کا اکثر خطوں میں اُنھوں نے تذکرہ بھی کیا ہے) بہت اچھا اثر پڑا۔ اُن کا یہ قیام اگرچہ علاج کے سلسلے میں تھا لیکن علاج سے پہلے مریض کو آسودگی، طمانیتِ قلب، خوش گوار ماحول اور پُرسکون فضا کی جتنی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کچھ بلکہ توقعات سے کچھ زیادہ ہی اقبال کو بھوپال آنے کے بعد قیام گاہِ مسعود یعنی "ریاض منزل" میں میسر آگئے ــ وہاں صرف مسعود ہی اُن کے ہمدرد، رفیق و جلیس نہ تھے ان کی بیگم بھی تھیں، جو راس مسعود سے زیادہ اقبال کی خبر گیری اور دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت موجود تھیں ــ پھر راس مسعود کے اردگرد بھوپال کی مشہور و ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں بھی تھیں جن کے لیے اقبال کی بھوپال میں آمد باعثِ فخر و منزلت بھی تھی اور قربت و استفادہ کا ایک ذریعہ بھی ــ خود شاعرِ مشرق کے لیے بھی بھوپال کا یہ قیام آسودگیِ خاطر کا سبب بن گیا جس کے عہد آفریں نتائج برآمد ہوئے اور جن پر تاریخِ ادب ہمیشہ نازاں رہے گی۔

بھوپال پہنچنے کے فوراً بعد راس مسعود نے اقبال کے علاج معالجہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور حمیدیہ اسپتال میں اُن کے خصوصی طبی معائنہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حمیدیہ اسپتال ــ بھوپال کا بہترین اسپتال تھا جہاں ہر قسم کی سہولتیں فراہم تھیں۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن جو بھوپال کے چیف میڈیکل آفیسر اور اسپتال کے نگراں تھے ــ اپنے فنی تجربہ، اعلیٰ قابلیت اور ماہرانہ تشخیص کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ ڈاکٹر رحمٰن کے علاوہ حمیدیہ اسپتال میں خان بہادر ڈاکٹر احمد بخش، ڈاکٹر سلطان، ڈاکٹر یوسن، ڈاکٹر عبدالباسط وغیرہ بھی تھے جو اپنی اپنی جگہ پر بہترین صلاحیت کار کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ بھوپال میں افسر الاطباء، حکیم سید ضیاء الحسن اور حکیم سلطان محمود ایسے طبیب حاذق بھی تھے۔ چنانچہ ان سب حضرات نے مشاورت کے بعد تین دن تک مسلسل اقبال کا طبی معائنہ کیا تاکہ مرض اور علاج کی تشخیص سے قبل صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگایا جاسکے۔

---

[1] اس تاریخ ساز عمارت کی تصویر کتاب میں شامل ہے۔

بالآخر طبی معائنہ کی رپورٹ کے بعد بجلی کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔ چنانچہ نذیر نیازی نے بھوپال خط لکھ کر اقبال کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے نہایت تسلی بخش جواب دیا۔

بھوپال سے اُن کا یہ پہلا خط تھا جس میں انھوں نے طبی معائنہ کے علاوہ اسپتال اور ڈاکٹروں کی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے معالجین کی تعریف[۱] کی ہے اس میں علاج کی تفصیل بھی ہے اور بھوپال کے خوش گوار موسم کا حال بھی:۔

"بھوپال ـــ ریاض منزل

۵ ر فروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ـ السلام علیکم

آپ کا خط کل ملا۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ اُمید ہے اس کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑے گا۔ طبی معائنہ کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے۔ طبی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہرحال آج گیارہ بجے سے Ultra Violet Rays کا غسل شروع ہوگا۔ جو ابتدا میں صرف ۷ منٹ روزانہ ہوگا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والسلام

محمد اقبال ـ ۵ ر فروری ۳۵ء[۱]"

چار دن بعد ہی انھوں نے نیازی صاحب کو دوسرا خط لکھا۔

"ڈیر نیازی صاحب ـ السلام علیکم۔

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ دوائی جو آپ نے ارسال کی تھی مل گئی ہے۔ اُمید ہے آواز والی دوائیں بھی لاہور پہنچ گئی ہوں گی۔ بجلی اور Ultra Violet Rays[۲] سے علاج شروع ہے۔ ایک آدھ ہفتے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہوگا۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھوپال میں موسم نہایت عمدہ ہے۔ فروری کے آخر تک بلکہ مارچ تک ایسا ہی رہے گا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت دہلی (میں)[۳] ہیں۔ ۱۷ ر فروری کو واپس آئیں گے۔ والسلام

محمد اقبال ـ بھوپال

۹ ر فروری ۱۹۳۵ء[۴]"

ان خطوط سے واضح طور پر مترشح ہے کہ وہ بھوپال کے موسم اور ڈاکٹروں کے علاج سے کافی مطمئن تھے۔ نواب صاحب ان دنوں پرنسز چیمبرس کے اجلاس کی صدارت کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے اس لیے اقبال کی اُن سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی البتہ ۱۷ ر فروری کے بعد وہ راس مسعود کی معیت میں کئی بار نواب صاحب سے ملاقات کے لیے احمد آباد پیلس

۱ـ مکتوبات اقبال ـ صفحہ ۲۵۶ ۲ـ ماورا بنفشی شعاعوں ـ (نیازی)

۳ـ "میں" سہواً رہ گیا ـ (نیازی) ۴ـ مکتوبات اقبال ـ صفحہ ۲۵۷

تشریف لے گئے۔ ان ملاقاتوں میں صحت و علاج سے لے کر سیاسی مسائل تک ہر موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ ذاتی مسائل بھی زیرِ بحث آئے۔ باہمی دلچسپی کے دیگر امور بھی موضوعِ گفتگو رہے اور اس طرح دیرینہ روابط کی تجدید ہوتی رہی۔ راس مسعود اقبال سے بے حد محبت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اس امر کے لیے کوشاں تھے کہ اقبال مالی پریشانیوں سے جلد نجات پا لیں۔ چنانچہ مالی اعانت اور مستقل وظیفہ کی چند تجاویز انھوں نے علی حیدر عباسی۔ مشیر المہام صیغہ سیاسیہ کے توسط سے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیں، جن کی تصدیق خود عباسی صاحب نے (جو ان دنوں کراچی میں ہیں[1]) مجھ سے گفتگو کے دوران فرمائی۔ راس مسعود کی ان مخلصانہ اور عقیدت مندانہ کوششوں کے نتائج جلد ہی سامنے آگئے۔ اور وہ فخر و امتیاز جو ہندوستان کی کسی ریاست کو نصیب نہ ہو سکا۔ راس مسعود کی تنہا کوششوں سے ریاست بھوپال کے حصہ میں آگیا اور تاریخ کا امٹ باب بن گیا۔

اقبال۔ ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور راس مسعود بھی ملک کی مقتدر ترین شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان دونوں کے قرب اور وابستگی نے بھوپال کی عظمت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اور اب جب کہ بسلسلہ علاج اقبال بھوپال میں قیام پذیر تھے۔ اُن کے ہزاروں، لاکھوں عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی نگاہیں بھوپال پر لگی تھیں۔ گویا ہندوستان سمٹ کر ایک مرکز بن گیا تھا اور وہ مرکز تھا بھوپال جس کے روحِ رواں اقبال بھی تھے اور ان کے معزز میزبان راس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں بھی جن کے طفیل اس ریاست کی اہمیت اور ادبی عظمت میں اضافہ ہوا تھا۔ اور وہ بھوپال سے "دار الاقبال" بن گیا تھا۔

اقبال کا علاج نہایت احتیاط اور توجہ سے جاری تھا۔ لیکن اُنھیں والدۂ جاوید کی علالت سے بڑی تشویش تھی جو عرصہ سے بیمار تھیں۔ بھوپال میں رہتے ہوئے بھی اقبال جسم و جاں کے رشتوں کو منقطع نہیں کر سکے تھے۔ وہ حکیم نابینا کے زیرِ علاج تھیں۔ چنانچہ جو خطوط اپنی بیگم کی ادویہ کے لاہور بھیجنے کے سلسلے میں انھوں نے نذیر نیازی کو لکھے ہیں اُن کے مطالعے سے کافی فکرمندی اور تردّد کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۱ر فروری ۱۹۳۵ء کے دونوں خطوط دوا لاہور نہ پہنچنے کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں:-

"بھوپال۔ ریاض منزل

۱۱ر فروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

اس سے پہلے ایک اور خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے پہنچا ہوگا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے جاوید کی والدہ کے لیے دوائے کردہلی سے اُسی روز روانہ کر دی تھی۔ جس روز میں دہلی سے بھوپال روانہ ہوا، مگر بھائی صاحب کا ایک خط ۹ رفروری کا لکھا ہوا آج مجھے بھوپال میں ملا جس سے معلوم ہوا کہ دوا آج تک نہیں پہنچی۔ مہربانی کر کے فوراً ڈاک خانہ سے دریافت کریں کہ کیا معاملہ ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو اور دوائے کر جلد ارسال کر دیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ یہاں (کا)[2] موسم بہت اچھا ہے۔ بجلی کا علاج شروع ہے۔ میں انشاء اللہ آخر فروری تک واپس ہوں گا۔ والسلام۔ محمد اقبال۔ اس خط کا جواب جلد دیں[3]۔"

---

[1] افسوس کہ ۱۹۷۲ء میں انتقال ہو گیا۔

[2] "کا" شاید سہواً رہ گیا ہے۔ (نیازی)۔ میرے خیال میں "کا" کے بغیر بھی مفہوم ادا ہوتا ہے۔

[3] مکتوباتِ اقبال۔ صفحہ ۲۵۸

"بھوپال ۔ ۱۱؍ فروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم

میں نے آپ کو ابھی ایک خط دوا کے متعلق لکھا ہے ۔ بھائی صاحب کا خط لاہور سے آیا تھا کہ دوا مرسلہ نیازی صاحب ابھی تک نہیں پہنچی ۔ مجھے اس سے بہت تعجب ہوا کیونکہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دوا ارسال کر دی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ آپ کی مرسلہ دوا کا پارسل لاہور پہنچ گیا تھا ۔ مگر وہاں سے ڈاک خانہ لاہور نے اسے بھوپال بھیج دیا ۔ کیونکہ میں آتی دفعہ ڈاک خانہ کو ہدایت دے آیا تھا کہ میرے خطوط اور پارسل بھوپال بھیج دیے جائیں چونکہ آپ نے یہ پارسل میرے پتے پر بھیجا تھا اس لیے ڈاک خانہ والوں نے وہیں سے اس کو بھوپال کر دیا ۔ لہٰذا آپ متردد نہ ہوں۔

میں یہ پارسل یہاں سے لاہور بھیج رہا ہوں ——— والسلام

محمد اقبال[1]"

بھوپال کی آب و ہوا نے اقبال کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا ۔ بجلی کا علاج بھی وقفہ وقفہ سے ہو رہا تھا ۔ ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ سے اقبال بے حد مطمئن تھے ۔ لیکن ڈاکٹروں کا کہنا یہ تھا کہ وہ کم سے کم تین ماہ جم کر علاج کریں جو فی الوقت ممکن نہ تھا کیونکہ انھیں والدۂ جاوید کی مسلسل علالت سے خاصی تشویش تھی ۔ پھر بھی انھوں نے راس مسعود اور ڈاکٹروں کے مشورہ پر عمل کیا اور بجلی کے علاج کا ایک کورس مکمل کرنا ضروری سمجھا ۔

ابھی اُن کا صرف چار مرتبہ بجلی سے علاج ہوا تھا جس سے آواز میں نسبتاً فرق محسوس ہونے لگا تھا ۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ کم سے کم ۸ ۔ ۱۰ مرتبہ بجلی کا علاج ہو جانے کے بعد اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے جس کا اظہار ۱۳؍ فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں بھی انھوں نے کیا ہے :۔

"بھوپال ۔ ۱۳؍ فروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم

آپ کو میں نے کل دو خط لکھے ہیں ۔ اُمید ہے کہ پہنچے ہوں گے ۔ دوا کا پارسل جو جاوید کی والدہ کے لیے تھا لاہور سے واپس ہو کر یہاں آ گیا تھا ۔ اب میں نے کر وہاں بھیج دیا ہے ۔ بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے ۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہو گا ۔ اس واسطے آپ ابھی حکیم صاحب والی دوا ارسال نہ کریں ۔

موسم بہت اچھا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں اور بہت پُر اُمید ہیں کہ مہینے کے اختتام تک نمایاں فرق ہو گا ۔ نبض کی حالت اور دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے میں انشاء اللہ اس ماہ کے آخر تک واپس ہوں گا ۔ بشرطیکہ کوئی خاص امر مانع نہ ہوا[2]...

محمد اقبال"

---

[1] مکتوبات اقبال ۔ صفحہ ۲۵۹

[2] مکتوبات اقبال ۔ صفحہ ۲۶۰

اس خط میں بھی انھوں نے بھوپال کے موسم کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے اپنی عام صحت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا ہے اور آخر ماہ فروری تک بھوپال میں قیام و علاج کے قصد سے بھی نیازی صاحب کو اطلاع دی ہے۔ لیکن وہ آخر فروری کے بجائے ، ۸ مارچ ۱۹۳۵ء تک بھوپال میں قیام پذیر رہے اور راس مسعود اور بیگم راس مسعود کے علاوہ بھوپال کی کئی مشہور و ممتاز شخصیتوں کو بھی اقبال سے ملنے، تبادلۂ خیالات کرنے اور استفادہ کے مواقع نصیب ہو گئے۔ ان شخصیتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممنون حسن خاں (پرسنل سکریٹری سر راس مسعود) مولانا ارشد تھانوی۔ سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ مائل نقوی۔ علی حیدر عباسی۔ مولوی شکر اللہ سہیل۔ قاضی ولی محمد۔ سہا مجددی ——— ذکی وارثی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

——— قیام "ریاض منزل" کی چند جھلکیاں آپ کو ذیل کے واقعات سے بھی مل جائیں گی جن کو محفوظ کرنے کا سہرا مشہور اہلِ قلم فقیر سید وحید الدین (مرحوم) کے سر ہے۔ انھوں نے "روزگار فقیر" جلد اول میں مختلف عنوانات کے تحت جس خلوص و محنت سے اقبال کی عام زندگی کے ان گنت مستند واقعات کو جمع کر کے شاعرِ مشرق کی جیتی جاگتی اور سچی تصویر کشی کی ہے اُس کا علم اس سے پہلے کسی کو نہیں تھا۔ فقیر سید وحید الدین کا یہ کارنامہ تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا اس لیے کہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہی اقبال کی عظیم شخصیت کے خد و خال مکمل ہوتے ہیں۔ وہ آفاقی شاعر بے شک تھے لیکن وہ ایک انسان بھی تھے اور اُن کی زندگی بھی عام انسانوں کی طرح دُکھ سُکھ، رنج و راحت، آسودگی و بے اطمینانی سے ہم کنار تھی ——— چنانچہ روزگار فقیر میں جو واقعات انھوں نے سید راس مسعود مرحوم کی بیگم سے (جو نواب زادہ راحت سعید چھتاری کی رفیقۂ حیات ہیں) براہِ راست حاصل کر کے شامل کتاب کیے ہیں اُن کے اقتباسات سے "ریاض منزل" کے شب و روز کی جیتی جاگتی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

اقبال پہلی بار علاج کے سلسلے میں ایک ماہ سات دن قیام پذیر رہے ہیں۔ ایک ماہ سات دن کا عرصہ معمولی عرصہ نہیں ہے بلکہ اس عرصہ کو اقبال نے جاوداں کر دیا ہے جس کا ثبوت یہ چند مستند واقعات بھی ہیں اور وہ یادگار نظمیں بھی جو "ریاض منزل" میں اقبال نے کہیں اور "ضربِ کلیم" میں شامل ہوئیں۔ روزگار فقیر جلد اول میں "بھوپال میں" کے عنوان سے فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:-

> ——— "ڈاکٹر محمد اقبال اور راس مسعود کے دوستانہ روابط وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی علالت نے جب طول کھینچا تو سر راس مسعود نے اُن کے علاج معالجہ کا بھوپال ہی میں معقول انتظام کیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے گلے کی تکلیف بڑھ چکی تھی اور ان کی آواز اتنی نحیف اور مدھم ہو چکی تھی کہ دوسروں کی سماعت تک بڑی مشکل اور دشواری سے پہنچتی تھی[1]"

"بھوپال میں ڈاکٹر صاحب کا زیادہ تر وقت سر راس مسعود کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال میں گذرتا۔ بیگم راس مسعود بھی اس گفتگو میں حصہ لیتیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اکثر اوقات مغموم اور فکر مند پایا گیا اور یہ غم اور فکر اپنے لیے نہیں قوم کے لیے ہوتی تھی۔ بڑے ہی پُر سوز لہجہ میں اکثر و بیشتر ڈاکٹر صاحب یہ فقرہ دُہراتے۔

---

[1] روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۳

"قوم کا تاریک مستقبل خود اپنی ہی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جاتا ہے اور افراد کی بے حسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بسا اوقات رات کو دیر تک کوٹھی کے شہ نشیں پر تنہا بیٹھے رہتے اور زار و قطار روتے رہتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کے اندر سوزِ غم کی بھٹی سُلگ رہی ہے جو اُنھیں چین سے نہیں رہنے دیتی۔" ڈاکٹر جانسن جن کا ذکر اس کتاب میں پڑھنے والوں کو ملے گا بھوپال ہی میں آکر ڈاکٹر صاحب سے ملے اور بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔[۱]

"لیڈی راس مسعود جو شعر و ادب کا نہایت ہی پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں" ڈاکٹر صاحب کی تیمار داری اور دیکھ بھال میں ہر وقت مصروف رہتیں۔ راس مسعود اور اُن کی بیگم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر صاحب کے نہ صرف یہ کہ قدر شناس تھے بلکہ اُن کی ذات سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ لیڈی مسعود ان گذرے ہوئے واقعات کا ذکر فرماتی ہیں تو ڈاکٹر صاحب کے اس فقرے کو اکثر دُہراتی ہیں۔

انگریز نے اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے۔[۲]"

شعر کا مفہوم

"ڈاکٹر صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "بالِ جبریل" جب منظرِ عام پر آئی تو انھوں نے سر راس مسعود کو ایک جلد پیش کی اور کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرما دیے۔ بیگم مسعود اُس وقت موجود تھیں۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کا کلام اِن سے بہتر میں سمجھتی ہوں اور کتاب آپ اِن کو عنایت فرما رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے اور دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اپنا شعر سُناتا ہوں تم میں سے جو کوئی اس کی زیادہ صحیح اور بہتر تشریح کرے گا وہی اس کتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

سر راس مسعود اور اُن کی بیگم صاحبہ دونوں نے اپنے اپنے الفاظ میں اس شعر کا مفہوم بیان کیا لیکن وقت کی بات کہ بیگم راس مسعود کی شرح و ترجمانی زیادہ بہتر اور شاعر کے مافی الضمیر سے قریب تر نکلی چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے "بالِ جبریل" کے سرورق پر راس مسعود کے بجائے بیگم راس مسعود لکھ دیا اور کتاب ان کو دے دی۔[۳]"

محبت کی شادی

"ایک دن بیگم راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اس موضوع پر بحث چل نکلی کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح و شادی کے دائرے میں آنے سے قبل فریقین کے مابین محبت و اُنس کی کسی نہ کسی حد تک جھلک اور آمیزش ضرور

۱-۲ روزگارِ فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۳-۱۵۴

۳ روزگارِ فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۵

ہونی چاہیے۔" ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر فرمایا۔

"شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔"

بیگم راس مسعود نے کہا۔ آج کل والدین لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اپنی پسند اور مرضی سے رشتوں کا جس طرح انتخاب کرتے ہیں اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا عموماً ان تمام ضروری باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہی (والدین[1]) رشتے طے کرتے ہیں[2]۔"

الہامی شاعری

"ڈاکٹر صاحب اُس وقت شعر کہتے جب اُن پر خاص کیفیت طاری ہوتی۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے وارداتِ قلبی کسی زحمت و تکلیف کے بغیر اشعار کے قالب میں ڈھلتے چلے جاتے۔ وہ جو فرمایا گیا ہے۔ ع

شاعری جزویست از پیغمبری

تو اقبال کی شاعری اس مصرعہ کا صحیح مصداق ہے۔

ٹھیک یہی رائے بیگم راس مسعود کی بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُن کے یہاں طویل قیام فرماتے تھے۔ بیگم صاحبہ ان کی میزبانی اور خاطر مدارات میں لگی رہتیں۔ ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور اُن کی عادات، مشاغل، اور رجحانات کے مطالعہ کے مواقع اُنھیں میسر آتے رہے۔

بیگم راس مسعود فرماتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کی کیفیت و حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے وجدان پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ جب ایسا وقت آتا تو ڈاکٹر صاحب خلوت و تنہائی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس فرماتے، وہ ایسے میں کسی کو اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بلاتکلف کہہ دیتے کہ بھائی اُس وقت تو میں تنہائی چاہتا ہوں۔ ہاں کل کسی وقت آنا۔ پھر فرصت سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب کے تکیہ کے نیچے سے جو کاغذ برآمد ہوتا وہ تازہ ترین شعروں سے مزین ہوتا[3]۔"

مخلوط تعلیم

"صنف نازک کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ کہ خواتین کا کام گھروں میں رہ کر نئی نسل کو تربیت دینا ہے کہ اس طرح معاشرے میں اعتدال و سکون قایم رہ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب عورت کو "شمع انجمن" نہیں "چراغ خانہ" دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے سامنے یورپ کی زندگی تھی کہ عورت نے وہاں جب سے گھریلو ذمہ داری، تدبیر منزل اور خانہ داری کو خیرباد کہا ہے۔ یورپ کا معاشرہ تباہ و ابتر ہو کر رہ گیا ہے اور گھریلو زندگیاں بے مزہ اور بے سکون ہو گئی ہیں۔ ایک دن بیگم راس مسعود نے قدرے شکایت کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مرد خود تو تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لیے رقص و سرود کی محفلوں اور کلب گھروں میں چلے جاتے ہیں۔

---

1. سہو کتابت سے رہ گیا ہے۔
2. روزگار فقیر (جلد اول) صفحہ ۱۵۶
3. روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحہ ۱۵۸

لیکن بیچاری عورتوں کو چہار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی متین لہجہ میں کہا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام تر خواتین کا ہی فائدہ ہے۔
سفر افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا گیا کہ جب قرآنِ کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا۔ بے شک قرآنِ کریم میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں؟۔
پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے اور وہ اپنے اس موقف سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی بچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی کوشش اور جد و جہد کے بعد علی گڑھ سے ایک معلمہ بلوائی جس نے گھر میں رہ کر ڈاکٹر صاحب کی بچی کو تعلیم دی۔
ڈاکٹر صاحب منطقی اور فلسفیانہ انداز میں مردوں اور عورتوں کو ایسے مختلف خوش رنگ اور مہکتے پھولوں سے تعبیر کیا کرتے تھے جن کو پروان چڑھانے کے لیے جداگانہ اقسام کی کھاد درکار ہوتی ہے۔ وہ زن و مرد کی ترقی، نشو و نما اور تعلیم و تربیت کے لیے جداگانہ میدانِ عمل کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور فرائض کے اعتبار سے بھی!۔ فولاد اور پھول کی ڈالی سے ایک جیسا کام نہیں لیا جا سکتا[1]"
چند اور دلچسپ واقعات ہمیں غلام السیدین کی کتاب "آندھی میں چراغ" میں مل جاتے ہیں جو "ریاض منزل" سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

> "بھوپال میں بھی چند روز اُن کے ساتھ ٹھہرنے کا شرف نصیب ہوا۔ میں عمر بھر اس میزبان عزیز کی مہمان نوازی کے لطف اور خلوص و محبت کے سلوک کو نہ بھولوں گا۔ اس زمانے میں ان کا اور لیڈی مسعود کا قیام "ریاض منزل" میں تھا۔ یہ وہ مکان ہے جس کے دل کش پُر فضا منظر اور ماحول نے اقبال کے تغزل کو باوجود اُن کی علالت کے از سرِ نو بیدار کر دیا تھا۔ جہاں اُنھوں نے یہ اشعار لکھے تھے ؎
>
> یہ بحر، یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی — اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
> طلوعِ مہر، سکوتِ سپہرِ مینائی — سفرِ عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں
>
> سر راس مسعود اور لیڈی مسعود کی شفقت بھری میزبانی اب ایک حسین خواب معلوم ہوتی ہے۔ وہ مہمان کی پذیرائی میں حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ یہ زمانہ بعض لحاظ سے ان کی مجلسی اور خانگی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ ذاتی افکار سے بہت حد تک نجات پا کر ان کا دماغ بھوپال اور اہلِ بھوپال کی بہتری کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ اپنی علمی اور ادبی دلچسپیوں کی طرف بھی وہ زیادہ توجہ کر سکتے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت کوئی کتاب لینے کے لیے میں نے اُن کے کتب خانے کا دروازہ کھولا تو آٹھ دس پنڈت بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ان کے گرد بیٹھے تھے۔ میں نے دریافت کیا۔ سید صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟ معلوم ہوا کہ ان کی نگرانی میں سنسکرت کی بعض مستند کتابوں کا

---

[1] روزگار فقیر۔ (جلد اول) صفحات ۱۶۴ تا ۱۶۶

ترجمہ اُردو میں کیا جا رہا ہے۔ آٹھویں دن یہ سب وِدوان اپنے اپنے ترجمے کر کے لاتے ہیں اور مسعود صاحب ان سب کو پڑھوا کر سنتے اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں غیر معمولی طور پر وسیع تھیں۔ حافظ، میرؔ، انیسؔ، حالیؔ، اقبالؔ کا بہت سا کلام انھیں حفظ تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی کے ہزاروں اچھے اچھے شعر اُن کی زبان پر تھے۔ انیسؔ کے بعض مرثیوں کا ترجمہ انھوں نے انگریزی نظم میں اس قابلیت سے کیا تھا کہ اہلِ زبان اس کی داد دیتے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک خاص شگفتگی اور جدت تھی۔ موسیقی اور مصوری دونوں میں بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے اور مشرق اور مغرب کی آرٹ کی تحریکوں سے باخبر تھے۔

ان آخری بے تکلفی کی ملاقاتوں میں اُن سے گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ ان کے دل میں کیا کیا منصوبے تھے۔ کتنے بڑے بڑے علمی ادبی کام کرنے کی اُمنگ تھی۔ خیالات میں کتنی بلندی اور وسعت تھی۔ دل میں ملک اور قوم کا کتنا درد تھا۔ لوگوں سے کام لینے کی کتنی اچھی صلاحیت تھی۔ ان سے گفتگو کر کے دل سَیر ہو جاتا تھا۔ جس قوم میں ایسے انسان موجود ہیں اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔[1]"

"ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انھیں لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں۔ انھیں کبھی یہ فکر نہ ہوئی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قایم کریں۔ اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلندی کا اعلان نہیں کرتا! ان کو نہ سربلندوں سے انکسار تھا نہ خاکساروں سے سربلندی۔ ہر شخص انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی سلوک کا مستحق تھا۔ بلکہ میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے، اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو!" برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ ؎

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام
دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام[2]"

"اقبال کے انگریزی خطبات میں ایک چھوٹا سا معنی خیز جملہ ہے جو اس بارے میں اس کی بنیادی پوزیشن کو بہت

---

[1] آندھی میں چراغ (پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۲ء) صفحہ ۱۳۴-۱۳۵

[2] آندھی میں چراغ۔ صفحہ ۱۴۳

خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے اور افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کے لیے ایک صحیح بنیاد اور ایک صالح اصول کا تعین کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو قایم رکھنے کے لیے ہم جو کام بھی کریں اس میں ایک اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ۔ یعنی ہم اپنی خودی کا بھی احترام کریں اور دوسروں کی خودی کا بھی ۔" اپنی خودی کا احترام ؎ یہ ایک ایسا سُر ہے جو اقبال کے کلام میں شروع سے آخر تک سنائی دیتا ہے ۔ اس عقیدے کی روشنی میں اقبال نے انسان کے بلند مقام کو پہچانا ، اسے ایک اُمید اور حوصلہ آفریں پیغام دیا اور ان راستوں کی جھلک دکھائی جو اس کو ہم دوشِ ثریا کر سکتے ہیں[1] ۔"

"ریاض منزل" ۔ دولت کدۂ راس مسعود کے قیام میں ایک اور واقعہ کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی جو اقبال اور راس مسعود کے نیازمند اور عقیدت کیش تھے بیان کرتے ہیں :۔

_____ "مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی ۔ اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا ۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں ۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب (مرحوم) نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی ۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلامِ پاک سُن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا ۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا ، پر اقبال نے "ارمغان حجاز" میں دخترانِ ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

زشامِ ما بروں آور سحر را　　　　به قرآں بازخواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأتِ تو　　　　دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے ۔ مرحوم خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا ہے یا نہیں ۔ ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں ۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں ؟ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا ـــ قرآن کیا سنیں گی ۔ وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں ۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں ۔ میں کیا کروں ۔ مرحوم خاموش ہو گئے ۔ پھر فرمایا ۔ صبر، علی بخش صبر یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے !

اہلِ نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی ؟ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ اُن کی فکر و فرزانگی ، شاعری و شخصیت اور اُن کا مجموعہ اُن کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے ۔ یہ وہی مقام ہے جہاں اقبال ہم سے ، آپ سے اور

---

[1] آندھی میں چراغ صفحہ ۔ ۵۳ ۔

بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں اور جدا ہو کر اُن پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے[1]۔"

اسی واقعہ کو فقیر وحید الدین (مرحوم) نے بعنوان "نادرہ مسعود"[2] قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے جس کی بیگم راس مسعود نے بھی حرف بہ حرف تصدیق کی ہے۔

"ریاض منزل" کے زمانۂ قیام کے ان چند واقعات کے علاوہ ایک اور غیر معمولی واقعے کا تذکرہ سید نذیر نیازی کے مضمون بعنوان "علامہ اقبال کی آخری علالت" میں ہمیں ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"بھوپال میں حضرت علامہ کا قیام بالعموم سر راس مسعود مرحوم ہی کے یہاں رہتا اور سر راس مسعود اُن کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتے کہ خود حضرت علامہ کو بھی تعجب ہوتا۔ اُنھوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب انھیں پیٹھ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصلی سبب ضعفِ قلب ہے لہٰذا اُنھیں چاہیے کہ نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں ۔حضرت علامہ کہتے ہیں:۔

"ریاض منزل" میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا۔ میں جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے تاکہ زینہ چڑھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر میں نے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی تو میں نے کہا۔ آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ اسی دن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں آرام سے لیٹے رہیے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اُنھوں نے بتلایا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے[3]۔"

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جس کا تذکرہ محمد عبداللہ قریشی نے اپنے ایک مضمون بعنوان "حقیقت وحی اور اقبال"[4] میں ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی صدر شعبۂ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کے حوالے سے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے:۔

"ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے میں راس مسعود سے ملنے کے لیے بھوپال اُتر گیا۔ اتفاق سے اقبال بھی مسعود ہی کے مکان پر فروکش تھے۔ لیکن بیماری کا اُن پر غلبہ تھا۔ تقریباً فریش تھے۔ معراج کی شب تھی۔ مسعود کا مدارالمہام امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہجہانی میں منعقدہ تقریب میں شریک ہونا شاید ضروری تھا۔ تقریبِ معراج میں جاتے ہوئے مسعود نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

منبر پر فروکش ایک مولانا وعظ فرما رہے تھے۔ اُنھوں نے وحی اور نبوت کے اسرار

---

[1] گنج ہائے گرانمایہ صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵

[2] روزگار فقیر (جلد اول) صفحہ ۱۶۲ - ۱۶۳

[3] رسالہ اردو - دہلی - "اقبال نمبر" اکتوبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۳۰۸

[4] ماہنامہ ادبی دنیا - لاہور - مئی ۱۹۶۵ء - صفحات ۱۲ تا ۱۶

جس عامیانہ انداز میں پیش کیے اور جس دریدہ دہنی کے ساتھ اس موقع پر اقبال کے کلام سے استناد کیا، راس مسعود کو اس جہل و جرأت نے بہت دُکھ پہنچایا۔ وہ ان مہملات کو سننے کی تاب نہ لا سکے، زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکے اور جلد ہی لوٹ آئے۔ گھر پہنچے تو اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی دورے کی وجہ سے کسی قدر بے چین تھے۔ مسعود، جن کی سحر بیانی، خوش کلامی، اور دلربایانہ انداز گفتگو، فطری ظرافت اور خوش طبعی اقبال کے لیے ہزاروں دواؤں کی ایک دوا ہوا کرتی تھی اقبال کی مزاج پُرسی کے لیے ان کے کمرے میں چلے گئے اور ان کا دل بہلانے کی خاطر نہایت ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں مولانا کی اس ہرزہ سرائی کا ذکر کیا جس سے خود مسعود تو بُر دل ہوئے تھے لیکن اقبال کو خوش دل کر دیا۔

اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے مسعود کی گفتگو نے تریاق کا کام کیا ہے۔ یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اقبال کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور انھوں نے بڑے ہی ظریف لیکن متین انداز میں کہا۔

"اگر مولانا نے میرے کلام کو حسب منشا استعمال کیا ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟"

اس موقع پر اقبال نے امام غزالی کا ایک واقعہ بھی بیان کیا۔ "فرمایا کہ طویل سفر کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد غزالی دمشق پہنچے جمعہ کا دن تھا جمعہ پڑھنے کے لیے جامع اموبہ کا قصد کیا۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کے قریب جوتیوں کے پاس جگہ پائی۔ صفیں چیر کر آگے بڑھنے کے بجائے درویشانہ انداز میں وہیں بیٹھ گئے۔ نماز کے بعد ایک واعظ نے اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ ایک موقع پر اپنے کسی قول کی تائید میں اس نے امام غزالی کا نام استعمال کیا۔ غزالی چونکے، بڑے حیران ہوئے اور انھوں نے اپنی نیک نفسی سے واعظ کے متعلق بدگمان ہونے کی بجائے یہ خیال کیا کہ کسی غلط روایت پر اعتماد کر کے میری جانب یہ قول منسوب کر دیا ہے۔

آداب فقر و درویشی نے امام غزالی کو فوراً واعظ کی اس غلطی کی تصحیح کی اجازت نہ دی، مگر جب وعظ ختم ہو گیا اور مجمع چھٹ چکا تو نہایت تواضع اور انکسار کے ساتھ آگے بڑھے اور واعظ سے تخلیہ میں کچھ کہنے کی درخواست کی غزالی عمر میں واعظ کے باپ ہو سکتے تھے۔ مگر واعظ نے ان کو "بچہ" کہہ کر مخاطب کیا اور کہا۔

"میاں! ہم سے تخلیہ کیا، جو چاہو کہہ دو۔"

غزالی نے جب واعظ کو اس غلط انتساب پر متنبہ کیا تو وہ ایک دم طیش میں آگئے۔ کہا:۔

"کچھ دماغ میں خلل تو نہیں ہوا ہے کہ خود کو غزالی سمجھنے لگا۔ ارے تیرے باپ نے تیرا نام اگر غزالی رکھ دیا ہے تو کیا تو امام غزالی ہو گیا؟"

امام غزالی اس کا جواب تو کیا دیتے، صبر کیا اور خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر میں ان مولانا سے یہ کہتا کہ میرا یہ منشا ہرگز نہیں تھا جس کا اظہار آپ فرما رہے ہیں تو شاید غزالی سے کچھ بہتر سلوک میرے ساتھ نہ کیا جاتا۔"

مسعود سے اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال بالکل تندرست ہو چکے ہیں۔ لیکن مسعود نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور ان کو آرام کی نیند سونے کے لیے خدا حافظ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اقبال کے لیے ملاّجی کی اس ہرزہ سرائی نے مہمیز کا کام کیا اور ایک بہترین الہام کا سامان مہیا کر دیا۔ ع

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

ڈاکٹر ظہیر فرماتے ہیں کہ صبح جب ہم اقبال کے ساتھ چائے پی رہے تھے تو اقبال نے کہا کہ رات حقیقت وحی کے متعلق بے ساختہ ایک خیال نظم ہو گیا ہے۔ مسعود جن کے لیے اقبال کا ہر لفظ الہام کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نئے الہام کے سننے کے لیے سراپا اشتیاق اور مجسم گوش دکھائی دینے لگے۔ اقبال نے حسبِ معمول اپنے پُرتمکین اور باوقار لہجے میں فرمایا ؎

"عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، اور عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات[1]"

حقیقت وحی کے متعلق اس ملہمانہ خیال کو اور خود اقبال کی زبانی سُن کر ایک عجیب وجد اور سرشاری کی کیفیت تھی جو صرف محسوس ہی کی جا سکتی ہے۔ مسعود تو تقریباً جھوم رہے تھے اور مزے لے کر اس قطعہ کو دہرا رہے تھے اس نادر تخیل نے وحی کے متعلق تمام پردے ہٹا دیے۔ اجنبیت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت دور کر کے یہ محسوس کرا دیا کہ وحی باہر سے مسلّط کیا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ خود انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے اُبلا ہوا چشمہ ہے۔ پیغمبر کا ضمیر انسانیت کے لیے مجلّا اور شفاف آئینے کا کام دیتا ہے۔ اس میں ہر فردِ انسانی کے ضمیر اور زندگی کے فطری احتیاجات کا انعکاس ہوتا ہے۔ پیاسی فطرت کی آبیاری کے لیے اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے علم و عرفان کے چشمے اُبل پڑتے ہیں جو پوری انسانیت کے ضمیر کی نمایندگی کرتے ہیں[2]"

ان واقعات کی قدر و اہمیت اس لیے مسلّم ہے کہ یہ ایک عظیم شاعر و مفکر کی عام زندگی کی چند ایسی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جن سے ایک منفرد شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان واقعات کے پہلو بہ پہلو "ریاض منزل" کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں مفکر مشرق نے اپنے عزیز ترین دوست سید راس مسعود اور ان کی باشعور اور مہمان نواز بیگم کی رفاقت و معیت میں انتہائی مسرت انگیز اور یادگار لمحے بسر کیے۔ دونوں میاں بیوی ہمہ وقت اقبال کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کی ہر ممکن آسایش و راحت کا سامان بہم پہنچاتے۔

ایک ماہ سات دن کے قیام بھوپال کا عرصہ پلک جھپکتے گذر گیا۔ لیکن "ریاض منزل" اور "سید راس مسعود" کو دوام بخش گیا۔ "ضربِ کلیم" کی سات نظمیں جو اس ذیلی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

"ریاض منزل (دولت کدۂ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے"۔

---

[1] نظم بعنوان "وحی" ضربِ کلیم صفحہ ۳۳۔ یہ اشعار "ریاض منزل" دولت کدۂ راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

[2] اقبال کی کہانی۔ کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی۔ صفحہ ۵۵

——اقبال کی وہ یادگار اور تاریخ ساز نظمیں ہیں جو ہمیشہ ریاض منزل بھوپال اور راس مسعود کی یاد تازہ کرتی رہیں گی۔
یہ مشہور و معروف نظمیں "ضرب کلیم" میں جس ترتیب سے شامل کی گئی ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :۔

عنوان نظم —①	سلطانی —	صفحہ	۲۶
″ —②	تصوف —	″	۲۹
″ —③	وحی —	″	۳۳
″ —④	مقصود —	″	۶۶
″ —⑤	حکومت —	″	۷۶
″ —⑥	نگاہ —	″	۱۰۲
″ —⑦	اُمید —	″	۱۰۸

یہ نظمیں اُن آسودہ اور پرسکون لمحوں کی امین ہیں جو اقبال کو "ریاض منزل" میں میسر آئے۔ ان کا بیشتر وقت مطالعہ اور فکر شعر میں گذرتا۔ صبح وہ اسپتال جاتے۔ دن بھر مطالعہ اور آرام کرتے ۔ شام کو راس مسعود اور اُن کی بیگم کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے۔ بھوپال اپنی خوبیوں اور خوبصورتیوں کے لیے جو شہرت رکھتا تھا اُس سے اقبال کی تخلیقی صلاحیتیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ چنانچہ ان نظموں کے مطالعہ سے اقبال کی فکری سمت اور ان کی مدتِ تخلیق بآسانی متعین کی جاسکتی ہے۔

ان سات نظموں میں اگر "سلطانی" اور "تصوف" اُن کے مخصوص حکیمانہ انداز فکر کی ترجمانی کرتی ہیں تو "مقصود" ان کے منفرد فلسفۂ خودی کی غماز ہے ؎

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

پھر "فلاطون" کے ذیلی عنوان سے حیات و موت کی تشریح کرتے ہیں ؎

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود

اور پھر ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

کہکر وہ ذات و کائنات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور اپنے مخصوص لہجے میں جوانانِ ملت کو اپنی نظم "حکومت" میں یہ پیغام دیتے ہیں ؎

قسمتِ بادہ مگر حق ہے اُسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

حیات، موت، مرد دانشمند، خودی، اور مقصودِ خودی، ملت، جوانانِ ملت —— اقبال کی ان چند نظموں کے مخصوص موضوعات ہیں۔ یہ تخلیقی سرمایہ۔۔ "ریاض منزل" ہی کا یادگار فکری سرمایہ ہے جو آج اور ہمیشہ

زندہ رہے گا۔ آخری دو نظمیں ہ ”نگاہ“ اور ”اُمید“ بھوپال کے خوش نما منظر اور اقبال کے جذب و سرور کی آئینہ دار ہیں ”نگاہ“ کے یہ تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

بہار قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر! یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
سفرِ عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی

اور ”اُمید“ کے یہ دو شعر ؎

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود

سچ پوچھیے تو بقول رشید احمد صدیقی :-

”_____ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے برخلاف لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں [1]“

یہی کچھ ان چند نظموں میں ہمیں ملتا ہے۔ حکمت و فلسفہ کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صداقتیں بھی اور عالمانہ بصیرتیں بھی ۔

۳۱ر جنوری تا ۷ر مارچ ۱۹۳۵ء کے پہلے قیامِ بھوپال کے دوران سید نذیر نیازی کے علاوہ اقبال کا ایک خط ہمیں اقبال نامہ میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام بھی ملتا ہے جو انھوں نے بھوپال ہی سے لکھا تھا۔ اس خط کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ ”ریاض منزل“ کے پُرسکون اور مسرت بخش ماحول میں وہ نہ صرف مطالعۂ فکر، شعر اور اصلاحِ شعر میں مصروف رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدت مندوں اور نیازمندوں کو جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے خط و کتابت میں بھی یاد رکھتے تھے اور اپنے قیمتی مشوروں سے انھیں نوازتے تھے۔ گویا شاعرِ مشرق کی فکر کا مرکز بھوپال تھا جس سے پورا ہندوستان فیضیاب ہو رہا تھا۔ ان کی صحت و عافیت، ان کی آفاق گیر عظمت، ان کی شاعرانہ بصیرت کا ایک محور بھوپال بھی بن گیا تھا جس کے تانے بانے سید راس مسعود نے بُنے تھے اور جو بالآخر

---

[1] گنجہائے گرانمایہ ۔ صفحہ ۱۸۰

نواب حمید اللہ خاں اور اقبال کے قریبی اور دوامی رشتوں میں منسلک ہو کر حیات اقبال کا ایک درخشندہ باب بن گیا۔ یہ درخشندہ اور تابناک باب اب تک تاریکی میں تھا اور دنیا کو ان کی تفصیلات کا بہت کم علم تھا۔ تاریخ صرف صداقت کا نہیں اظہار صداقت کا نام ہے اور یہ واقعات اظہار صداقت سے محروم تھے۔

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ جاگیردار ٹونڈہ پور۔ مشرقی خاندیش اقبال کے بے حد عقیدت مند تھے۔ ٹیگور سے اُن کے خاص مراسم تھے اور ان کے ایماء پر وہ اقبال سے ملنے لاہور بھی گئے تھے۔ وہ بیک وقت شاعر اور نثر نگار تھے۔ انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے اور اردو نظم و نثر سے بھی اُنھیں دلچسپی تھی۔ وہ اقبال سے مشورہ بھی لیتے تھے جیسا کہ اقبال نامہ کے خطوط (صفحات ۲۸۷ - ۲۸۸ اور ۲۸۹) کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا یہ لکھنا ۔ "کبھی کبھی جب طبیعت لگے ضرور شعر کہیے۔ آپ کی طبیعت شاعری کے (لیے[۱]) مناسب ہے اور آپ کی نظموں میں مجھ کو لطف آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھیے۔ آپ کی نثر بھی دلچسپ ہوتی ہے۔" اس بات کا غماز ہے کہ وہ لمعہ کی صلاحیتوں سے کافی متاثر تھے اور اُنھیں برابر مشورے دیتے تھے۔

اردو کا کلام وہ اقبال کو بھیجتے تھے اور اقبال اُس پر مناسب اصلاح کر کے اُنھیں لوٹا دیتے تھے۔ لمعہ جو حیدر آباد میں رہتے تھے۔ خود حیدر آباد میں بہت کم مشہور تھے جس کا تذکرہ ہمیں نظر حیدر آبادی کی کتاب ——— "اقبال اور حیدر آباد" میں ملتا ہے:۔

> ——— "یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام سے "اقبال نامہ" کی اشاعت سے قبل خود اہلِ حیدر آباد بہت کم واقف تھے۔ لیکن ان خطوط کے مطالعے سے ان کی صلاحیتوں سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس کہ اقبال سا شاعر جن کی صلاحیتوں کا معترف ہے وہ حیدر آباد میں اتنے گم نام رہے[۲]۔"

بھوپال سے تحریر کردہ یہ خط نہ صرف اقبال سے لمعہ کے قریبی روابط کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ اس بات کا انکشاف بھی کہ اقبال لمعہ کو اپنے قیمتی مشوروں سے برابر نوازتے تھے۔ اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے دل سے معترف تھے۔ لکھتے ہیں:۔

> "مخدومی۔ تسلیم!
> میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ آپ کی تازہ نظم میں پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اس میں اصلاح کی گنجایش نہیں ہے۔ میں یہ سُن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ دنیا کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ آپ کی عمر کے لحاظ سے بالکل درست ہے مگر آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا ایک بہت اہم مقام ہے اور اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں انسان کامل بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مولانا رومی کو بغور پڑھیے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے،

۱؎ "لیے" سہواً رہ گیا ہے۔
۲؎ اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۲۳۱

اس سے انکار نہ ہو۔میرے گلے کی حالت اب روبصحت ہے۔آپ کے گراں قدر مشوروں کا شکریہ۔

نگہدار آنچہ درآب و گلِ تُست
سرور و سوز و مستی حاصلِ تُست
تہی دیدم سبوئے این وآں را
مئے باقی بہ مینائے دلِ تُست

آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے۔ شکریہ۔
زندہ ہوں، دل مضمحل، مسرت فنا، اللہ اللہ۔ خیر صلا۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور
۲۰ رفروری ۱۹۳۵ء[1]"

خط کے آخر میں۔"مخلص محمد اقبال ۔لاہور" شاید اس لیے لکھا ہے کہ فروری کے آخر میں وہ بھوپال سے روانہ ہونے والے تھے۔ یہ خط ۲۰ رفروری ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے اور خط کے آغاز ہی میں انھوں نے لکھا ہے "میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں" مقصد یہ تھا کہ ملحقہ انھیں لاہور کے پتے پر جواب دیں اگر بھوپال میں طویل قیام ممکن ہوتا تو سید نذیر نیازی کے خطوط کی طرح وہ "ریاض منزل" کا پتہ اس خط پر ضرور تحریر کرتے۔ ملحقہ سے ان کی مستقل خط وکتابت تھی جیسا کہ اقبال نامہ کے خطوط بنام ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ (صفحات ۲۶۲ تا ۲۹۸) کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

آخر فروری ۱۹۳۵ء تک اقبال کا پابندی سے علاج جاری رہا،اُن کی صحت وتوانائی میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ علاج کا پہلا کورس مکمل ہونے کے بعد اُنھیں ڈاکٹروں نے لاہور جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ، ۲۷رفروری اور ۴رمارچ ۱۹۳۵ء کے خطوط میں نیازی صاحب کو قصدِ روانگی سے مطلع کرتے ہیں۔لاہور کی روانگی اب اس لیے ضروری تھی کہ اقبال کی اپنی صحت پہلے سے نسبتاً بہت اچھی تھی ـــــ لیکن والدۂ جاوید کی تشویشناک علالت کے سبب وہ بے حد فکرمند اور متردّد تھے جس کی اطلاعات اُنھیں برابر مل رہی تھیں:۔

"بھوپال ـــــ ۲۷رفروری ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ـــــ میں ۷، یا ۸رمارچ کی شام کو یہاں سے چلوں گا۔اور ۸، یا ۹رکو ساڑھے نو بجے دہلی پہنچوں گا۔ وہاں ایک دو روز قیام کروں گا۔ آپ سردار صلاح الدین سلجوقی صاحب کو بھی مطلع کر دیں۔بعد میں پھر میں آپ کو اور اُن کو بذریعہ تار یا خط مطلع کر دوں گا۔ باقی بروقت ملاقات ـــــ والسلام ـــــ محمد اقبال[2]"

"بھوپال ـــ ۴رمارچ ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ـــــ السلام علیکم

میں ۷رکی شام کو یہاں سے چلوں گا۔۸رکی صبح دہلی پہنچ جاؤں گا۔ یہ گاڑی ۹ بجے

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحات ۲۸۳ - ۲۸۴ - [2] مکتوبات اقبال - صفحہ ۲۶۱

یا ساڑھے نو بجے دہلی پہنچتی ہے۔ ۸ر کا دن دہلی ٹھہروں گا اور ۹ر کی شام لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ سردار صلاح الدین سلجوقی صاحب کو بھی مطلع کر دیں۔ میں نے ان کو علیحدہ خط بھی لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب سے بھی ۹ کی صبح کا وقت۔ (۸ یا ساڑھے آٹھ) مقرر کر دیں۔ ان سے ملے بغیر لاہور جانا ٹھیک نہیں ——— ہاں راغب احسن صاحب کو مطلع کر دیں۔ اُن کا پتہ یہ ہے:۔

2, Canning-Lane,
New Delhi.

باقی انشاء اللہ وقت (بوقت[۱]) ملاقات ——— والسلام

محمد اقبال[۲]"

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال ۸ر مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچے تو نیازی صاحب نے اُن کا اسٹیشن پر استقبال کیا۔ اُن کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی۔ دورانِ گفتگو بھوپال کے معالجین کی خصوصی توجہ اور علاج کا ذکر بھی آیا چنانچہ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں !۔

———" حضرت علامہ ۸ر کی صبح دہلی تشریف لائے۔ صحت نہایت اچھی تھی ——— معالجینِ بھوپال کو یقین تھا ان کے علاج سے حضرت علامہ کا مرض جاتا رہے گا[۳]"

دوسرے روز وہ حکیم نابینا صاحب سے ملے۔ انھیں نبض دکھائی اور بیگم صاحبہ کی علالت اور دواؤں کے بارے میں گفتگو کی اور شام کی گاڑی سے لاہور تشریف لے گئے۔

۱؎ (بوقت) (نیازی)
۲؎ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۶۲
۳؎ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۶۳

اقبال اور وظیفہ

۹ر مارچ ۱۹۳۵ء کو اقبال دہلی سے روانہ ہو کر لاہور پہنچے تو رفیقۂ حیات کو شدید علیل پایا۔ گھر کا نظام درہم برہم تھا۔ جاوید اور منیرہ ابھی بہت کم سن تھے۔ اِن حالات میں اُن کی ذہنی پریشانی اور اُن کے قلبی انتشار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ بیگم صاحب کی دوائیں دہلی سے آتی تھیں اور وہ پابندی سے اُن کے امراض کی تفصیلات سے نیازی صاحب کو مطلع کرتے تھے۔ اب بھوپال سے واپسی کے بعد بیگم صاحبہ کو نہایت کمزور حالت میں پایا تو لاہور پہنچتے ہی نیازی صاحب کو صورتِ حال سے مطلع کرتے ہوئے تاکید کی کہ جلد حکیم صاحب سے مشورہ کر کے جواب دیں:۔

"لاہور ــ ۱۱ر مارچ ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ــ السلام علیکم

میں بخیریت لاہور پہنچ گیا۔ جاوید کی والدہ نے دوا آج سے شروع کر دی ہے۔ وہ اب چل پھر سکتی ہے۔ اور بواسیر کی شکایت بھی نہیں ہے مگر اور شکایتیں بہت ہیں۔ ان کی طرف حکیم صاحب کی توجہ دلائیے اور مجھے مطلع کیجیے۔

(۱) جگر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس پہلو پر لیٹنا بھی مشکل ہے۔

(۲) رات کو کھانسی بہت آتی ہے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ جواب جلدی ــــــ والسلام

محمد اقبال [۱]"

اس خط کے ساتھ ہی اُسی دن انھوں نے نیازی صاحب کو دوسرا خط بھیجا جس میں بیگم صاحبہ کے عوارض اور شکایات کا کچھ اور تفصیل سے ذکر تھا۔ چنانچہ نیازی صاحب نے تمام تفصیلات حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ضروری ہدایات سے اقبال کو مطلع کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ خاموشی رہی۔

حکیم صاحب کی ادویہ سے بیگم صاحبہ کی تکلیف میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اُنھیں دہلی لے جا کر حکیم صاحب کو دکھا دیں۔ لیکن ابھی اُن میں چلنے پھرنے اور سفر کرنے کی سکت نہ تھی۔ اقبال کی اپنی صحت اگرچہ اچھی تھی

---

[۱] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۶۳

لیکن بیگم صاحبہ کی لگاتار اور پریشان کن بیماری کے سبب وہ بے حد متردد تھے۔ کیونکہ انھیں بجلی کا مزید علاج کرانے کے لیے پھر بھوپال جانا تھا جیسا کہ روانگی سے قبل بھوپال کے معالجین نے انھیں مشورہ دیا تھا اور بتایا تھا کہ کم سے کم ایک سال تک پابندی سے علاج ضروری ہے۔ چنانچہ حکیم محمد حسین عرشی کے نام ایک خط میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں:۔

"لاہور — ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب! — السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر بھوپال جانا ہوگا[1]"

خانگی مسائل کے ساتھ ساتھ انھیں قومی اور ملی مسائل کا بھی سامنا تھا۔ چنانچہ ان پریشان کن حالات میں بھی وہ اپنا بیشتر وقت نیازمندوں اور عقیدت مندوں سے صلاح و مشورہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے چند در چند مسائل کو حل کرنے میں صرف کر رہے تھے۔ انھیں دنوں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی۔ انجمن حمایت اسلام سے اُن کی وابستگی اور مسلمانوں کے اس نمایندہ ادارہ کی ترقی و بقا سے اُن کی خصوصی دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال کے قیام کے دوران نواب صاحب بھوپال سے بھی تفصیلی گفتگو کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ نواب صاحب لاہور آکر انجمن حمایت اسلام کے ایک اجلاس کی صدارت فرمائیں تاکہ مسلم قوم کی شیرازہ بندی کے لیے کچھ اور فضا سازگار ہو سکے اور یہ ادارہ مالی استحکام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علمی و فکری ترقی میں نمایاں حصہ لے سکے۔ چنانچہ راس مسعود کے نام ایک خط میں جو ۷ر مارچ ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے اس کا اظہار بھی کیا ہے:۔

"لاہور — ۷ر مارچ ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر مسعود

امید ہے آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ بخیریت ہوں گے۔ میں بھی بفضلِ خدا خیریت سے ہوں۔ میرا خیال ہے اعلیٰ حضرت کی لاہور تشریف آوری کے لیے ۱۲ر اپریل موزوں ہوگی۔ ۱۷ر اپریل کو تو گورنر پنجاب اجلاس میں رسمی شمولیت فرمائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۱۲ر اپریل تمام تر اعلیٰ حضرت اور مسلمانانِ پنجاب کے لیے ہی مخصوص رہے۔ اگر اعلیٰ حضرت انگلستان تشریف نہیں لے جا رہے ہیں تو اس انتظام کی طرف توجہ کیجیے۔ اُمید ہے اعلیٰ حضرت کے لیے ایک علیحدہ دن مخصوص کرانے میں میرے منشا کو آپ نے پالیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ قطعی طور پر طے پاگیا ہے کہ اعلیٰ حضرت عازم انگلستان نہ ہوں گے اگر ایسا ہے تو تار کے ذریعے اطلاع دیجیے اور یہ اطلاع بھی بذریعہ تار ہی دیجیے کہ ۱۲ر اپریل اعلیٰ حضرت کو منظور ہے۔ معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے؟ میں اس خط کا جو اس ماہ کے آخر میں آپ مجھے لکھنا چاہتے ہیں بے تابی سے منتظر ہوں۔

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۷

لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام اور اللہ کو دعا۔

محمد اقبال[۱]"

بھوپال میں اُن کے عزیز ترین دوست راس مسعود کی موجودگی اُن کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھی۔ انھیں کامل یقین تھا کہ نواب صاحب انگلستان نہ جانے کی صورت میں ضرور لاہور تشریف لائیں گے جیسا کہ ملاقات کے دوران نواب صاحب نے بھی اُن سے وعدہ کیا تھا۔ جب ایک ہفتہ تک راس مسعود کا جواب نہ آیا تو انھیں تشویش لاحق ہوئی کیونکہ انجمن کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں قریب آرہی تھیں اور تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مولوی غلام محی الدین مرحوم سکریٹری انجمن حمایت اسلام برابر اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ حال سے انھیں مطلع کر رہے تھے۔ چنانچہ اقبال نے ۲۹ ؍ مارچ ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کو دوسرا خط بھیجا جس میں دیگر امور کے علاوہ خصوصیت سے نواب صاحب کی لاہور میں آمد کے سلسلے میں استصواب کیا گیا تھا:۔

" لاہور ـــ ۲۹ ؍ مارچ ۱۹۳۵ء

ضروری

ڈیر مسعود۔ کئی دن ہوئے میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا مگر تاحال جواب نہیں آیا، شاید یہ خط آپ کو ملا نہ ہو۔ کیونکہ ان دنوں آپ بھوپال میں نہ تھے۔ والدۂ ماجدہ کی علالت کی وجہ سے علی گڑھ چلے گئے تھے۔ بہرحال اگر وہ خط مل گیا ہو تو جواب لکھیے۔ شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے۔ آپ کا خیال تھا کہ مارچ کے آخر میں آپ قطعی کسی فیصلہ کی اطلاع دے سکیں گے۔ میرے حالات اس امر کے متقضی ہیں کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو۔ گو میں آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اس طرف سے نا امیدی ہے۔ غرض کہ میں آپ کے جواب کا شدت سے منتظر ہوں۔

اس امر کی اطلاع آپ نے نہیں دی کہ آیا ہز ہائی نس جلسۂ انجمن میں جلوہ افروز ہوں گے یا نہیں اور مجھ سے ہز ہائی نس نے خود فرمایا تھا کہ اگر انگلستان نہ گئے تو ضرور تشریف لائیں گے۔ یہاں اس خبر سے جوشِ مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مہربانی کر کے مطلع فرمائیے کہ آیا ہز ہائی نس ولایت تشریف لے جائیں گے؟ مولوی غلام محی الدین سکریٹری انجمن نے دو تین روز ہوئے مجھے اطلاع دی کہ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مہربانی کر کے جلد اطلاع دیجیے۔

جب سے میں بھوپال سے واپس آیا ہوں لوگ زمینوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ میرے پاس کوئی اُن شرائط کی کاپی نہیں ہے جن کے مطابق اراضی دی جاتی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں ایک صاحب اسی غرض کے لیے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کو خط لکھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ خود بھوپال حاضر ہوں گے۔ شرائط کی کاپی ارسال کروا دیجیے تاکہ میں زمین کے خواستگاروں کو دکھا سکوں۔

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۲ ـ ۳۵۳

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ میں ان کے لیے دعائے صحت کرتا ہوں۔ انور میاں کو دُعا اور حکیم صاحب سے بھی سلام کہیئے ——— والسلام

محمد اقبال[۱]

کتاب کی نظرِ ثانی کے دوران خوش قسمتی سے راس مسعود کے چھ نادر خطوط بنام اقبال اور ان کے وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب بھوپال کی قیمتی یادداشت کا مسودہ جلیل قدوائی نے بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) اور ڈاکٹر احسان رشید کے تعاون سے راس مسعود کے کاغذات میں سے ڈھونڈ نکالا اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ قومی زبان کراچی میں شائع کردیا۔ یہ خطوط اور یادداشت کا مسودہ انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ جلیل قدوائی نے کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے حواشی لکھ دیے ہیں۔

اس گم شدہ سرمائے کی قدروقیمت کا صحیح اندازہ آپ کو اقبال کے خطوط اور راس مسعود کے جوابات سے ہوگا جو اس دَور کے عام حالات، اقبال کے ذاتی مسائل، وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب اور راس مسعود کی مخلصانہ سعی و کاوش پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ خطوط اور وظیفہ کی یادداشت پہلی بار اس کتاب میں شامل ہو رہی ہے اور مجھے یہ اظہار کرتے ہوئے مسرت ہے کہ اس باب میں مَیں نے جن واقعات اور حقایق کا تجزیہ کیا تھا اور جو نتایج اخذ کیے تھے وہ ان نایاب خطوط اور وظیفہ کی یادداشت سے بھی درست ثابت ہوئے۔

راس مسعود کے حسب ذیل خطوط مورخہ ۲۱ مارچ اور نقل خط مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء کے مطالعہ سے جہاں اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ راس مسعود اقبال کے سچے عاشقوں اور جاں نثاروں میں تھے وہیں یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ وہ اور نواب صاحب بھوپال اقبال کی آسودہ و مطمئن زندگی کے لیے درپردہ کیا کچھ عملی کوششیں کر رہے تھے جن کا نتیجہ اپریل تک برآمد ہونے کی توقع تھی۔ ملاحظہ ہو:

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۳ تا ۳۵۵

(۱)

ریاض منزل
بھوپال۔ سی۔ آئی
۳۱؍مارچ ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

مجھے تمھارا خط مورخہ ۲۹؍مارچ اسی لمحے ملا اور تمھاری اس شکایت پر کہ میری طرف سے تمھیں کوئی خبر نہیں ملی تعجب ہوا۔ میں اس خط کی ایک نقل بھیجتا ہوں جو یہاں سے تمھارے نام ۲۵؍مارچ کو ڈاک میں ڈالا گیا اور جو تمھیں ۲۹؍سے جب تم نے مجھے اپنا موجودہ خط لکھا بہت پہلے مل جانا چاہیے۔ جہاں تک تمھارے ذاتی معاملہ کا تعلق ہے میں سرِ دست اپنے پہلے خط مورخہ ۲۵؍مارچ ۱۹۳۵ء کے مضمون میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ اپریل میں کسی وقت ہم قطعی نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔ ہز ہائی نس سے زیادہ تمھاری بہتری کا کوئی خواہش مند نہیں ہے اور میں پھر کہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں جو کچھ ان سے ممکن ہے کر رہے ہیں۔

میں نے ۲۵؍مارچ کو مولوی غلام محی الدین صاحب کو حسب ذیل مضمون کا تار بھیجا تھا:

"افسوس کہ غیر متوقع مصروفیات کے سبب ہز ہائی نس اس بار سالانہ جلسے میں شرکت نہیں کر سکتے۔ آیندہ سال شرکت کی توقع رکھتے ہیں۔ یہی مضمون اقبال کو بھی لکھ بھیجا ہے۔"

جہاں تک یہاں کے شرائطِ تقسیمِ اراضی کا تعلق ہے اس سلسلے میں ضروری کاغذات تمھیں بھجوا رہا ہوں۔

آج میں سرکاری کام سے پانچ دن کے لیے اندور جا رہا ہوں اور واپسی پر تمھیں پھر خط لکھوں گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور مایوس نہ ہو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جتنی کچھ بھی کوششیں ہو رہی ہیں ان کا نتیجہ قابلِ اطمینان نکلے گا۔

صمیمِ قلب کے ساتھ
تمھارا ہمیشہ
سید راس مسعود

ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ نائٹ
بار ایٹ لا۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

(نقل خط منسلکہ)

ریاض منزل
بھوپال۔ سی۔ آئی
۲۵ مارچ ۱۹۳۶ء

(۲)

میرے نہایت پیارے اقبال

میں علی گڑھ سے آج ہی صبح واپس آیا اور تمھارے اس مشفقانہ تار کے جواب میں جو مجھے علی گڑھ میں عین اس وقت ملا تھا جب میں بھوپال کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک تار بھیجا ہے جس میں تمھیں والدہ صاحبہ کی حالت سے مطلع کیا ہے۔ امتلؔ[1] اور میں سخت فکر مند اور پریشان رہے اور مارا مار علی گڑھ کا سفر کرنے اور وہاں سے واپس آنے کے سبب تھک کر چور ہو گئے ہیں۔

آج صبح ہز ہائی نس نے مجھے شرفِ باریابی بخشا مگر تمھیں مایوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت اپنی چند در چند غیر متوقع اہم مصروفیات کی وجہ سے امسال انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت نہ کر سکیں گے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تمھیں مطلع کر دوں۔ اگر کوئی ناگہانی مجبوری نہ آ پڑی تو وہ انجمن کے اجلاس ۱۹۳۷ء میں تم سب کے ساتھ موجود ہونے کی پوری کوشش کریں گے۔ لہٰذا تمھیں "دیر آید درست آید" کی مثل کی صداقت پر یقین رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے انشاء اللہ جب آیندہ سال اعلیٰ حضرت لاہور تشریف لائیں گے تو وہ سب کے لیے اپنی آمد کو حقیقی مسرت کا موجب بنا دیں گے۔

اب سنو "معاملہ معلومہ" کی بابت۔ بس کچھ ہی دن کی بات ہے۔ ذرا اور انتظار کر لو کیونکہ ہز ہائی نس تمھیں کوئی قابلِ اطمینان بات اپریل کے مہینے میں کسی وقت لکھ سکیں گے۔ اعلیٰ حضرت تمھارے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک انسان سے ممکن ہے اور کم از کم میں تو نتیجہ کی طرف سے پُر امید ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے اجازت نہیں۔ تمھارے ان محب خاص نے جن کی طرف سے خلیفہ عبدالحکیم نے تمھیں اطمینان دلایا تھا، معلوم ہوتا ہے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ متبادل تجویز پر عمل در آمد آج سے شروع ہو گیا۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ ہم میں سے جو لوگ تمھارے عاشق ہیں تمھارے لیے اپنی امکانی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ میں تمھیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ آج دنیا بھر میں ہز ہائی نس ــــ نواب صاحب بھوپال سے بڑھ کر تمھارا کوئی بہی خواہ موجود نہیں ہے۔ میں نے حقیقتاً یہ خط خوشی کی کیفیت میں لکھا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم ہماری تجویز نمبر ۲ کے نتیجے کے بارے میں ذرا بھی مایوسی سے کام لو۔

---

[1] سابق لیڈی مسعود جو شادی سے قبل امۃ الرشید تھیں اور جنھیں اپنا شریکِ حیات بنانے کے بعد مسعود لاڈ میں امتل کہتے تھے۔ (جلیل قدوائی)

میری ابدی محبت اور میری والدہ صاحبہ کی تمہاری بحالی صحت کے لیے بہترین
دعاؤں نیز امتنان کی نہایت مؤدبانہ تسلیم کے ساتھ۔

بخدمت سر محمد اقبال - نائٹ — میں ہوں۔ ہمیشہ تمہارا چاہنے والا
بیرسٹرایٹ لا۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور — سید راس مسعود لہ

اقبال کے ۲۰ مارچ اور ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے خط اور راس مسعود کے ۳۱ مارچ اور ۵ مارچ ۱۹۳۵ء کے جوابات نہ صرف اقبال کے ـــــ راس مسعود اور نواب صاحب بھوپال سے قریبی ربط و تعلق کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ تین مختلف مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جن کی وضاحت اور تجزیہ کے بغیر اقبال کی بھوپال سے خصوصی وابستگی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

پہلی بات ـــــ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس سے تعلق رکھتی ہے جس کا ان خطوں میں تذکرہ ہے۔ اقبال کی دلی خواہش تھی کہ نواب صاحب بھوپال انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوں۔ کیونکہ جب سے یہ اطلاع پنجاب والوں کو ہوئی تھی وہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ راس مسعود کے خط اور مندرجہ تار کے مضمون سے ظاہر ہے ـــــ نواب صاحب چند غیر متوقع اور اہم ـــــ مصروفیات کے سبب انجمن کے سالانہ جلسہ میں شرکت سے قاصر رہے۔

دوسرا مسئلہ بھوپال کی تقسیم اراضی سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے خط کا یہ حصہ:

> ـــــ جب سے میں بھوپال سے واپس آیا ہوں لوگ زمینوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ میرے پاس کوئی ان شرائط کی کاپی نہیں ہے جن کے مطابق اراضی دی جاتی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں ایک صاحب اسی غرض کے لیے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کو خط لکھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ خود بھوپال حاضر ہوں گے۔ شرائط کی کاپی ارسال کروا دیجیے تاکہ زمین کے خواستگاروں کو دکھا سکوں۔

دراصل اس تجویز کا ایک حصہ ہے جو اقبال نے بھوپال کے پہلے قیام (۳۱ جنوری تا ۸ مارچ ۱۹۳۵ء) کے دوران نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ انھوں نے نواب صاحب سے درخواست کی تھی کہ ریاست کے غیر آباد علاقوں میں مسلمانوں کو آباد کر دیا جائے اور انھیں ریاست کی جانب سے آبادکاری کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمینوں کی کاشت سے پیداوار اور عوام کی خوش حالی میں اضافہ ہو سکے۔ اس تجویز کو نواب صاحب نے پسند فرمایا اور ضروری احکام جاری ہو گئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے ایک عینی شاہد حسن عزیز جاوید (مرحوم) (جو حضرت قدسی کے ارادت مندوں میں شامل ہیں) مجھے کراچی ہی میں مل گئے اور انھوں نے مجھے آبادکاری کے سلسلے میں اقبال کی تجویز کی پسندیدگی کے علاوہ آبادکاروں کے لیے جو انتظامات خصوصی ریاست کی جانب سے کیے گئے تھے ان کی تفصیلات مہیا کر دیں جن کا مطالعہ

لہ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل ۱۹۳۶ء، صفحہ ۷ تا ۹

خالی از دلچسپی نہ ہوگا :۔

حسن عزیز جاوید ۱۹۰۵ء میں ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حاجی محمد عمر دراز خاں صاحب نواب صدیق حسن کے ایماء پر سندیلہ (یو۔پی) سے بھوپال آکر آباد ہوگئے تھے۔ جاوید صاحب نے اردو، انگریزی، ہندی، مرہٹی زبانوں میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور ابتداً خواجہ حسن نظامی سے تربیت حاصل کی۔ پھر لاہور، کلکتہ، اور دہلی کے متعدد اردو، انگریزی اخبارات و رسائل سے منسلک رہے۔ تقریباً بارہ سال تک حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات میں خدمات انجام دینے کے بعد آپ کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" کے وقائع نگار خصوصی مقرر ہوگئے، اور ۱۹۴۷ء تک اسی اخبار سے وابستہ رہے۔ آپ کی تصانیف میں ٹرائل آف بہادر شاہ" (جس کا ایک ہی نسخہ لال قلعہ میں تھا) کا اردو ترجمہ بعنوانات "بہادر شاہ کا مقدمہ" "غدر دہلی کے اخبار نویس" اور "غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط" آپ نے خواجہ حسن نظامی کے ایماء پر کیا۔ مختصر افسانوں کے چار مجموعے اور کئی غیر مطبوعہ مسودات شامل ہیں۔

آپ کو نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ دریافت پر آپ نے جو تفصیلات بتائیں اُن سے اقبال کے مندرجہ بالا خط کی نہ صرف تصدیق ہوتی ہے بلکہ کئی نئی باتیں بھی ہمارے علم میں آتی ہیں :۔

"صحیح تاریخ اب یاد نہیں۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ سلطان پور نیل گڑھ کی آبادکاری کی اسکیم کا حکومت ریاست بھوپال نے اعلان کیا تھا اور میں اُس سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اخبار اسٹیٹسمین کے نمایندہ اور وقائع نگار کی حیثیت سے بھوپال گیا تھا۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ اس وقت "ریاض منزل" (بھوپال) میں قیام فرما تھے۔ علامہ سے بھی ملا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلم ریاستوں میں اگر مسلمان اکثریت کی کوشش نہ کی گئی تو آیندہ یہ ریاستیں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اور میں نے نواب صاحب بھوپال کو آمادہ کرلیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو باہر سے بلا کر ریاست میں آباد کرائیں۔

پھر اسی ضمن میں نواب حمید اللہ خاں (مرحوم) والیٔ ریاست بھوپال کے ہاں باریابی کا شرف حاصل کیا تھا اور میرے استفسارات کے جواب میں نواب صاحب نے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا حوالہ دے کر فرمایا تھا کہ میری حکومت نے اُن کا مشورہ بطیبِ خاطر قبول کیا ہے اور اب زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ریاست میں آکر آباد ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

سلطان پور نیل گڈھ کا علاقہ بھی دیکھنے گیا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں سرسبز و شاداب وسیع و عریض خطۂ ارض تھا۔ اس علاقہ میں ایک دریا بھی بہتا تھا۔ نگرانِ اعلیٰ افسر نو آبادیات نواب زادہ سعید الظفر خاں (نواب صاحب کے بھتیجے) مقرر ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے قافلے کے قافلے شمالی ہند سے وارد ہو رہے تھے۔ کوئی ٹرین آبادکاروں سے خالی نہ جاتی تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹرین رُکتی تو اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے۔ ان لوگوں کا شاندار اور پُرتپاک استقبال کیا جاتا۔ نواب زادہ صاحب بہ نفس نفیس ان کی قیادت کرتے اور منتخبہ علاقوں میں پہنچاتے۔ ان کے خور و نوش کا معقول انتظام ہوتا تھا۔

میں نے یہ دیکھا کہ جب یہ قافلے اور جماعتیں وہاں پہنچ جاتیں اور ان کے لیے اراضی اور جائے مسکن کی نشان دہی کردی جاتی تو یہ لوگ سب سے پہلے درختوں کو کاٹ کر ان کی لکڑی کے ستون کھڑے کرکے اوپر پتوں سے چھپر بنا لیتے اور

پھر اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی۔ باقاعدہ نماز ادا کی جاتی۔ اس کے بعد آبادی کی اس مسجد کے اطراف میں لوگ اپنے جھونپڑے بنا لیتے۔ حکومت انھیں سال بھر کھانے کے قابل غلہ بونے کے قابل بیج، جوتنے کے قابل بیل اور ضروریات کے لیے مختص رقم دیتی۔"

آبادکاری کی یہ اسکیم جیسا کہ حسن عزیز جاوید نے بیان کیا ہے اقبال کی تحریک پر نواب صاحب نے شروع کی تھی۔ جو عرصہ تک کامیابی سے جاری رہی لیکن کچھ مدت کے بعد بھوپال کے متعصب ہندوؤں نے کانگریس کی پشت پناہی سے اس کی شدید مخالفت شروع کردی اور لاکھوں روپیہ تقسیم کرکے ایک مخالف آبادکاری جماعت کھڑی کردی۔ جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ اس پروپیگنڈے سے بھوپال کے وہ مسلمان بھی جو کانگریس کے ہم خیال تھے اس جماعت میں شامل ہوگئے اور انھوں نے "بھوپال صرف بھوپالیوں کے لیے" کا نعرہ لگا کر ایجی ٹیشن شروع کردیا۔ جس کے نتیجہ میں فسادات ہوئے اور سیاسی فضا مکدر ہوگئی۔ انجام کار آبادکاری کی یہ اسکیم محض کانگریسیوں اور شوریدہ سروں کے ہاتھوں ناکام ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح "حیدرآباد۔ حیدرآبادیوں کا ہے" کے نعرے لگا کر حیدرآباد میں بھی ناعاقبت اندیشوں نے سرعلی امام صدرالمہام ریاست دکن کی آبادکاری کی تجویز کو ناکام بنادیا تھا جس کا خمیازہ تقسیم ملک کے وقت بھگتنا پڑا۔

آبادکاری کی اس اسکیم کی کامیابی اور ناکامیابی سے قطع نظر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اقبال کی اس تجویز کا حقیقی منشا و مقصد کیا تھا۔ وہ دراصل مسلم ریاستوں میں مسلم اکثریت دیکھنا چاہتے تھے۔ بھوپال میں ہندو اکثریت میں تھے اور کشمیر میں مسلمان۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بھوپال کے پہلے سفر کے دوران اقبال حسین خاں سے یہ دلچسپ بات بھی کہی تھی:۔

> "ہمارے خیال سے تو کشمیر نواب صاحب بھوپال کو دے دیا جائے اور بھوپال مہاراجہ کشمیر کو۔ وہاں مسلمانوں کی کثرت ہے اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت۔"

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ دوقومی نظریہ سے متعلق اپنے ذہن میں کیا نقشہ بنا چکے تھے اور نواب صاحب بھوپال کو کن دوررس نتائج کے تحت انھوں نے آبادکاری کی یہ اسکیم پیش کی تھی۔ بہرطور اقبال کے ان نظریات کے علاوہ ان کی دوراندیشی، ہندوستان کی تقسیم، مسلم اکثریتی علاقوں کی وحدت اور اس کے سیاسی اثر و نفوذ پر ان کی بالغ نظری سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے۔

ان خطوں کا تیسرا حصہ خود اقبال کی ذات سے تعلق رکھتا ہے جس کے پس منظر میں راس مسعود کی وہ مساعی تھیں جو وہ ان کی خصوصی امداد و اعانت کے سلسلے میں خاموشی سے کررہے تھے اور جن کا تھوڑا بہت علم اقبال کو بھی تھا۔ اگرچہ فوری طور پر ان کوششوں کے نتائج برآمد نہ ہوسکے لیکن خطوط کے ان اقتباسات سے اقبال کی ذہنی اور مالی پریشانیوں کی واضح طور پر نشان دہی ہوتی ہے۔

۱۲ رمارچ کے خط کا یہ اقتباس:۔

> "معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے؟ میں اس خط کا جو اس ماہ کے آخر میں آپ مجھے لکھنا چاہتے ہیں بے تابی سے منتظر ہوں۔"

اور ۲۹ رمارچ کے خط کا یہ حصہ واضح طور پر ان مساعی پر روشنی ڈالتا ہے جو راس مسعود اقبال کے مستقل وظیفہ کے سلسلے میں کررہے تھے تاکہ وہ جن مالی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے ان سے نجات مل جاتی اور وہ آسودگی۔

طمانیتِ قلب اور یک سوئی کے ساتھ فکر و تخلیق کا فریضہ انجام دے سکتے۔

"شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے۔ آپ کا خیال تھا کہ مارچ کے آخر میں آپ کسی قطعی فیصلہ کی اطلاع دے سکیں گے۔ میرے حالات اس امر کے متقضی ہیں کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو۔ گو میں آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اس طرف سے ناامیدی ہے۔ غرض کہ میں آپ کے جواب کا شدت سے منتظر ہوں۔"

راس مسعود سے اقبال کے ذاتی اور خانگی مسائل پوشیدہ نہ تھے۔ قیام بھوپال کے دوران ان مسائل پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی تھی اور راس مسعود کوشاں تھے کہ ریاست بھوپال کے علاوہ ریاست حیدر آباد، ریاست بھاولپور اور سر آغا خان ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیں تاکہ وہ قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے نوٹ تیار کر سکیں جس کا تذکرہ انھوں نے بھوپال کے دوران قیام راس مسعود سے کیا تھا۔

ان اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ انھیں حیدر آباد سے کسی وظیفے یا اعانت کی توقع نہ تھی۔ کیونکہ اس سے قبل وہ دو بار حیدر آباد جا کر نظام حیدر آباد۔ سر اکبر حیدری۔ اور مہاراجہ کشن پرشاد سے مل چکے تھے۔ مہاراجہ و سر اکبر حیدری نے اقبال کو حیدر آباد بلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن انھیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی تھی۔ اور یہ اطلاعات صرف افواہ کی حد تک ہی رہیں کہ اقبال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو کر آ رہے ہیں یا انھیں جامعہ عثمانیہ کی وائس چانسلری کی پیش کش کی گئی ہے۔ یہی صورت وظیفے کے سلسلے میں رونما ہوئی۔ حیدر آباد کی با اقتدار اور اقبال سے دلی عقیدت رکھنے والی شخصیتیں بھی ریاست سے ان کے وظیفے کا اجرا نہ کرا سکیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے "اقبال اور حیدر آباد" میں نظر حیدر آبادی نے جگہ جگہ اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ حیدر آباد کی ملازمت کے سلسلے میں افواہ پھیلنے پر اقبال نے جو خط مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا ہے اس کے اقتباس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا:-

"یہاں پنجاب اور یو۔ پی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دور دور سے مبارکباد کے تار اڑ گئے اور اضلاع پنجاب کے اہلِ مقدمات جن کے مقدمات میرے سپرد ہیں ان کو گونہ پریشانی ہوئی۔ بہرحال مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ [۱]"

لیکن بقول نظر حیدر آبادی:-

"مرضیٔ مولا کو یہ منظور نہ تھا کہ اقبال حیدر آباد کے ہو رہتے۔ اگرچہ حیدر آباد میں بھی اکثر یہ افواہیں پھیلتی رہتی تھیں کہ اقبال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنا دیے گئے" کبھی یہ سننے میں آتا کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس۔ لیکن ان میں سے کوئی خبر بھی حقیقت نہ بن سکی حالانکہ اہلِ حیدر آباد اور خصوصاً مہاراجہ کشن پرشاد اور اکبر حیدری وغیرہ جیسے ذی اثر حضرات دل سے چاہتے تھے کہ اقبال حیدر آباد آ جائیں [۲]"

حیدر آباد میں اقبال کے شایانِ شان ملازمت کی پیش کش اور اقبال کا وظیفہ مقرر نہ ہونے کے اسباب پر نظر حیدر آبادی ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:-

---

[۱] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۱۸۴ [۲] اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۱۳

"——— حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدر آبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدر آباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔ لیکن اس کا ملال بھی کو رہا کہ اقبال کے شایانِ شان عہدہ کے "اختراع" اور "تجسس" ان نے رجوع سرکارِ عظمت مدار"۔ برطانیہ کے نمائندہ حیدر آباد کے اشارے سے کبھی وجود میں نہ آسکا) ایک سامنے کی بات کو اکابر دکن کی نظروں سے اوجھل کر دیا اور وہ سیدھی سی بات تھی اُن کے لیے معقول وظیفہ کا اجراء۔ اور یہ بات کچھ ایسی مشکل بھی نہ تھی اور نہ اس سے کسی کو "خوف" ہو سکتا تھا۔ دیگر مشاہیر کے قطع نظر خود پنجاب کے ایک اور شاعر حفیظ[1] جس ریاست سے ماہانہ وظیفہ پا سکتے تھے وہاں اقبال کے لیے کسی وظیفہ کا اجراء کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی کو سوجھا ہی نہیں اور سوجھا بھی تو اُس وقت جب ریاست بھوپال نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا[2]۔"

اس پس منظر میں اقبال کا یہ لکھنا ———

"——— شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے۔"

اور پھر فوراً ہی ماضی کے تلخ تجربوں کی روشنی میں اپنی واضح رائے کا اظہار کر دینا:۔

"——— گو میں آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ مجھے اُس طرف سے نا اُمیدی ہے۔"

اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اُنھیں حیدر آباد کی اُلجھی ہوئی سیاست اور حیدر آبادی اور غیر حیدر آبادی کے نعروں سے آلودہ فضا کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا حالانکہ خود ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ حیدر آباد میں رہ کر ریاست کی خدمت سرانجام دیتے جیسا کہ سرکشن پرشاد کے نام اس خط کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے:۔

"——— حیدری صاحب تو اقبال کو بلاتے بلاتے رہ گئے۔ یونیورسٹی کے کاغذات ان کی طرف سے کبھی کبھی آجاتے ہیں کہ یہیں سے مشورہ لکھوں۔ اُدھر سے مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحات علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ ان کے تراجم اردو پر تنقید کروں گویا ان بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اور کام نہیں۔

میرا جذبِ دل تو بوڑھا ہو گیا۔ آپ کا جذبہ تو بفضلہٖ ابھی جوان ہے اور ہمیشہ رہے گا پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا[3]۔"

لیکن اقبال کو کھینچ لے جانے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہ تھی وہ تلخ حقیقت جس کے نتیجہ میں اُنھوں نے حیدر آباد سے کسی اعانت کی توقعات ختم کر دی تھیں۔ لے دے کر اب راس مسعود ہی ان کے مونس، جلیس اور غم خوار تھے جنھیں وہ بلا تکلف اپنا حالِ دل لکھ دیا کرتے تھے۔ وہ ان دنوں سخت مشکلات اور مصائب میں مبتلا تھے۔ ان کے مالی حالات بھی بے حد پریشان کن تھے۔ بیوی کی مسلسل علالت نے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ نذیر نیازی صاحب کو بھوپال سے لوٹ کر جو خط اُنھوں نے حکیم نابینا صاحب کو لاہور بلانے کے سلسلے میں

---

[1] ابوالاثر حفیظ جالندھری سے مراد ہے۔ [2] اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۲۰-۲۱
[3] اقبال نامہ (جلد دوم) صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲

لکھا ہے اُس کے اقتباس سے ان کے ذاتی حالات اور ذہنی الجھنوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

"_____ ایک سال سے زیادہ مدت ہوئی کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے کچھ کام نہیں کر سکا آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ تاہم جہاں تک ممکن ہوگا میں حکیم صاحب کے سفر کا بار اٹھانے کو حاضر ہوں [۱۱]"

ان حالات میں اقبال کا راس مسعود کو اپنے ذاتی مسائل کے سلسلے میں بار بار متوجہ کرنا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُنھیں راس مسعود کی بے ریا دوستی، سچی ہمدردی اور بے پناہ عقیدت مندی پر ناز ہی نہیں، ان کی مخلصانہ سعی و کوشش پر اعتماد بھی تھا۔

چنانچہ ایک اور خط میں جو ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے انہیں ریاست بھاول پور کا تذکرہ ملتا ہے اس کا تعلق بھی غالباً وظیفہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ خط کی عبارت واضح نہیں ہے اس لیے یہ گمان کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال سے جو خط نواب صاحب بھاول پور کو لکھوایا تھا وہ یقیناً وظیفہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مندرجات کا اقبال کو پہلے سے کوئی علم نہ تھا۔ لیکن اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال نے کسی دوست کے ذریعہ اس خط کے مضمون سے آگاہی حاصل کر لی چنانچہ لکھتے ہیں :-

"لاہور

۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر مسعود

اُمید ہے آپ کو میرا وہ خط جس میں مس فرکوہرسن کا خط ملفوف تھا مل گیا ہوگا۔ خط کشیدہ پیرا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ کاغذات بھی آپ کو مل گئے ہیں جو مس موصوفہ نے آپ کو بھیجے تھے۔

میں اور چند دوسرے احباب اعلیٰ حضرت کے استعفیٰ کے متعلق ایک بیان اورینٹل پریس میں بھیج رہے ہیں۔

میرے متعلق آپ کی جو تجویز ہے اس کا سراغ مجھے انجام کار مل ہی گیا۔ مجھے یہ اطلاع ایک بہاول پوری دوست کی معرفت ملی ہے اور یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے نواب صاحب بہاول پور کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کے مضمون سے تھوڑی بہت آگاہی ہوئی ہے۔ کیا میری اطلاع درست ہے ؟۔ اس خط کا جواب موصول ہونے پر میں اس سلسلے میں اپنی رائے آپ پر ظاہر کر سکوں گا۔

انور کو پیار۔ محمد اقبال [۱۲]"

اس خط کا راس مسعود نے فوراً جواب دیا اور اس خط کے مندرجات کے بارے میں بھی مختصراً وضاحت کر دی۔ ساتھ ہی اس امر کی تصدیق بھی کی کہ بہاولپور خط بھیجے جانے کی خبر درست ہے۔

سطور بالا میں مَیں نے وظیفہ کے سلسلے میں نواب صاحب بہاولپور کے نام خط کا تذکرہ کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ راس مسعود کے جواب مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء اور وظیفہ کی یادداشت سے لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوئے۔ راس مسعود کا یہ خط اور مسودۂ یادداشت کتاب کی نظر ثانی کے دوران دستیاب ہوا۔ ملاحظہ ہو :

بھوپال
۱۶ر اپریل ۱۹۳۶ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمھارا مہربانی نامہ مورخہ ۱۴ر اپریل مجھے ابھی ابھی ملا۔ ہاں بہاولپور خط بھیجے جانے کی خبر درست ہے۔ تمھاری دوست مس فرکوہرسن[1] کے کاغذات بھی مجھے مل گئے ہیں جن کا میں توجہ کے ساتھ مطالعہ کروں گا۔ میں متعدد امور میں بری طرح اُلجھا ہوا ہوں۔ ہز ہائی نس کے بھوپال واپس آجانے کے بعد میں ان سے تمھاری خط کشیدہ عبارت پر تبادلۂ خیال کروں گا مگر مجھے نہیں معلوم موصوف کی اس کے بارے میں کیا رائے ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئے دستور کے سلسلے میں طریق کار کی کسی تبدیلی کے لیے اب بہت تاخیر ہو چکی ہے۔

تم ہمارے پاس اپنا علاج جاری رکھنے کے لیے کب واپسی کا ارادہ رکھتے ہو۔ امید ہے کہ جیسا میں نے پچھلے خط میں عرض کیا تھا تم علی گڑھ جاؤ گے۔

محبت کے ساتھ

ہمیشہ تمھارا مخلص دوست

سید راس مسعود[1]

اقبال کے وظیفہ کے بارے میں ایک یادداشت

"قومی زبان" کے پچھلے اقبال نمبر (اپریل ۱۹۷۵ء) میں اپنے مضمون — "خطوط راس مسعود بہ نام اقبال" کے ایک فٹ نوٹ میں میں نے عرض کیا تھا کہ ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کے ایما سے علامہ اقبال کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہوار کے وظیفہ کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں — سر راس مسعود نے ہز رایل ہائی نس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں نیز دیگر مسلم والیانِ ریاست کو ارسال کرنے کی غرض سے ایک خط کا مسودہ تیار کیا تھا جسے میں نے ۱۹۷۰ء میں "خیابانِ مسعود" کے انگریزی حصہ میں شائع کر دیا تھا۔ اس فٹ نوٹ میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ اس مسودہ کا اردو ترجمہ بشرطِ حیات آیندہ کبھی شایع کیا جائے گا۔ چنانچہ علامہ اقبال پر "قومی زبان" کی موجودہ اشاعت خاص میں یہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ فٹ نوٹ مذکورۂ صدر میں کہا گیا تھا کہ اس اسکیم پر عمل نہ ہوا۔ مراد یہ تھی کہ یہ مراسلہ جاری نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ علامہ اقبال نے نواب صاحب بھوپال کے پانچ سو روپیہ ماہوار ہی کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ محترمہ بیگم صاحبہ چھتاری — (سابق لیڈی راس مسعود) سے بعد کی گفتگو میں معلوم ہوا کہ نواب صاحب (بھوپال) کی مقررہ رقم اسی اسکیم کا حصہ تھی اور موصوف کی منظوری کے بعد مسودۂ مذکور کی ترسیل بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ صرف ہز رایل ہائی نس آغا خاں مرحوم نے بقیہ پانچ سو

---

[1] مس فرکوہرسن - نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی طرف سے رائل کمیشن کی رپورٹ بابت فلسطین پر علامہ سے اُن کے اور جمیع مسلمانانِ غیر منقسم ہندوستان کے خیالات معلوم کرنے کی غرض سے خط و کتابت کر رہی تھیں۔ (جلیل قدوائی)

روپیہ ماہانہ کی اعانت منظور فرمائی تھی مگر علامہ نے یہ اضافی رقم قبول نہیں کی۔ یہ ضرور ارشاد فرمایا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اُسے قبول کرنے پر غور کریں گے لیکن اس قسم کی کوئی ضرورت پیش آنے سے قبل ہی وہ معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ (جلیل قدوائی)

مسودہ

آج میں یور ہائی نس کو ایک ایسے موضوع پر مخاطب کرنے کی جسارت کرتا ہوں جس پر پچھلے کچھ عرصے سے بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ مسلم والیانِ ریاست کی موروثی اعلیٰ روایات کے عین مطابق ہونے کے باعث وہ آپ کے فطری جذبۂ فیاضی کو متاثر کرے گا۔

دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر سر محمد اقبال کے نامِ نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ ان کا نہ صرف ہماری قوم کی ذہنی و فکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے بلکہ مغربی دنیا بھی آج اُنھیں ادب و فلسفہ ہر دو کے میدان میں مسلمانانِ ہند کی ثقافت کا عظیم نمایندہ تسلیم کرتی ہے۔ بد قسمتی سے گزشتہ بارہ ماہ سے وہ حلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور اس کی کوئی امید باقی نہیں کہ وہ آیندہ کبھی اپنی بیرسٹری کی پریکٹس جاری کر سکیں گے جو ان کی معاش کا واحد وسیلہ تھی۔ جب تک اُردو زبان ہمارے ملک میں بولی جاتی رہے گی۔ آیندہ نسلیں اقبال کا نام ایک ایسے صاحبِ کمال کی حیثیت سے جس نے ہماری شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی اور جس کے سبب ہماری مادری زبان کے ثقافتی معیار اور اس کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ محبت و افتخار کے ساتھ لیتی رہے گی۔

یہ امر ہمارے لیے شایاں ہوگا کہ ان تاریک ایام میں جو بد قسمتی سے اب ان کے سامنے آنے والے ہیں ہم سے جس قدر ممکن ہو ان کی خدمت کریں تاکہ یہ کہنے کو نہ ہو اگرچہ ہندوستان میں اس وقت مسلم والیانِ ریاست موجود تھے تاہم موصوف کو ناداری اور مصائب کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہماری نسل کے طولانی وقائع علم و ثقافت کے لیے ہمارے عظیم الشان حکمرانوں کی امداد و سرپرستی کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں اور انھیں اسباب کی بنا پر ان کے نام نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ مہذب دنیا میں قدر و منزلت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعراء واہلِ علم کے ساتھ اس قسم کی امداد کو مغرب کے ان نکتہ چینوں نے بھی مسلم ثقافت کا بنیادی جزو تسلیم کیا ہے جنھوں نے اسلامی ثقافت کی عظمت کو گھٹانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی ہے۔ ہمیں دنیا کو دکھانا چاہیے کہ ایسے افراد کی ہر امکانی امداد کے سلسلے میں جنھوں نے ہماری ثقافت کی خدمت کی ہے، آج کے مسلم والیانِ ریاست اپنے معزز پیش رووں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

ان امور کے پیشِ نظر میں اپنے برادر شہزادگان سے جو مسلم والیانِ ریاست بھی ہیں اپیل کرکے سر محمد اقبال کے لیے ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔ اس سے وہ نہ صرف اپنی باقی ماندہ مختصر زندگی نسبتاً اطمینان کے ساتھ گزار سکیں گے بلکہ اپنے مفید ادبی مشاغل بھی جاری رکھ سکیں گے۔

مجھے قوی امید ہے کہ آپ میری تجویز سے اتفاق کریں گے اور مندرجہ بالا مقصد کی خاطر بخوشی مبلغ ــــــ روپیہ ماہانہ کا عطیہ منظور فرمائیں گے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مسلم والیانِ ریاست کی طرف سے سر محمد اقبال کی شاندار خدمات کا متفقہ اعتراف جمیع مسلمانانِ ہند کے لیے مسرت کا باعث ہوگا اور مسلم ریاستیں ان تمام امور

کی ترقی و تحفظ کی راہ میں جنھیں ہماری قوم کی زندگی میں ثقافتی اہمیت حاصل ہے آج بھی جو عظیم الشان کردار ادا کر رہی ہیں یہ واقعہ اس کی ایک اور مثال ہوگا۔

میں خود مبلغ —— روپیہ ماہوار اس مد کے لیے نکال رہا ہوں اور شکرگزار ہوں گا اگر آپ بھی اپنا عطیہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو مجھے ارسال کر دیا کریں تاکہ سر محمد اقبال کو ہر ماہ باقاعدگی سے ایک ہزار روپیہ کی رقم پہنچتی رہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یور ہائی نس از راہِ کمال فیاضی جو رقم عطا کرنا منظور فرمائیں گے حضرت موصوف کو اس سے مطلع کر دیا جائے [۱۵]

اس نایاب یادداشت کی فراہمی کے بعد اقبال کے ان خیالات کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جس کا اظہار انھوں نے ریاست حیدر آباد اور ریاست بہاولپور کے بارے میں کیا ہے۔

۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے خط کا یہ اقتباس:

"شاید آپ حیدر آباد سے کسی جواب کے منتظر ہوں گے"

اور ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کا یہ اقتباس:

"میرے متعلق آپ کی جو تجویز ہے اس کا سراغ مجھے انجام کار مل ہی گیا۔ مجھے یہ اطلاع ایک بہاولپوری دوست کی معرفت ملی ہے اور یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے نواب صاحب بہاولپور کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کے مضمون سے بھی تھوڑی بہت آگاہی ہوئی ہے۔"

اس حقیقت کے غماز ہیں کہ انھیں ان دونوں ریاستوں سے کسی امداد و سرپرستی کی ہرگز توقع نہ تھی جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے بھی ثابت ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب بھوپال کی اس قابلِ قدر یادداشت کا ریاست حیدر آباد یا ریاست بہاولپور نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا بجز آغا خاں مرحوم کے۔

یہ تھیں راس مسعود کی وہ مخلصانہ کوششیں جو وہ اپنے عزیز ترین دوست کے لیے کر رہے تھے تاکہ انھیں جلد از جلد مالی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں سے چھٹکارا نصیب ہو سکتا۔ اور وہ اپنا تمام تر قیمتی وقت اس عظیم خدمت کے لیے وقف کر سکتے۔ جس کا تعلق قرآن مجید کے حواشی سے تھا اور جس کی تکمیل کی اقبال کو دلی آرزو تھی۔

راس مسعود اور اقبال کے درمیان اس عرصہ میں خط و کتابت کا سلسلہ پابندی سے جاری تھا۔ راس مسعود نے اقبال کو دوبارہ جلد بھوپال آنے کی دعوت بھی دی۔ خود راس مسعود کی صحت ان دنوں اچھی نہیں تھی اس کے باوجود وہ اپنے محترم دوست کے ہر خط کا جواب دے رہے تھے۔ راس مسعود اور اقبال کے حسب ذیل خطوط سے ان امور کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء سے قبل اقبال نے جو خط راس مسعود کو لکھا ہے۔ افسوس کہ وہ نہ اقبال نامہ میں شامل ہے نہ کہیں اور دستیاب ہو سکا —— اس کے باوجود راس مسعود کے خط مورخہ ۲۴ اپریل اور اقبال کے جواب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء سے اقبال کے صبر آزما حالات کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں:

"ریاض منزل
بھوپال۔ سی۔ آئی
۲۴ ؍اپریل ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمھارے محبت نامے کا شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ تم علی گڑھ نہ جا سکے اور یہ معلوم ہو کر کہ بیگم صاحبہ سخت علیل ہیں تکلیف ہوئی۔ تم نے محترمہ کی بیماری کی نوعیت نہیں لکھی۔ ایسی حالت میں اتنے فاصلے سے صحت یابی کی دعا کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔

تمھارے ذاتی معاملہ کی بابت صورتِ حال ذرا کچھ اور واضح ہو تو خبر دوں گا۔ پچھلے چار روز سے میں خود ملیریا کے شدید حملے کی وجہ سے بستر پر پڑ گیا اور اس نے جاتے جاتے مجھے کچھ بہرا اور خاصا بے حال کر دیا۔ مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ اپنا علاج جاری رکھنے کے لیے یہاں کس تاریخ کو پہنچ رہے ہو۔

امتل کی طرف سے مؤدبانہ سلام اور لیڈی اقبال کے لیے دعا قبول کرو۔ میری طرف سے علی بخش کو سلام اور جاوید کو دعا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال — ہمیشہ تمھارا چاہنے والا
بار ایٹ لا — سید راس مسعود"[1]
میکلوڈ روڈ۔ لاہور

یہ خط ملتے ہی اقبال نے جواباً لکھا:

(انگریزی)

"لاہور — ۲۶ ؍اپریل ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر مسعود ——

نوازش نامہ موصول ہوا۔ آپ کی علالت کی اطلاع باعثِ تشویش ہوئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ جلد آپ کو صحت کلّی عطا فرمائے۔ میں انشاء اللہ مئی کے

---

[1] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۴۶

آخر تک بھوپال آسکوں گا۔ میری بیوی گذشتہ دس سال سے بیمار اور تلّی اور جگر کے عوارض میں مبتلا ہے اور اب بوجہ بخار زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔

ہم لوگ انشاء اللہ وسط مئی تک اپنے نئے مکان میں چلے جائیں گے۔ خدا کرے کہ اس وقت تک میری بیوی میں چلنے پھرنے کی ہمت پیدا ہو جائے۔ آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کے اس کوشش میں کامیاب ہونے کی توی امید تھی اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآنِ کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِ غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآنِ کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔

بہر حال دیدہ باید۔ ہر امر اللہ تعالےٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اگر عالمِ جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لیے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام کہیئے۔ علی بخش آپ دونوں کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ جاوید بھی آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہے۔ محمد اقبال[1]"

اس خط سے مئی میں ان کے دوبارہ بھوپال جانے کے ارادہ کا اظہار بھی ہوتا ہے اور بیوی کی علالت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ "نئے مکان" سے مراد "جاوید منزل" ہے جو تکمیل کے آخری مرحلے میں تھی۔ اس خط میں واضح طور پر راس مسعود کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ان خطوط کی طرف اشارا کر کے اپنی مایوسی کا اظہار بھی کر دیا ہے جو راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال سے حیدر آباد اور بہاول پور بھجوائے تھے۔ ان کا یہ لکھنا ــــ

"مجھے اس سلسلہ میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں ــــ"

اور پھر انتہائی مایوسی کے عالم میں یہ اظہار کرنا:۔

"ــــ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا ــــ

اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآنِ کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا ــــ"

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۶ تا ۳۵۸

ان کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اقبال کی مایوسی اور دل برداشتگی کے باوجود راس مسعود نے اپنی پُرخلوص مساعی جاری رکھیں۔ حیدرآباد اور بھاول پور سے توقعات کے مطابق کامیابی نہ ہوئی تو اُنھوں نے نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خاں سے رجوع کرنا مناسب سمجھا جس کی اطلاع اُنھوں نے اقبال کو بھی نہیں دی۔ کیونکہ ان ہی دنوں نواب صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کی چانسلری سے استعفیٰ دے دیا تھا اور علی گڑھ کے حالات ایک بار پھر اُلجھ گئے تھے۔ ۲ر مئی کے خط سے بیوی کے آپریشن، بھوپال آخر مئی میں پہنچنے کے قصد اور نواب صاحب کے چانسلری سے استعفیٰ کے متعلق مسائل پر واضح روشنی پڑتی ہے:۔

(انگریزی)

"لاہور ــــــ ۲ر مئی ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر مسعود ــــ

اُمید ہے آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ دونوں بخیریت ہوں گے۔ الحمدللہ میری تشویش ذرا کم ہو گئی ہے۔ میری بیوی کو ایک آپریشن کرانا پڑا۔ اگرچہ یہ بڑا ہی ہولناک اور ناقابلِ برداشت منظر تھا۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی بچ گئی ــ میں انشاءاللہ مئی کے آخر میں آپ دونوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ نے کوئی اطلاع نہیں دی اس لیے میں سمجھتا ہوں معاملہ جوں کا توں ہی ہے۔

یونیورسٹی کا چانسلر اب کون ہوگا؟ کاش اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اپنے استعفیٰ پر دوبارہ غور فرما سکتے۔ لیکن شعیب صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ اس کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ لارڈ ولینگڈن نواب صاحب کو استعفیٰ پر مکرر غور کرنے پر ضرور مائل کر لیں گے۔

مجھے اطلاع دیجیے کہ اعلیٰ حضرت کا اس سلسلے میں کیا ارادہ ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت رضامند نہ ہوں تو پھر کیا آپ کی رائے میں نواب صاحب بھاول پور اس منصب کے لیے موزوں ہوں گے ــــ محمد اقبال ــــ

علی بخش آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے[1]"

اقبال کا خط پاکر راس مسعود نے پہلی فرصت میں جواب دیا اور انھیں مئی کے آخر تک بھوپال آکر علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ اس بار وہ نواب صاحب بھوپال کے مہمان ہوں گے اور اعلیٰ حضرت بہ نفسِ نفیس ان کے آرام دہ قیام کا مناسب انتظام فرمائیں گے۔ اسی خط سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ نواب صاحب بھوپال نے جن حالات کے تحت مسلم یونیورسٹی کی چانسلری سے استعفیٰ دیا تھا، ان پر نظرِ ثانی کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ خط کے آخر میں اقبال کے ذاتی معاملہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو:

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۵۸ ــ ۳۵۹

در بھوپال
۹ مئی ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمھارے نہایت پیارے خط مورخہ ۲ مئی کو پاکر مجھے بڑا اطمینان ہوا جس میں یہ خوش خبری تھی کہ خداوند تعالیٰ کی مہربانی سے تمھاری نیک بیگم صاحبہ کا آپریشن کامیاب رہا۔ ہاں، مئی کے آخر تک یہاں ضرور آجاؤ اور اپنا علاج جاری رکھو۔ شاید میری بیوی سے تمھاری ملاقات نہ ہو اس لیے کہ ــــ کم و بیش اسی زمانے میں وہ اندور چلی جائیں گی اور اس کے بعد جلد ہی مجھے بھی ان کے پاس چلا جانا ہوگا مگر میں نے ہزہائی نس سے ساری باتیں کرلی ہیں اور انھوں نے فرمایا ہے کہ وہ تمھیں بڑی خوشی سے اپنا مہمان بنائیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اعلیٰ حضرت بہ نفسِ نفیس یہاں تمھارے آرام دہ قیام کا مناسب انتظام فرمائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں اس امر کا زیادہ امکان نہیں ہے کہ ہزہائی نس مسلم یونیورسٹی کی چانسلری سے اپنے استعفیٰ پر نظرثانی کریں گے۔ اعلیٰ حضرت کسی اقدام میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور اسی لیے میرا خیال ہے وہ اپنی رائے نہیں بدلیں گے۔ تم چانسلری کے لیے جس شخص کو مناسب سمجھو اس کی سفارش کردو۔

ہزہائی نس اپنی چھوٹی شہزادی کو سوئٹزرلینڈ رخصت کرنے کے لیے جہاں انھیں بغرض علاج جانا پڑرہا ہے، بمبئی تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی واپسی پر مجھے معلوم ہوسکے گا کہ تمھارا معاملہ کس مرحلے میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کا تصفیہ ابھی تک نہ ہوسکا درحالیکہ ہزہائی نس اور مراسلہ ہذا کے ادنیٰ راقم سے زیادہ کوئی اور دو اشخاص اس معاملے میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔

مکرر۔ براہ کرم علی بخش کو میرا سلام پہنچائیں اور ان سے کہیں کہ جتنی گرمی انھیں اپنے پیارے لاہور میں لگ رہی ہوگی یہاں اس کی آدھی بھی نہیں۔

بہترین پیار کے ساتھ
تمھارا ہمیشہ
راس مسعود[1]

---

[1] ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۱۰

راس مسعود کے اس خط کے جواب میں اقبال نے ۱۲ر اور ۱۳ر مئی ۱۹۳۵ء کو یکے بعد دیگرے دو خط انھیں ارسال کیے جو بدنصیبی سے دست یاب نہ ہو سکے، البتہ نظر ثانی کے دوران راس مسعود کا خط مورخہ ۲۰ر مئی ۱۹۳۵ء مل گیا جس سے اقبال کے خطوط کے مندرجات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے ان خطوط میں قرآن مجید کے حواشی سے متعلق جو تجویز پیش کی تھی راس مسعود نے اس سے کلیتاً اتفاق کیا ہے اور انھیں کوئی دس دن اور صبر سے کام لینے کی تلقین کی ہے تاکہ اس عرصے میں وہ نواب صاحب بھوپال سے گفتگو کر سکیں۔

راس مسعود کے خط مورخہ ۲۰ر مئی اور اقبال کے جواب ۲۳ر مئی ۱۹۳۵ء سے ان مسائل پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے:

"بھوپال۔ سی آئی
۲۰ر مئی ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

مجھے تمھارے ۱۲ر اور ۱۳ر مئی ۱۹۳۵ء کے دونوں خط ملے۔ ہز ہائی نس کل ہی سیہور کو واپس تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ مجھے تمھارے معاملے پر اعلیٰ حضرت سے تبادلۂ خیال کا وقت نہیں ملا مگر اس ہفتے باریابی کا موقع بخشے جانے پر جلد ہی اس سوال کو اٹھاؤں گا۔ میں تمھارے دونوں خط اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں گزاروں گا۔ اس لیے کہ تم نے ان میں جو تجویز پیش کی ہے اس سے مجھے کلی اتفاق ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے تمھیں ایسی خبر سنانے کے قابل بنائے جس سے تمھاری موجودہ مشکلات رفع ہو جائیں۔ خدارا کوئی دس دن اور صبر سے کام لو۔

امتل کے بارے میں یہ ضرور ہے کہ انھیں ابتدائے ماہ جون میں اندور ضرور چلا جانا ہے اور میں غالباً اُن تک ۱۲ر تاریخ کے لگ بھگ پہنچ جاؤں گا۔ یہاں تمھارے باآسایش قیام کے سلسلے میں جیسا کہ اپنے ۹ر مئی کے خط میں لکھ چکا ہوں، ہز ہائی نس مناسب انتظامات فرمائیں گے۔ براہ مہربانی مجھے اپنی متوقع آمد کی صحیح تاریخ سے مطلع کریں۔

مکرر۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہز ہائی نس چند دن کے لیے پھر باہر تشریف لے جا رہے ہیں۔

صمیم قلب کے ساتھ
تمھارا ہمیشہ
سید راس مسعود [1]

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی زندگی کا یہ دور بڑی ابتلا و آزمائش کا تھا۔ ان کے سچے رفیق اور قدرداں ـــــ راس مسعود انھیں تقریباً ہر خط میں جلد بھوپال آنے کے لیے لکھ رہے تھے، لیکن اقبال اپنی بیگم کی خطرناک علالت کے سبب اس وقت لاہور سے باہر نہیں جا سکتے تھے ـــــ چنانچہ راس مسعود کا خط ملتے ہی انھوں نے فوراً جواب دیا۔

---

[1] ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۱۱

فوراً جواب دیا۔۔۔

"لاہور ۔۔۔ ۲۳رمئی ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر مسعود ۔۔۔

نوازش نامہ کے لیے جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ سراپا سپاس ہوں۔ میری خواہش تو حقیقت میں اس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفرِ آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دینے کا تمنائی ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ اعلیٰ حضرت کی خدمتِ اقدس میں اس مسئلے کو پیش کر دیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے مراحمِ خسروانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری آسائش کا ان کو اس قدر خیال ہے۔ میری بیوی خطرناک طور پر بیمار ہے، شاید یہ اس کے آخری لمحات ہیں لہٰذا میرے لیے لاہور سے اس وقت باہر جانا ممکن نہیں۔ آپ کو بعد میں اطلاع دے سکوں گا۔ مجھے اطلاع دیجیے کہ آپ اور لیڈی مسعود صاحبہ کب بھوپال واپس آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ لیڈی مسعود صاحبہ تو کچھ دیر اندور میں مزید قیام فرمائیں گی اور آپ جون کے آخر میں بھوپال واپس پہنچ جائیں گے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام کہیے۔ اور انور کو دعا۔ کیا حکیم صاحب ابھی وہاں ہی ہیں۔ امید ہے انھیں ملازمت مل گئی ہوگی۔۔۔

والسلام۔ محمد اقبال

ساڑھے پانچ بجے میری بیوی کا انتقال ہوگیا ۔۔۔ اقبال [۱]"

ابھی اقبال بھوپال جانے کے پروگرام کو آخری شکل دینے بھی نہ پائے تھے کہ ۲۳رمئی کو ہی ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہوگیا۔ اور خط بند کرتے ہوئے۔ آخری سطر میں انھوں نے راس مسعود کو اس المناک حادثہ کی اطلاع دیدی۔ اور دوسرے ہی روز انھوں نے نیازی صاحب کو بھی جو اس علالت کے دوران برابر اُن کی خدمت میں مصروف رہے تھے اس دردناک واقعہ سے مطلع کیا۔

"لاہور ۔۔۔ ۲۴رمئی ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ۔۔۔ السلام علیکم

کل شام چھ بجے والدۂ جاوید اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ اُن کے آلام ومصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینانِ قلب کا ۔۔۔ اللہ فضل کرے۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکو است

باقی رہا میں ۔۔۔ سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی۔ بھوپال نہ جاسکوں گا جب تک بچوں کے لیے کوئی معقول انتظام نہ ہوجائے [۲]"

اس حادثۂ جانکاہ پر نذیر نیازی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

۔۔۔ " جاوید منزل میں منتقل ہوئے ابھی تین دن گذرے تھے کہ یہ حادثۂ المیہ

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۰ ـ ۳۶۱

[۲] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۷۴ ـ ۲۷۵

پیش آیا اور ٹھیک اس وقت جب حضرت علامہ کو بیگم صاحبہ کی رفاقت اور معیت کی شدید ضرورت تھی لیکن عمر بھر کا یہ ساتھ اسی وقت ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا مشیتِ ایزدی یونہی تھی۔ میں نے تعزیت کا تار بھیجا۔ جامعہ نے بھی تعزیت کی۔

بچوں کی پرورش اور نگہداشت اب ایک دوسرا مسئلہ تھا جس نے حضرت علامہ کے لیے مستقل پریشانی کی صورت اختیار کرلی۔ یہ صورتِ حالات بڑی یاس انگیز تھی۔ "باقی رہا میں" ان الفاظ کو پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ بھوپال جانا بھی رہ گیا [۱]"

بیوی کی رحلت کے بعد اقبال نے سب سے پہلے گھر کے بگڑے ہوئے نظام پر قابو پایا۔ بچوں کی پرورش و نگہداشت پر توجہ دی اور پھر اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔

۳۰ رمئی کو انھوں نے پھر راس مسعود کو انتہائی مایوسی کے عالم میں خط لکھا۔

(انگریزی)

"لاہور ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود

'چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں'، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآنِ کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جدِ امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسّر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔

مخلص محمد اقبال [۲]"

عجب اتفاق ہے کہ اس خط کو سپردِ ڈاک کرنے کے فوراً بعد انھیں دوسری ڈاک سے راس مسعود کا وہ خط بالآخر مل گیا جس میں انھوں نے نواب صاحب کے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کرنے کی اطلاع دی تھی ۳۰ رمئی ہی کو انھوں نے یہ دوسرا خط راس مسعود کو ارسال کیا:۔

"لاہور ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں۔ انھوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت کا اور ان کے دودمانِ عالی کا ممنونِ احسان نہیں ہے

---

[۱] مکتوباتِ اقبال۔ صفحہ ۲۷۵-۲۷۶ [۲] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۱-۳۶۲

در دوستاں را باحساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند[1]

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سُنا دیجیے۔ میں خود حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا۔ اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے ہی، سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اس مضمون کا ایک خط مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار کے رہے گا اور وہ اس پر فخر کریں گے۔ میں انشاء اللہ یا تو چالیسویں کے بعد حاضر ہوں گا یا جب آپ اور لیڈی مسعود ابتداء اگست میں مع الخیر اندور سے بھوپال واپس آجائیں گے تو مہربانی کر کے مجھے یہ لکھ دیجیے کہ اگر میں جون کے آخر میں آؤں تو اپنے بھوپال پہنچنے کی کس کو اطلاع دوں۔ ممنون کو اطلاع دے دوں یا جس کو آپ لکھیں۔ لیڈی مسعود کی خدمت میں سلام۔ جاوید آداب کہتا ہے — باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے۔ بالخصوص آپ کے خاندان کی۔۔۔ آپ کا

محمد اقبال[2]"

راس مسعود کو خط لکھنے کے بعد انھوں نے لائف پنشن کے سلسلے میں نذیر نیازی صاحب کو بھی مطلع کیا:۔

"ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم۔

— اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے میری لائف پنشن پانچ (سو[3]) روپیہ ماہوار کر دی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا — والسلام

محمد اقبال — لاہور یکم جون

اس خط کی وضاحت کرتے ہوئے نیازی صاحب لکھتے ہیں:۔

"— عجلت میں حضرت علامہ پانچ کے بعد سو کا اضافہ کرنا بھول گئے۔ یہ امر کہ حضرت علامہ کو مالی پریشانیوں سے نجات ملی بڑا اطمینان بخش تھا۔ پھر مسرت بالائے مسرت یہ کہ حضرت علامہ تعلیمات قرآنی کی تشریح اور ترجمانی کا عزم رکھتے ہیں[4]"

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں ان کی سچی رفاقت، قدردانی اور رنگا رنگی تارسی و کوشش کے بعد ان کی بروقت

---

[1] یہ شعر اسی طرح مشہور ہے لیکن مطبوعہ کلیات صائب میں جہاں یہ شعر آیا ہے وہاں "افگند" کی جگہ "آورد" ہے۔
[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۲ تا ۳۶۴
[3] "سو" سہواً رہ گیا۔ (نیازی)
[4] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۷۶۔ ۲۷۷

اعانت کا سہرا صرف راس مسعود کے سر ہے جسے اردو ادب کی تاریخ اور آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کریں گی۔ نواب صاحب کے متعلق اقبال کا یہ کہنا ——

> "انھوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی ہے جب کہ میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت کا اور ان کے دودمانِ عالی کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔"

ان صداقتوں کا اظہار ہے جن سے اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کے ہر حکمراں نے تاریخ ادب میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ لہٰذا اقبال کا اظہارِ عقیدت مندی کسی خوشامد یا تملق سے عبارت نہیں۔ راس مسعود ان کے انتہائی مخلص اور عزیز ترین نیاز مندوں میں تھے۔ اور انھوں نے اس سلسلے میں جتنی کچھ مساعی کی تھیں وہ اس لیے نہیں کی تھیں کہ اقبال سے ان کی کچھ اغراض وابستہ تھیں — وہ تو ان گہری وابستگیوں اور دلی ارادت مندیوں کا نتیجہ تھا جو راس مسعود کو اقبال سے تھیں اور اقبال کو راس مسعود سے، جن کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

> "باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے۔ بالخصوص آپ کے خاندان کی —"

یہ اظہار بھی ان سچائیوں کا امین ہے جن سے سر سید کے اس جانشین نے درس تپش لیا تھا اور بھوپال کے ساتھ اقبال کی وابستگی کو نقشِ دوام بخش گیا تھا۔ اقبال جو خود حیاتِ دوام تھے راس مسعود کے ناتے ریاست بھوپال کو بھی اور نواب حمید اللہ خاں کو بھی حیاتِ دوام بخش گئے۔ تاریخ و تہذیب کے ان صداقت آفریں ابدی رشتوں سے کون ہے جو انکار کر سکے۔ ادیب و مفکر بھی انسانی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں اس لیے ان کی دستگیری اور اعانت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ زندگی کے لیے سانس کی — اس حقیقت پر کتنے لوگوں کی نظر رہی اور اقبال ایسی عظیم شخصیت کو آزمائش کے انتہائی صبر آزما لمحوں میں کس کس نے کتنی مدد دی؟ — یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں — نواب صاحب اور راس مسعود کے علاوہ شاید ہی کوئی اور شخصیت ایسی مل سکے جس نے اقبال کی بجا طور پر قدر دانی اور حقِ نیاز مندی ادا کیا ہو۔ یہ افتخار سچ پوچھیے تو نہ حیدر آباد کو حاصل ہو سکا نہ کسی اور ریاست کو، بجز ریاست بھوپال کے جس نے اقبال ایسے آفاقی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی نواز کر زندہ دستی اور اعترافِ عظمت کی ایک عہد آفریں مثال قایم کی جو آج اور ہمیشہ زندہ رہے گی اور بقول رشید احمد صدیقی :-

> "بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے جن کو آیندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کے مانند اداروں کو بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی متیقّن ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں اور بہت سی منزلتوں پر ما فوق رکھتے ہیں۔"[1]

---

[1] گنج ہائے گرانمایہ۔ صفحہ ۱۸۳

بھوپال کا دوسرا قیام

(۱۷ر جولائی تا ۲۸ر اگست سنہ ۱۹۳۵ء)

نواب حمیداللہ خاں کی اقبال شناسی، ادب دوستی اور علم پروری کے باعث اقبال بڑی حد تک مالی اور ذہنی پریشانیوں سے نجات پا چکے تھے اور اب اُن کی تمام تر توجہ بھوپال جانے پر مرکوز تھی تاکہ وہاں کچھ عرصہ قیام کرکے وہ اپنے بجلی کے علاج کا دوسرا کورس مکمل کرسکیں اور فرصت اور یک سوئی کے ساتھ اس عظیم کام یعنی قرآن مجید کے حواشی لکھنے کا کام بھی شروع کر دیں جس کی انھیں بڑی تمنا تھی اور جس کی تکمیل کے لیے وہ اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود کو اس سے قبل بار بار لکھ چکے تھے۔ راس مسعود سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اِس دوران انھیں لندن سے "روھوڈز لیکچرز" کے سلسلے میں دعوت بھی موصول ہوگئی تھی۔ لیکن اب وہ ملک سے باہر جانے پر تیار نہ تھے —— والدۂ جاوید کی رحلت کے بعد جاوید اور منیرہ کی پرورش و پرداخت کا تمام تر بار انھیں کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ علاوہ ازیں رفیقۂ حیات کی وصیت کے مطابق وہ ان بچوں کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک خط میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی خط میں اُنھوں نے لائف پنشن کے سلسلے میں نواب صاحب بھوپال کی قلمی تحریر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ تاحیات وظیفہ کے احکام اعلیٰ حضرت اپنے قلم سے لکھ کر انھیں بھیج دیں تاکہ وہ اسے فریم کراکے رکھ لیں —— یہ عجیب سی خواہش بظاہر اُس جذبے کی غمازی کرتی ہے جو بلا امتیاز ہر انسان میں کم و بیش پائی جاتی ہے —— اسے جذبۂ ممنونیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور اسے انسان کے فطری جذبے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن اقبال کے بعض ناقدین نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ مثلاً عزیز احمد کا یہ لکھنا:۔

> —— "باوجود "فقر" کے فلسفہ کو کمال تک پہنچانے کے اقبال کسی نہ کسی طرح کی شاہ پرستی سے آخر تک اپنے دماغ کو چھٹکارا نہ دلا سکے —— چنانچہ امان اللہ خاں، نادر خاں، شاہ افغانستان، ظاہر شاہ یہاں تک کہ فرماں روائے بھوپال کو بھی مخاطب کرکے انھوں نے نظمیں لکھیں۔ اقبال کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی نظموں سے مدح کا پہلو بالکل خارج ہوتا گیا اور موعظت اور عمل کا پہلو بڑھتا گیا —— لیکن موعظت اور خیر کی تلقین سعدی کی زبانی اچھی معلوم ہوتی ہے اور سعدی کے زمانے کے لحاظ سے موزوں بھی تھی۔ بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی تعلیم میں خارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد

پیدا ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی[1]"

عزیز احمد کے ان اعتراضات کا جواب نظر حیدر آبادی کی کتاب "اقبال اور حیدر آباد" میں ہمیں مل جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"—— "موعظت" اور "عمل" کی تلقین کے لیے ہر زمانہ میں کسی نہ کسی سعدی نے کسی نہ کسی بغداد پر آنسو بہائے اور مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑا دی۔ اقبال نے جس زمانے میں یہ فرض ادا کیا، اُس وقت پوری ملّتِ اسلامیہ سراپا بغداد کی تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس مسلسل اندھیرے میں اقبال جن "کھوئے ہوؤں کی جستجو" میں نکلے تھے انھیں جہاں کہیں کوئی رُوشنی، کوئی کرن، کسی نادر، کسی ظاہر شاہ، کسی نواب بھوپال یا کسی نظام دکن کی شکل میں نظر آتی تھی وہ اسے دلیلِ راہ سمجھتے تھے، چراغِ منزل نہیں۔ اقبال کو شاہ پرست یا قصیدہ گو قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ کس کس کا "وظیفہ خوار" اور کس کس کا مصاحب رہا اور کہاں کہاں "اتراتا" پھرا۔ مرض الموت کے زمانہ میں گوشہ گیری اور جہد معاش کے لیے ناقابل ہو جانے کی وجہ سے اگر انھوں نے نواب صاحب بھوپال کی دوستانہ اعانت قبول کرلی تھی تو یہ کوئی "جرم" نہیں۔ ایسے فعلِ مجبوری کی مثال دے کر یزداں شکار اقبال کی پیشانی پر شاہ پرستی کا لیبل چپاں کرنا نہ صرف یہ کہ نامناسب ہے بلکہ تکلیف دہ ہے:-

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ[2]"

عمر کے آخری حصے میں اقبال اپنی مسلسل علالت، بیوی کی لگاتار بیماری، مالی حالت کی ابتری اور محدود وسائل کے سبب جن صبر آزما مرحلوں سے گذر رہے تھے۔ عزیز احمد نے شاید اُن کا تجزیہ ضروری نہیں سمجھا اور اقبال کو صرف ایک عظیم مفکر، بلند پایہ فلسفی اور انقلابی سمجھ کر "شاہ پرستی" کا رسمی اعتراض کر دیا حالانکہ اپنی گوناگوں شاعرانہ خصوصیات وصفات کے باوجود اقبال ایک انسان بھی تھے اور ان کو بھی ایک عام انسان کی طرح مادّی ضرورتوں کا سامنا تھا۔ اس لیے ان کا یہ کہنا:-

"—— بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی انقلابی تعلیم میں خارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔"

درست نہیں کہ اقبال ایسے بلند پایہ مفکر کی بجا طور پر قدر دانی ایک علیحدہ بات ہے اور "شاہ پرستی" ایک جداگانہ موضوع۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانا کیا معاشرہ یا افرادِ معاشرہ کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اور کیا نواب بھوپال سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اقبال کی ساری فکر قصیدہ گو شاعروں کی طرح شاہ پرستوں

---

[1] اقبال نئی تشکیل۔ صفحہ ۸۲۔۸۳

[2] اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۸۴

کے لیے وقف ہو کر رہ گئی — اور پھر کیا اقبال کا آخری سرمایۂ شعری تمام تر بادشاہوں کے ذکر پر ہی مشتمل ہے۔ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً نفی میں ہے) تو پھر اس کی واضح تاویل یہ ہے کہ اقبال نے نواب صاحب بھوپال کو کبھی شاہوں کے زمرے میں نہیں رکھا۔ اقبال اور نواب صاحب کے قریبی روابط کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ایک ذی حیثیت دوست کی بروقت رفاقت کو "شاہ پرستی" کا الزام دینا نہ حق گوئی ہے نہ تنقیدی دیانت۔ زیادہ سے زیادہ اسے اعتراض برائے اعتراض کا نام دیا جا سکتا ہے اور بس۔

اقبال کی خودداری، شانِ قلندری اور اُن کے فقر و غیور کے بے شمار واقعات اُن کے نیاز مندوں اور قدردانوں نے بیان کیے ہیں جن کے پیشِ نظر بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے کسی دور میں بھی انھوں نے "شاہ پرستی" کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے برعکس اُن کا سارا کلام اور اُن کی تمام تر فکر شاہی کی نفی کرتی ہے۔

اقبال کے ایک نیاز مند اور اردو ادب کے نہایت معتبر اور ممتاز ادیب و نقاد خواجہ غلام السیدین کے پیش کردہ صرف دو واقعات ہی عزیز احمد کے عاید کردہ الزام کی تردید کے لیے کافی ہیں:۔

— "وہ بت شکنی کتنی ہی ضروری ہو وہ بت شکن کو ہر دل عزیز نہیں بناتی۔ یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ باوجود عمر بھر اس ناگوار فرض کو انجام دینے کے انھوں نے، ان کے فکر نے، ان کے کلام نے، ہماری نسل کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور وہ ہماری ذہنی، جذباتی اور روحانی میراث کا ایک جزو عزیز بن گئی ہے۔

آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دیا جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

اس شانِ فقر کے ایک دو دل چسپ واقعات "قابلِ ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی اور علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو جائے۔ ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال کو ایک دوسرے دولت مند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بہ مشکل بھوپال کی کمتر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اوّل تو اتنی رقم میری ضروریات کے لیے کافی ہے میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا! یہ تھا غیرتِ فقر کا تقاضا، ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر منصب جاہ و دولت کی خاطر ہر قسم کا "ایثار" کرنے کو تیار رہیں —

— "ایک اور واقعہ انھیں (علامہ اقبال کو) سر اکبر حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے یومِ اقبال پر، "توشہ خانہ حضور نظام"

کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور تواضع کے پیش کی۔ جب وہ چیک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے اسے ان اشعار کے ساتھ واپس کردیا جو بعد میں "ارمغانِ حجاز" میں شائع ہوئے ؎

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اقبال میں بہت سی غیر معمولی ذاتی خوبیاں تھیں۔ لیکن میرے دل میں بڑی عقیدت ہے اس شانِ فقر کے لیے جس کی تفسیر انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرکے کی تھی۔ لیکن اس کا خطاب دراصل عصرِ حاضر کے تمام نوجوانوں سے ہے ؎

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
حاصل اس کا شکوہِ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال نے اس فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ ایمان کی دولت سے مالامال تھے[1]!"

بات کچھ دور جا پڑی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اب اقبال جلد سے جلد بھوپال جانے کے لیے بیتاب تھے اور راس مسعود کے جواب کے منتظر جیسا کہ اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے:۔

"لاہور — ۱۵ رجون ۱۹۳۵ء

"ڈیر مسعود

امید کہ آپ اور لیڈی مسعود بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کے خط کے انتظار میں ہوں۔ امید کہ ضروری احکام متعلقہ پنشن جاری ہوگئے ہوں گے۔ اب صرف مجھے اس خط کا انتظار ہے جس کا ذکر میں نے اپنے گذشتہ خط میں کیا تھا۔ اگر اعلیٰ حضرت پچمڑھی[2] سے واپس تشریف لے آئے ہوں تو وہ خط لکھوا کر بھجوا دیجیے۔ کل اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کا تار تعزیتی آیا تھا اور آج سردار صلاح الدین سلجوقی اعلیٰ حضرت کا زبانی پیغام لائے ہیں، بہت حوصلہ افزا اور دل خوش کن پیغام ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعا و ترقیٔ مراتب۔ لارڈ لودین کا خط ابھی لندن سے آیا ہے"

۱؎ آندھی میں چراغ — صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۶

۲؎ قدیم صوبہ متوسط کا پُرفضا گرمائی مقام۔

وہ پوچھتے ہیں کہ" رہوڈز لیکچرز" کے لیے کب آؤ گے ؟ اب بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں!
ان کی ماں کی وصیت ہے کہ ان بچوں کو اپنے سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہ کرنا ـــــ
لیڈی مسعود کی خیریت سے آگاہ کیجیے۔ اور میری طرف سے اُنھیں سلام کہیے۔
آپ کا ـ محمد اقبال [۱]"

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد راس مسعود کا تفصیلی جواب موصول ہو گیا اور نواب صاحب بھوپال کی وظیفہ سے متعلق قلمی تحریر بھی ۔ لیڈی مسعود کی علالت سے اُنھیں تشویش تھی چنانچہ ۲۴ رجون ۱۹۳۵ء کے خط میں اس کا ذکر ملتا ہے اور بھوپال جانے کے قصد کا اظہار بھی ۔ وہ بھوپال جانے کے لیے کتنے بے چین تھے' اس کا اندازہ خط کی اس عبارت سے :۔

"ـــــ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے کے واسطے تڑپ رہا ہوں ـــــ"

واضح طور پر لگایا جاسکتا ہے ۔ خط کا پورا متن ملاحظہ ہو :۔

" لاہور ـــــ ۲۴ رجون ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود ـــــ

آپ کا خط مل گیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی موصول ہو گیا ہے جسے میں نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے ۔ آپ شاید اندور [۲] تشریف لے گئے ہوں گے۔ میں لیڈی مسعود کے لیے دست بہ دعا ہوں ۔ جب ان کو فراغت ہو تو مجھے ان کی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کیجیے۔

میں انشاء اللہ وسط جولائی تک بھوپال پہنچوں گا ۔ جاوید کو ہمراہ لانا ہوگا ۔ علی بخش بھی ہمراہ ہوگا ۔ وہ آپ کو ہر روز ایک دو دفعہ یاد کر لیتا ہے ۔ شعیب صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دے دوں گا ۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میرا ایڈریس بھوپال میں کیا ہوگا تاکہ میں گھر میں وہ ایڈریس چھوڑ جاؤں ۔ اس طرح بچی منیرہ کی خیریت کی خبر مجھے روز ملتی رہے گی ۔ جس جگہ مجھے ٹھہرنا ہوگا اس جگہ کا مجھے پتہ لکھ دیجیے ۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے کے واسطے تڑپ رہا ہوں ـــــ والسلام

محمد اقبال

ہاں آپ کا پرائیویٹ سکریٹری ممنون حسن ریاض منزل ہی میں ہوگا یا کہیں اور ـــــ میں اپنے آنے کی اطلاع اسے بھی دے دوں گا [۳]"

اقبال کو راس مسعود اور لیڈی مسعود سے کتنی گہری وابستگی اور قربت تھی اس کا ثبوت ۲ر جولائی کے اس خط سے

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۶۴ ـ ۲۶۵

[۲] اندور جانے آنے کا سلسلہ دراصل لیڈی مسعود کے والد کرنل عبدالرشید خاں کے سبب تھا جو ان دنوں ریاست اندور میں تھے ۔

[۳] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۶۵ ـ ۲۶۶

بھی مل جاتا ہے جو انھوں نے لیڈی مسعود کی شدید علالت کے سلسلے میں بھوپال بھیجا تھا۔ اسی خط سے اس جذبۂ احسان مندی کا اظہار بھی ہوتا ہے جس کا تعلق اُن کے پہلے قیام بھوپال سے ہے جب کہ وہ "ریاض منزل" میں راس مسعود اور لیڈی مسعود کے مہمان تھے۔ لیڈی مسعود نے اقبال کی دیکھ بھال اور خبر گیری میں جس دلچسپی اور انہماک کا ثبوت دیا تھا اس کی کچھ جھلکیاں گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب وہ پھر بھوپال جا رہے تھے اس لیے ولادت کے سلسلے میں راس مسعود کی پریشانی ان کے لیے بھی پریشانی کا موجب تھی چنانچہ وہ ان کے لیے دعائے صحت بھی کرتے رہے اور جب تک راس مسعود کا تار انھیں نہیں مل گیا بے حد متردد اور متفکر رہے:۔

"لاہور۔۔۔ ۲ر جولائی ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود۔۔۔ ابھی آپ کا تار ملا جس سے اطمینان خاطر ہوا۔ خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ آپ کا خط ملنے سے اس وقت تک میری طبیعت نہایت پریشان تھی۔ گذشتہ رات بھی میں دیر تک ان کے لیے دعا کرتا رہا۔ دورانِ قیام بھوپال میں انھوں نے جو توجہ مجھ پر مبذول کی میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ اب وہ جلد صحت کامل حاصل کریں گی۔ اور آپ کی طبیعت کو بھی اطمینان نصیب ہوگا۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ موسم سخت گرم ہے۔ بارش کا انتظار ہے۔ کل سے مطلع غبار آلود ہے۔ میری طرف سے اُنھیں سلام کہیے۔ اور دعائے صحت۔۔۔ آپ کا

محمد اقبال[۱]"

لیڈی مسعود اب پہلے سے بہتر تھیں اس لیے انھیں ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ ہفتہ عشرہ میں ہی وہ بھوپال جانا چاہتے تھے چنانچہ اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ راس مسعود کو اپنے پروگرام سے مطلع کرنے کے علاوہ انھوں نے نیازی صاحب کو بھی بھوپال کی روانگی کے بارے میں اطلاع دی:۔

"ڈیر نیازی صاحب۔

میں دو چار روز تک بھوپال جاؤں گا اور قریباً ڈیڑھ ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ شاید اب تک چلا جاتا مگر بارش نہیں ہوئی۔ برسات شروع ہو جائے تو جاؤں۔ بہتر ہے آپ ابھی لاہور ہیں[۲] نہ آئیں اور مجھے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ملیں۔ ہاں اگر آپ کو کوئی ضروری کام ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ میں غالباً ۱۵ر جولائی تک یہاں سے چلوں گا بشرطیکہ بارش ہو گئی۔۔۔ والسلام محمد اقبال

۱۱ر جولائی ۱۹۳۵ء[۳]"

۱۱ر جولائی کے اس خط کے دو دن بعد ہی اُنھوں نے رختِ سفر باندھ لیا اور نیازی صاحب کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا:۔

۱؎ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۷

۲؎ 'ہیں' زائد ہے (نیازی)

۳؎ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۷۹

"لاہور ـــ ۱۳؍ جولائی ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ـــ السلام علیکم۔

اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں ۔ امید کہ آپ کو مل گیا ہوگا میں یہاں سے ۱۵؍ جولائی کی شام (فرنٹیر میل) بروز سوموار روانہ ہوکر ۱۶؍ کی صبح دہلی پہنچوں گا۔ وہاں تمام دن قیام رہے گا تاکہ جاوید دہلی دیکھ سکے۔ آپ مجھ سے ریلوے اسٹیشن پر ملیں۔ اور بھوپال کی گاڑی میں جو وہاں سے شام کو چلے گی میرے لیے دو سیٹ سیکنڈ کلاس (لوئر برتھ) ریزرو کرادیں ـــ باقی بروقت ملاقات۔

والسلام ـــ محمد اقبال [1]"

چنانچہ پروگرام کے مطابق اقبال ۱۵؍ جولائی کو لاہور سے روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں جاوید اور ان کا دیرینہ خدمت گذار علی بخش ان کے ہمراہ تھا۔ ۱۶؍ کو دہلی پہنچے تو اسٹیشن پر نیازی صاحب اور دیگر معتقدین نے ان کا استقبال کیا۔ دن بھر انھوں نے دہلی میں قیام کیا۔ جاوید نے دہلی کی سیر کی۔

۱۶؍ کی شام کو وہ دہلی سے روانہ ہوئے اور ۱۷؍ جولائی کو دوسری بار بھوپال پہنچے۔ راس مسعود، شعیب قریشی نواب صاحب کے ندیم خاص، ممنون حسن خاں (پرائیویٹ سکریٹری راس مسعود) اور کئی عقیدت مندوں نے اسٹیشن پر اُن کا خیر مقدم کیا اور انھیں سرکاری قیام گاہ "شیش محل" میں ٹھہرایا۔ "شیش محل" وسط شہر کی ایک عالی شان اور پُرشکوہ عمارت تھی اس کے سامنے مشہور کھرنی والا میدان واقع تھا۔ شیش محل کے متصل کئی اور عالی شان محل کھڑے تھے جن میں صدر منزل جو سرکاری تقریبات اور بھوپال کے یادگار سالانہ مشاعروں کے باعث شہرتِ دوام رکھتی تھی قابلِ ذکر ہے۔ شیش محل کے سامنے قدسیہ محل بھی تھا جہاں اقبال کے خصوصی معالج ڈاکٹر عبدالباسط رہتے تھے۔ میدان کے دوسری طرف بڑا تالاب تھا۔ اور یہ سارا علاقہ فتح گڑھ کہلاتا تھا۔ دائیں جانب ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر حمیدیہ اسپتال تھا۔ دوسری جانب بھوپال کی مشہور موتی مسجد [2] تھی جو فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔

"شیش محل" میں اقبال کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انھیں یہاں ہر طرح کی آسودگی اور راحت مل سکے اور علاج معالجہ کے سلسلے میں بھی سہولت رہے۔ اس کے علاوہ اب وہ ریاست کے وظیفہ یاب بھی تھے، اس لیے شاہی محل میں ان کے قیام کا انتظام نواب صاحب بھوپال کی خواہش پر کیا گیا تھا تاکہ انھیں علاج اور قیام کے دوران کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ "شیش محل" میں صرف مقتدر و معزز شخصیتیں ہی قیام کرتی تھیں ورنہ عموماً یہ محل مقفل رہتا تھا۔ محل کی تاریخ میں اب پہلی بار اُسے حکیم الامت اور مفکرِ مشرق ایسی باعظمت شخصیت کے مکین ہونے کا شرف ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی شان و عظمت بھی دوچند ہوئی اور اُن شاہکار تخلیقات سے جو اقبال نے "شیش محل" کے قیام کے دوران کہیں اُسے تاریخی حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ یہی وہ "شیش محل" ہے جس کے قیام کے دوران اقبال اپنے عزیز ترین دوست راس مسعود کی ہمہ وقت رفاقت اور نواب صاحب کی خصوصی توجہات سے فیضیاب ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے فرصت و آسودگی کے بہترین لمحات بسر کیے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انھوں نے قرآن مجید کے حواشی لکھنے

---

[1] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۷۹۔ ۲۸۰

[2] اس مشہور اور قابلِ دید مسجد کی تصویر شاملِ کتاب ہے۔

کے لیے باقاعدہ کام کا آغاز کیا۔ ریاست بھوپال کا یہ فخر بے جا نہیں کہ اُس نے اقبال ایسے آفاقی شاعر کو جسم و جاں کی راحتوں کا سامان ہی مہیا نہیں کیا۔ فکر و تخلیق کے نئے گوشے اُجاگر کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔

بھوپال آنے کے بعد دوسرے ہی دن سے ان کے معائنہ اور علاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُن کے معالجین نے پہلے سے زیادہ احتیاط اور توجہ اُن کے علاج پر صرف کی۔ پہلی بار مختصر علاج کے بعد اُن کی صحت سنبھل گئی تھی۔ مگر لاہور لوٹنے کے بعد وہ مسلسل پریشانیوں اور حادثات کا شکار رہے چنانچہ ان کی صحت پہلے سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کے معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ علاج اپنی جگہ پر تھا اور ان کے فکر و استغراق، مطالعۂ کتب، احباب اور نیاز مندوں سے خط و کتابت کا سلسلہ اپنی جگہ پر تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو مصروف رکھ کر صحیح معنوں میں "عالم باعمل" ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ چنانچہ اس قیام کے دوران ہمیں ان کی تحریروں سے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً علامہ سلیمان ندوی، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور پروفیسر شجاع وغیرہ کے نام لکھی ہیں، کے علمی و فکری مشاغل، کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ یوں کہنے کو وہ "صرف علاج" کے سلسلے میں بھوپال آئے تھے لیکن سچ پوچھیے تو بھوپال میں ان کا دوسرا قیام فرصت و آرام کے علاوہ یک سوئی کے ان لمحوں میں اُس عظیم کام کا آغاز کرنا تھا جس کا انھوں نے نواب بھوپال سے وعدہ کیا تھا۔ یعنی قرآن مجید کے حواشی کی تیاری۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ردِ قادیانیت پر بھی مضامین کی تیاری کر رہے تھے۔ چنانچہ بھوپال پہنچنے کے تیسرے ہی دن انھوں نے سید سلیمان ندوی کو تفصیلی خط لکھا جس کے مطالعہ سے اقبال کی فکر و جستجو کے کئی گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں:۔

"بھوپال، شیش محل ——— ۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب ——— السلام علیکم!

میں گلے کے برقی علاج کے لیے کچھ مدت کے لیے بھوپال میں مقیم ہوں۔ اس خط کا جواب یہیں مذکورہ بالا پتے پر عنایت فرمایئے۔

۱۔ کیا فقہ اسلام کی رو سے توہین رسول قابلِ تعزیر جرم ہے[۱]۔ اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے[۲]۔

۲۔ اگر کوئی شخص جو اسلام کا مدعی ہو، یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالتمآب پر جزوی فضیلت حاصل ہے۔ اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، تو کیا ایسا شخص توہینِ رسول کے جرم کا مرتکب ہے؟ بالفاظ دیگر اگر توہینِ رسول جرم قابلِ تعزیر ہے۔ تو عقیدہ مذکور توہینِ رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں[۳]؟

۱؎ بے شبہ۔ ۲؎ تعزیر حسب رائے امام قید سے لے کر قتل تک۔

۳؎ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے اور ایسا کہنا نہ کفر ہے نہ توہین ہی کا باعث ہے البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ جزوی فضیلت حقیقت میں فضیلت کے شمار میں ہے بھی۔ مثلاً زیادہ متمدن زمانہ میں ہونا کوئی فضیلت نہیں، کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے۔ نہ اخلاقی۔ نہ عقلی، بلکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اور بھی دنیا زیادہ متمدن ہو جائے، تو اس زمانے کے آدمی پر بھی اس زمانے کے آدمی کو فوقیت ہو جائے۔ اور اگر یہ امر باعثِ فضیلت ہو تو غلام احمد قادیانی کیا اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے۔ بلکہ غلام احمد سے زیادہ۔ کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے۔ چکھا اور آزمایا نہیں۔ (سید سلیمان ندوی)

۳ - اگر توہینِ رسول کی مثالیں کتب فقہ میں مذکور ہوں تو مہربانی فرما کر ممنون فرمایئے[1]۔

امید ہے کہ اس عریضہ کا جواب جلد ملے گا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ امید ہے اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا ——— والسلام

مخلص محمد اقبال (لاہور)

حال وارد بھوپال[2]''

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت پنجاب میں فتنۂ قادیانی نے پھر سر اٹھایا تھا اور اقبال ردِ قادیانی کے سلسلے میں مضامین لکھ رہے تھے اس خط کے مندرجات سے اقبال کی ذہنی مصروفیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

چند روزہ علاج ہی سے ان کی بگڑی ہوئی صحت سنبھل گئی تھی جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے:-

''——— میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ امید ہے اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا ———''

انھوں نے اس خط کا جواب بھوپال کے پتے پر ہی طلب کیا تھا اور مقصد یہ تھا کہ سید صاحب کی رہبری کے بعد وہ اپنے مضمون کی تکمیل کر لیتے۔ چنانچہ حسبِ توقع انھیں جلد جواب مل گیا۔ اس دوران قادیانیوں سے متعلق کچھ اور مسئلے زیرِ بحث آ گئے تو انھوں نے یکم اگست کو دوسرا خط بھی بھوپال سے روانہ کیا جس میں چند اور مسائل کے بارے میں استصواب کیا گیا تھا:-

''بھوپال ——— شیش محل

یکم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا السلام علیکم ———

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں ان کے جواب سے بھی ممنون فرمایئے[3]

۱ - تکملۂ مجمع البحار صفحہ ۸۵ - میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے ——— یعنی یہ کہ حضور رسالت مآب کو خاتم النبیین کہو، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا[4]

مہربانی کر کے کتاب دیکھ کر یہ فرمایئے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں۔ اور اگر ہیں تو

---

[1] یہ نقل کفر مجھ سے نہ ہوگا ——— آپ السیف المسلول علی شاتم الرسول دیکھ لیجیے۔

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۰۔

[3] اس وقت وہ ردِ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے۔

[4] جی ہاں۔ اس کتاب میں یہ روایت ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ سے لی گئی ہے۔ لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت وضعف کا پتہ لگایا جائے، اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم نے بار بار خود فرمایا ہے: ''لا نبی بعدی'' میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰ کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں۔ بہرحال ان کا خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلعم کے قول کے خلاف ہو ——— (سید سلیمان ندوی)

آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے ؟ ایسا ہی قول درمنثور جلد پنجم صفحہ ۲۰۴ میں ہے۔ اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے [1] میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں افسوس اب تک نہیں ملیں —

——— حجج الکرامہ صفحہ ۲۲۴ — ۴۳۱ حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے۔ "من قال بسبب نبوتہ کفر حقا" اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے [2]۔

۳ — "لو عاش ابراھیم لکان نبیاً" اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ نووی اسے معتبر نہیں جانتا۔ ملا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے، کیا اس کے اسناد درست ہیں [3]۔ بخاری کی حدیث واما مکم منکم میں واؤ حالیہ ہے کیا [4] اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا۔

۴ — ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ——— والسلام

مخلص — محمد اقبال [5]"

بھوپال کی آب و ہوا، وہاں کی خوش گوار فضا، پُرسکون ماحول، راس مسعود ایسے جاں نثار و مخلص دوست کی قربت، نواب حمید اللہ خاں کی رفاقت اور معالجین کی خصوصی توجہ سے اقبال کی صحت عامہ برابر رو بہ ترقی تھی چنانچہ

---

[1] جی ہاں وہی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے۔ اور اس کی نسبت پہلے لکھ چکا۔

[2] حجج الکرامہ فی آثار القیامہ نواب صدیق حسن خاں کی کتاب ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی بصفت نبوت ہوگی یا بلا صفت نبوت اس باب میں علما کا اختلاف ہے۔ نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہوگی۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی آمد ثانی میں ان کی صفتِ نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ مرتکب کفر ہیں۔ بہرحال یہ رائے ہے۔

[3] یہ ابن ماجہ کی روایت ہے، اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے واقعہ نہیں۔ کیونکہ لو فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے اسی لیے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن میں ہی اٹھا لیا گیا۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے۔ چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ہے ولو قضی ان یکون بعد محمد نبیٌ لعاش ابنہ ولکن لا نبی بعدہ (ابن ماجہ جنائز۔ بخاری انبیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلہ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادے زندہ رہتے۔ لیکن یہ فیصلہ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے، اس کو معتبر نہیں کہا ہے۔ ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے — بلکہ وہ متروک الحدیث — منکر الحدیث۔ باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بشرط صحت ملا نے اس کی تاویل کی ہے بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے۔ لو کان بعدی نبیا لکان عمر (مسند احمد، ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمرؓ بن خطاب نبی ہوتے، لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے — ...

[4] صحیح یہی ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا [امام] گا حضرت عیسیٰ نہ ہوں گے۔ (سید سلیمان ندوی) ...

[5] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۴

اسی دور کے دو خط ہمیں اور ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال کے قیام اور بجلی کے علاج سے انھیں خاطر خواہ فائدہ ہو رہا تھا۔ یکم اگست ۱۹۳۵ء کا خط سید نذیر نیازی کے نام ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"یکم اگست ۱۹۳۵ء

شیش محل — بھوپال

ڈیر نیازی صاحب — السلام علیکم۔

میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ الحمد للہ — اگر آپ لاہور سے واپس آ گئے ہوں تو اطلاع دیں — والسلام

محمد اقبال[1]"

اور یہ دوسرا خط پروفیسر شجاع کے نام ہے — اس میں بھی اقبال نے اپنے قیام بھوپال اور صحت کی بحالی کا ذکر کیا ہے :۔

"بھوپال — ۵ / اگست ۱۹۳۵ء

ڈیر مسٹر شجاع

میں بغرض علاج برقی بھوپال میں مقیم ہوں — اور اگست کے آخر تک یہیں رہوں گا۔ میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی ہے اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے۔ امید ہے کہ اس دفعہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوگا۔ رُبِ شہتوت کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ مفید ہے۔ بہر حال آزمانے پر معلوم ہوگا — میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں کہ آپ نے محض میرے لیے اس درخت کی حفاظت کی اگر اس کا پھل فائدہ نہ بھی کرے تو ممکن ہے آپ کے اخلاص کی برکت سے فائدہ ہو جائے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے — والسلام

محمد اقبال[2]"

انھیں دنوں لاہور کی فضا نہایت مکدر ہو گئی — مسجد شہید گنج کے انہدام اور ما بعد اثرات کے سبب حکومت نے مارشل لا نافذ کر دیا تھا۔ نیازی صاحب نے اقبال کو لاہور کی صورت حال سے مطلع کیا تو انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے ۶ / اگست ۱۹۳۵ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے اس امر سے بھی آگاہ کیا کہ ان کے علاج کا کورس ۲۸ / اگست تک مکمل ہو جائے گا۔ نیازی صاحب نے انھیں "طلوع اسلام" کے اجراء کی خوشخبری بھی سنائی تھی چنانچہ اس خط میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نیازی صاحب یہ ملی اسلامی مجلہ اقبال کے ایماء پر نکال رہے تھے اور جب ان کی موجودگی میں بعض نیازمندوں نے رسالہ کا نام اِن کی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" پر رکھنے کی تجویز پیش کی تو انھوں نے نہایت فراخ دلی سے اس کی اجازت دے دی۔

خط کا پورا متن یہ ہے :۔

---

[1] مکتوبات اقبال — صفحہ ۲۸۰۔

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۲۱۔

"بھوپال — ۶ راگست ۱۹۳۵ء

"ڈیر نیازی صاحب ——— السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ جاوید بھی راضی خوشی ہے۔ لاہور کے حالات افسوس ناک ہیں۔ خدا تعالیٰ رحم کرے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ "طلوع اسلام" کے لیے فضا سازگار ہے۔ آپ جب دہلی واپس آئیں تو مجھے اطلاع دے دیں۔ میں ۲۸ راگست تک اپنے علاج کا کورس ختم کرلوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ سلامت اللہ شاہ صاحب سے سلام کہہ دیں۔ علی بخش بھی آداب لکھواتا ہے ——— والسلام

محمد اقبال۔ بھوپال [۱]"

اس خط کے بعد انھوں نے پھر نیازی صاحب کو خط لکھا جس میں صحت عامہ کی بحالی، روانگی کے پروگرام اور "طلوعِ اسلام" کے سلسلے میں قیمتی مشورے دیئے تھے۔ اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "طلوعِ اسلام" کے اجراء کے سلسلے میں کتنی گہری دلچسپی رکھتے تھے:۔

"بھوپال ——— ۱۰ راگست ۱۹۳۵ء

"ڈیر نیازی صاحب ——— السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے ——— الحمدللہ خیریت ہے۔

صحت خوب ترقی کر گئی ہے۔ آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔ شاید ایک دفعہ اور بھوپال آنا پڑے گا۔ یعنی اس ہفتے کے بعد آپ دہلی پہنچ جائیں تو وہاں پہنچتے ہی مجھے خط لکھ دیں۔ میں غالباً ۲۶ رایا ۲۸ راگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا۔ "طلوع اسلام" کے متعلق جو کچھ آپ نے مجھے لکھا اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ صور اسرافیل [۲] کا ایک ٹکڑا بھیج دوں گا۔ یا دہلی پہنچ کر خود لکھ دوں گا۔ میرے خیال میں ایک نئی چیز جو "طلوع اسلام" کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ سکھوں کے دور سے پہلے کی تاریخِ پنجاب پر مفصل مضمون لکھے جائیں۔ چوہدری محمد حسین صاحب سے اس بارے میں مشورہ کریں۔ انھوں نے حال ہی میں [۳] مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ میں اسے پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بیداری کے لیے اس حصہ تاریخ پر لکھنا ضروری ہے۔ باقی خیریت ہے۔ "طلوعِ اسلام" کے پہلے نمبر میں ہی ایک مضمون تاریخی ضروری ہے ——— والسلام

محمد اقبال [۴]"

۱؎ مکتوباتِ اقبال ——— صفحہ ۲۸۱

۲؎ صور اسرافیل کا نام بعد میں ضربِ کلیم رکھا گیا۔

۳؎ "میں"، سہواً رہ گیا۔ (نیازی)

۴؎ مکتوباتِ اقبال ——— صفحہ ۲۸۳

خط وکتابت اقبال کے معمولات کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ مطالعہ کے علاوہ نہایت پابندی سے ہر خط کا جواب خود ہی لکھتے تھے۔ بھوپال کے قیام کے دوران انھوں نے مجوزہ کتاب کے سلسلے میں بھوپال کی مشہور اور مستند حمیدیہ لائبریری اور دیگر لائبریریوں سے استفادہ کیا نیز سید سلیمان ندوی سے جن کے وہ بے حد عقیدت مند اور معتقد تھے۔ خط وکتابت کے ذریعے اپنے بعض شکوک وشبہات رفع کیے اور بعض اہم دینی امور میں اُن سے مشورے لیے۔ خود اپنی نظر میں اُن کی شاعرانہ حیثیت کیا تھی۔ یہ بات بھی انھوں نے بلا تکلف سید صاحب کو ۱۳؍اگست ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں لکھ دی جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ خط اقبال کی فکری عظمت کے ساتھ ساتھ ان کے عجز وانکسار کا بھی آئینہ دار ہے۔

" بھوپال —— ۱۳؍اگست ۱۹۳۵ء

مخدومی —— السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا۔ الحمد للہ کہ بہت سی باتیں مل گئیں۔ اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا اور آپ کے خطوط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں۔

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات وروایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست   کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

(زبور عجم)

مخلص محمد اقبال[۱]"

راس مسعود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ حیدرآباد ہو یا علی گڑھ یا بھوپال۔ جہاں بھی وہ رہے سب کے کام آتے رہے۔ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین نے انھیں لکھا کہ حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت شدید مالی مشکلات میں گھرا ہے۔ اس کی مدد کی جائے۔ راس مسعود ایسے عالی ظرف، دردمند اور علم وادب کے شیدائی بھلا کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نواب صاحب بھوپال کو پانی پت کی تقریب کے لیے رضامند کر لیا، پھر اقبال کو آمادہ کیا۔ مولوی عبدالحق کو حیدرآباد دکن خط لکھا اور سارے انتظامات پلک جھپکتے مکمل کرا دیے۔ علم وتعلیم کی سچی لگن جو انھیں ورثے میں ملی تھی اس سے ان گنت شخصیتیں بہرہ مند ہوئیں۔ ان کے جہاں اور کارنامے زندہ رہیں گے وہاں پانی پت ایسے دور افتادہ مقام پر حالی کا صد سالہ جشن بھی ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا کہ اس کے روحِ رواں راس مسعود اور تنہا راس مسعود تھے۔ جن کے خلوص وجوش نے پانی پت میں اقصائے ملک کی مقتدر شخصیتوں کو آن کی آن میں جمع کر کے ایک مثالی تقریب منعقد کرا دی اور اتنا عطیہ فراہم کر دیا کہ حالی مسلم ہائی اسکول کو دوام نصیب ہو گیا۔ اس جشن کا تذکرہ پہلی بار ہمیں اقبال کے اس خط میں ملتا ہے جو انھوں نے نیازی صاحب کو تحریر کیا۔

۱؎ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۵ — ۱۹۶۔

"بھوپال ـــــ ۱۲راگست ۱۹۳۵ء

ڈیر نیازی صاحب ـــــ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے ہی ایک خط آپ کو دہلی کے پتہ پر لکھ چکا ہوں۔ شاید یہ خط اسی کا جواب ہے۔ سفارشی تحریر ملفوف ہے۔ اس کو ٹائپ کرالیں یا ایسے ہی ساتھ ٹانک دیں۔ عبد العلی صاحب کو میں نہیں جانتا۔ مسعود[1] سے دریافت کروں گا اگر وہ جانتے ہوئے تو ان سے لکھوادوں گا۔

"طلوعِ اسلام" کا پہلا نمبر سید راس مسعود کے نام بھی ارسال فرمایئے۔ مولانا حالی کی سنٹینیزی[2] اکتوبر کے آخر میں ہوگی۔ ان پر ایک مضمون آپ کے پہلے نمبر میں ہو جائے تو بہت اچھا ہے یا دوسرے نمبر میں بشرطیکہ دوسرا نمبر اکتوبر کے وسط سے پہلے نکل جائے تاکہ آپ کا رسالہ سینٹینیزی کے موقع پر تقسیم ہو سکے۔ سینٹینیزی پانی پت میں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے۔ میں بھی پانی پت اس موقع پر پہنچ جاؤں گا۔ بلکہ اعلیٰ حضرت کے متعلق بھی اس رسالے میں کچھ ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو۔ مولانا حالی پر جو مضمون ہو کسی اچھے مبصر کے قلم سے ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر ہو کہ آپ کا پہلا نمبر ہی وسط اکتوبر میں نکلے۔ میں انشاء اللہ ۲۸ راگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ رکی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ روانگی سے پہلے اطلاع دوں گا۔

محمد اقبال

آپ دہلی پہنچ کر مجھے کارڈ لکھ دیں جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ دہلی پہنچ گئے ہیں[4]"

راس مسعود کے پروگرام کے مطابق حالی کی صد سالہ برسی آخر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں زیرِ صدارت نواب صاحب بھوپال منعقد ہو رہی تھی جیسا کہ اقبال کے خط سے ظاہر ہے۔

اس خط سے واضح طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں صد سالہ برسی کی تقریبات سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ نیازی صاحب کو "طلوعِ اسلام" کے سلسلے میں یہ لکھنا کہ مولانا حالی پر بھی ایک مضمون کسی اچھے مبصر سے لکھوا کر شامل کریں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی راس مسعود کی طرح اس جشن کو کامیاب دیکھنے کے آرزومند تھے ـــ ساتھ ہی انھیں نواب صاحب بھوپال کی معارف پروری اور علم دوستی کا بھی اعتراف تھا۔ چنانچہ خط کا یہ ٹکڑا "اعلیٰ حضرت کے متعلق بھی اس رسالہ میں کچھ ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو" واضح طور پر ان کے پُر خلوص اور دلی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ انھیں "طلوعِ اسلام" سے کتنی گہری دلچسپی تھی اس کا اظہار بھی اس خط کے متن سے ہوتا ہے۔ وہ راس مسعود کے نام یہ مجلہ بھیجنے کی تاکید بھی کر رہے تھے تاکہ اس کی سرپرستی کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں ان کے جذبۂ ہمدردی و دردمندی کی غمازی کرتی ہیں جن کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔

---

[1] عبد العلی خاں کسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نائب مہتمم تھے اور اس وقت بھوپال میں تھے۔ (نیازی)

[2] سر راس مسعود مرحوم۔ (نیازی) [3] Centenary صد سالہ برسی۔ (نیازی)

[4] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۸۵ ـ ۲۸۶

اقبال کو بھوپال آئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہوچکا تھا۔ اُن کا علاج بڑی توجہ سے ہو رہا تھا۔ اور ان کی عام صحت بھی پہلے سے کہیں بہتر تھی۔ ان کا بیشتر وقت آرام و مطالعہ اور خط وکتابت میں صرف ہوتا تھا۔ راس مسعود کی خصوصی ہدایت کے مطابق ملنے جلنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ تین حضرات کو خصوصیت کے ساتھ راس مسعود نے اقبال کی دیکھ بھال پر متعین کر دیا تھا جو صبح و شام پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ وقت ان کی معیت میں گذارتے تھے تاکہ اقبال کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ ان تین شخصیتوں میں سے دو حضرات خوش نصیبی سے پاکستان آگئے اور مجھے ان سے اقبال کی مصروفیات اور مشاغل کا کچھ نہ کچھ علم ہو گیا جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ ان تین حضرات میں ایک تو ممنون حسن خاں تھے، جو اب بھی بھوپال میں ہیں۔ ان کے نام اقبال کے چند خطوط بھی اقبال نامہ میں شامل ہیں۔ دوسرے صاحب محمد خلیل اللہ خاں تھے اور تیسرے سید مسیح الدین۔ محمد خلیل اللہ خاں ابتداً خورجہ سے آکر بھوپال میں بحیثیت تحصیل دار مقرر ہوئے تھے اور علی گڑھ کے ناتے راس مسعود کے خاص نیاز مندوں میں تھے۔ سید مسیح الدین بھوپال کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور وہیں برسرِ کار تھے اور راس مسعود کے قریبی دوستوں میں تھے۔ ممنون حسن خاں ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔

یہ تینوں حضرات اپنی اعلیٰ علمی و ادبی خصوصیات کی بنا پر اقبال کی خصوصی دیکھ بھال کرتے تھے۔ دیگر حاضر باشوں میں شعیب[۱۱] مجددی، ملّا[۱۲] رموزی، مولانا ارشد[۱۳] تھانوی، مولانا محمد یوسف[۱۴] قیصر بھوپالی، بھوپال کے بزرگ و محترم شاعر ذکی وارثی[۱۵]، مولوی شکر اللہ سہیل[۱۶]، دبیر الملک قاضی ولی محمد[۱۷]، سر لیاقت علی[۱۸]، شعیب قریشی[۱۹]، راس مسعود[۲۰] اور محمد احمد سبزواری وغیرہ شامل تھے۔ وقتاً فوقتاً یہ حضرات علمی و ادبی موضوعات پر اقبال سے تبادلۂ خیالات کرتے اور انھیں کسی طور تنہائی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ آنے جانے والوں سے جو وقت بچتا اُسے اقبال مطالعہ میں صرف کرتے یا فکر شعر و ادب میں۔ چنانچہ ریاض منزل کی طرح شیش محل کو بھی یہ تاریخی امتیاز حاصل ہوا کہ اس کی پُرسکون فضا میں جہاں اقبال نے دقیق علمی و فکری مسائل پر قلم اٹھایا وہیں ان کی فکرِ تازہ نے چند شاہکار نظموں کی تخلیق بھی کی جو اس خصوصی نوٹ کے ساتھ "ضربِ کلیم" کی زینت ہیں:-

"بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے"

پہلی نظم "صبح[۲۱]" ہے جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

بھوپال جس کی صبحیں اور شامیں جادو جگاتی تھیں اقبال کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ شہر مسجدوں کا شہر بھی کہلاتا تھا جہاں اعلیٰ سرکاری انتظام کے سبب مساجد ہمیشہ آباد و پُررونق رہتی تھیں۔ "مومن کی اذاں" کے پس منظر میں سچ پوچھیے تو اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کا وہ شکوہ نظر آتا ہے جو کہیں اور بمشکل مل سکے گا۔

---

[۱۱] تا [۲۰] افسوس کہ یہ شخصیتیں اب اس دنیا میں نہیں ورنہ حیاتِ اقبال کے کئی اور گوشے نمایاں ہو سکتے تھے۔

[۲۱] ضربِ کلیم ـ صفحہ ۶۔

لہٰذا اقبال کے تاثرات کے پس منظر میں شعر کی صداقت بھی ہے اور حقیقت کی ترجمانی بھی شیش محل کے اردگرد تقریباً چودہ پندرہ مسجدیں تھیں جن میں صبح کے وقت اذانوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا تھا۔ اس نظم میں بھی وجد و انبساط کی حقیقی کیفیت نمایاں ہے۔ وہ ان چار مصرعوں میں امروز و فردا کی عقدہ کشائی ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ شبستانِ وجود کو اس سحر کی کارفرمائی قرار دیتے ہیں جو "بندۂ مومن کی اذاں" سے عبارت ہے۔ دوسری نظم "مومن"[۱] ہے۔ جس کا پہلا حصہ "دنیا میں" کے ذیلی عنوان سے پیش کیا گیا ہے اور دوسرا "جنت میں" کے عنوان سے۔ نظم کا پہلا شعر ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں ہیں بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اور آخری شعر ہے ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

پہلی نظم "صبح" کی طرح یہ نظم بھی ان کے مخصوص موضوعِ سخن کی آئینہ دار ہے۔ تیسری نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام"[۲] چھ اشعار پر مشتمل ہے۔

چوتھی نظم "جمعیت اقوامِ مشرق"[۳] ہے جس کا مشہور شعر ہے ؎

طہراں ہو اگر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں کہ یہی کچھ ان کی شاعری کا مقصود تھا۔ اقوامِ مشرق کی "ملوکیت افرنگ" پر برتری کا خواب جو انھوں نے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر جلد یا بدیر دنیا کے سامنے آگئی۔ پانچویں اور آخری مشہور نظم جو بقید تاریخ ۲۲ راگست ۱۹۳۵ء "شیش محل" بھوپال میں انھوں نے لکھی ہے۔ اس کا عنوان ہے "مسولینی"[۴]۔ اس نظم میں بھی اقبال کی شاعرانہ فکر معراج پر ہے اور یہاں بھی وہ "معصومانِ یورپ" کو للکارتے نظر آتے ہیں اور ان کی تہذیبی برتری کے کھوکھلے نعروں کا اپنے منفرد لب و لہجہ میں پردہ چاک کرتے ہیں ؎

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راج دھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

اور آخر میں واضح طور پر یہ اعلان کردیتے ہیں ؎

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

---

[۱] ضربِ کلیم۔ صفحہ ۴۱ [۲،۳،۴] ضربِ کلیم۔ صفحہ ۱۴۸ - ۱۴۹ - ۱۵۱ - ۱۵۲

ان پانچ نظموں کے موضوعات اور قیام شیش محل کی ذہنی اور فکری وسعتوں کا احاطہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔ ان میں شعری حسن سے زیادہ صداقت آفرینی ہے۔ معاملہ بندی اور زبان کے چٹخارہ کے برعکس ٹھوس حقیقتیں ہیں جو غلام ہندوستان کا مقدر بنی ہوئی تھیں اور جن کے خلاف اقبال کی باغی فکر برسرِ پیکار تھی۔ ع

کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

یہ بات صرف اقبال ہی کہہ سکتے تھے۔ اس دور میں جب سفید آقا کالے غلاموں کو پابہ زنجیر رکھنے پر تلا بیٹھا تھا۔ "ضربِ کلیم" کی تقریباً تمام نظمیں سوچنے والے ذہن کے لیے فکری سرمایہ بہم پہنچاتی ہیں۔ اقبال بحیثیت شاعر کبھی اپنے فن پر نازاں نہیں ہوئے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ۱۷ راگست ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو بھی انھوں نے لکھا ہے۔ شاعری سے اُنھیں صرف اسی حد تک دلچسپی تھی کہ وہ اُسے "بعض مقاصد خاص" کی ترجمانی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور بس۔ انھیں تو مسلم قوم کی شیرازہ بندی، اسلام کی عظمت اور مسلمانوں میں احساس بیداری پیدا کرنے کا جذبہ ہر وقت ستاتا رہتا تھا چنانچہ نظم ہو یا نثر وہ اظہار کے ذریعہ سے زیادہ حقیقی مقصد پر توجہ صرف کرتے تھے۔

"شیش محل" بھوپال کے دورانِ قیام میں صرف یہی پانچ نظمیں، جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ "ضرب کلیم" میں ملتی ہیں۔ یہ مجموعۂ کلام اشاعت کی منزل میں تھا۔ چنانچہ ان نظموں کے موضوعات اور ان کے پس منظر سے نہ صرف ان نظموں کے عرصۂ تخلیق کا ہمیں علم ہو جاتا ہے بلکہ اقبال کی سوچ اور فکر کے مربوط گوشے بھی کھُل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

اس قیام کے دوران میں سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کا ایک اور خط ملتا ہے جس سے ان کی مخصوص طرزِ فکر کے کچھ اور پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ان کے علاج کا کورس ۲۸ راگست ۱۹۳۵ء تک ختم ہو رہا تھا۔ اور وہ اُسی روز لاہور کے لیے روانہ ہونے والے تھے:۔

"بھوپال ــــ ۲۳ راگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا ــــ السلام علیکم۔

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں۔ امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا ــــ ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی۔ جواب عرض کرتا ہوں۔ کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جو حیات و نزولِ مسیح ابن مریم کے منکر ہوں؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے[۱]؟ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میں ۲۸ راگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا۔ علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا۔ اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمایئے۔

والسلام

مخلص محمد اقبال[۲]"

اس خط کے دوسرے ہی روز انھوں نے نیازی صاحب کو بھی روانگی کے پروگرام سے مطلع کر دیا:۔

۱؎ مجھے جہاں تک علم ہے نزولِ مسیح کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو۔ البتہ ابن حزم وفاتِ مسیح کے قائل تھے ساتھ ہی نزول کے بھی۔ (سید سلیمان ندوی)

۲؎ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۶ ـ ۱۹۷

"ڈیر نیازی صاحب ـــ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے، الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ میں ۲۸ راگست کی شام کو سات بجے یہاں سے روانہ ہوکر ۲۹ رکی صبح آٹھ بجے دہلی پہنچوں گا۔ دن بھر ریلوے اسٹیشن پر قیام رہے گا۔ رات کی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوکر ۳۰ رکی صبح انشاءاللہ لاہور۔ دہلی سے میرے لیے دو سیٹ سیکنڈ کلاس لوئر برتھ ریزرو کرا چھوڑیں۔ ہمارے وہ ہندو دوست جنھوں نے دہلی سے پانچ بجے شام چلنے کا مشورہ دیا تھا ان سے مدد لیجیے۔ باقی وقت ملاقات ـــ والسلام

محمد اقبال

۲۴ راگست ـــ ۱۹۳۵ء[1]"

اب اقبال بھوپال سے واپس لاہور جارہے تھے۔ بجلی کے علاج کا دوسرا کورس ۲۸ رتک ختم ہورہا تھا۔ ان کی صحت عامہ پر اس علاج کا خاطر خواہ اثر پڑا تھا۔ پہلی بار وہ ایک معزز سرکاری مہمان کی حیثیت سے شیش محل میں ٹھہرے تھے جہاں ریاست کی طرف سے بھی اور راس مسعود ایسے جاں نثار دوست کی خصوصی توجہ کے سبب بھی اُن کی آسائش و راحت کا ہر ممکن انتظام کیا گیا تھا۔

اس قیام سے اُنھوں نے نہ صرف ذہنی آسودگی حاصل کی بلکہ فکر و تخلیق کے علاوہ بیش از بیش مطالعہ بھی کیا اور استفادہ بھی۔ اسی قیام کے دوران اُنھوں نے فتنۂ قادیانی پر اپنے مشہور مضامین لکھے۔ قرآن مجید کے حواشی کے سلسلے میں ابتدائی خاکہ تیار کیا۔ راس مسعود کی معیت میں وہ ایک سے زائد بار نواب صاحب بھوپال سے بھی ملاقات کرنے گئے اور مختلف مسائل پر اُن سے گفتگو کی۔ ان کے معالجین ان کی صحت کی بحالی سے بے حد خوش اور مطمئن تھے اور اُنھیں بتا چکے تھے کہ بجلی کے علاج کا تیسرا کورس بھی وہ جلد بھوپال آکر مکمل کرلیں چنانچہ انھوں نے پھر جلد ہی بھوپال آنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ فی الوقت ان کا لاہور جانا ضروری تھا کیونکہ جاوید تو اُن کے ساتھ ہی آئے تھے لیکن منیرہ لاہور میں تھی اور وہ زیادہ عرصہ اُسے تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جاوید نے بھوپال کے دورانِ قیام وہاں کے تاریخی اور تفریحی مقامات کی خوب سیر کی۔ ڈاکٹر عبدالباسط کے بچوں کے ساتھ ان کا بیشتر وقت کھیل کود میں صرف ہوتا تھا۔ اقبال کے ساتھ انھیں بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ـــ اس وقت وہ بہت کم عمر تھے ـــ پھر بھی بھوپال کے اس سفر و قیام کی یادوں کے جو دھندلے نقوش محفوظ رہ گئے ـــ ان کا احوال آپ جاوید اقبال کی زبانی سنیے:-

"اماں جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ (مراد اقبال) مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں مَیں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی دھندلی سی یاد اب تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ بہت لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور کئی راتیں ریل گاڑی میں ہی گذریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر کی برتھ پر سُلا دیتا تھا اور ابا جان نیچے کی برتھ پر سوتے۔ ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔

---

[1] مکتوبات اقبال ـ صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۷

جب ہم بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر محمد شعیب استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم موٹر کار میں شیش محل پہنچے جہاں اباجان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع وعریض عمارت تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان سے گذرتے ڈر آیا کرتا تھا۔

ہم بھوپال میں کوئی دو ایک ماہ ٹھہرے۔ وہاں ڈاکٹر باسط اباجان کے معالج تھے اور ان کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے کرتے تھے۔ مجھے روز پڑھانے کے لیے ایک استاد بھی شیش محل آیا کرتے۔ شیش محل کے قریب ایک جھیل[1] کے کنارے میں ڈاکٹر باسط کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا اور اس کے سامنے غالباً ایک وسیع میدان[2] تھا۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز میں اباجان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں 'ریاض منزل' جایا کرتا تھا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنھیں میں نے اباجان کو اقبال کہہ کر پکارتے سُنا۔ سید راس مسعود قد میں اباجان سے بہت اونچے، قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور اباجان ہفتہ میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ 'ریاض منزل' میں کھایا کرتے۔ بسا اوقات ہم اور جگہوں پر بھی کھانے پر مدعو ہوتے۔

ایک مرتبہ ہم کسی کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے اور گاڑی میں اباجان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی منہس مکھ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ بعد میں اباجان نے مجھے بتایا کہ وہ سروجنی نائیڈو تھیں۔

اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کو فرشی سلام کیے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بہرحال بھوپال میں میرا بیشتر وقت اباجان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچ اس طرح پکڑنا چاہیے اور کانٹا ایسے۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا اس لیے جب کبھی انھیں لوگ وہاں ملنے آتے یا دوسرے لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔

بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لیے دہلی ٹھہرے۔ وہاں اباجان بذاتِ خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا پھر نظام الدین اولیاء گئے اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر چڑھ جاؤں اور میں نے اباجان کو بھی ساتھ آنے کے لیے کہا مگر وہ بولے۔ تم جاؤ۔ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔ بالآخر ہم لاہور آ گئے[3]۔

---

[1] بھوپال کا مشہور بڑا تالاب جس کے قریب قدسیہ محل تھا جس میں ڈاکٹر سید عبد الباسط رہتے تھے۔

[2] یہ کھرنی والا میدان تھا جہاں اکثر بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے۔ [3] مے لالہ فام۔ صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۷

جشنِ حالی اور اقبال

(۲۶ ر ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء)

لاہور پہنچتے ہی اقبال کی صحت پھر متاثر ہوگئی۔ زکام ہوا تو انھوں نے بہیدانہ اور شربت بنفشہ کا استعمال شروع کردیا، جس سے بلغم پک گیا اور خفیف سے دمہ کا اثر بھی محسوس ہوا۔ نیازی صاحب کے نام ۵ر ستمبر ۱۹۳۵ء کا مکتوب اس امر کی نشان دہی کرتا ہے۔ ۸ر ستمبر کو انھوں نے پھر خط لکھا اور کھانسی، زکام اور بلغم کی شکایات کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا:۔

"بھوپال میں بھی یہی کیفیت تھی مگر وہاں بلغم پختہ نہ تھی۔ یہ بات صرف بہیدانہ اور شربت بنفشہ پینے کے بعد ہوئی ہے [۱]"

پھر ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں اُنھوں نے بھوپال میں پھیپھڑوں کے معائنہ کا حال لکھ بھیجا:۔

"—— بھوپال میں دو دفعہ پھیپھڑوں کا امتحان کرایا تھا معلوم ہوا کہ پھیپھڑے بالکل صاف ہیں [۲]"

اسی طرح ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط کی یہ عبارت:۔

"—— وہ معمولی بلغم جو زکام سے پہلے آتی تھی ابھی آتی ہے۔ مختصراً یہ کہ جیسا میں بھوپال سے آتے وقت تھا۔ اب وہی حالت عود کر آئی ہے [۳]"

ان خطوط کے جواب میں نیازی صاحب حکیم نابینا صاحب سے ان کے حیدرآباد (دکن) چلے جانے کے سبب مشورہ کر سکے نہ ادویہ بھیج سکے لیکن جب وہ حیدرآباد (دکن) سے لوٹ آئے تو تمام خطوط انھیں پڑھ کر سنائے اور ادویہ لاہور روانہ کردیں۔

اسی خط کے آخری اقتباس سے پانی پت میں مولانا حالی کے جشنِ صدسالہ کی تواریخ اور اقبال کے قصدِ روانگی کا بھی علم ہوتا ہے:۔

"—— مولانا حالی کی سال گرہ کی تاریخ ۲۶ر ۲۷ر اکتوبر مقرر ہوئی ہے۔ میں غالباً

---

[۱] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۹۱

[۲-۳] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۹۲-۲۹۳

۲۵ رتا ۲۶ راکتوبر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ کے رسالے کے (لیے ــ سہواً رہ گیا) ــ یہ بہتر ہوگا کہ اگر ممکن ہو تو آپ خود وہاں پہنچ جائیں اور اگر فوٹوگراف (مطلب ہے، فوٹوگرافر) کا بھی انتظام کر سکیں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ وہاں میں آپ کو سید راس مسعود سے بھی انٹروڈیوس کراؤں گا۔ غالباً چوہدری محمد حسین اور جاوید بھی ساتھ ہوں گے[1]۔"

اِس دوران راس مسعود سے بھی ان کی خط وکتابت جاری رہی۔ جشن حالی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ پروگرام کے مطابق اقبال کو بھی نظم پڑھنا تھا۔ ۱۸ رستمبر ۱۹۳۵ء کا یہ خط ان امور پر روشنی ڈالتا ہے:۔

"لاہور ــــ ۱۸ رستمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود ــــ تمھارا خط جس میں دو نامے ملفوف تھے، ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل وکرم سے اچھا ہوں ــــ انشاء اللہ ۲۴ ریا ۲۵ راکتوبر کو پانی پت پہنچوں گا۔ جو چند اشعار فارسی کے لکھے تھے وہ میں نے خواجہ سجاد حسین کی خدمت میں ان کی درخواست پر بھیج دیئے ہیں۔ جاوید کے ماموں کو بھی آج قالین کے لیے پھر لکھ دیا ہے۔ اطمینان فرمایئے۔

باقی رہا وہ معاملہ سو اس میں تمھارے اس خط کے بعد مَیں کیا عرض کروں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئینِ جواں مردی نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو اپنا دوسرا [illegible] خیال کرتا ہوں اس واسطے جو کچھ آپ لکھتے ہیں اس پر عمل کرتا ہوں۔ اخباروں میں اس کا چرچا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اور اس کی ادائیگی بھی معرفت اعلیٰ حضرت ہی ہونی چاہیے جیسا کہ آپ نے مجھ سے زبانی کہا تھا۔ زیادہ کیا عرض کروں ــ

لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ جاوید سلام عرض کرتا ہے، علی بخش آداب کہتا ہے۔

والسلام ــــ محمد اقبال ــ لاہور[2]"

اس خط سے جہاں ۲۴ ر۲۵ راکتوبر کو اقبال کے پانی پت پہنچنے کا علم ہوتا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فارسی اشعار انھوں نے خواجہ سجاد حسین (پسر مولانا الطاف حسین حالیؔ) کو روانہ کر دیے تھے۔

خط کا دوسرا حصہ ــــ جس میں نواب صاحب کی لائف پنشن قبول کرنے کا تذکرہ ہے ــــ دراصل اُس وظیفہ کی پیش کش سے تعلق رکھتا ہے جو سر آغا خاں نے راس مسعود کی تحریک پر کی تھی۔ ان کا یہ کہنا:۔

"ــــ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جواں مردی نہیں ــــ"

اس عظیم درویش صفت، احسان کیش، مرد قلندر اور مفکرِ مشرق اقبال کے اُن خدوخال کو نمایاں کرتا ہے،

---

[1] مکتوبات اقبال ــ صفحہ ۲۹۴

[2] اقبال نامہ ــ (جلد اول) صفحہ ۳۶۸ ــ ۳۶۹

جن سے ایک سچے مسلمان کی ساری زندگی عبارت ہے۔ وہ نواب صاحب کے وظیفہ کے بعد کسی مزید وظیفہ کے طالب نہیں تھے کیونکہ ان کی زندگی نہایت سادہ و درویشانہ تھی ـــــ پھر ان میں صبر و رضا، قناعت و توکل، مہر و مروت اور جذبۂ احسان مندی کی اعلیٰ صفات بھی موجود تھیں چنانچہ راس مسعود کو جنھیں وہ اپنا دوسرا سیلف خیال کرتے تھے۔ بلا تکلف "آئین جواں مردی" کا اشارا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دوست کو صحیح راستہ کی جانب متوجہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ بہر طور اس ضمن میں اقبال اور راس مسعود کے درمیان جو مزید مراسلت ہوئی ہے اُس کی تفصیلات آیندہ صفحات میں پیش ہوں گی۔

یہاں صرف اس امر کی طرف اشارا ضروری ہے کہ اقبال نواب صاحب کے وظیفہ کی تشہیر کو بھی ناپسند کرتے تھے جیسا کہ خط کی اس عبارت: "اخباروں میں اس کا چرچا مناسب نہیں" سے ظاہر ہے۔ وہ وظیفہ کی ادائی بھی اعلیٰ حضرت کی معرفت چاہتے تھے اور اس سلسلے میں راس مسعود سے بھوپال کے قیام کے دوران گفتگو بھی ہو چکی تھی۔

ستمبر کا پورا مہینہ بیماری کی نذر ہو گیا۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں انھوں نے نیازی صاحب کو پورا حال لکھ کر بھیجا اور یہ خواہش کی کہ حکیم صاحب سے ان تین امور پر مشورہ کریں:۔

(۱) بلغم کا استیصال

(۲) قوت جسمانی میں ترقی

(۳) آواز

بھوپال سے لوٹنے کے بعد ان شکایات نے اُنھیں پھر اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ بعض ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ وہ ویانا تشریف لے جائیں۔ نیازی صاحب نے حکیم صاحب سے مشورہ کیا اور دوائیں روانہ کر دیں۔ اسی زمانے میں اُنھیں لاہور کے ایک دوست نے جو ویانا سے علاج کرا کے لوٹے تھے ویانا چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں وہ راس مسعود سے مشورہ طلب کرتے ہیں:۔

> "لاہور ـــــ ۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء
>
> ڈیر مسعود ـــــ ایک خط اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ جو اُمید ہے تم کو مل گیا ہوگا۔ جواب کا ابھی تک انتظار ہے۔ امید ہے کہ آپ اور بیگم مسعود مع الخیر ہوں گے۔ میرے ایک دوست جو یہاں کے سادات میں سے ہیں اور مرض ذیابیطس کے پُرانے بیمار تھے حال میں تندرست ہو کر وائینا[۱] (آسٹریا) سے واپس آئے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دوران علاج میں انھوں نے اپنے ڈاکٹر سے میرے مرض کا ذکر بھی کیا تھا جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آجائے تو میں گارنٹی کرتا ہوں کہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر وائینا[۲] جانے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤں۔ آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ فی الحال میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی قدرے امپرومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے جو فوٹو میرے سینے کا لیا تھا اسے ڈاکٹر رحمٰن وائینا[۳] بھیجنے والے تھے۔ معلوم نہیں ابھی تک بھیجا ہے"

[۱-۳] سے مراد ویانا۔

یا نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب (عبدالباسط) کو خط لکھ کر دریافت کیا ہے۔ وہاں سے اکسپرٹ اوپینین آ جانے پر آخری فیصلہ کروں گا۔ فی الحال میں آپ کی رائے چاہتا ہوں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ جاوید آداب عرض کرتا ہے۔ اور علی بخش سلام لکھواتا ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال

بیگم مسعود صاحب سے سلام عرض کیجیے۔ انشاءاللہ پانی پت میں ملاقات ہوگی۔ کل سے کوٹھی کے بقایا حصے کی تعمیر ہوگی۔ امید کہ پانی پت جانے تک کام ختم ہو جائے گا۔[1]"

اپنی بیماری سے قطع نظر انھیں جشن پانی پت کی شرکت سے بھی خصوصی دلچسپی تھی جس کا اس خط کے آخر میں بطور خاص تذکرہ کیا ہے۔ کوٹھی (جاوید منزل) کے بقایا حصہ کی تعمیر بھی جاری تھی جسے وہ پانی پت جانے سے قبل مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس خط میں ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر رحمٰن کا بھی ذکر ہے۔ جو پہلے ہی اُن کے سینے کے فوٹو لے چکے تھے اور مشورہ کے لیے ویانا بھیجنے والے تھے۔

علامہ اقبال نے ڈاکٹر عبدالباسط کے نام اس سلسلے میں پانچ خطوط تحریر کیے جو آیندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے۔ یہ خطوط اب تک غیر مطبوعہ تھے جو خوش نصیبی سے مجھے اُن کے صاحبزادے سید عبدالحیٔ سے کراچی میں دستیاب ہو گئے۔ سید عبدالحیٔ کی اقبال سے ملاقات کا احوال بھی اگلے صفحات میں شامل ہوگا۔

واقعتاً اقبال کی موجودہ تکلیف پھر تردّد کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اپنی علالت کا تذکرہ سید محفوظ علی بدایونی کے نام ایک اور خط میں بھی کرتے ہیں جس میں ویانا جانے کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے:۔

"لاہور ۔۔۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مخدومی ۔ السلام علیکم۔

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ مع الخیر ہیں۔ میں گذشتہ ۱۸ ماہ سے علیل ہوں۔ سفر بہت کم کرتا ہوں۔ ہر تیسرے مہینے بھوپال جاتا ہوں۔ وہاں برقی علاج ہے جس سے کچھ فائدہ ہے اب وائینا[2] (آسٹریا) جانے کی فکر میں ہوں۔ یہ ظاہری علاج ہے، باطنی علاج صرف اس قدر ہے کہ آپ کے جد پر درود پڑھتا ہوں آپ بھی دعا فرمائیے اگر بدایوں آتا تو ضرور آپ ہی کے ہاں ٹھہرتا ۔۔۔ اور آپ کے روحانیات سے مستفیض ہوتا ۔۔۔

والسلام

مخلص محمد اقبال[3]"

اس خط کے دوسرے دن انھوں نے نیازی صاحب کو بھی ویانا جانے کے بارے میں خط تحریر کیا:۔

"ڈیر نیازی صاحب

میرا خط آپ کو ملا ہے یا نہیں۔ آپ لکھتے تھے کہ آپ خود لاہور آنے کو ہیں مگر نہ آپ آئے نہ میرے خط کا جواب دیا نہ آپ کا رسالہ نکلا۔ بہرحال حکیم صاحب قبلہ سے پوچھ کر جواب لکھیے

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۰ ۔ ۳۷۱

[2] مراد ویانا۔ [3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۴۸

میں نے ابھی تک دوا کا استعمال شروع نہیں کیا کہ آپ کے خط کا انتظار تھا۔ وائینا[1]
(آسٹریا) جانے کا خیال ہے ڈاکٹر انصاری صاحب سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔
انھوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اگر گیا تو فروری یا اپریل ۱۹۳۶ء
میں جاؤں گا ——— والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء[2]

نذیر نیازی صاحب کا بیان ہے کہ وہ حضرت علامہ کی خواہش کے باوجود اجتماع پانی پت سے پہلے نہ "طلوعِ اسلام" شائع کر سکے نہ لاہور ہی پہنچ سکے۔ اسی طرح علامہ کے ویانا جانے کا ارادہ بھی افسوس کہ پورا نہ ہو سکا۔

پروگرام کے مطابق جشن حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے اقبال ۲۵ر اکتوبر کو پانی پت پہنچ گئے لیکن ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ نذیر نیازی نے پانی پت پہنچ کر حضرت علامہ کو جس ضعف کے عالم میں دیکھا اس کا حال اُنھیں کے الفاظ میں سنیے:-

——— "اکتوبر کے آخری ہفتہ میں پانی پت پہنچا لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ کے چہرے پر زردی چھا رہی ہے اور آواز کا ضعف بھی بہت کچھ بڑھ گیا ہے بڑا دکھ ہوا۔ معلوم ہوتا تھا لاہور سے پانی پت کا سفر بھی ان کی برداشت سے باہر ہے حالانکہ ابھی چند ہفتے پیشتر جب آخر اگست میں وہ بھوپال سے واپس آئے ہیں تو ضعف و اضمحلال کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ پانی پت میں حضرت علامہ کا قیام دو روز رہا۔ انھوں نے تقریب میں شرکت فرمائی۔ حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضری دی۔ احباب اور نیاز مندوں سے باکرام و التفات پیش آئے اور پھر چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم، راجہ حسن اختر، جاوید سلمہ، اور علی بخش کی معیت میں لاہور واپس تشریف لے گئے۔ مگر پھر یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس تقریب میں حضرت علامہ اگرچہ مسند پر تشریف فرما رہے لیکن نہ اپنا مشہور قطعہ ؎

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

خود پڑھ سکے۔ نہ اُن تعریفی کلمات کے جواب میں بطور تشکر ہی کچھ فرمایا جو اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اور دوسرے حضرات نے اُن کی شان میں کہے[3]۔"

پانی پت میں مولانا حالی کے جشن کے سلسلے میں جو وسیع انتظامات کیے گئے تھے۔ نواب صاحب بھوپال نے جو خطبہ وہاں پڑھا تھا، برصغیر کی جن مایۂ ناز اور بلند پایہ شخصیتوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ ان کی واضح تفصیلات چار سال کی لگاتار سعی و کوشش کے باوجود مجھے کہیں دستیاب نہ ہو سکیں لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور تلاش و جستجو جاری رکھی۔ نواب صاحب بھوپال کا خطبۂ صدارت اصولاً بھوپال کی کسی لائبریری یا نواب صاحب کے محکمۂ صرفِ خاص میں

---

[1] مراد ویانا [2] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۲۹۸ - ۲۹۹
[3] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۰۱

ملنے کی توقع پر میں نے بھوپال کئی حضرات کو خطوط لکھے۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ بھوپال کے ایک ایم۔اے اور ریسرچ کے طالب علم شمیم احمد نے (جو اورنگ آباد بھارت) میں لکچرر ہیں) کافی سعی و تلاش کے بعد مجھے جو معلومات بہم پہنچائیں[۱] اُس سے جشن کا کچھ نہ کچھ حال ضرور معلوم ہو گیا اور اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ نواب صاحب نے حالی مسلم ہائی اسکول کے لیے بیس ہزار کی گراں قدر امداد عطا فرمائی تھی۔ ان کے ایک خط مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۶۲ء کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"___ نواب صاحب کے خطبہ کو تین دن تک ریکارڈس آفس (بھوپال) میں خود تلاش کیا۔ اُن کے ۱۹۲۹ء ۱۹۳۰ء ۱۹۳۲ء کے کچھ مطبوعہ خطبات جو اندور اور علی گڑھ میں پڑھے گئے تھے ملے۔ لیکن مطلوبہ خطبہ نہ مل سکا۔ ریکارڈس آفس میں اس قدر بے ترتیبی اور بھونڈ پن ہے کہ کوئی بھی چیز آرڈر میں نہیں۔ وہاں سے مایوس ہوا تو اسمٰعیل صاحب[۱] کے کتاب گھر گیا۔ وہاں اسمٰعیل صاحب نے "زمانہ" کانپور دسمبر ۱۹۳۵ء جلد ۶۵ شمارہ ۶ دیا۔ یہ حالی کے اُس جشن صد سالہ کی یادگار کے بطور شائع کیا گیا تھا۔ اس کے شروع میں نواب صاحب بھوپال کی تصویر تو ہے جس کے نیچے مرقوم ہے کہ آپ نے حالی کے جشن صد سالہ کی صدارت فرمائی۔ مگر اس میں وہ خطبہ نہیں ہے۔ البتہ صفحہ ۲۳۴ پر مندرجہ ذیل تحریر ملی:-

"___ مولانا حالی کے صد سالہ یادگاری جشن کے سلسلے میں سب سے بڑا جلسہ اعلیٰ حضرت ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں آخری ہفتہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مولانا کے خاص مولد و منشا پانی پت میں منعقد ہوا جس میں ملک کے بڑے بڑے معززین موجود تھے۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے بیس ہزار کی گراں قدر امداد حالی میموریل اسکول کے لیے منظور فرمائی۔"

بھوپال سے خطبہ کی فراہمی کے امکانات جب تقریباً ختم ہو گئے تو میں نے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی[۲] سے استصواب کیا اور میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب قبلہ شیخ صاحب نے مجھے یہ لکھا کہ نواب صاحب کا خطبہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ جس خطبہ کی تلاش چار سال تک جاری رہی وہ مجھے حسن اتفاق سے لاہور ہی میں مل گیا اور شیخ صاحب نے از رہِ شفقت نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کا قلمی خطبہ رجسٹری سے مجھے عنایت فرما دیا۔ اس سلسلے میں قبلہ شیخ صاحب کے گرامی نامہ مورخہ ۱۱ر ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۶۵ء) کے اقتباس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا:-

"___ حضرت محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[۳] ___ گرامی نامہ باعث اعزاز ہوا۔ میں آپ کے حکم کی بڑی خوشی سے تعمیل کرتا مگر کمزوری۔ نقاہت اور اضمحلال اب تو نئی ہیں

---

[۱] اسمٰعیل صاحب بھوپال کے ایک صاحب علم اور باذوق انسان ہیں جن کا ذاتی کتاب گھر نایاب اور قیمتی مسودات، قدیم اخبارات و رسائل کی فائلوں اور نادر کتابوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔

[۲] عرصۂ دراز تک شیخ صاحب نے حالی مسلم ہائی اسکول کے لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

[۳] میں نے شیخ صاحب سے خطبہ کی نقل طلب کی تھی۔ یہ جواب اسی سلسلے میں دیا ہے۔

اتنا زیادہ پیدا ہو گیا ہے کہ اتنی لمبی چوڑی تقریر کی نقل میرے لیے ناممکن ہے۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کا کام میری کم ہمتی اور ناطاقتی کے باعث رُک جائے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ تقریر شاید کہیں اور سے نہ مل سکے۔ (یقیناً نواب صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں یا اُن کے پرائیویٹ کاغذات میں تو ضرور ہو گی) اس لیے ایک آخری تدبیر میری سمجھ میں اس مشکل کے حل کے لیے یہ آئی ہے کہ میں بذریعہ رجسٹری نہایت احتیاط کے ساتھ وہ اصل تقریر جو مرحوم نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، آپ کو بھیج دوں اور آپ تکلیف فرما کر اس کی نقل وہاں کسی سے کروالیں اور پھر اصل تقریر مجھے واپس فرمادیں۔ میں نے آج۔ تیس برس سے اس تقریر کو اور اس جلسہ کی مفصل کارروائی کو بڑی حفاظت کے ساتھ اپنی جان کے برابر رکھا ہوا ہے۔ مگر میں صرف اس وجہ سے وہ آپ کو بھیجنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر آپ کا کام بن جائے تو اس میں میرا کیا نقصان ہے۔ اس حقیر فقیر کے گوشت پوست کو موت کے بعد تو کتے بھی نہیں کھائیں گے لہٰذا اگر اپنی ذات سے کسی کی مشکل حل ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل کی دنیا میں اخلاقی قدریں بالکل بدل گئی ہیں مگر مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں جو اعتبار اور اعتماد میں آپ پر کرنے لگا ہوں وہ قایم رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت فرمائے۔

اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کا جواب آنے پر وہ تقریر میں انشاءاللہ آپ کو بھیج دوں گا ______"

خط ملتے ہی میں نے شیخ صاحب سے بصد عجز و نیاز درخواست کی اور انھیں یقین دلایا کہ نقل کرنے کے بعد بذریعہ رجسٹری نواب صاحب کا خطبہ لوٹا دوں گا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے نواب صاحب کے دو خطبے جو علی الترتیب جشن صد سالہ کی تقریب اور ایڈریس منجانب میونسپل کمیٹی پانی پت کے جواب میں نواب صاحب نے پڑھے تھے مجھے عطا فرما دیے جنھیں میں نے نقل کر کے محفوظ کر لیا (یہ خطبات آیندہ صفحات میں شامل ہیں) اور اصل خطبات شیخ صاحب کو لوٹا دیے۔ جشن صد سالہ کے انتظامات کے بارے میں دریافت پر شیخ صاحب نے ایک اور گرامی نامہ میں لکھا:۔

"______ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا مرحوم کی یادگار میں جو جلسہ پانی پت میں ہوا تھا اُس کا سارا انتظام اس احقر نے اور میرے نہایت ہی عزیز ترین دوست شیخ محمد بدرالاسلام صاحب فضلی (مرحوم) ہیڈ ماسٹر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت نے کیا تھا۔"

نواب صاحب کے خطبہ کی فراہمی کے بعد اب مجھے اس امر کی تلاش رہی کہ جشن صد سالہ میں شرکت کرنے والی کوئی ایسی شخصیت مجھے مل جائے جو وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بتا سکے ____ اتفاق سے اسی دوران علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند جلیل قدوائی نے راس مسعود اکیڈمی قایم کر کے اس موقع پر "مرقع مسعود" کے عنوان سے چند قیمتی اور نایاب مضامین شائع کر دیے اور از راہِ محبت اس کی ایک کاپی مجھے بھی عطا فرمادی ____ کتاب کے مطالعہ کے دوران جہاں تقریباً سبھی مضامین نے میرے علم و مطالعہ میں اضافہ کیا وہاں خصوصیت کے ساتھ جمیل نقوی کے سیر حاصل مضمون بعنوان ____ "سر سید راس مسعود" نے جشن پانی پت کے کئی ڈھکے چھپے گوشوں کو اُجاگر کر دیا۔ اس مضمون کے دو اقتباسات بطورِ

قابل مطالعہ ہیں:۔

"اُسی زمانے میں آپ نے ایک اور قومی خدمت انجام دی ۔ یہ واقعہ بھی ہماری ادبی و تعلیمی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے ۔ مولانا حالی کی یادگار میں بمقام پانی پت ایک اسکول عرصہ سے قایم تھا ۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی مالی حالت بڑی سقیم ہوگئی ۔ خواجہ سجاد حسین مرحوم خلف مولانا حالی نے جو اسکول کے سکریٹری تھے اس باب میں راس مسعود صاحب سے رجوع کیا اور آپ کے مشورے سے ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ جوبلی منائی گئی ۔ مرحوم نہ صرف یہ کہ خود پانی پت جاکر اس یادگار اجتماع میں شریک ہوئے بلکہ نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کو بھی اپنے ہمراہ وہاں لے گئے ۔ اطراف ہند سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائی پانی پت پہنچے۔ نواب صاحب نے ایک گراں قدر رقم بطور امداد اسکول کو عطا کی ۔ دوسرے مخیر حضرات نے بھی معتد بہ رقمیں نذر کیں ۔ اس موقع پر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم اپنے ہمراہ حیدرآباد سے بہت سے لوگوں کو لے کر آئے ۔ دہلی، علی گڑھ اور دوسرے مقامات سے بھی معزز مہمان پہنچے تھے ۔ علامہ اقبال نے اس یادگار موقع کے لیے ایک نظم لکھی تھی جو جلسے میں سنائی گئی تھی ۔ ابوالاثر حفیظ بھی وہاں موجود تھے اور نظم پیش کی تھی لیکن یہ سب کچھ راس مسعود کے پُرخلوص تعاون سے ممکن ہو سکا تھا[۱]"

اسی مضمون میں پانی پت کے دورانِ قیام کا ایک لطیفہ بھی قابلِ ذکر ہے جس سے راس مسعود کی ذہانت، علمیت، اقبال دوستی اور جشن صد سالہ کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔ جمیل نقوی لکھتے ہیں:۔

"ان[۲] کا ادبی مذاق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا ادب و شاعری کے دلدادہ تھے۔ اردو ادب میں تو خیر اہلِ زبان کی شان تھی ہی ۔ فارسی ۔ انگریزی ۔ فرانسیسی، عربی ۔ اطالوی ادب پر بھی زباں داں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا ۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں خود اہلِ زبان اُن کا لوہا مانتے تھے ۔ اہلِ زبان کی طرح ان دونوں زبانوں کے حسن و قبح پر بے تکان گفتگو کرتے تھے ۔ ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔
فارسی میں مولانا روم سے عشق تھا ۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ تقریباً ساری مثنوی حفظ تھی۔ علامہ اقبال کا پورا کلام یاد تھا ۔ اس طرح کہ خود علامہ کو بھی اتنا یاد نہ تھا ۔ سینٹینری کے موقع پر ہر روز صبح کو سارے سربرآوردہ مہمان اُن کے خیمے میں جمع ہوجاتے تھے اور ان کی گفتگو سے، اُن کے لطائف سے، ان کے طنزیہ جملوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔
ایک صبح بیٹھے حجامت بنا رہے تھے، چہرے پر صابن کے جھاگ لگے تھے، مسہری پر ان کی پشت پر علامہ اقبال نیم دراز لیٹے تھے ۔ علامہ اقبال کی کسی نظم کا ذکر چھڑا ـــــ میں بھی وہاں

---

[۱] مرقع مسعود ۔ صفحہ ۱۴۴ ۔ ۱۴۵

[۲] مراد راس مسعود

حاضر تھا۔ راس مسعود صاحب نے جو اقبال کا کلام سنانا شروع کیا ہے تو تقریباً ایک گھنٹے تک سناتے رہے۔ ایک شعر پر خود وجد میں آ گئے، پیچھے کی طرف جُھک کر علامہ اقبال کا منہ چوم لیا۔ ان کا رخسار صابن سے لتھڑ گیا۔ راس مسعود صاحب نے ایک فرمایشی قہقہہ لگایا۔ باقی حاضرین بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔[1]"

ان دو اہم واقعات کی نشان دہی کے بعد جمیل نقوی سے جو "افکار" کے اور میرے دیرینہ رفیق و ہم دم ہیں، میں نے کراچی میں رابطہ قایم کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس جشن کی کچھ اور تفصیلات مجھے فراہم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک خط کی صورت میں انتہائی دلچسپ یادداشت مجھے لکھ کر عنایت کر دی جس کی تفصیلات پیش خدمت ہیں۔ ان تفصیلات سے سچ پوچھیے تو جشن کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ جمیل نقوی ایک ممتاز ادیب و شاعر ہیں اور خوش نصیبی سے سید احمد خاں کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی نسبت سے وہ راس مسعود کو 'نانا' کہتے تھے۔ اس جشن میں وہ بہ نفس نفیس شریک تھے۔ انھوں نے نوعمری کے زمانے میں اس جشن میں کیا کچھ دیکھا اُس کی روداد اُنھیں کی زبانی سنیے جو حیات اقبال اور جشنِ حالی کے کئی نئے گوشے اُجاگر کرتی ہے:۔

مولانا حالی کی صد سالہ سال گرہ

"صہبا بھائی — ہدیہ مسنون — بات بہت پُرانی ہو گئی۔ اس تقریب کی بہت سی تفصیلات ذہن سے نکل چکی ہیں جس قدر واقعات ذہن کے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے ہیں اُنھیں سمیٹ کر یہ مختصر سی روئداد پیش خدمت ہے:۔

اس تقریب کی تیاریاں کافی عرصہ پہلے شروع کی گئی تھیں۔ اس کا مقصد اول تو یہ تھا کہ مولانا مرحوم کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے اور دوسری غرض عوام و خواص کو اس اسکول کی طرف متوجہ کیا جائے جو عرصۂ دراز سے مولانا کی یادگار میں قایم تھا اور بہت سے شعبوں میں توسیع کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

اس موقع کے لیے مسدس حالی کا صدی ایڈیشن بڑی آب و تاب سے شائع کیا گیا تھا (حالی بک ڈپو کی جانب سے) اور اس کا منافع غالباً حالی اسکول فنڈ میں دیا جانا طے پایا تھا اور مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ یہ کتاب بڑی تعداد میں فروخت بھی ہوئی تھی

جلسہ میں شرکت کے لیے کئی ہزار دعوت نامے ہندوستان کے منتخب لوگوں کو جاری کیے گئے تھے اور اُن کے ٹھہرنے، کھانے پینے کا بڑے پیمانے پر بندوبست کیا گیا تھا۔ حالی اسکول کے سامنے کھیل کے میدان میں لاتعداد خیمے نصب کیے گئے تھے اور مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے اسکول کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ شہر پانی پت کے بوڑھے جوان سب ہی موجود تھے۔

جلسہ سے دو روز قبل مہمانوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا تھا۔ لاہور۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ بدایوں

---

[1] مرقع مسعود۔ صفحہ ۱۴۵-۱۴۶

میرٹھ ۔ الہ آباد ۔ لکھنؤ ۔ ناگپور ۔ حیدرآباد دکن ۔ بمبئی ۔ بھوپال اور بہت سے شہروں سے ادیب، شاعر، صحافی، ماہرین تعلیم اور دوسرے معتقدین حالی پانی پت پہنچے تھے۔ مہمانوں میں جو لوگ خاص طور پر مجھے یاد رہ گئے ہیں ۔ ان میں حسب ذیل بزرگ شامل تھے۔

ڈاکٹر اقبال ۔ ڈاکٹر سر راس مسعود ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۔ ڈاکٹر عابد حسین ۔ پروفیسر مجیب ۔ رشید احمد صدیقی ۔ مولانا سید علی احسن مارہروی ۔ مولوی محمد امین زبیری ۔ مرزا ابراہیم بیگ (سرگزشت علی گڑھ) نواب کرنال ۔ مولوی محی الدین ۔ خواجہ غلام السیدین ۔ مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) ابوالاثر حفیظ جالندھری ۔ سید ہاشمی فریدآبادی ۔ شاہد احمد دہلوی ۔ انصار ناصری ۔ فضل حق قریشی ۔ ظفر قریشی ۔ آل احمد سرور ۔ سید نذیر نیازی ۔ جاں نثار اختر وغیرہ۔[1]

جیسا میں نے اوپر عرض کیا ۔ لاہور، علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد دکن سے خصوصاً بہت لوگ آئے تھے جن میں علی گڑھ کے طالب علم اور دہلی کا نوجوان ادیب طبقہ پیش پیش تھا۔

یہ سب حضرات جلسہ سے ایک روز قبل پانی پت پہنچ چکے تھے ۔ رات کو بڑی بہار رہی۔ لوگ خیمہ بہ خیمہ گھومتے پھر رہے تھے اور ایک عجیب خوشی اور یگانگت کا ماحول پیدا ہو گیا تھا ۔ بڑے چھوٹے سب ہی خیموں میں مقیم تھے ۔ کسی کی تخصیص نہ تھی ۔ کچھ لوگ مولوی عبدالحق صاحب کے خیمہ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے، کچھ راس مسعود کے یہاں پر اجماع ہوئے تھے ۔ مرزا ابراہیم بیگ کا خیمہ زعفران زار بنا ہوا تھا ۔ مرحوم بڑے زندہ دل صحافی تھے اور علیگ برادری میں بڑے مقبول تھے ۔ ڈھیر سا حلوہ اور نہ معلوم کیا کیا تیار کرا کے اپنے ساتھ لائے تھے ۔ جو آتا اس کی خوب خاطر ہوتی اور یار لوگ کئی کئی بار آتے اور بہانہ بازی سے خوب کھاتے ۔ انھوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار کا جو (علی گڑھ اور علیگ برادری کے کارناموں کی پبلسٹی کے لیے مخصوص تھا) حالی نمبر نکالا تھا ۔ اُسے میں نے ایڈیٹ کیا تھا ۔ میرا کام یہ تھا کہ خیمہ خیمہ جا کر وہ پرچہ تقسیم کروں ۔ اس طرح مجھے سب ہی مہمانوں سے ملنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔

مولوی صاحب (بابائے اُردو) کے خیمہ میں اخبار دینے کے بہانے پہنچا تو بڑے بڑے بڈھے بیٹھے تھے ۔ میں جھانک کر ٹھٹھک گیا ۔ مولوی صاحب نے آواز دے کر اندر بلایا اور کہا کہ بھئی خوب آئے ۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی چھوٹا پھنسے تو حقہ کی تواضع کرائیں ۔ ٹھنڈا ہو گیا ہے ۔ میں حقے کر باہر نکل آیا اور ایک والنٹیر کو پکڑ کر حقہ تازہ کرایا ۔ مطبخ میں چلم بھروائی اور اسے ساتھ لے کر خیمہ کے دروازے تک آیا اور وہاں پہنچ کر اس سے حقہ لے کر اندر گیا ۔ مولوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے حقہ خیمہ کے دروازہ پر آکر لیا ہے ۔ اندر سے چیخے "دیکھ لیا ہے" ۔ سب لوگ جو وہاں بیٹھے تھے چوکنا ہو گئے اور جھانک کر باہر دیکھنے لگے میں سہما سہما اندر گیا اور حقہ مولوی صاحب کے روبرو رکھ دیا ۔ اس دوران میں مولوی صاحب "سرگزشت" کے پرچہ کی ورق گردانی کر چکے تھے ۔ میں اندر پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ ۔ مولوی محمد امین

[1] اس جشن میں پروفیسر فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی شریک ہوئے تھے ...

زبیری (مرحوم) بھی وہیں بیٹھے تھے۔ دراصل مولوی صاحب کے خیمہ میں جتنے حاضرین تھے وہ سب حقہ کے چکر ہی میں وہاں تشریف فرما تھے۔ تب مولوی صاحب نے محمد امین صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھئی یہ لڑکا تو ابھی سے اچھا لکھتا ہے۔ خاندان کا اثر اس کے انداز بیان اور زبان سے ظاہر ہوتا ہے۔ تم اس کی طرف توجہ کرو یہ آگے چل کر اچھا لکھنے لگے گا ــ مگر دیکھو اسے کمبوہ مت بنا لینا۔

مولوی صاحب کی ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ حیدرآباد واپس پہنچ کر مولوی صاحب نے جو مجھے خط لکھا اُس میں بھی اس مضمون کی تعریف کی اور بعد میں میں نے اس مضمون کو بڑھا کر "تذکرۂ حالی" کی شکل دے دی تو اس پر مولوی صاحب نے تعارف لکھا اور بہت خوش ہوئے۔ سّو روپیہ انعام دیا اور کہا کہ باقی پیسے اپنے پاس سے لگا کر اسے چھپوا لو۔

اُس زمانہ میں چھپائی کافی سستی تھی۔ شاید ڈھائی سو روپے میں وہ تذکرہ چھپ گیا تھا۔ خوب دوستوں میں تقسیم کیا باقی کاپیاں ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گئیں۔

"ذکر مسعود" میں ڈاکٹر اقبال کے ساتھ جو سرراس کا لطیفہ تھا وہ میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں (جسے گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں) سرراس کا خیمہ کافی بڑا تھا۔ اس کے پہلوؤں میں دو چھوٹے چھوٹے پارٹیشن تھے۔ ایک میں میں مقیم تھا۔ دوسرے میں حفیظ جالندھری صاحب۔ حفیظ صاحب نے اپنی نظم[1] جلسہ میں پڑھنے کے لیے اُسی خیمہ میں رات کو لکھی تھی ــ

جلسہ والے دن صبح کو آٹھ بجے لوگ نواب حمید اللہ خاں (مرحوم) والیٔ بھوپال کے استقبال کے لیے پانی پت اسٹیشن پہنچے۔ استقبال کے لیے جانے والوں میں سرراس ــ سیدین صاحب نواب کرنال، حالی اسکول کے پرنسپل فضلی صاحب اور چند اور عمائدین شہر شامل تھے۔ میں بھی سرراس کے ساتھ تھا۔ باقی لوگ جلسہ گاہ میں جمع تھے۔ تقریباً ۹ بجے کی گاڑی سے نواب صاحب تشریف لائے۔ رسمی تعارف کے بعد جلسہ گاہ پہنچے۔ معزز مہمانوں سے ہاتھ ملایا۔ تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد خواجہ سجاد حسین مرحوم خلف مولانا حالی نے سپاس نامہ پیش کیا جو تختی کے قلم سے لکھا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کی بینائی کمزور تھی، ہاتھ میں رعشہ تھا۔ ایک صاحب انھیں سہارا دیے کھڑے تھے۔ عجیب منظر تھا۔ ہر شخص متاثر نظر آتا تھا۔

اُس کے بعد ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی نظم سنائی۔ اُن کی نظم کے بعد سیدین صاحب نے اعلان کیا کہ علامہ اقبال کی نظم ایک اور صاحب سنائیں گے، کیونکہ اُس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی آواز پر کسی عارضہ کا اثر تھا اور بہت آہستہ بولتے تھے۔ نظم سنانے والے صاحب بڑے خوش الحان تھے (حالی اسکول کے اسٹاف کے آدمی تھے) ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی گئی کہ نظم خوانی کے دوران ڈائس پر تشریف رکھنے کی زحمت گوارا کریں۔ پہلے ہی شعر پر داد کا شور بلند ہوا۔[2]

---

[1] حفیظ جالندھری کی یہ نظم اس باب کے آخر میں ملاحظہ فرمایئے۔

مزاجِ ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

خصوصاً یہ شعر تو بے پناہ تھا ؎

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

خود نواب صاحب بھوپال جھک کر ڈاکٹر صاحب کو داد دیتے جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس وقت کیا جذبات تھے ان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ البتہ چہرہ پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ لوگ اس بات پر نازاں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں اُن کا کلام سننے کا موقع ملا۔ میرا شعور اس وقت زیادہ بیدار نہ تھا۔ طالب علمانہ ذہنیت تھی۔ جب نواب حمید اللہ خاں کی شان میں ان کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

تو مجھے شعر العجم کا وہ حصہ یاد آ گیا جس میں علامہ شبلی نے اکبر اعظم کے دربار میں فیضی کی قصیدہ خوانی کا منظر پیش کیا ہے اور میں سوچنے لگا حضرت اقبال نے یہ شعر لکھ کر حمید اللہ خاں کو زندۂ جاوید کر دیا۔ وہ پہلے اور آخری فرماں روا تھے جن کی شان میں خود اقبال نے خود نہ سہی اپنی موجودگی میں مدحیہ شعر پڑھوایا۔ نواب بھوپال اُن خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کی مدح میں ان کی زندگی میں اقبال نے ایسا شعر کہا ورنہ اُن کے دواوین ایسی کسی دوسری مثال (باستثنائے شہریارِ دکن) سے غالباً خالی ہیں۔ شعر خوانی کے بعد میں نے اپنے مضمون کا ایک ٹکڑا پڑھا پھر سید بن صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مضامین پڑھے گئے۔ آخر میں صدر کے خطبہ سے قبل مسدس حالی صدی ایڈیشن کا وہ مختصر دیباچہ پڑھا گیا جو سر راس مسعود نے لکھا تھا۔ صدر کے خطبہ کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ نواب صاحب نے کئی ہزار[1] کی گرانٹ مدرسہ کو دی اور اس کا اعلان سر راس نے کیا۔ اس کے بعد سب لوگ مزار حالی پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ شام کی گاڑی سے نواب صاحب واپس دہلی تشریف لے گئے۔ غالباً اسی شام سر راس، ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور دوسرے عمائدین بھی واپس چلے گئے۔

مدتوں تک اس جلسہ کی باتیں موضوعِ بحث رہیں۔ جن بزرگوں سے اس موقع پر نیاز حاصل ہوا تھا وہ بڑھ کر عقیدت اور تعلق میں تبدیل ہو گیا۔ میں اس تقریب کو اپنی زندگی کا سنگِ میل سمجھتا ہوں۔ یہیں سے میں نے بزرگوں سے استفادہ کرنا اور لکھنا سیکھا۔ بزرگانِ ادب و سیاست سے ملنے کے جو مواقع آئندہ مجھے نصیب ہوئے وہ بھی

---

[1] یہ رقم بیس ہزار تھی جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔

میں مولانا حالی کا فیضان ہی سمجھتا ہوں ۔ پانی پت ہی میں مَیں ادبی طور پر متعارف ہوا اور بزرگوں کی ہمت افزائی ہمیشہ میرے لیے شمع راہ رہی ۔

آپ سوچیں گے کہ ایسے مہتم بالشان مجمع میں مجھ جیسے نوعمر کو مضمون پڑھنے کا موقع ملنا بڑی عجیب سی بات تھی لیکن مسعود نانا کی یہ عادت تھی کہ اپنے خاندان کے نوجوانوں کو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مواقع فراہم کرتے تھے ۔ میں نے مرحوم سے ایک دفعہ عرض کیا کہ وہ ایسا نہ کیا کریں مجھے بڑی شرم آتی ہے ۔ انھوں نے فرمایا کہ ابھی تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں ۔ بڑے ہو جاؤ گے اور جب ہم نہ ہوں گے تو محسوس کرو گے کہ ایسا کیوں کیا گیا اور یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی ۔ کم از کم میری اپنی حد تک تو بالکل سچ ثابت ہوئی ۔ اُن کے اس عمل نے میرے اندر جذبۂ اعتماد اور خاندانی فخر کو اُبھارا جس نے میری شخصیت کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا ہے ۔

مجھے بھوپال کئی دفعہ حاضر ہونے کا موقع ملا ۔ غالباً دو مرتبہ علامہ اقبال وہاں تشریف فرما تھے ۔ شام کو سر راس کے یہاں محفل جمتی تھی ۔ مخصوص لوگ روزانہ جمع ہوتے ۔ علامہ اقبال بھی اگر وہاں ہوتے تو شامل ہو جاتے ۔ خالص ادبی و علمی محفل ہوتی تھی ۔ ادب ، فلسفہ ، تاریخ اور دوسرے عام موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی ۔ مذہب اور سیاست اس بحث سے یک سر خارج تھے ۔

علامہ اقبال کو جو مالی امداد بھوپال سے ملی وہ کلیتاً سر راس کی وجہ سے تھی ۔ میں نے وہ سارے خطوط دیکھے تھے جو علامہ اقبال سر راس کو اس سلسلے میں لکھتے رہتے تھے ۔ شیخ عطاء اللہ نے مکاتیب کے پہلے ایڈیشن میں تو سارے " خطوط بھوپال " شامل کر دیے تھے ۔ لیکن بعد کے ایڈیشن میں کچھ لوگوں کے اعتراض پر وہ خطوط نکال دیے اور آپ کی کتاب کا خاصا اہم مواد پردۂ خفا میں چلا گیا ۔ مجھے معلوم نہیں اب پہلا ایڈیشن کہاں ملے گا ؟

میرے پاس ایک نسخہ تھا جو مولوی محمد امین زبیری مرحوم نے اپنی کتاب اقبال کی تدوین کے سلسلے میں لیا تھا لیکن اُن کے انتقال کے بعد وہ سارا مواد کہاں چلا گیا ۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا ۔ مرحوم نے علامہ اقبال کے تعلقات حیدر آباد اور بھوپال پر دو الگ الگ باب مرتب کیے تھے ۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ مسودہ سید ہاشمی فرید آبادی کے پاس تھا ۔ اب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ کس سے پوچھا جائے ۔

ماہانہ وظیفہ سے قبل راس مسعود کی مساعی سے ڈاکٹر اقبال کو یک مشت بھی کئی ہزار کی رقم نواب صاحب بھوپال نے عطا کی تھی تاکہ وہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے کتب کی خریداری کر سکیں ۔ اس رقم کا حوالہ ڈاکٹر اقبال نے ممنون حسن خاں کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے جو اقبال نامہ کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھا ۔ بعد میں

اسے بعض وجوہ کی بناء پر پہلے ایڈیشن سے خارج کر دیا گیا لے"

جمیل نقوی نے جشن صد سالہ کے جو چشم دید واقعات بیان کیے ہیں اُن کی صداقت اور اثر آفرینی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انھوں نے اقبال کے مدحیہ شعر کے سلسلے میں شعر العجم کے قصیدہ کا جس انداز سے تذکرہ کیا ہے وہ غالباً اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے دوستانہ اور قریبی روابط کی لاعلمی کے سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہ مدحیہ شعر ہرگز "قصیدہ خوانی" کے ذیل میں نہیں آتا اور نہ آنا چاہیے کہ اقبال فطرتاً قصیدہ گو شعراء کی صف میں کبھی شامل نہیں رہے۔ جذبۂ ممنونیت، انسان کی اعلیٰ صفات کی قدر دانی اور علمی و تعلیمی کاموں کے سلسلے میں نواب بھوپال کی عہد آفریں خدمات کا حقیقی اعتراف نہ کرنا بھی یقیناً ناسپاسی، کور ذوقی، اور محسن کشی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اقبال ایسے سچے اور حقیقت پسند شاعر کا مدحیہ شعر بیں "اعتراف خدمت" آج اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

جشن کی ان جھلکیوں سے جہاں ایک طرف پانی پت کے اس عظیم و تاریخی اجتماع کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہیں چند ایک انکشافات بھی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں۔ مثلاً دنیائے ادب کو اب تک صرف یہی علم تھا کہ بھوپال سے اقبال کو پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس سے قبل راس مسعود کی مساعی سے انھیں یک مشت رقم بھی دی گئی تھی جس کی تصدیق اقبال نامہ کے پہلے ایڈیشن سے ممکن تھی جو افسوس کہ دستیاب نہ ہو سکا۔ دوئم یہ کہ مولوی محمد امین زبیری نے اقبال پر کتاب کے دو باب لکھے۔ جن میں ایک باب بھوپال سے متعلق تھا۔ کتاب کا یہ مسودہ بھی اب کہیں دستیاب نہیں۔

جشن پانی پت کی ایک اچھوتی تصویر جمیل نقوی نے پیش کی۔ جو آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ جو بیشتر اقبال سے متعلق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ واقعات سید نذیر نیازی نے "مکتوبات اقبال" میں تحریر کیے ہیں:۔

اجتماع پانی پت

"اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو میں پانی پت اس وقت پہنچا جب منتظمین جلسہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لائے تھے۔ اور پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انھوں نے پانی پت آتے ہی حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے مزار کی زیارت کی اور بعض دوسرے مقامات

لے کوشش کے باوجود اقبال نامہ کا پہلا ایڈیشن کہیں دستیاب نہ ہو سکا جس سے یک مشت رقم کی ادائی کی تصدیق ہو سکتی۔ ممنون حسن خاں اب بھی بھوپال میں موجود ہیں اور معتبر اطلاعات کے بموجب چند غیر مطبوعہ خطوط اُن کے پاس محفوظ ہیں لیکن وہ یہ خطوط جو قطعی ذاتی ہیں کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ یک مشت رقم کے سلسلے میں بھی وہ تصدیق یا تردید کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اگر کہیں لائبریری میں یا کسی صاحب ذوق کے پاس اقبال نامہ کا پہلا ایڈیشن موجود ہو گا تو آئندہ اس واقعہ کی تصدیق یا تردید ممکن ہو گی۔

ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی

بھی دیکھے۔ اگلے روز والئ بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرت علامؒ نے بھی شرکت فرمائی۔ یہ جلسہ بڑا پُر رونق تھا۔ پھر جب منتظمین جلسہ کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ مولانا حالی کی اس صد سالہ برسی کا یہ اجتماع تین دن تک جاری رہے گا اور اس کا ایک اجلاس ہر روز صبح و شام منعقد ہوا کرے گا تو لوگ یہ سمجھے کہ حضرت علامہ بھی ان میں شرکت فرمائیں گے۔ اس غلط فہمی سے قدر دانانِ اقبال کو جو پریشانی ہوئی اس کی کیفیت صاحب لوائے فردا حضرت ایوب[1] کی زبانی سنیے وہ اپنے ایک حکومت نامے میں لکھتے ہیں:۔

"۱۹۳۵ء میں جب کہ اس برسی کا انعقاد ہوا میں بسلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم تھا۔ برسی کے اجلاس تین دن تک ہونا تھے اور ہر روز صبح اور شام کے وقت الگ الگ نشستوں کا اہتمام تھا۔ ایک مجبوری کے باعث میں دن کے صبح کے اجلاس میں شریک نہ ہوسکا۔ میری گاڑی پانی پت میں بعد دوپہر پہنچی جب کہ پہلی نشست ختم ہوچکی تھی۔ پانی پت پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس نشست میں جس کی صدارت نواب حمیداللہ خاں صاحب والئ بھوپال نے کی تھی علامہ اقبال بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ چونکہ ان کے گلے کی تکلیف بدستور قائم تھی اس لیے وہ اشعار جو انھوں نے حالی کی برسی کے سلسلے میں کہے تھے کسی دوسرے صاحب نے ان کی جانب سے پڑھ دیے تھے۔ جب شام کے وقت پہلے دن کی دوسری نشست منعقد ہوئی تو اہلِ مجلس کی نظریں پوری بے تابی کے ساتھ ڈائس کی جانب لگی ہوئی تھیں کہ علامہ کب تشریف لاتے ہیں۔ جب پنڈال پُر ہوگیا اور جلسہ کی کارروائی کی ابتدا کا وقت آیا تو ڈائس سے یہ اعلان ہوا کہ علامہ اقبال کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ اس لیے وہ اس اجلاس میں تشریف نہیں لاسکے۔ لیکن وہ کل صبح کے جلسے میں ضرور تشریف آور ہوں گے۔ اس اعلان نے دعوتِ شوق کو تلخئ انتظار کی دعوت دی۔ دوسرے دن صبح کے اجلاس میں کشتگانِ انتظار کی نظریں پوری تیزی کے ساتھ پھر ڈائس کے طواف میں منہمک تھیں۔ امید کو یہ سہارا تھا کہ کل کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا۔ لیکن آج بھی ہزارہا تمناؤں کا خون ہوا جب مسند کی جانب سے یہ آواز آئی کہ علامہ اقبال ایک ضروری کام کے سلسلے میں دلی گئے ہیں دوپہر تک واپس تشریف لے آئیں گے۔ اور شام کے اجلاس میں شرکت فرمائیں گے۔ شوق کو اگرچہ خود فریبی کا شکار ہونے سے کبھی باک نہیں ہوتا۔ تاہم آرزومندوں کو محسوس ہوا کہ یہ سب اعلانات محض محفل کی رونق افزائی کے وسیلے یا حیلے ہیں۔ اقبال تو غالباً اب کسی نشست میں شریک ہونے والے نہیں اس احساس کی رہنمائی میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب پانی پت میں رُکنا بے سود ہے اور مناسب ہے کہ بعد دوپہر کی گاڑی سے

---

[1] (سابق) نائب مشیر مالیات (مواصلات) حکومت پاکستان۔ کراچی (نیازی)

دلّی واپس جایا جائے۔ میرے چند احباب نے جو دلّی سے میرے ساتھ آئے تھے۔ میری رائے سے اتفاق کیا۔ اور ہم گاڑی کی آمد سے کوئی بیس منٹ پہلے پانی پت ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں جو داخل ہوئے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ علامہ اقبال وہاں پر تشریف فرما ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی دلّی کی جانب سے آنے والی تھی۔ جس میں علامہ لاہور کا سفر اختیار کرنے والے تھے۔ علامہ موصوف کو دیکھنے کا عمر بھر میں یہ میرا پہلا اور آخری موقع تھا۔ جب میری نظر اُن پر پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انسانی عظمت کا کوئی ہالہ میرے سامنے آگیا ہو۔ اس وقت میری عمر کوئی چوبیس برس کی تھی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے علامہ سے مصافحہ کیا اور کوئی ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ایک بنچ پر دم بخود بیٹھ گیا۔ کمرے میں چند لوگ اور بھی تھے، ایک صاحب نے جو غالباً ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے جرأت کرکے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا۔ "ہم نے سنا تھا کہ جناب وائسرائے سے ملاقات کی غرض سے دلّی تشریف لے گئے ہیں، آپ کے دلّی تشریف لے جانے کا اعلان تو آج صبح کے جلسہ میں بھی ہوا تھا" اس سوال کے جواب میں علامہ نے اپنی میٹھی ہوئی مگر جلال آگیں آواز میں فرمایا۔ "فقیر کا وائسرائے سے کیا کام" اس کے بعد ایک صاحب نے علامہ کو ایک کاغذ پر لکھے ہوئے ان کے چند شعر دکھائے جو ان کی جانب سے برسی کے اولین اجلاس میں پڑھے گئے تھے۔ اور عرض کیا کہ یہ اشعار میں نے جلسہ میں سُن کر لکھے تھے آپ انھیں ملاحظہ فرماکر یہ فرمائیں کہ میں نے لکھنے میں تو کوئی غلطی نہیں کی۔ علامہ نے سید نذیر نیازی کی جانب جو ایک گوشہ میں کرسی پر بیٹھے ہاتھ میں تھامے ہوئے چند کاغذات کی طرف گھور رہے تھے۔ اشارہ کیا اور فرمایا کہ نیازی صاحب کو دکھا دیجیے۔ ادھر نیازی صاحب نے ان اشعار کی صحت پر صاد کیا اور اُدھر لاہور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آپہنچی۔ علامہ وہاں سے اٹھے اور آکر گاڑی میں تشریف فرما ہوئے۔ چند منٹ بعد گاڑی جاچکی تھی لیکن اس اتفاقی ملاقات کے ناقابل فراموش تاثرات و تصورات اپنی جگہ پر قائم تھے۔"

جیسا کہ سب کو معلوم ہے صد سالہ برسی کی تقریب حالی مسلم ہائی اسکول میں منائی گئی تھی۔ اور حضرت علامہ کے قیام کا انتظام بھی اسی مدرسہ کی ایک عمارت میں کیا گیا تھا۔ صاحب لوائے فردا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ شام کے اجلاس میں قدردانانِ اقبال کی نگاہیں انھیں ڈھونڈتی رہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ والیِ بھوپال واپس تشریف لے گئے تو حضرت علامہ بھی جوان دنوں خلاف اُمید بہت زیادہ نقاہت اور ضعف محسوس کرتے تھے جلسہ گاہ سے اُٹھ آئے۔ انھیں اس وقت بے حد آرام کی ضرورت تھی چنانچہ حضرت علامہ نے اول تو کچھ آرام فرمایا، پھر کھانا کھایا۔ علی بخش حقہ بھر کے لے آیا۔ چوہدری صاحب مرحوم، راجہ صاحب اور راقم الحروف خدمت کے لیے حاضر تھے۔ مجھ سے حکیم صاحب قبلہ کے بارے میں استفسار فرمایا۔ اپنے خطوں اور دوا دیر ہیز کا ذکر کرنے لگے۔ میں حکیم صاحب قبلہ سے مل کر سب حالات

عرض کر چکا تھا۔ دوائیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوا اور پرہیز کے بارے میں ان کا اطمینان ہوا تو حسبِ معمول کچھ نیند لی۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ سہ پہر میں دارالاقامے کے میدان میں نشست رہی۔ چائے کا اہتمام ہوا، موسم بڑا خوش گوار تھا، شام کو میدان سے اٹھ کر پھر کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس دوران میں بھی جو حضرات ملنے کے لیے آئے ان کی باتوں کا اپنی دھیمی اور کمزور آواز میں جواب دیتے رہے۔ اس اثناء میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک صاحب بار بار آتے اور ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہیں پاس ہی کچھ کاغذ اور پمفلٹ پھینک دیتے۔ یہ صاحب شلوار کوٹ پہنے تھے خشخشی سی داڑھی تھی۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کسی تبلیغی جماعت کے کارکن ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ جو پھر مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے تو کسی نے کہا یہ آپ کیا پھینک رہے ہیں۔ ان کا بہ عجلت پمفلٹوں کو تپائیوں پر رکھنا اور اُلٹے پاؤں جانا "پھینکنے" ہی کے مترادف تھا۔ کہنے لگے یہ ہماری جماعت کا لٹریچر ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے عرض کیا مبلغ ہیں۔ فرمایا یہ تو بڑی اچھی بات ہے اور پھر ارشاد ہوا ان سے کہیے ہم سے اتنا خائف کیوں ہیں۔ بار بار تکلیف فرماتے ہیں کیوں نہ ہم سے بیٹھ کر بات کریں۔ ہمیں سمجھائیں ہم ان سے کچھ سیکھیں۔ لیکن ہمارا اُن سے یہ کہنا تھا کہ وہ مسکرائے اور پھر اسی تیزی سے جس سے اس مرتبہ انھوں نے جھلک دکھائی تھی غائب ہو گئے۔

شام کے اجلاس میں حضرت علامہ کی شرکت ناممکن تھی، سفر کی کلفت سے ان کا ضعف و اضمحلال بہت کافی بڑھ گیا تھا، بلکہ تشویش تھی کہ اُنھیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے [1]۔"

جشنِ حالی کے موقع پر علامہ اقبال کی جو نظم پڑھی گئی تھی وہ اقبال نامہ میں حسبِ ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:۔

حالی اور اقبال

یہ اشعار جو حالی کی صد سالہ برسی پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور اب تک اقبال کی کسی کتاب میں درج نہیں ہوئے حسبِ ذیل ہیں [2]

"مزاجِ ناقہ را مانندِ عُرفی نیک می بینم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

---

[1] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۴۶ تا ۳۵۱

[2] مندرجہ بالا اشعار ابتداً حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے رسالہ "حیاتِ نو" میں شائع ہوئے تھے جو جشنِ حالی کے مضامین نظم و نثر پر مشتمل تھا۔ اقبال نامہ کے علاوہ یہ اشعار "باقیاتِ اقبال" میں صفحہ ۲۴۵۔ ۲۴۶ پر بھی شامل ہیں "باقیاتِ اقبال" کی ترتیب اول سید عبدالواحد معینی ایم اے آکسن (کی ہے جس میں ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی نے کیا ہے۔

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگِ گل افشانم[1]"

ایک دوسرے موقع پر حالی سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا ؎

"آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد | سید دگر او را نمے از اشکِ سحر داد
حالی زنوا ہائے جگر سوز نیاسود | تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

۲۴ر جون ۱۹۳۵ء[2]"

جشنِ حالی کے موقع پر نواب صاحب بھوپال نے بحیثیت صدر جلسہ جو یادگار خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ خطبہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کئی سال کی سعی و تلاش کے بعد مجھے مل سکا۔ اس خطبہ میں نواب صاحب نے اقبال کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف ہی نہیں کیا۔ اس کا اختتام بھی اُن کی مشہور نظم کے ایک بند پر کیا ہے:۔

تقریر ہز ہائی نس اعلیٰ حضرت حضور نواب صاحب بہادر والیٔ بھوپال خلد اللہ ملکہٗ

بجواب

ایڈریس مینجنگ کمیٹی حالی مسلم ہائی اسکول و کمیٹی استقبالیہ حالی سنٹیزی پانی پت

۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

"صاحبان۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پانی پت کے احباب نے بلا امتیاز مذہب و ملت جس پُر خلوص، جوش اور محبت اور سرگرمی سے میرا خیر مقدم کیا ہے۔ اس سے میرا دل جذبات مسرت و امتنان سے لبریز ہے اور میں تہِ دل سے آپ سب صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کی بھی بہت خوشی ہے کہ حالی کی صد سالہ سال گرہ کے جلسے کی انجمن استقبالیہ نے اس تقریب میں دعوت دے کر میرے لیے آپ کے اس قدیم اور تاریخی شہر میں آنے کا ایک موقع مہیا کر دیا جس کی سرزمین پر بارہا ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے اور جس کی گذشتہ صدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور افضلیت یہ ہے کہ وہ مولانا حالی مرحوم کا مولد و مدفن ہے۔ اسی واسطے جب مجھے اس جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا۔ تو میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک ایسے شخص کی یادگار میں منعقد ہو رہا ہے جو کسی ایک خطے یا طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ جس کی ذات پر ہر زمانہ اور ہر ملک فخر کر سکتا ہے۔ اور اس کی اتنی عالمگیر اہمیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس میں شرکت کو اپنی دیگر گوناگوں

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۶۹

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۰

مصروفیتوں پر مقدم رکھا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ نے کہا ہے میری ہمیشہ یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ حتی الامکان ہر ایسی تحریک میں ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا جائے جو اہل ملک اور ابنائے وطن کے واسطے مفید ہو۔ اور یہ نتیجہ ہے میری اس تعلیم و تربیت کا جس کے لیے میں سب سے زیادہ اپنی والدہ محترمہ حضور سرکار عالیہ مرحومہ فردوس آشیاں کا اور اس کے بعد اپنی مادر درس گاہ علی گڈھ کا ممنونِ منت ہوں۔ اس لیے میں حالی کی صدسالہ سال گرہ کی تقریب پر نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ بالخصوص اہلِ ریاست بھوپال اور بالعموم تمام مسلمانانِ ہند کی جانب سے مبارک باد دینے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

صاحبان! — یہاں مجھے حالی مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح حیات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ صاحبان ان سے میری نسبت بدرجہا زیادہ واقف اور باخبر ہیں — میں ان کی قومی اور ملکی خدمات کا بھی ذکر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ملک ان کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ میں ان کے ادبی کارناموں پر بھی کوئی تنقید اور تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ اس وقت مجھے ان کی اس مخصوص حیثیت سے بحث نہیں ہے۔ اور اس سے قطع نظر ابھی اسی جلسے میں ان مختلف پہلوؤں پر نہایت خوش اسلوبی سے کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی مرحوم جن کے یوم ولادت کی صدسالہ سال گرہ منانے کے لیے آج ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ملک کے ایک سچے بہی خواہ اور قوم کے ہمدرد تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر ابنائے وطن کی اصلاح اور تربیت کی کوشش میں صرف کی۔ ان کی ہر بات وعظ و نصیحت کی تھی اور ان کا ہر کام خلوص و محبت کا۔ میرا یقین ہے اور غالباً اس سے کسی شخص کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں سے مرحوم گذشتہ صدی کے اکابرِ ملک کی صفِ اول میں تھے۔ اور وہ ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کی احسان شناس قوم ہر ممکن ذریعہ سے ان کی یادگار کو قایم رکھے۔ تاکہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور تتبع کی تحریک ہو۔

بلاشبہ ان کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے۔ حقیقت میں انھوں نے اردو شاعری کے اصل مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ قدرت کی نیرنگیوں کے مشاہدہ سے جو اثر اس کے حساس اور ذکی دل و دماغ پر مترتب ہوئے ایسے دل کش انداز اور موزوں الفاظ میں ادا کرے جس سے سامعین کے اعلیٰ ترین احساسات برانگیختہ ہوں۔ اور نظام فطرت کے مطالعہ سے مسائل حیات کے متعلق جو نتائج وہ خود اخذ کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے دلوں میں بھی پیدا کردے۔ اس کی نظم ہر قسم کے رکیک خیالات اور ادنیٰ جذبات سے پاک ہو۔ چنانچہ انھوں نے نثر میں شاعر کے اس نصب العین کو نہایت وضاحت اور سلاست سے پیش کیا۔ اور نظم میں پوری بے باکی اور یک سوئی سے اسے پیش نظر رکھا۔ اس لیے انھوں نے تمام قوتوں کو ملک اور قوم کی اصلاح میں صرف کردیا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے

کہ وہ غیر فانی اور عدیم المثال کتاب "مدوجزرِ اسلام" المعروف بہ مسدسِ حالی جس کی نسبت سرسید علیہ الرحمۃ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لایا تو میں مسدسِ حالی پیش کردوں گا لیکن قطع نظر اس سے کہ وہ خاص طور پر مسلمانوں کو ان کی موجودہ زبوں حالی پر غیرت دلانے اور ان میں ملکی اور قومی حمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ یقینی بات ہے کہ اردو شاعری میں۔ یہی وہ ایک ایسی نئی چیز تھی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ کیونکہ جیسا کہ مرحوم نے خود اس کے پہلے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"——— اس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے۔ نہ رنگین بیانی ہے۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ مگر ہے کیا؟ خلوص ہے۔ صداقت ہے۔ سلاست ہے۔ روانی ہے۔ صاف گوئی ہے۔ سادہ بیانی ہے ———"

ایک آئینہ خانہ ہے جس میں قوم اپنے صحیح خط و خال دیکھ سکتی ہے اور سمجھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے؟ اس نظم کی ہر دل عزیزی اور قبولیت عامہ نے اور اس کے سا

مقدمہ "شعر و شاعری" نے شعراء کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہو گیا، اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے اور جس کی مثال میں دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرحوم نے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ اہلِ مشرق کا مذہب سے کتنا گہرا تعلق ہے اور وہ ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں کتنا مؤثر اور دخیل ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مسلمانوں کی تمام شیرازہ بندی مذہب ہی سے ہے اور ان کی ساری قومی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب کا اصلی مفہوم فرقہ وارانہ تعصب اور تنگ نظری سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور اس کی صحیح اور سچی تعلیم عالمگیر اخوت اور رواداری کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے احکام کی تعمیل جہاں ہر شخص کو بہترین اخلاق سکھاتی ہے وہیں وہ اُسے کسی دوسرے شخص کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے سے بھی باز رکھتی ہے اور اس کے دل میں عام انسانی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ حالی کی تمام تصنیفیں شاہد ہیں کہ وہ اس سچی تعلیم کے کیسے سچے عامل تھے۔ ان کے دل میں سچا اسلامی درد تھا۔ اُن کو اپنی قوم کے تنزل کا شدید احساس تھا۔ ان کی تمام سعی و کوشش یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو اُن کے اس خوابِ غفلت سے بیدار کریں اس لیے وہ ان کو سخت سست کہتے تھے۔ ان کو لعن طعن کرتے تھے۔ مگر وہ کسی دوسری قوم کو کبھی بھی بُرا نہیں کہتے تھے، کسی دوسرے مذہب کی بھول کر بھی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ ان کے پند و نصائح سے تمام اہلِ وطن یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کی وہ خصوصیت ہے جو ان کی مابہ الامتیاز ہے اور جس کی تقلید آج کل ہر شخص کو کرنی چاہیے۔ چنانچہ "یادگارِ غالب"

میں ایک جگہ انھوں نے نہایت پُر لطف طریقے سے اس روش کے برخلاف اپنے سابقہ طرزِ عمل پر خود ہی اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے، خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہلِ سنت کو اور اہلِ سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف ان کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرۂ رحمت الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعتِ سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔"

میرے نزدیک یہ سب سے بڑا سبق ہے جو ہم کو مرحوم کی زندگی سے لینا چاہیے، کیونکہ اگر اس وقت ہم بھی اسی نقطۂ خیال سے اپنے مذہبی عقائد کو جانچیں اور مرحوم کی وسعت نظری اور فراخ دلی سے کام لے کر آپس میں رواداری کا برتاؤ کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے سارے جھگڑے نمٹ جائیں اور ہماری ساری دقتیں حل ہو جائیں۔ آخر ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں ہزار برس تک باہم شیر و شکر رہ کر زندگی بسر کی ہے۔ کیا وہ اپنے مذہب کے سچے پرستار نہ تھے یا ان میں ہماری نسبت مذہبی شغف کم تھا؟ کم سے کم میں تو یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور میں اس خلافِ مذہب تعصب کو صحیح اور سچی مذہبی تعلیم سے بیگانگی اور اصولِ مذہب سے ناآشنائی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ ہر مذہب نکوکاری کی تلقین کرتا ہے۔ ہر مذہب ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ تو پھر کیا ہم ان اصول اصلیہ کے اشتراک کے باوجود بھی

"لکم دینکم ولی دین"

کے زرّیں اصول پر کاربند نہیں ہو سکتے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا برتاؤ نہیں کر سکتے۔ میں نہایت اصرار اور تاکید سے اپنے تمام ابنائے وطن اور بالخصوص ہر ایک مسلمان سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر غور کریں کہ کیا وہ اس طرح اپنے ملک اور اپنی قوم کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں یا اپنے معبودِ حقیقی کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کر سکتے ہیں جو بلا شبہ ان کی اس تمام تگ و دو کا منشا ہے۔

میری رائے میں ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم بھی ایک بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ تعلیم کا ایک صحیح مقصد یہ ہے کہ ہم کو ماہیت اشیاء کا علم ہو۔ تاکہ ہم قوانین قدرت کو سمجھ سکیں۔ ہم میں تحقیق و تنقیح کی قابلیت ہو تاکہ ہم بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکیں اور

جو معاملات ہمارے سامنے آئیں ان کے متعلق ہم کوئی درست رائے قایم کرکے کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ غرض یہ کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں اور دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کرسکیں۔ یہ قابلیت پیدا کرنے کی بجائے ہم مدرسوں کی مروّجہ تعلیم سے فقط چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ سیکھ لیتے ہیں۔ چند غلط سلط اصطلاحیں ازبر کرلیتے ہیں۔ چند اُلٹے سیدھے جملے بول لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنے قدیم تمدن کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی آبائی معاشرت کو فراموش کردیتے ہیں اور اپنے مذہب کے اصول سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔ ہمارا غایت المال کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہے، اور ہماری معراجِ ترقی کسی محکمے میں محرری کی جگہ لے لینا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملازمتوں کی تعداد محدود ہے اور یقیناً وہ اس قدر جلد خالی اور زیرِ انتظام نہیں ہوتیں جتنی کثرت سے اُن کے خواستگار پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تعلیم کی عمومیت کی خواہش اور دوسری طرف تعلیم کے بعد ملازمتوں کے لیے جدوجہد دو ایسی مخالف اور متضاد باتیں ہیں جن کو کسی طرح جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں تعلیمی اسناد کی کس مپرسی اور کساد بازاری اور مختلف قوموں کی باہمی کوششِ وکاوش ملازمتوں کے حصول میں بڑی حد تک فرقہ وارانہ جنگ وجدل کی ذمہ دار ہے۔

یہ درس گاہ جس کی بنیاد حالی کے مقدس ہاتھوں نے رکھی ہے اور جو مرحوم کی یادگار ہے اس کے طلبہ سے میں خاص طور پر یہ کہوں گا کہ وہ اپنی تعلیم کا مقصد محض سرکاری ملازمت قرار نہ دیں بلکہ اپنا نصب العین اس سے بلند تر رکھیں یعنی وہ تعلیم کو تعلیم کی غرض سے حاصل کریں اسے صرف ایک پیشے کی طرح نہ سیکھیں۔ مجھے یہ سُن کر نہایت خوشی ہوئی کہ یہاں کے طلبہ کی دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم کے بچوں کے دلوں میں ہاتھ سے کام کرنے کا عار نکالنے اور ہاتھ سے کام کرنے کی عادات ڈالنے کی غرض سے بطور ایک ضروری تربیت کے اس مدرسے کے مقدور کے مطابق کسی نہ کسی قسم کی دستکاری سکھانے کا بھی انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مالی مشکلات کی وجہ سے اب تک اس کا کوئی مستقل اور اطمینان کے قابل انتظام نہیں ہوسکا۔ مالی مشکلات آج کل ہر جگہ ہیں اور کوئی بھی ان سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن ایسی ضروری اور مفید تحریک میں یقیناً یہ مشکلات مانع نہ ہونی چاہئیں۔ اور میں یہ مشورہ دوں گا کہ اگر اور کوئی صورت ممکن نہ ہو تو دیگر ضروریات کو ملتوی یا کسی قدر کم کرکے اس کا مستقل اور قابلِ اطمینان انتظام کرنا چاہیے کیونکہ حقیقت میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت اور ہماری بہت سی شکایتوں کا واحد علاج ہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ تعلیم پانے کے بعد پیشوں کو ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی درست نہیں ہوسکتا۔ اور خاص کر اپنے آبائی پیشے کو حقیر سمجھنا تو نہایت ہی نازیبا بات ہے۔ چونکہ میں "الکاسب حبیب اللہ" کے ماننے والوں میں ہوں اس لیے میرے نزدیک ہر پیشہ ور جو اپنی قوتِ بازو سے حلال روزی پیدا کرتا ہے اپنی آمدنی کی

مقدار کے لحاظ کے بغیر یکساں قابلِ عزت ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ضروری تعلیم پانے کے بعد سرکاری نوکریاں تلاش کرنے کے بجائے اپنے اُن ہی پیشوں کو اپنا ذریعۂ معاش بنائیں اور اپنی علمی لیاقت کو ان کے ترقی دینے اور ان میں اصلاح کرنے میں صَرف کریں تو یقیناً ہم خود اپنے اور اپنے ملک کے لیے بہت زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔

صاحبان — مجھے یہ سُن کر اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے ہاں تعلیم نسواں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ بچوں کی دُرست تربیت ماؤں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہے اور آج کل کی کشاکشِ ہستی میں کوئی قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا ہر فرد تنازع للبقا کے لیے آمادہ اور مستعد نہ ہو۔ اگر اس دوڑ دھوپ میں ہماری قوم کی نصف جماعت سست رَو رہی تو میدان مقابلہ میں ہمارا آگے بڑھنا ناممکن ہوگا۔ قوم کی ترقی کی بنیاد ماں کی گود ہے۔ ہمدردی، جراُت، دلاوری، استقلال، قناعت، فیاضی، سیر چشمی، اتحاد، ایثار، محبت اور ملک اور قوم کی عزت کے زیور سے ہر شخص اپنی ماں کی آغوشِ شفقت میں آراستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی خواتین کو اس زیور سے سب سے پہلے آراستہ کریں۔ اس مدرسہ کا میری والدۂ محترمہ فردوس آشیاں کے اسم گرامی سے منسوب ہونا اس کے لیے ایک مبارک شگون اور میرے واسطے اس میں مزید دلچسپی کا باعث ہے۔ بلاشبہ اس بارے میں خواجہ لطیف حسن صاحب کی جواں ہمتی قابل تعریف ہے مگر مجھے امید ہے کہ حالی مسلم ہائی اسکول کی جماعتِ منتظمہ اس کو بھی جلد اپنی نگرانی میں لے کر اسے حالی مرحوم کے نام سے منسوب کردے گی۔ تاکہ یہ دونوں مدرسے اسی بزرگ کی یادگار بن جائیں جس کی محنت اور کوشش کا یہ نتیجہ ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی ادنیٰ توجہ سے آپ کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں گی اور آپ نے جن ضروریات کا اظہار کیا ہے وہ پوری ہو سکیں گی۔ میں حتی المقدور اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوں مگر میں اس امرِ واقعی کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ مالی مشکلات سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ ریاستوں کو خود اپنے اندرونی کاموں کے لیے روپے کی سخت ضرورت ہے اور وہاں کے باشندوں کی یہ خواہش کچھ بے جا نہیں ہے کہ سب سے پہلے خود اُن کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم سب کی جُدا جُدا ذمہ داریاں ہیں اور صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کا بار دوسرے پر ڈالنے کے بجائے اسے خود پورا کرنے کی کوشش کرے۔

برطانوی ہند میں ریاستوں کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے صحیح حالات سے بے خبر ہیں اور اُن میں وہ ارتباط باہمی نہیں ہے جو اس کمی کا کماحقہٗ تدارک کر سکے۔ ہمارے اس دعوے سے غالباً کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مشرقی تہذیب و تمدن کے نمونے اب بھی بیشتر ریاستوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جہاں وہ ابھی تک ایک حد تک تہذیب مغرب کی بے جا دست بُرد سے بچے ہوئے ہیں۔ بہر حال

ہم اپنے مقدور بھر ہر اہم ملکی تحریک میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہیں اور یہی اُمید ہم آپ صاحبان سے بھی رکھتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو آپ بھی اسی طرح ہماری معاونت کریں گے۔

میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اپنی ان اہم ذمہ داریوں کی جانب حکومت ہند کو بھی توجہ دلائیں کیونکہ مجھے قوی امید ہے کہ وہ ان میں آپ کی دستگیری کرے گی اور آپ کی مساعی جمیلہ انشاء اللہ ضرور مشکور ہوں گی۔

صاحبان۔ زمانہ جلد جلد بدل رہا ہے، اصلاحات کا نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے حقوق دیے جا رہے ہیں ہم سب کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ میں اس وقت سیاسیات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا بلکہ آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر ہم نے وقت کی تدرنہ کی اور اس کے میلان کو پیش نظر نہ رکھا تو ہم ترقی کی شاہراہ پر نہ صرف خود پیچھے رہ جائیں گے بلکہ اپنے ساتھ ملک کی رفتار کو بھی دھیما کر دیں گے جس کے لیے آیندہ نسلیں ہم کو ذمہ دار ٹھہرائیں گی۔ اس لیے میں اپنی اس تقریر کو اسی دعا پر ختم کرتا ہوں جو اقبال نے بڑی خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ مانگی ہے۔

"یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو گرما دے، جو قلب کو تڑپا دے[1]
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے"

اُسی روز شام کو میونسپل کمیٹی کے جواب میں نواب صاحب نے یہ تقریر فرمائی[2]

تقریر ہز ہائینس اعلیٰ حضرت حضور نواب صاحب بھوپال

بجواب

ایڈریس منجانب میونسپل کمیٹی پانی پت بموقع حالی سینٹیزی پانی پت

مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء

صاحبان۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے میرا خیر مقدم کیا ہے اس پر میں آپ سب صاحبان کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ یوں تو جب سے تاریخ میں پانی پت کی تین فیصلہ کُن لڑائیوں کا ذکر پڑھا تھا تب ہی سے اس قدیم شہر کی تاریخی اہمیت دل پر نقش تھی۔ لیکن آج جن الفاظ میں آپ نے اس کی گذشتہ عظمت کو یاد دلایا ہے ان سے چشم تصور میں

---

[1] صحیح مصرعہ یوں ہے:۔ "جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے"۔

[2] یہ تقریر بھی نایاب تھی۔ چونکہ جشنِ پانی پت سے اس کا تعلق ہے اس لیے شامل کتاب کی گئی۔

بہت سی باتوں کا نقشہ پھر گیا۔ اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں بار بار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا اور صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدلا۔ لیکن صاحبان۔ اب ان بھولی بسری باتوں کو یاد کرنا بیکار ہے۔ زمانہ ایسے بہت سے رنگ بدل چکا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔ ہمارا تعلق سب سے زیادہ حال سے ہے اور آپ نے درست کہا کہ اس وقت ظاہری امن و امان کے باوجود بھی ہر شخص کارگارہ ہستی میں مصروف پیکار ہے اور تنازع للبقائے ہر گھر کو پانی پت کا میدان بنا رکھا ہے۔ علم و جہل کی جنگ جاری ہے۔ اور روشنی اور تاریکی میں لڑائی ہو رہی ہے۔ مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ صاحبان علم کی اشاعت اور روشنی کے اضافے میں حتی المقدور پوری کوشش کر رہے ہیں اور میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ امر بلاشبہ قابل مسرت ہے کہ آپ نے اس چھوٹے سے شہر میں برقی روشنی کا انتظام کر دیا جس سے شہر کی ظاہری رونق اور خوش نمائی میں اضافہ ہونے کے علاوہ یہاں کے باشندوں کو بھی بہت آرام ہو گیا ہوگا۔ پانی کے صاف کرنے کی تجویز بھی نہایت مناسب اور مفید ہے کیونکہ لبسا اوقات اہلِ شہر کی صحت کا مدار زیادہ تر اسی پر ہوتا ہے اور پانی کی خرابی بہت سی بیماریوں کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ اصلاحیں ایسی ہیں جو میونسپلٹی کے اولین فرائض میں داخل ہیں اور یقیناً پانی پت کے باشندوں کو اپنی میونسپلٹی کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

انٹر میڈیٹ کالج قایم کرنے کا خیال بھی آپ کی عالی ہمتی کو ظاہر کرتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ یہاں مفید ثابت ہو لیکن اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ پانی پت کے قرب و جوار میں ایسے کئی شہر ہیں جہاں بہترین کالج موجود ہیں۔ اور یہاں کے طلبہ میٹرک کے بعد آسانی سے وہاں جا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک کالجوں کی تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ کو قابل ترین اساتذہ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف حصہائے ملک سے آئے ہوئے دیگر طلبہ کے ساتھ ان کی نشست و برخاست ہوتی ہے۔ ابنائے وطن کے متفرق طبقات سے ان کا میل جول ہوتا ہے۔ اور یوں باہمی تبادلۂ خیالات سے ان کی نظر میں وسعت اور دماغ میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ محض ایک انٹر میڈیٹ کالج بنا دینے سے یہ باتیں ایک چھوٹے سے شہر میں حاصل نہیں ہو سکتیں اور یوں طلبہ ان فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک انٹر میڈیٹ کالج میں اعلیٰ ترین قابلیت کے اُستاد فراہم نہیں ہو سکتے نہ طلبہ کے جسمانی اور دماغی قویٰ کی تربیت اس پیمانے پر ہو سکتی ہے جو ایک اول درجے کے بڑے مرکزی کالج میں ممکن ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن پر پوری احتیاط اور توجہ سے غور کر لینا چاہیے۔ ذاتی طور پر تو میں ایک زنانہ ہائی اسکول کو لڑکوں کے انٹر میڈیٹ کالج پر مقدم رکھنے کا مشورہ دوں گا۔ کیونکہ لڑکیاں بالعموم تعلیم کے لیے باہر نہیں بھیجی جا سکتیں اور اُن کی ساری تعلیم و تربیت ان کے مقامی مدرسے کے حدود میں

محدود ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ایک سرسری رائے ہے، کیونکہ قطعی اور مختتم فیصلہ اُسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کے متعلق تمام جزوی اور تفصیلی حالات پیشِ نظر ہوں۔ جو ہر مقام کے لیے مخصوص اور مختلف ہو سکتے ہیں اور جن سے پوری واقفیت مقامی اصحاب ہی کو ہوتی ہے۔

یہ سُن کر مجھ کو دلی مسرت ہوئی کہ آپ کے ہاں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ نہایت خوش گوار رہے ہیں اور گذشتہ چند سالوں میں بعض اوقات جو بے لطفی پیدا ہوئی اس کا سبب درحقیقت بیرونی اثرات تھے۔ میرے خیال میں کوئی عقلمند اور سمجھ دار آدمی ایسا نہیں ہوگا جو اپنے لپشت ہا لپشت کے ہم وطنوں سے لڑنا جھگڑنا پسند کرتا ہو۔ اور حقیقت میں یہ ہمارے ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہاں محض خود غرض اور ناعاقبت اندیش لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو طرح طرح کے حیلوں سے اس فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میری آپ سے اور تمام ابنائے ملک سے مخلصانہ استدعا ہے کہ آپ نہایت حزم واحتیاط سے اپنا دامن اس آلودگی سے بچائے رکھیں اور کبھی بھول کر بھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے شگفتہ اور خوش گوار تعلقات میں ٹھیس لگے۔ آپ کے شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر مجھے کامل یقین ہے کہ وہ کبھی اپنی اس اکثریت سے کوئی بے جا یا نامناسب فائدہ نہ اٹھائیں گے اور سچی اسلامی ہمدردی کو مدِ نظر رکھ کر ہر معاملے میں پوری رواداری اور ایثار سے کام لیں گے اور اقلیت کے فائدے کے لیے اپنے فائدے کی کسی بات کو چھوڑ دیں تب بھی ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور یقیناً تعلقات کی عمدگی اس کی کافی تلافی کردے گی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایسے ایثار کا اثر نہ ہو اور کوئی شریف قوم اس احسان کو فراموش کردے۔ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اگر ہر بات میں پورے عدل وانصاف سے کام لیا جائے تو کسی کو کیونکر کوئی شکایت یا غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور کسی بیرونی دراندازی کو کس طرح فتنہ پردازی کا موقع مل سکتا ہے۔ غلط فہمیاں تب ہی پیدا ہوتی ہیں جب کہ دل صاف نہ ہوں اور سینوں میں کدورتیں بھری ہوں۔ ہم اگر امن و امان کے ساتھ اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو ہم کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا فائدہ باہمی مصالحت اور اتحاد ہی میں ہے، اختلاف اور انتشار میں نہیں ہے۔ اس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار مختصراً ابھی اپنی سابقہ تقریر میں کر چکا ہوں۔ اس لیے اب اس بارے میں مجھے اور کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

صاحبان ــــ اس سلسلے میں میں صرف اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ایک شہری کے لیے فقط یہی کافی نہیں ہے کہ وہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پال لے، بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرے تاکہ وہ ابنائے وطن کو بھی کچھ فائدہ پہنچا سکے۔ میونسپلٹی کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ وہی محصول جو آپ صاحبان اُسے ادا کرتے ہیں اور رفاہِ عام کے تمام کام وہ کسی طرح پورے کر لیتی ہے۔ اُسی روپے سے جو وہ

آپ سے وصول کرتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہی میونسپلٹی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتی ہے جہاں کے باشندے زیادہ دولت مند ہوں اور اس امداد باہمی میں زیادہ حصہ لے سکیں۔ اپنی ذات کے لیے روپیہ کمانے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش تو ہر شخص خود ہی کرتا ہے مگر دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایسی کوشش میری رائے میں ایک عبادت بن جاتی ہے اور اسی لحاظ سے میں اسے ایک شہری کا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہوں۔

صاحبان — اس ضمن میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ بسا اوقات ہماری میونسپلٹیوں میں ممبروں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے طرح طرح کی بدنظمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ موردِ طعن و اعتراض ہوتی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ جب ہم عوام کی کوئی خدمت قبول کریں تو اس کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سوچ لیں اور ہر قسم کی ذاتی غرض سے بالا ہو کر اُسے انجام دیں۔ اختلاف رائے میں یقیناً کچھ ہرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ نفسانیت سے پاک ہو اور اُس کی تہہ میں کوئی اور مقصد پنہاں نہ ہو کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو رائے کے اختلاف کو دلی کدورت کا سبب بنا دیتی ہے اور جس سے ہر طرح کا فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ صاحبان اپنے تمام کاموں میں اس بات کو مدِ نظر رکھیں گے اور خلوص اور صداقت کا وہ نمونہ پیش کریں گے جو دوسروں کے لیے قابلِ تقلید ہوگا اور جس میں اکثریت اور اقلیت کے پیچیدہ مسئلے کا آسان اور عملی حل ہوگا۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ صاحبان کے سپاس نامہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

ان خطبات سے جہاں نواب بھوپال کے تدبّر، تفکر، بلند نظری، مسائل حاضرہ پر اُن کے ترقی پسندانہ خیالات اور مسلمانوں کے حالات کی بہتری کے لیے ان کے قیمتی مشوروں اور عملی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں علم و ادب سے ان کے گہرے شغف، حالی سے دلی عقیدت، اقبال ایسے فلسفی شاعر سے محبت اور تعلقِ خاطر کا بھی ثبوت ملتا ہے اور جسے ہم بلاخوف تردید تاریخ ادب کے ایک زرّیں و یادگار باب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

جشنِ حالی کے پہلے اجلاس میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جو نظم پڑھی تھی۔ اُسے میں نے کافی تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہو سکی۔ جمیل نقوی نے اتنا ضرور بتایا کہ یہ یادگار نظم غالباً حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت کے رسالے "حیات نو" میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ یہ رسالہ بھی نہ مل سکا۔ حفیظ جالندھری کے تمام مجموعے دیکھ ڈالے لیکن یہ نظم اُن کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں تھی۔ نہ حفیظ صاحب کے پاس اس کی نقل ہی محفوظ تھی۔

عجب اتفاق ہے کہ یہ کتاب تیاری کی منزلوں سے گزر رہی تھی کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا جریدہ "العلم" (جولائی تا ستمبر ۱۹۷۲ء) مجھے موصول ہوا۔ دورانِ مطالعہ حسین احمد خاں جمشید پانی پتی کا ایک مضمون "مولانا حالی اور پانی پت" میری نظر سے گزرا جس میں مولانا حالی اور پانی پت کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات فراہم کی گئی تھیں — ساتھ ہی حفیظ جالندھری کی اُن دو نظموں کا تذکرہ بھی تھا جو انھوں نے حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں ۱۲ر فروری ۱۹۳۲ء اور ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بعنوانات "یادِ حالی" اور "خواجہ حالی پانی پتی" علی الترتیب پڑھی تھیں۔ "یاد حالی" سر راس مسعود کی صدارت میں منعقدہ ایک جلسے میں اور "خواجہ حالی پانی پتی" "جشن حالی کے موقع پر نواب بھوپال کی

صدارت میں پڑھی گئی تھی۔ جمشید پانی پتی نے اپنے مضمون کے آخر میں ان نایاب نظموں کو شانِ نزول کی دلچسپ تفصیلات کے ساتھ شامل کر دیا۔ چنانچہ ان گم شدہ اوراق کی اچانک دستیابی کو میں نے غیبی مدد جانا اور یہ ضروری سمجھا کہ باب کے آخر میں انھیں شامل کرکے محفوظ کر دوں۔ کیونکہ یہ دونوں نظمیں حالی، پانی پت، نواب حمید اللہ خاں، اقبال اور سر راس مسعود کی شخصیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دوسری نظم "خواجہ حالی پانی پتی"، تو حالی کے جشن صد سالہ میں پڑھی گئی تھی جس میں اقبال بھی موجود تھے۔

حسین احمد خاں جمشید پانی پتی نے ان تاریخی اور یادگار نظموں کا جو پس منظر بیان کیا ہے وہ انھیں کی زبانی سنیے:۔

——— "پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ تھیوسوفیکل ہال کراچی میں طلبہ کے ایک جلسے میں حضرت حفیظ جالندھری نے "شاہنامۂ اسلام" کے چند شہ پارے اور اپنی مشہور نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا اور جب جلسے کے بعد باہر تشریف لائے تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت حفیظ بالکل بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہجوم عاشقاں میں مَیں بھی شامل تھا اور میں آڑا ترچھا ہو کر ان کی کار تک پہنچ ہی گیا۔ مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ آج میں تینتیس ۳۳ سال بعد آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ حفیظ صاحب نے پوچھا۔ کہاں دیکھا تھا؟ عرض کیا ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں جب کہ آپ نے حالی مسلم ہائی اسکول میں دو مشہور نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ سُن کر حفیظ صاحب ذرا بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے —"ارے بھئی اگر وہ دونوں نظمیں کسی کے پاس محفوظ ہوں تو جمیل الدین عالی صاحب کے ذریعہ میرے پاس بھیج دیں۔ تقسیم ہند کے وقت وہ افراتفری میں جالندھر ہی میں رہ گئیں۔ شاید وہ اسی زمانے میں حالی اسکول میگزین میں یا ممکن ہے پاکستان کے کسی رسالے میں بھی شائع ہوئی ہوں۔ لیکن میرے لیے وہ ناپید ہیں۔" میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن گھر آکر تلاش کیا تو غزلوں اور نظموں کی میری پرانی کاپی عارضی طور پر اللہ کو پیاری ہو چکی تھی اور مجھے وعدہ فراموش ثابت کرنے کے لیے روپوش تھی۔

۱۹۷۱ء کے آغاز میں وہ کاپی مل گئی۔ لیکن میں یہ نظمیں حضرت حفیظ کی خدمت میں نہ بھیج سکا۔ کیوں نہ پیش کر سکا اور ایک عظیم المرتبت شاعر اور فردوسیٔ اسلام کے حکم کی تعمیل میں اس قدر تساہل کیوں ہوا؟ جس شاعر کی ان دو نظموں کے علاوہ میں اس کے پورے کلام کا عاشق ہوں۔ شاہنامۂ اسلام کی چاروں جلدوں کو سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ ہر سال ماہ ربیع الاول میں جن شاہناموں کی تاریخی نظموں سے پورے ہندوستان کی فضائیں گونجتی تھیں۔ آج اتنا بھی نہ کر سکا کہ اسی کی امانت اُس کے سپرد کر دوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ پوری انسانی خصوصیات ہی دھندلا چکی ہیں اور بغیر کسی لالچ اور خود غرضی کے تعمیلِ حکم اور ادائیگی فرض میں بھی تو آنا کانی ہوتی ہے۔ یقیناً اسی بدبختی کے بوجھ تلے میں دبا ہوا ہوں۔

سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی نے حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت، سرسید، حالی اور خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم اور حفیظ جالندھری کے یہ واقعات سُن کر ادیبانہ انداز سے پہلو بدلے اور اس راہ گیر کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس گفتگو سے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ پانی پت، حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت، مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب کی خدمات اور آج سے چالیس سال پہلے کے حالات پر اگر ایک مضمون لکھ دیں اور وہ دونوں نظمیں بھی منسلک کر دیں تو یہ ایک یادگار مضمون ہوگا اور وہ قابلِ قدر تاریخی نظمیں ''العلم'' میں محفوظ ہو جائیں ....

یہ دونوں نظمیں پیش کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان کی وجہ نزول بھی عرض کر دوں۔ مولانا حالی کے صاحبزادے اور حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت کے سکریٹری خواجہ سجاد حسین صاحب سر راس مسعود۔ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (جسٹس محمود کے صاحبزادے اور سرسید کے پوتے) کو اپنے اسکول میں مدعو فرماتے ہیں گویا حالی ہاں سرسید آرہے ہیں۔ بہار سید، چمن زار حالی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علی گڑھ سے کالی کالی بدلیاں اٹھی ہیں اور گلستانِ پانی پت پر برسنے والی ہیں۔ علی گڑھ سے پروفیسر، لکچرر اور لڑکے ٹرینوں میں بھر بھر کر آرہے ہیں۔ سر راس مسعود کو اسکول کی مسجد کا افتتاح فرمانے کے لیے زحمت دی گئی تھی۔ سر راس مسعود تشریف لائے۔ شاہانہ استقبال ہوا۔ ایک سجے ہوئے دربار کی کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ کرنال اور کنج پورہ سے نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے خاندان کے نواب، یوپی اور پنجاب کے رؤسا اور جاگیردار، اعلیٰ حکام، عوام اور رؤسائے شہر حالی مسلم ہائی اسکول کے اور مسلم یونیورسٹی سے آئے ہوئے طلبہ اپنی ترکی ٹوپیوں، سیاہ شیروانیوں اور علی گڑھ کٹ سفید پاجاموں سے ایک عجیب شانِ یکتائی پیدا کر رہے تھے۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے چست و چالاک لڑکے تعینات تھے اور ہدایت یہ تھی کہ مہمانوں کو درجہ بندی کے لحاظ سے مناسب جگہوں پر پہنچا دیا جائے۔

حالی مسلم ہائی اسکول کی طرف سے مہمان ذی شان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے جا رہے تھے۔ شاید شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی[1] کے بعد خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی فارسی میں آخری سپاسنامہ پیش فرما رہے تھے کہ اسکول کے گیٹ پر ایک تانگہ رکا اور اس میں سے بظاہر ایک سیدھے سادھے صاحب برآمد ہوئے۔ شیروانی، ترکی ٹوپی۔ پاجامہ۔ قد آور۔ چھریرا بدن۔ بریف کیس بغل میں۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھے اور دو ایک لڑکے اُن کی متوسط شخصیت کی مناسبت سے کسی مناسب

---

[1] افسوس کہ ۱۹۷۲ء کے دوران شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا بھی انتقال ہوگیا۔

نشست پر پہنچانے کے لیے اُن کے پیچھے لپکے لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اُن سے یہ عرض کیا جائے کہ حضور اتنی سادگی لیے آگے ہی کیوں بڑھتے جا رہے ہیں؟ گو لباس سادہ تھا لیکن اُن کے چہرے پر ایک سنجیدہ رعب، چال میں ایک خاص فاتحانہ تیکھاپن اور انداز ذرا نکیلے واقع ہوئے تھے۔ ہم اُن کے پیچھے پیچھے ایسے بھاگ رہے تھے جیسے گھونسلے کے انڈوں بچوں کو چھونے والے شخص کے چاروں طرف چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔ لیکن رہتی ذرا دور ہی ہیں۔ سر راس مسعود انھیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے۔ حفیظ بھائی آ گئے۔ مہمانِ خصوصی کے اس احترام میں سب شریک ہو گئے اور ایک کھلبلی سی مچ گئی اور یہ حضرت راس مسعود صاحب کے برابر براجمان ہو گئے۔ سر راس مسعود نے اہلِ پانی پت کے سپاس ناموں کے بعد مختصر انداز میں شکریہ ادا کیا اور فرمانے لگے کہ مجھے معلوم تھا کہ میں کس شہر کی سرزمین پر قدم رکھ رہا ہوں ـــــ دربارِ حالی میں کیا عرض کر سکوں گا اسی لیے میں نے حفیظ بھائی کو جالندھر تار دے دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ بھائی! حالی اسکول اور پانی پت کو میری جانب سے خراجِ عقیدت آپ پیش کریں گے۔ لہٰذا میں حضرت حفیظ جالندھری سے درخواست کرتا ہوں، وہی کچھ فرمائیں۔ جوان حفیظ جن کی ہلکی سی خشخشی داڑھی بھی نظر آئی۔ کھڑے ہوئے اور ہمارے سامنے فردوسیِ اسلام الحاج حفیظ جالندھری جن کے شاہنامۂ اسلام کے متعلق اخبارات میں دھوم تھی۔ میدانِ جنگ اور حالی کی چہار دیواری میں، حالی اور سر سید کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ حفیظ شاہنامۂ اسلام پڑھنے کے خاص لہجہ میں نغمہ سرائی فرماتے ہیں۔ میں دوڑا، بورڈنگ ہاؤس سے کاپی لایا اور یہ جواہر ریزے محفوظ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ایک قیامت سی بپا تھی، شور مچ رہا تھا۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ کسی نظم نے ایک تڑپ پیدا کی تھی اور لوگوں کو سر دھنتے دیکھا تھا۔ آیئے آپ بھی اس دربارِ حالی میں شرکت فرمائیں۔

یادِ حالی

یہ نظم حضرت حفیظ جالندھری نے مسلم ہائی اسکول، پانی پت کے ایک خاص جلسے میں زیرِ صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۲ر فروری ۱۹۳۲ء کو پیش فرمائی۔

(۱)

نشانِ زندگی پاتا ہوں پانی پت کی راہوں میں　　یہ منزل، منزلِ مقصود ہے میری نگاہوں میں

یہاں نقشِ قدم موجود ہیں اُن کاروانوں کے
زمیں پر جن کے آگے سر جھکے تھے آسمانوں کے
یہاں لہرا چکے ہیں پرچم اسلامی نشانوں کے
یہاں ٹکرا چکے ہیں جوش مغلوں اور پٹھانوں کے

اذانوں کی صدائیں بس چکی ہیں ان ہواؤں میں فضائیں محو ہیں اب تک انہی دل کش صداؤں میں

فلک نے اس زمیں پر شعلہ ہائے جنگ دیکھے ہیں
زمیں نے اس فلک پر انقلابی رنگ دیکھے ہیں
یہیں اُمڈا تھا دریا مرہٹوں کی تند فوجوں کا
تلاطم تھا یہیں اس جوشِ انسانی کی موجوں کا
بشر کی ہمتِ عالی کا منظر اس نے دیکھا ہے
کہ احمد شاہ ابدالی کا لشکر اس نے دیکھا ہے
اسی وادی میں گونجی تھیں وہ باطل سوز تکبیریں
اسی میدان میں چمکی تھیں شمشیروں پہ شمشیریں
یہیں چپ ہو گئے تھے وہ سماعت پاش جے کارے
یہیں سے کھا کے بھاگے تھے شکستِ فاش پنڈارے
یہم کثرت کے آگے شانِ قلت اس نے دیکھی ہے
جہاں حق ہو وہاں باطل کی ذلت اس نے دیکھی ہے
یہاں آتے ہی مردانِ مجاہد یاد آتے ہیں
جو تلواریں اٹھاتے تھے وہ زاہد یاد آتے ہیں

اسی باعث ملا اس سرزمیں کو رتبۂ عالی کہ اس بستی کی خاکِ پاک سے پیدا ہوا حالیؔ

وہ حالیؔ جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا
تکلم سے مسخر کر لیا ہندوستان سارا
وہ شاعر جس نے اصنافِ سخن میں جان پیدا کی
بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی
وہ بلبل جس نے گلہائے سخن کو زندگی بخشی
خزاں کے دور دورے میں چمن کو زندگی بخشی
وہ حالیؔ جو علم بردار تھا دینِ پیمبر کا
وہ حالیؔ جو سپہ سالار تھا سید کے لشکر کا
وہ حالیؔ جس نے دل کو درد سے آگاہ فرما کر
کیا مُردوں کو زندہ قم باذن اللہ فرما کر

جگا کر خاکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے وہ حالیؔ سو گیا اپنے وطن کی خاک کے نیچے

وہ حالیؔ، ہاں وہی سرسیدِ مرحوم کا بازو
وہ اُمت کی سپر، وہ ملتِ مظلوم کا بازو

---

[1] یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ غالباً 'شان' ہوگا۔

دلوں کو تیرِ حُبّ قوم سے برما دیا جس نے
مسلمانوں کے خونِ سرد کو گرما دیا جس نے

وطن میں جس نے اسلامی اخوت کی بنا ڈالی ۔ پڑا ہے آج اپنے ہی وطن میں بے وطن حالی

نہ بھول اے شاہِ اقلیمِ سخن کے مولد و مدفن
اسی تربت سے ہے اب روضۂ رضا اثر گلشن

نہ بابر تیرے دامن میں، نہ اکبر ہے نہ ابدالی
تری بزمِ کہن کی زیب و زینت ہے فقط حالی

تری شہرت کا باعث یہ چراغِ زیرِ دامن ہے
اسی کی یاد سے تیرے شرف کی شمع روشن ہے

بقائے نام ہے تیری بقائے نام حالی سے
سخن کی سرخوشی قایم ہے اب تک جام حالی سے

نبرد زیست میں ملحوظ رکھ پاسِ دیانت کو
امانت کی طرح محفوظ رکھ اپنی امانت کو

دوامی زندگی بخشے گا تجھ کو نام حالی کا ۔ سُنا سارے زمانے کو سُنا پیغام حالی کا

دعا یہ ہے کہ جب تک شوکتِ اسلام باقی ہے
خدا کا اور محمد مصطفےٰ ؐ کا نام باقی ہے

مساجد سے اذانوں کی صدا اُٹھتی رہے جب تک
مدینے کی طرف بانگِ درا اُٹھتی رہے جب تک

جہانِ دل نہ ہو جب تک سپاس و شکر سے عاری ۔ الٰہی چشمۂ الطافِ حالی بھی رہے جاری

اس نظم سے متعلق ابوالاثر حفیظ جالندھری اور سید راس مسعود کے دو اہم خط نظرثانی کے دوران دستیاب ہوئے جن کی تلاش کا سہرا جلیل قدوائی کے سر ہے۔

حفیظ جالندھری کے خط مورخہ ۲۹ فروری ۱۹۳۲ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نظم راس مسعود کے ایما پر ارسال کی تھی جس کے جواب میں راس مسعود نے لکھا کہ وہ اس کی طباعت کا خاص اہتمام کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے مخلص دوست کو نظم کے بعض اشعار پر نظرثانی کا بھی مشورہ دیا جس سے نہ صرف ان کی تنقیدی بصیرت، ادبی دیانت اور صاف گوئی کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ قریبی ربط و تعلق کا بھی۔

راس مسعود کے خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے جلیل قدوائی سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ راس مسعود کے اکثر خطوط پر تاریخ کا اندراج رہ گیا ہے۔ یہ خط بھی انھیں میں شامل ہے البتہ متعلقہ خط سے تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

یہ دونوں خط دوسرے ایڈیشن میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں:

"دفتر شاہ نامہ اسلام
ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور
۲۹ر فروری ۱۹۳۲ء

میرے محسن و محترم حضرت سید صاحب ۔ اسلام علیکم

پانی پت والی نظم[1] ارسال خدمت کرچکا ہوں ۔ تاحال رسید نہیں ملی ۔ پانی پت کی وہ صحبت اور سفر دہلی کا وہ وقت جب میں آپ کے حضور تھا میری زندگی کے لیے بہترین لمحوں پر مشتمل تھا ۔ دعا ہے کہ پروردگار عالم ایسے محسن، ایسے خلیق اور ایسے قدر شناس کو دین و دنیا ہر جگہ فائز المرام کرے :

تم سلامت رہو قیامت تک
اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو

جناب کے رفیق ڈاکٹر صاحب کی محبت کا بھی ایسا نقش دل پر ہے کہ ان کی صورت آنکھوں میں بسی ہے ۔ خدا ان کو شاد آباد رکھے ۔ نظم کے متعلق جلد مطلع فرمائیے کہ بلاک کب بنیں گے اور کس ڈیزائن میں چھپے گی ۔

ہاں یہ درخواست میرے بھتیجے کی ہے جس کے متعلق میں نے ذکر کیا تھا ۔ وہ حساب انگریزی اور سائنس میں ماہر ہے مگر میں نے آپ سے سیکنڈ ڈویژن کہا تھا ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا اگرچہ نمبر سیکنڈ سے تھوڑے ہی کم ہیں ۔ بہرحال اگر یہ لیا جا سکے تو حالی اسکول کے لیے جس تنخواہ پر بھی آپ پسند کریں حاضر ہو جائے گا ۔ میں پانچ سال اس کی پڑھائی کا بوجھ اٹھا چکا ہوں ۔ اب مشکل ہے :

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
ہو چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

خاکسار نیاز مند
حفیظ "[2]

جواب سید راس مسعود

"پیارے حفیظ ۔ تمھاری نظم پریس میں ہے ۔ اس کی طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ کر بہت خوش ہوگے ۔ چونکہ تم نے یہ نظم بہت عجلت میں لکھی ہے اس لیے بعض اشعار پر نظر ثانی کی ضرورت ہے ۔ میرے خیال میں وہ اشعار حسب ذیل ہیں :

۔ یہ دھرتی سہہ چکی ہے بوجھ مرہٹوں کی فوجوں کا — مرہٹوں کی ٹ پر تشدید
تلاطم تھا یہیں اس جوش انسانی کی موجوں کا — صحیح نہیں ۔

---

[1] حالی کی صد سالہ برسی منعقدہ حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے موقع پر حالی پر کہی اور پڑھی ہوئی ۔ (جلیل قدوائی)

[2] ماہنامہ قومی زبان ۔ کراچی ۔ مارچ ۱۹۷۶ء ۔ صفحہ ۲۲

۲۔ وہ حالیؔ جو علم بردار تھا محراب و منبر کا — محراب و منبر کی علم برداری
وہ حالیؔ جو سپہ سالار تھا سید کے لشکر کا — قابلِ غور ہے

۳۔ دلوں کو تیرِ حُبّ قوم سے برما دیا جس نے — تیر سے برمانا کیا اس
مسلمانوں کے خونِ سرد کو گرما دیا جس نے — موقع پر مناسب ہے؟

کاپیاں تیار ہیں۔ کاغذ مطبع میں جاچکا ہے۔ صرف اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ جواب جلد بھیجو گے۔

تمھارا سچا خیر خواہ[1]

افسوس کہ راس مسعود کے اس خط کا جواب ان کے مسودات میں نہ مل سکا البتہ مندرجہ بالا تین اشعار میں سے پہلے دو اشعار کے پہلے مصرعے حفیظ نے تبدیل کیے ہیں جیساکہ مشمولہ نظم سے ثابت ہے۔

۱۔ یہ دھرتی سہہ چکی ہے بوجھ مرہٹوں کی فوجوں کا

تبدیل شدہ مصرعہ:۔

یہیں اڈا تھا دریا مرہٹوں کی تند فوجوں کا

۲۔ وہ حالیؔ جو علم بردار تھا محراب و منبر کا

تبدیل شدہ مصرعہ:

وہ حالیؔ جو علم بردار تھا دینِ پیمبر کا

۳۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ جوں کا توں رہا ——

دلوں کو تیرِ حُبِّ قوم سے برما دیا تو نے

خواجہ حالیؔ پانی پتی

مولانا خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کی صد سالہ جوبلی پر جو کہ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو حالی مسلم ہائی اسکول۔ پانی پت میں زیرِ صدارت ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں۔ فرماں روائے بھوپال منائی گئی۔ خود حضرتِ حفیظؔ نے اپنے خاص ترنم میں پڑھ کر سُنائی۔

مسلمانوں کی شوکت بھی مرے اللہ کیا شے تھی!
فلک بھی اس کے درپے تھا، زمیں بھی اس کے درپے تھی
کتابِ زندگی کے سَو ورق الٹا رہا ہوں میں
گزشتہ اک صدی کی داستاں دُہرا رہا ہوں میں
زوالِ سلطنت کا آہ وہ اندوہ گیں منظر
الم انگیز، حسرت خیز، عبرت آفریں منظر

---

[1] ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ مارچ ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۲۲-۲۳

نہیں تھا بزمِ دہلی میں وہ ذوقِ شعلہ آشامی
کہ خمیازہ کشوں میں چل رہا تھا دورِ ناکامی
صدائے عندلیب افسردہ، پژمردہ گل ولالہ
خزاں آلود تھا رنگِ بہار ہفت صد سالہ
نشاطِ زندگی سے روح خالی اے سے خُم خالی
نہ فکرِ بے پروبالی، نہ ذکرِ ہمتِ عالی
حریفانِ طرب آمادہ اظہارِ خصومت پر
ہوا کی یورشیں اک آخری شمعِ حکومت پر
ظفر کے نام سے اک آفتابِ بام باقی تھا
شرابِ مُشک بو تو اُڑ چکی تھی، جام باقی تھا
شفق کے گیسوؤں نے اس رُخِ روشن کو گھیرا تھا
دھوئیں میں آخری شعلہ یہی تھا پھر اندھیرا تھا
زمینِ ہند پر مسلم کا یہ انجام تھا گویا فروغِ روزِ روشن پر یہ وقتِ شام تھا گویا
یہ شامِ غم اندھیری رات کا پیغام لائی تھی
فضاؤں پر اُداسی اور تاریکی سی چھائی تھی
جمود و بے حسی کو ساتھ لے کر انقلاب آیا
ہماری قسمتِ بیدار کو پیغامِ خواب آیا
سہارا بال و پر کا جب نہ زیرِ آسماں پایا
قفس میں طائرِ بے بال و پر نے آشیاں پایا
حوادث نے کیا مغلوں کا پرچم سرنگوں آخر
ہوا یہ مہرِ عالم تاب، غرقِ موجِ خوں آخر
ہوا شیرازۂ ملت پریشاں اس ہزیمت سے
کہ مسلم بے خبر تھے اپنی اصلی قدر و قیمت سے
یہ تاج و تخت میں اسلام کو محدود سمجھے تھے
غبارِ رہ گزر کو منزلِ مقصود سمجھے تھے
زوالِ جاہ و ملک و مال کو سمجھے زوال اپنا یہ خود بھی ایک دولت ہیں نہیں آیا خیال اتنا
حجازی قافلہ ہندوستاں میں راہ بھولا تھا
ہوائے سرد کے جھونکے تھے اور غفلت کا جھولا تھا
وہ جس کا ہر قدم تھا پیش خیمہ خوش نصیبی کا
اُسے اب مرحلہ درپیش تھا شامِ غریبی کا
کلامِ مصطفےٰ بھولا، پیامِ مصطفےٰ بھولا
رموزِ بے خودی بھولا، خودی بھولا، خدا بھولا

جرس کی ہر صدا اب رائیگاں معلوم ہوتی تھی
تباہی کارواں در کارواں معلوم ہوتی تھی
پراگندہ جماعت، فرد، اس پر خود فراموشی
مسلسل ایک سناٹا، مسلسل ایک خاموشی
پڑے تھے رہ گزارِ سیل میں سب نیند کے ماتے — بس اتنی دیر تھی طوفان آتا اور یہ بہہ جاتے
سُنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
کہ اس ظلمات میں اک چاند اُترا آسمانوں سے
شرافت لے کے آیا تھا یہ آغوشِ اصالت سے
کیا تھا اُس نے کسبِ نورِ خورشیدِ رسالت سے
نظر والے اُسے اک دردمند انسان کہتے تھے — زباں والے فقط سر سید احمد خان کہتے تھے
یہ آیا ہند میں علم و عمل کی روشنی لے کر
مسلماں کے لیے اُس کی پُرانی زندگی لے کر
اُسے زعمِ کرامت تھا نہ کچھ اعجاز کے دعوے
محمدؐ کی غلامی پر تھے فخر و ناز کے دعوے
مسیحائی نہیں مُردے جلانا کام تھا اُس کا
عروجِ زندگی پر لے کے جانا کام تھا اُس کا
نہ گھاتیں پیش گوئی کی نہ کچھ الہام کی باتیں — وہ کرتی جاتا تھا خدمتِ اسلام کی باتیں
مقابل میں جہالت تھی، کٹھن تھا راستہ اُس کا
ضرورت تھی کہ ساتھی ہو کوئی مردِ خدا اُس کا
بر دئے کار آئی جستجوئے کامیاب اُس کی
ملی حالی کی صورت میں اُسے تعبیرِ خواب اُس کی
اِدھر درد آشنا سید، اُدھر گرمِ نوا حالی — زبان و دل نے گویا ربطِ باہم کی بنا ڈالی
عجب انداز سے شاعر نے تارِ ساز کو چھیڑا
جگایا روحِ خوابیدہ کو، خوابِ ناز کو چھیڑا
عجب نغمہ تھا خونِ سرد کو گرما دیا جس نے
عجب ناوک تھا ہر پتھر کا دل برما دیا جس نے
جگایا کاروانِ خفتہ کو آوازِ حالی نے
کیا پھر گرم رَو مسلم کو اس شعلہ مقالی نے
سخن کی اک نئی دنیائے عالی شان پیدا کی
بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی
قیامت بن گئی قلبِ جرس میں اس کی گویائی
ہوا پیدا سروں میں پھر جنونِ جادہ پیمائی

جگا کر خاکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے — وہ حالی سو گیا اپنے وطن کی خاک کے نیچے

بجا ہے ناز حالی کے وطن کو اُس کی تربت پر
کہ ہے ہفت آسماں کو رشک اس مٹی کی رفعت پر
عیاں ہو سیدِ شاہِ سخن کا رتبۂ عالی
کہ آیا اس کے شوقِ دید میں بھوپال کا والی
مبارک اے حمید اللہ خاں تیرا یہاں آنا
ترے آنے سے زندہ ہو گیا پھر ایک افسانا

نہیں ہے آج قدرِ گوہرِ دل، کج کلاہوں میں — یہ جوہر اب نظر آتا ہے تیری ہی نگاہوں میں

دعا یہ ہے کہ جب تک شوکتِ اسلام باقی ہے
خدا کا اور محمد مصطفےٰؐ کا نام باقی ہے
مساجد سے اذانوں کی صدا اٹھتی رہے جب تک
مدینے کی طرف بانگِ درا اٹھتی رہے جب تک

زبان و دل نہ ہو جب تک سپاس و شکر سے عاری — الٰہی چشمۂ الطافِ حالی بھی رہے جاری[1]

---

[1] سہ ماہی "العلم" کراچی جولائی تا ستمبر ۱۹۷۲ء ـ صفحہ ۳۶ تا ۴۲

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر سید عبدالباسط کے نام

بھوپال کے قیام اور نقرس کے علاج کے سلسلے میں اقبال کے خصوصی معالج کی حیثیت سے ڈاکٹر سید عبدالباسط کا نام سرِفہرست ہے۔ گذشتہ صفحات میں جابجا اقبال نے ڈاکٹر عبدالباسط کا تذکرہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباسط سے اقبال کی قربت و وابستگی اور خصوصی ربط و تعلق کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ آپ نہ صرف بھوپال کے بلکہ ہندوستان کے نامی گرامی ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے اور بجلی کے علاج کے سلسلے میں آپ کا تجربہ و قابلیت، آپ کی ماہرانہ اور فنی حیثیت بے مثال تھی۔ پھر آپ صاحبِ علم بھی تھے اور شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ اور اقبال کے مداحوں، قدردانوں اور نیازمندوں میں شامل تھے۔ تیسرے یہ کہ شیش محل میں جہاں اقبال نے دو بار قیام کیا۔ اُسی کے مقابل قدسیہ محل تھا۔ جہاں ڈاکٹر سید عبدالباسط رہائش پذیر تھے اس لیے "مریض و معالج" کے ہمہ وقت قرب نے ایک دوسرے سے گہری وابستگی پیدا کر دی تھی۔ جاوید جو پہلی بار بھوپال گئے تھے اپنا بیشتر وقت ڈاکٹر سید عبدالباسط کے صاحبزادے سید عبدالحئی اور دیگر عزیزوں کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گذارتے تھے۔ اکثر ڈاکٹر صاحب شیش محل میں رات کا کھانا اقبال کے ساتھ کھاتے تھے اور ان کی محفلوں میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی اقبال ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور جیسا کہ عبدالحئی صاحب نے بتایا ڈاکٹر سید عبدالباسط اور علامہ اقبال سے دلی تعلق کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وہ راس مسعود کے عزیزوں میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا سید عبدالغفور صاحب کی شادی سر سید کی ہمشیرہ صفیہ بیگم کی صاحبزادی ذکیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس نسبت سے راس مسعود ہمیشہ ڈاکٹر سید عبدالباسط کو اپنا قریبی عزیز بتاتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالباسط دہلی کے رہنے والے تھے۔ ابتداً دہرہ دون کی ایکسرے انسٹیوٹ میں بطور ریڈیالوجسٹ ملازم ہوئے۔ ہندوستان میں پہلی بار دہرہ دون میں ایکسرے انسٹیٹیوٹ قائم ہوا تھا جہاں ڈاکٹروں کو ایکسرے اور بجلی سے علاج کی تربیت دی جاتی تھی۔ آپ کا شمار ماہرینِ فن میں ہوتا تھا اور سارے ہندوستان میں آپ کی شہرت تھی۔

۱۹۲۶ء میں آپ دہرہ دون سے ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ وہیں آپ کی ملاقات ڈاکٹر انصاری سے ہوئی جو اپنی گوناگوں سیاسی، سماجی اور علمی خدمات کی بنا پر ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ آپ نواب حمیداللہ خاں کے ذاتی معالج بھی تھے اور اُن کے قریبی دوست بھی۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط سے انھوں نے کہا کہ نواب صاحب بھوپال میں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ قائم کرنا چاہتے ہیں لہٰذا آپ وہاں چلے جائیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط

ریاست بھوپال کی چند در چند خوبیوں سے واقف تھے۔ بھوپال جانے پر فوراً آمادہ ہو گئے، چنانچہ ۱۹۲۶ء ہی میں آپ بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں بطور ریڈیالوجسٹ آپ کا تقرر ہو گیا۔ اور آپ نے پرنس آف ویلز اسپتال میں (جو بعد میں حمیدیہ اسپتال کہلایا) ایکسرے ڈیپارٹمنٹ قایم کر کے بجلی کے علاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے بھوپال کے کئی ڈاکٹروں کو اس نئے شعبۂ علاج کی تربیت بھی دی۔

۱۹۳۵ء میں اقبال جب پہلی بار علاج کے سلسلے میں بھوپال آئے تو دیگر معالجین کے علاوہ خصوصی معالج کا شرف ڈاکٹر سید عبدالباسط کو حاصل ہوا اور جبھی سے اقبال اور ڈاکٹر صاحب کے روابط میں قرب و استحکام پیدا ہو گیا۔

ڈاکٹر سید عبدالباسط کے صاحبزادے عبدالحئیؒ صاحب کا بیان ہے کہ علامہ اقبال والد صاحب سے بڑی محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ والد صاحب بھی نہایت توجہ سے اُن کا علاج کر رہے تھے اور بجلی کے علاج سے انھیں کافی فائدہ ہوا تھا۔ پہلے اور دوسرے قیام کے بعد جب علامہ اقبال لاہور واپس تشریف لے گئے تو وہاں سے بھی خطوط بھیجتے رہے اور والد صاحب سے مشورے لیتے رہے۔ خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ والد صاحب انھیں جلد بھوپال آنے کے لیے لکھتے تھے تاکہ علاج کا کورس مکمل ہو سکے اور علامہ کے گلے کی تکلیف رفع ہو سکے۔ لیکن ان کا جلد جلد آنا ممکن نہ ہو سکا۔ البتہ اس عرصہ میں انھیں کسی نے ویانا جانے کا مشورہ دیا تو انھوں نے پھر والد صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ علامہ کے کئی خطوط والد صاحب کے نام آئے تھے جن میں سے صرف پانچ خطوط[۱] اور ضرب کلیم کا وہ نسخہ[۲] جسے علامہ اقبال نے اپنے دستخط کے ساتھ بھیجا تھا محفوظ رہ گیا۔

اقبال کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط۔ جیسا کہ مطالعہ سے ظاہر ہوگا اگرچہ تمام تر بیماری کی تفصیلات، ویانا جانے کے سلسلے میں مشورے، ایکسرے کی رپورٹ وغیرہ سے متعلق ہیں لیکن ان میں بھی اقبال کا منفرد لب و لہجہ اور طرز تحریر کی سادگی و پرکاری ملتی ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ڈاکٹر سید عبدالباسط سے انھیں کتنا قلبی ربط و تعلق تھا۔

پہلا خط ۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کا ہے جس کا عکس پیش خدمت ہے۔ اسی تاریخ کو انھوں نے راس مسعود کو بھی خط لکھا تھا جو گزشتہ صفحات میں شامل ہے۔ اس خط میں انھوں نے ویانا جانے کے سلسلے میں راس مسعود سے مشورہ طلب کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالباسط کے نام خط بھیجنے کا تذکرہ بھی ہے۔

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt. Lahore
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law Dated ________ 193

لاہور ۲ر اکتوبر ۳۵ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب ۔ آپ کا خط ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں

[illegible]

۱-۲ یہ پانچ غیر مطبوعہ خطوط اور ضرب کلیم کا دستخطی نسخہ جن کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔ راقم الحروف کی خصوصی درخواست پر سید عبدالحئیؒ نے اقبال اکیڈمی میں محفوظ کرا دیے ہیں۔ ایلؔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

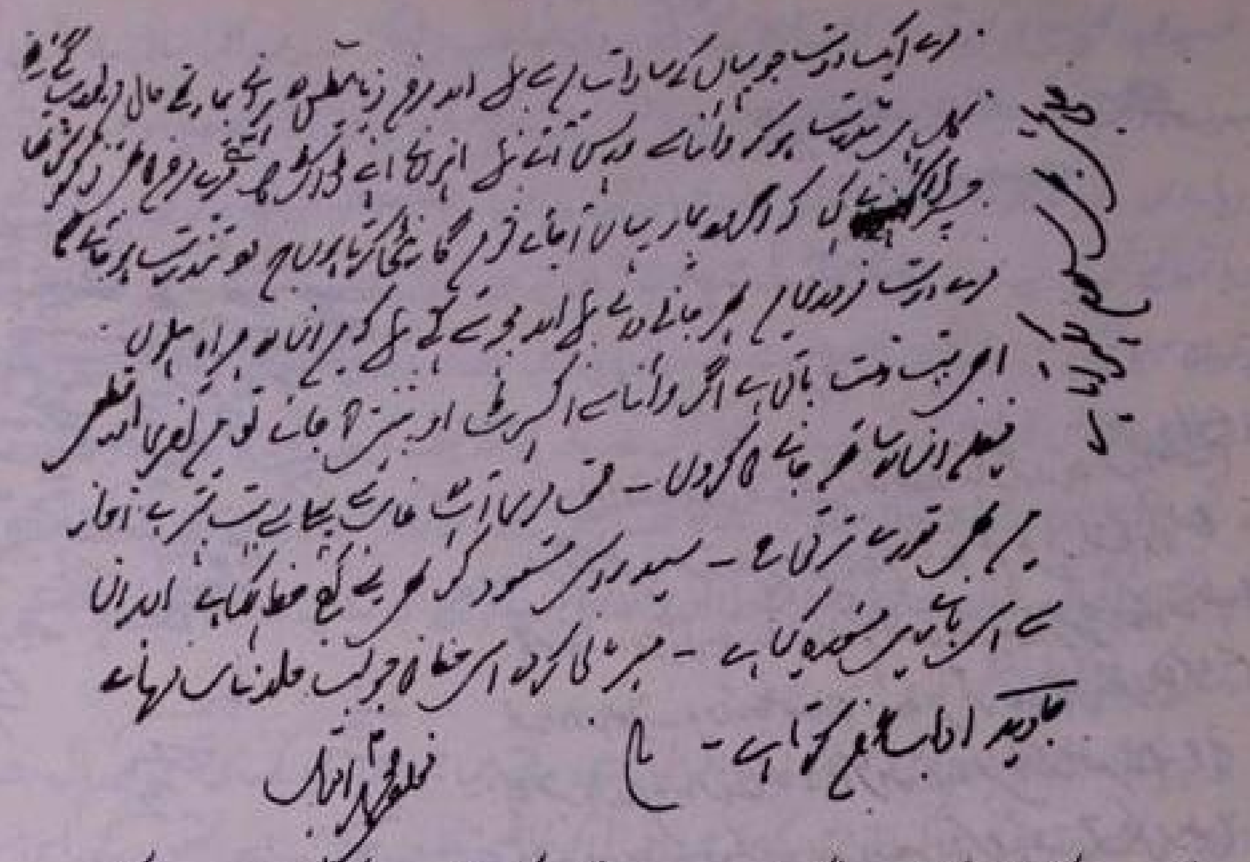

محمد اقبال

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی صحت اگرچہ پہلے سے بہتر تھی لیکن بلغم اور گلے کی تکلیف سے مکمل ب ت ابھی تک نہیں مل سکی تھی۔ چنانچہ جب اُن کے ایک دوست نے یورپ سے لوٹ کر انھیں ویانا چلنے کا مشورہ دیا تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے عزیز ترین دوست۔ راس مسعود سے مشورہ حاصل کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے خصوصی معالج ڈاکٹر سید عبدالباسط کو بھی تفصیلات سے مطلع کیا۔

اقبال کا خط ملتے ہی ڈاکٹر سید عبدالباسط نے فوراً جواب لکھا۔ اسی دوران اقبال نے ڈاکٹر انصاری کا مشورہ بھی حاصل کیا اور راس مسعود اور ڈاکٹر انصاری سے مشورے کے بعد پھر ایک تفصیلی خط ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تحریر کیا جس میں ویانا جانے کے پروگرام کو آخری شکل دینے سے پہلے ڈاکٹر مظفر علی کو ضروری تفصیلات بھیجنے کی درخواست کی۔ اقبال کے سینہ کا فوٹو (ایکسرے)، مرض کی تفصیلات، معائنہ کا مکمل ریکارڈ وغیرہ بھوپال میں موجود تھا۔

ڈاکٹر خان بہادر، ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر سید عبدالباسط نے علیحدہ علیحدہ اقبال کا معائنہ کیا تھا اور مرض و علاج کی تشخیص کے بارے میں ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر سید عبدالباسط میں قدرے اختلاف تھا جس کا ذکر ہمیں ذیل کے خط سے ملتا ہے۔

اقبال کی خواہش یہ تھی کہ فوٹو کے ساتھ ڈاکٹروں کی رپورٹ اور اختلاف کے سلسلے میں ایک نوٹ تیار کر کے ڈاکٹر مظفر کو ویانا بھیج دیا جائے تاکہ وہاں کے ماہرین اس پر غور کر کے کوئی فیصلہ کر لیں تب ویانا جانے کا پروگرام بنایا جائے۔

اس خط کی عبارت سے جو حاشیے تک میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ عجلت میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے اور احتیاط پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا چند درچند ملکی، ملی اور خانگی ذمہ داریاں دامن گیر تھیں اس لیے اتنا دور دراز کا سفر اختیار کرنے سے پہلے ویانا کے ماہرین کی آخری رائے حاصل کرنا نہایت ضروری تھا۔

۱-۲؎ خان بہادر ڈاکٹر احمد بخش اور ڈاکٹر رحمٰن بھی اقبال کے معالجین میں شامل تھے اور ان کی خصوصی نگرانی میں ڈاکٹر سید عبدالباسط بجلی کا علاج کر رہے تھے۔

۳؎ مے ، سہواً رہ گیا۔

۴؎ آپ ڈاکٹر انصاری کے بھانجے تھے اور اُن دنوں ویانا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

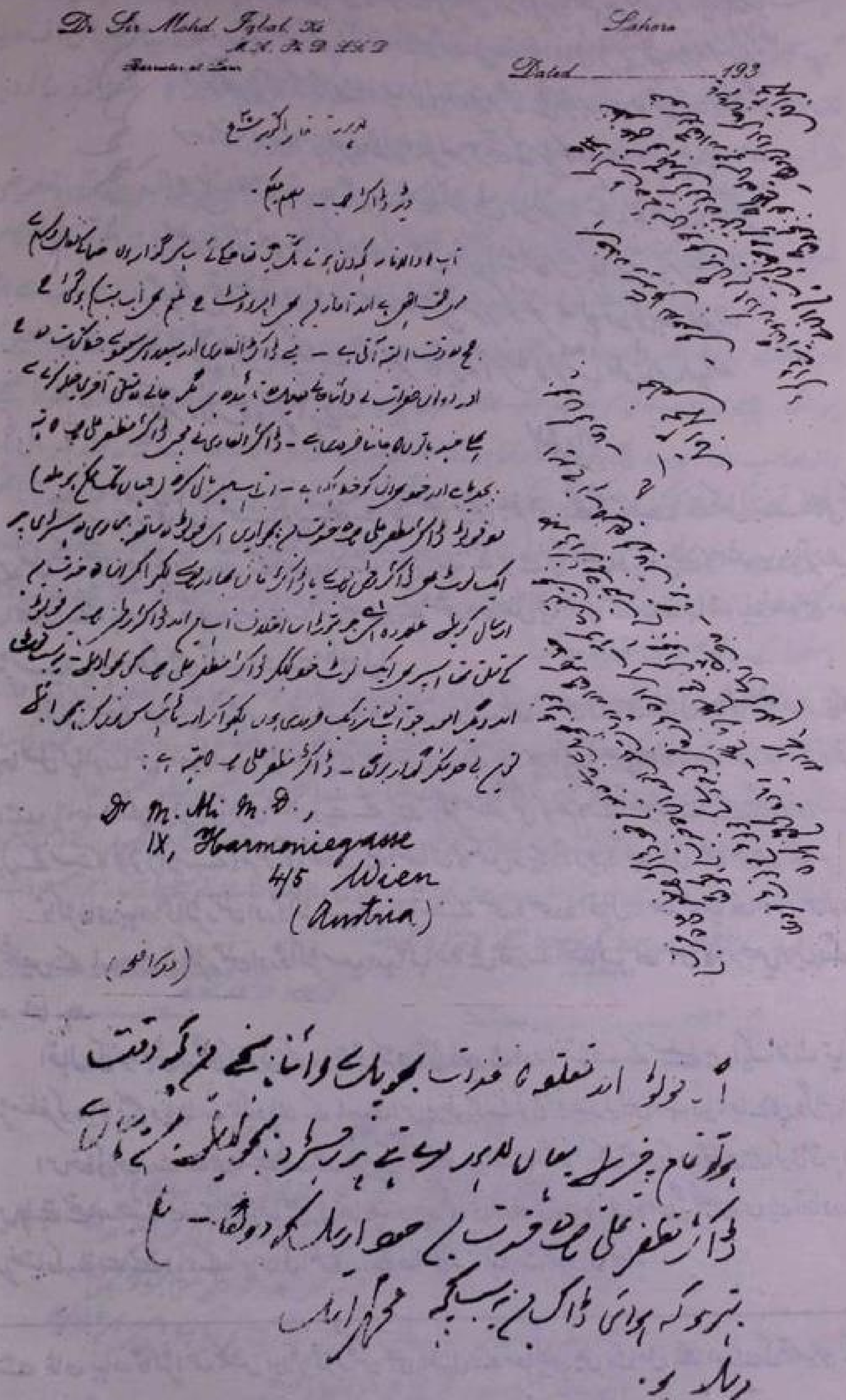
Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt. M.A., Ph.D., LL.D.
Barrister at Law

Lahore
Dated ________ 193

[illegible]

ڈیئر ڈاکٹر صاحب — السلام علیکم

[illegible]

Dr. M. Ali M.D.,
IX, Harmoniegasse
4/5 Wien
(Austria)

(ڈاکٹر اقبال)

[illegible]

ڈاکٹر مظفر علی [illegible]

بہتر ہو کہ ہوائی ڈاک [illegible]

روانہ ہو۔

۱؎ کے، سہواً رہ گیا۔ ۲؎ سید عبدالحی سے مراد ہے۔

سید عبدالحیٔ بیان کرتے ہیں کہ اس خط کے ملنے پر والد صاحب (ڈاکٹر سید عبدالباسط) نے اقبال کے سینے کا فوٹو (ایکسرے)، ڈاکٹروں کی رپورٹ، اپنا اختلافی اور وضاحتی نوٹ ڈاکٹر مظفر علی کو ویانا بھیج دیا اور حسبہٗ اقبال کو بھی مطلع کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ خاموشی رہی۔ جہاں تک ویانا جانے کا سوال تھا خود والد صاحب نے بھی اقبال کو مشورہ دیا تھا کیونکہ یورپ سائنسی اور فنی ترقی میں اوجِ کمال پر تھا۔ وہاں نئی دریافتوں کے ساتھ ساتھ علاج و معالجہ کی جدید ترین سہولتیں بھی میسّر تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ ویانا میں سینے اور گلے کی تکالیف کا خصوصی علاج کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مظفر علی جن کا اس خط میں تذکرہ ہے۔ آنکھ، ناک اور گلے کی تکالیف کی جدید تحقیقات سے استفادہ کے لیے ہی ویانا گئے تھے۔ اقبال براہِ راست ڈاکٹر مظفر علی سے واقف نہیں تھے۔ وہ ڈاکٹر انصاری کے بھانجے تھے چنانچہ اُن ہی کی رہبری و ہدایت پر اقبال نے اُن سے خط و کتابت کی اور والد صاحب کو بھی اُن کے پتہ سے آگاہ کیا اور تفصیلی رپورٹ انھیں ارسال کرنے کی خواہش کی۔

نومبر کے دوران صرف دو خط "مکتوبات اقبال" میں ملتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق بھوپال سے ہے۔ اس خط کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ پانی پت کے سفر میں اقبال کو خاصی تکلیف ہوئی۔ جسے انھوں نے راس مسعود اور نواب حمیداللہ خاں کی خاطر برداشت کیا۔ سید نذیر نیازی کے نام اس خط میں دیگر امور کے علاوہ پانی پت کے سفر کی صعوبت اور تیسری بار بھوپال جانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"ـــــ مگر یقین جانیے کہ مجھے پانی پت کے سفر میں تکلیف ہوئی۔ اب جو قوتِ سفر باقی ہے اُسے بھوپال کے سفر کے لیے محفوظ رکھتا ہوں [1]"

اب اقبال بھوپال کے تیسرے سفر کی تیاری کر رہے تھے تاکہ علاج کا تیسرا کورس بھی مکمل ہو سکتا۔ ڈاکٹر سید عبدالباسط اور راس مسعود سے اُن کی خط و کتابت جاری تھی۔ یہ دونوں حضرات اُنھیں جلد بھوپال آنے کے لیے لکھ چکے تھے۔ چنانچہ، ۶؍ دسمبر ۱۹۳۵ء کے اس قلمی خط میں جو ڈاکٹر سید عبدالباسط کے نام ہے ان امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

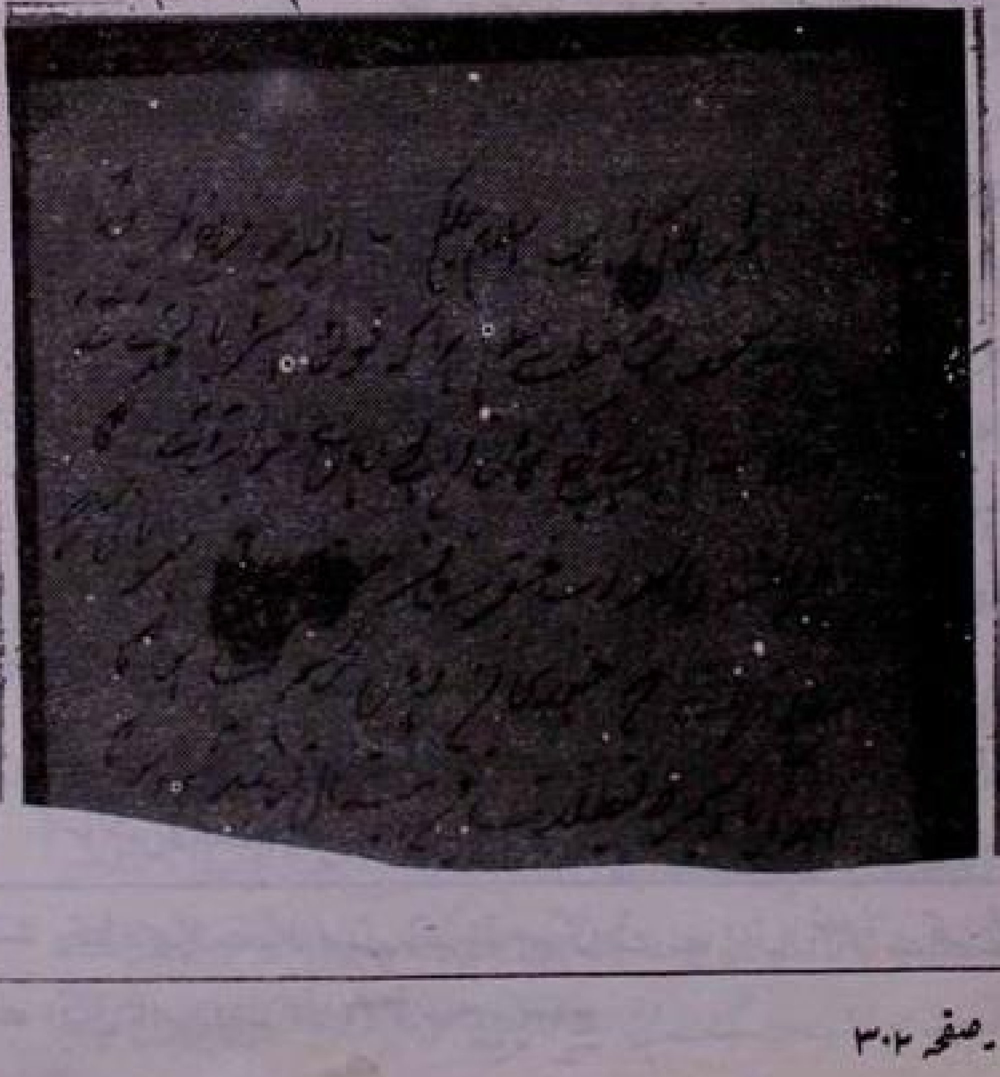

۱؎ مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۰۲

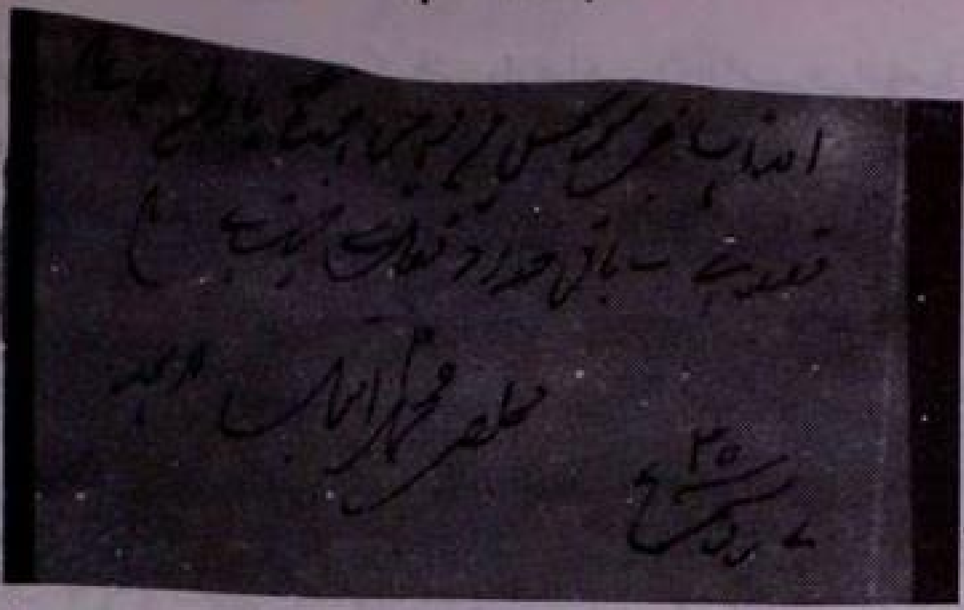

ب اقبال کو راس مسعود کا ایک خط اور تار ملا جس میں اُن کی خیریت دریافت کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ب بھوپال کی تشویش کا ذکر بھی تھا جس کا تعلق اقبال کی علالت سے تھا۔ اقبال جشنِ حالی کے دوران بھی علیل تھے اور پانی پت سے لاہور پہنچنے کے بعد بھی علیل رہے۔ نواب صاحب کو اس علالت کا کسی طور علم ہو گیا تھا چنانچہ اس خط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے:

"لاہور ـــ ۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود۔ تمہارا خط ابھی ملا۔ کل شام کے قریب تار بھی ملا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ میں اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ معلوم ہوتا ہے اُن کو میری آسائش کا بہت خیال ہے۔ خدائے تعالیٰ اجرِ عظیم ان کو عطا فرمائے۔

ہز ہائینس آغا خاں کو بھی خط لکھ دوں گا۔ اطمینان فرمایئے۔ اس سے پہلے ایک خط آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں، امید ہے پہنچ گیا ہوگا۔ اور کتابوں کا پارسل بھی مل گیا ہوگا۔ اندور سے رشید صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ ان کو بھی جواب لکھ دیا تھا۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں ان کی علالت کا تذکرہ کر دیا تھا۔ وہ نومبر[1] میں تمہارے ساتھ دہلی آئیں تو ضرور ان کو نبض دکھائیں۔

لاہور میں گرمی کی بے انتہا شدت ہے۔ بارش کا نام و نشان نہیں ہے۔ سرحد پر جنگ باقاعدہ شروع ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مسجد شہید گنج کا اثر وہاں بھی جا پہنچا ہے۔ اور راولپنڈی میں کیا تمام پنجاب میں مسجد کی بازیابی کے لیے جوش و خروش بڑھ رہا ہے۔ خدائے تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا فضل کرے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ جاوید آپ کی اور لیڈی مسعود کی خدمت میں آداب لکھواتا ہے۔ علی بخش بھی آداب عرض کرتا ہے۔ والسلام

محمد اقبال ـ لاہور[2]"

اس خط میں نواب حمید اللہ خان کے بارے میں اُن کا یہ لکھنا:۔

"ـــــ میں اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ معلوم ہوتا ہے ان کو میری آسائش کا بہت خیال ہے۔ خدائے تعالیٰ اجرِ عظیم ان کو عطا فرمائے ـــــ"

---

[1] یہ خط دسمبر کا ہے۔ ظاہر ہے نومبر یا تو سہو کتابت ہے یا اقبال غلطی سے لکھ گئے ہیں۔

[2] اقبال نامہ۔ (جلد اول) صفحہ ۳۷۲ - ۳۷۳

سچ پوچھیے تو اُس گہری وابستگی، دلی قُرب اور خصوصی تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو نواب صاحب کو اقبال سے اور اقبال کو نواب صاحب سے تھا۔ ورنہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک والیٔ ریاست کو اقبال ایسے مردِ قلندر کی علالت و بیماری کے سلسلے میں پریشان اور فکرمند ہونے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب نہ صرف اقبال سے گہری محبت کرتے تھے بلکہ اس امر کے خواہش مند بھی تھے کہ وہ جلد روبصحت ہو جائیں تاکہ ملک و قوم اُن سے بیش از بیش استفادہ کرسکے۔ وہ اُن کے وجود کو ملت کی فلاح و تعمیر کے لیے مقدم سمجھتے تھے اور ایک سچے اور مخلص نیاز مند کی حیثیت سے اُن کی صحت و عافیت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ راس مسعود کے خط اور تار کا سلسلہ بھی اسی کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے اور اقبال کا جذبۂ سپاس گذاری بھی اسی تعلق خاطر کی ایک بنیاد جس سے دونوں کے باہمی اور مخلصانہ روابط کی نشان دہی ہوتی ہے۔

اس خط میں ہزہائی نس آغا خاں کا ذکر بھی ہے، لیڈی مسعود کی علالت کا بھی ـــــ رشید صاحب (لیڈی مسعود کے والد جو اندر میں تھے) کے خط کا تذکرہ بھی ہے اور مسجد شہید گنج کے سلسلے میں سرحد پر جنگ کا حال بھی۔ پنجاب میں اس واقعہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی ـــ اس پر بھی یہ خط کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

"راولپنڈی میں کیا تمام پنجاب میں مسجد کی بازیابی کے لیے جوش و خروش بڑھ رہا ہے۔"

ان جستہ جستہ واقعات میں خصوصیت کے ساتھ آغا خاں کو خط لکھنے کا تذکرہ دراصل اُس وظیفہ سے تعلق رکھتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ کے بعد راس مسعود کی سعی و کوشش سے سر آغا خاں نے اقبال کو دینا منظور کرلیا تھا۔

اقبال کی فقر دوستی، سادہ روی، قناعت پسندی، احسان شناسی اور دوست نوازی کے سلسلے میں ان کا یہ خط جو ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے کتنے ہی گوشے بے نقاب کرتا ہے اور ہمارے دل میں اقبال کی عظمت دوچند ہو جاتی ہے۔ اس خط میں جس صاف دلی، بے باکی اور اعلیٰ ظرفی کا اظہار کیا گیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکے گی۔ لکھتے ہیں:-

"لاہور ـــــ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود۔ کل خط لکھ چکا ہوں۔ آج اس تمام معاملے پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں۔ آپ اس خط کو کانفیڈنشل تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھوپال میں آپ کے بیڈ روم میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کرلینے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کردیا ہوگا۔ اس کے بعد جس مسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں بے حد تذبذب کی حالت میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی ہزہائی نس آغا خاں سے کیا خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس تحریر کو ناشکری پر محمول نہ کیا جائے۔

بہرحال میں نے ہز ہائی نس آغا خاں کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہے۔ گو اس میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا اور اخلاقاً مجھ کو ایسا کرنے کی جرأت بھی نہ ہونی چاہیے تھی۔ آپ جب اس معاملے پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت پہلو ہیں اور میں نے تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھ کر آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ آپ مہربانی کرکے مجھ کو جلد اس امر سے اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے اتفاق ہے یا نہیں۔ اگر اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز کا ڈراپ کرنا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائی نس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کردیں۔ اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوجائے یا جس وقت تک ہز ہائی نس مناسب تصور کریں بعض پرائیویٹ وجوہ کی بنا پر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو معلوم بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بہ کلی اطمینان ہوجائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس آغا خاں میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ میں نے اپنی مشکلات کا حال آپ کو لکھ دیا ہے۔ اب آپ جو تجویز چاہیں کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں جہاں تک ممکن ہے جلد۔ آخری فیصلے تک اس بات کا پریس میں جانا مناسب نہیں ہے۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام محمد اقبال ۔ لاہور[1]"

اس خط کے یہ جملے غور طلب ہیں :-

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں اُن کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ راس مسعود کو اقبال کی مالی دشواریوں، ان کی گرتی ہوئی صحت اور چند در چند پریشانیوں کا ذاتی طور پر علم تھا۔ نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ کے اجراء کے بعد انھوں نے ذاتی طور پر بھی اور نواب صاحب بھوپال کے وسیلے سے بھی سر آغا خاں سے مراسلت کی اور یہ کوشش کی کہ وہ بھی اقبال کا پانچ سو روپے وظیفہ مقرر کردیں تاکہ وہ آسائش و اطمینان سے زندگی بسر کرسکیں اور بچوں کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ حیدر عباسی صاحب[2] کا بیان ہے کہ راس مسعود کی تجویز جب اُنھیں موصول ہوئی تو اُنھوں نے نواب صاحب بھوپال کے ایماء سے اسے خصوصی سفارش کے ساتھ سر آغا خاں کو بھیج دیا جس کی جلد ہی منظوری آگئی۔ لیکن اقبال ان واقعات سے قطعی لاعلم اور بے خبر تھے۔ انھیں تو راس مسعود کے خط سے ہی سر آغا خاں کے وظیفہ کی منظوری کا علم ہوا اور جب اُنھیں علم ہوا تو وہ

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۷

[2] سابق مشیر المہام صیغۂ سیاسیہ ریاست بھوپال جو کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

عجب اُلجھن میں پڑ گئے ۔ جیسا کہ مندرجہ بالا خط کی عبارت سے ظاہر ہے ۔ اس اُلجھن سے قطع نظر اُن کے جذبۂ احسان مندی کا بھی اندازہ لگایئے کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ جو رقم نواب صاحب بھوپال نے مقرر کردی ہے وہ اُن کے لیے کافی ہے اور کافی نہ بھی ہو تب بھی وہ امیرانہ زندگی کے عادی نہیں ۔ یہ ہے وہ طرزِ فکر، اصولِ زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدر جو مفکرِ مشرق کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی تھی اور جسے اپنا کر انھوں نے ایک سچے مسلمان کی ان تمام خصوصیات کو اُجاگر کیا جس سے رسولِ کریم کی ساری زندگی عبارت ہے ۔

راس مسعود کی خواہش پر انھوں نے سر آغا خاں کو شکریہ کا خط تو لکھ دیا لیکن وہ خود ان کی پیش کش قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے ۔ چنانچہ مندرجہ بالا خط میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پنشن کی رقم جاوید کو عطا کردی جائے تاکہ اُس کی تعلیم کی تکمیل ہو سکے ۔ چنانچہ راس مسعود نے اقبال کے جذبات و خیالات کو نہ صرف سراہا بلکہ دلی اعتراف بھی کیا اور پھر یہ کوشش کی کہ سر آغا خاں کی پنشن دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کے نام منتقل ہو جائے اور ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں صرف کی جائے تاکہ دونوں بچوں کی تعلیم میں کسی طور رکاوٹ پیدا نہ ہو ۔ لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا ۔ ابھی ان کی مساعیٔ جمیلہ کا سلسلہ جاری تھا کہ راس مسعود کا بلاوا آگیا اور وہ معبودِ حقیقی سے جا ملے اور ان خوابوں کا شیرازہ ہی بکھر گیا جو وہ سوتے جاگتے اپنے پیارے دوست اقبال کی سود و بہبود کے لیے دیکھتے تھے ۔

ان واقعات کی تصدیق فقیر سید وحید الدین مصنف "روزگار فقیر" کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو "شانِ استغناء" کے عنوان سے شامل کتاب ہے ۔ اس کے مطالعہ سے جہاں نواب حمید اللہ خاں اور سر آغا خاں کے وظائف کے سلسلے میں راس مسعود کی پُرخلوص سعی و جہد کا علم ہوتا ہے وہیں اقبال اور راس مسعود کے قریبی روابط پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راس مسعود اقبال سے کتنی گہری اور شدید محبت کرتے تھے اور ان کی آسائش و آسودگی کے لیے وہ کس خلوص اور لگن سے آخری سانس تک جد و جہد کرتے رہے :۔

> "ڈاکٹر صاحب کے یوں تو بہت سے احباب تھے مگر راس مسعود کی محبت اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے ۔ فکر اس بات کی کہ ڈاکٹر صاحب کی علالت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے، اُن کے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں ! آخر کار ڈاکٹر صاحب کے حالات پر بہت کچھ غور کرنے کے بعد نواب سر حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال اور سر آغا خاں سے سلسلہ جنبانی کی اور بڑے عزت و وقار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے معاملے کو پیش کیا ۔ سر راس مسعود خود اپنی جگہ ممتاز شخصیت رکھتے تھے ۔ پھر جو شخصیت موضوعِ فکر و گفتگو تھی وہ سب کے نزدیک محترم اور قابلِ عزت و تکریم تھی ۔ چنانچہ انھوں نے نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خاں کو پانچ پانچ سو روپے ماہوار کے وظائف کے لیے آمادہ کر لیا ۔ جب یہ معاملہ طے پا گیا تو سر راس مسعود نے جو اُس وقت بھوپال کے وزیر تعلیم بھی تھے ڈاکٹر صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے التجا کی کہ میں نے آپ کے ایماء کے بغیر یہ کوشش کی ہے آپ اس پیش کش کو قبول فرمالیں ۔
>
> یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی قانونی پریکٹس عرصہ سے موقوف تھی، بیماری کے تسلسل نے اُن کے مالی حالات کو بُری طرح متاثر کیا تھا ۔ ان کی ضروریات وسیع بھی تھیں اور ناگزیر بھی ۔ ایسے عالم میں ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی کی سبیل کتنی بڑی چیز تھی ۔ مگر ڈاکٹر صاحب

قلندر صفت اور درویش مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے عالی ظرف اور طبیعت کے مستغنی تھے۔ انھوں نے سر راس مسعود کا یہ مشورہ تو قبول کر لیا اور ان کی بات مان لی مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے پانچ سو روپیہ ماہوار مجھے بہت کافی ہیں۔ اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لیے نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ پر اکتفا کی جائے اور سر آغا خاں سے وظیفہ نہ لیا جائے۔

سر راس مسعود نے ڈاکٹر اقبال کے اس جواب اور اُن کی قناعت پسند روش کو بہت سراہا لیکن ساتھ ہی اس امر کے لیے کوشاں ہوئے کہ سر آغا خاں والے وظیفہ کی رقم ماہ بہ ماہ کسی بینک میں جمع ہوتی رہے اور ڈاکٹر صاحب کے دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کی تعلیم و تربیت میں دشواری پیش آنے پر ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں اسے صرف کیا جائے۔ یہ اقدام بڑی دور اندیشی پر مبنی تھا۔ لیکن قدرت کا فیصلہ کون بدل سکتا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ٹرسٹ قایم کیا جاتا یا سر آغا خاں وظیفہ کی ادائیگی شروع کرتے، سر راس مسعود ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے اور یہ بساط ہی اُلٹ گئی۔[1]

سر آغا خاں کے وظیفہ کے سلسلے میں راس مسعود کو خط لکھنے کے فوراً بعد اُنھیں دیانا سے ڈاکٹر مظفر علی کا خط موصول ہو گیا اور جب اس خط سے انھیں یہ علم ہوا کہ اُن کے کاغذات ابھی تک دیانا نہیں پہنچے ہیں تو اُنھوں نے دوسرے ہی روز یعنی ۱۳ دسمبر ۱۹۳۵ء کو پھر ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تفصیلی خط لکھا اور کاغذات کے بارے میں معلومات فرمائی اور پھر درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر خان بہادر سے کہہ کر ہسٹری شیٹ دوبارہ تیار کرا دیں تاکہ جنوری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں وہ بھوپال آنے کے بعد اُسے نئے فوٹو کے ساتھ دیانا بھیج دیں:

لاہور ۱۳ دسمبر ۳۵ء

ڈیر ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

آج مجھ کو ایک بہت افسوس ناک خبر معلوم ہوئی

کہ ڈاکٹر مظفر علی صاحب کا خط ولایت سے آیا ہے

آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھوپال کے کاغذات ان کو

موصول نہیں ہوئے یہ خط ۲ دسمبر کا لکھا ہوا ہے اللہ جانے

---

[1] یہ حادثۂ جانکاہ اگرچہ اقبال کے تیسرے قیام بھوپال کے بعد رونما ہوا لیکن چونکہ اس کا تعلق اقبال کے ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کے خط سے تھا اس لیے تاریخی اور واقعاتی تسلسل قایم رکھنے کے لیے اسے ان صفحات میں شامل کیا گیا۔

[2] روزگار فقیر۔ صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۳۔

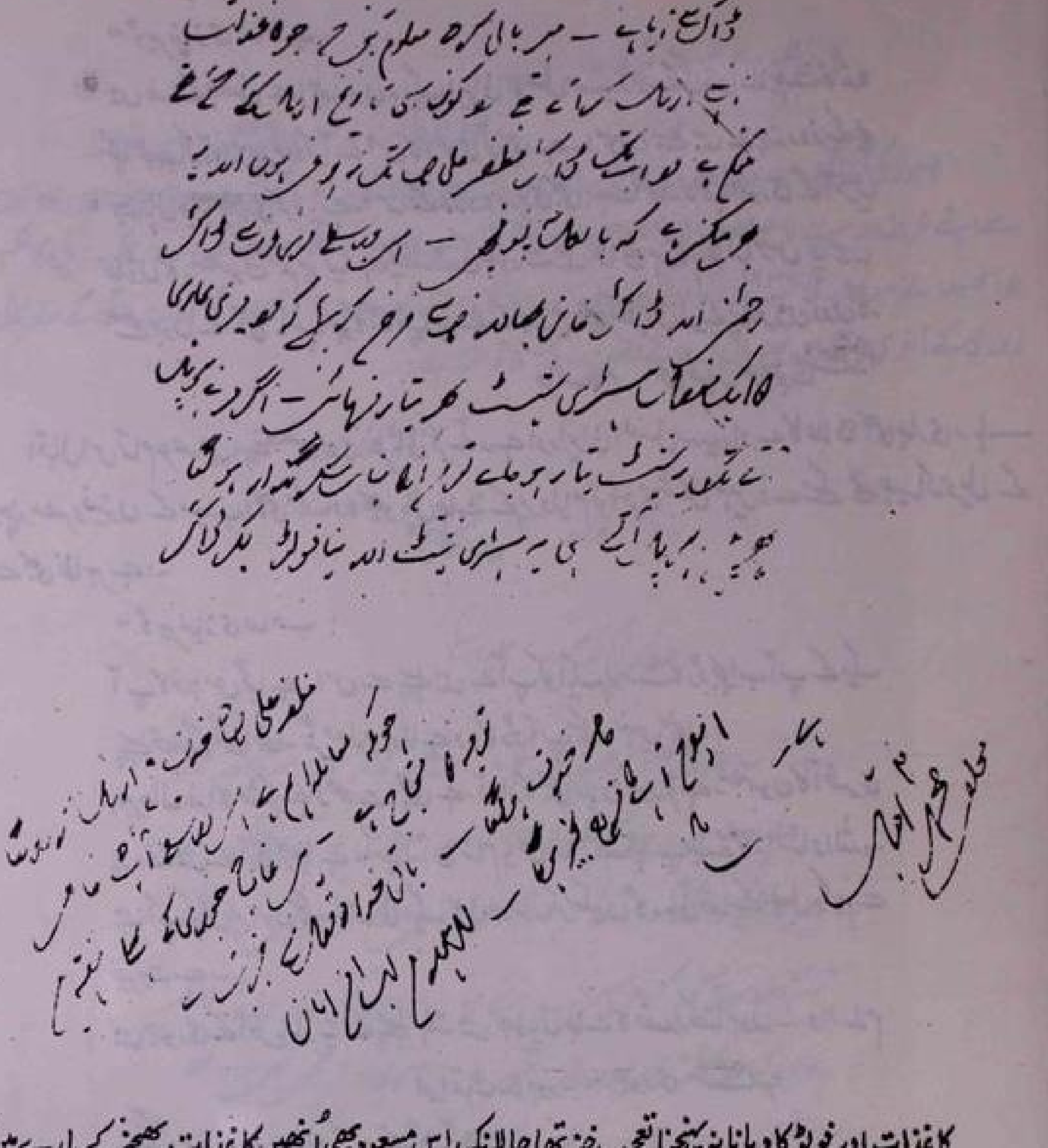

کاغذات اور فوٹو کا دیا نانہ پہنچنا تعجب خیز تھا حالانکہ راس مسعود بھی اُنھیں کاغذات بھیجنے کے بارے میں لکھ چکے تھے اور ڈاکٹر عبدالباسط بھی۔ بہرطور اب تو اقبال کے بھوپال پہنچنے کے بعد ہی ان کی دوبارہ ترسیل ممکن تھی۔ وہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں بھوپال جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اسی عرصہ میں مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے مذہبی اور سیاسی جھگڑے نے نازک صورت اختیار کر لی جس سے پنجاب کی فضا کافی مکدر ہو گئی۔ اقبال نے ختم نبوت پر جو بیان دیا تھا وہ ہر اعتبار سے جامع اور مکمل تھا لیکن پنڈت نہرو نے اس بیان پر دیدہ و دانستہ ایک ایسا بیان دیا جس سے نہ صرف اقبال کے نظریات پر ضرب پڑتی تھی بلکہ جو اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کو بھی ظاہر کرتا تھا۔ چنانچہ اقبال نے اس کی وضاحت کو ضروری سمجھا اور جوابی بیان لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران ایک ایرانی النسل سید زادے (جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا) کا اُنھوں نے علاج شروع کر دیا جس سے انھیں خاصا فائدہ ہوا۔ چنانچہ بھوپال جانے کا پروگرام انھوں نے فی الوقت ملتوی کر دیا جیسا کہ نذیر نیازی کے نام ۳ر جنوری ۱۹۳۶ء کے اس خط سے ظاہر ہے:۔

"ڈیر نیازی صاحب۔

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ایک ایرانی الاصل سید زادے کی دوا نے بہت فائدہ کیا عجب کہ آواز پھر عود کر آئے اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ اسی واسطے میں نے چند روز کے لیے بھوپال جانا ملتوی کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ سردی بھی بہت تھی۔ غالباً جنوری کے آخر میں جاؤں گا۔ مضمون[1] ختم ہو گیا ہے پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوگا۔ غالباً تیس چالیس صفحے ہوں گے۔ آج ٹائپ ہوگا۔ ٹائپ ہونے کے بعد میں پھر نظر ثانی کر کے پریس میں دوں گا۔

والسلام محمد اقبال ۳ر جنوری ۱۹۳۶ء[2]

اقبال اس تمام عرصہ میں اپنے مضمون پر نظر ثانی کرتے رہے اور ایرانی النسل سید زادے کا علاج بھی جاری رہا۔۔۔ چند در چند مصروفیتوں کے سبب ابھی تک وہ بھوپال جانے کے پروگرام کو آخری شکل نہیں دے سکے تھے جیساکہ ذیل کے خط سے بھی ظاہر ہے:۔

"ڈیر نیازی صاحب!

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو ایک پوسٹ کارڈ بجواب آپ کے ایک پہلے خط کے لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے وہ کارڈ آپ تک نہیں پہنچا۔

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ صحت اچھی ہے۔ آواز کا بھی علاج ہو رہا ہے۔ مضمون کا آخری پروف میں نے آج بھیجا ہے۔ اُمید کہ آج شام یا کل شام تک چھپ جائے گا۔ انشاء اللہ۔ میں آپ کو کل پرسوں تک اس کی ایک کاپی ارسال کر سکوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

میں جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتہ میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں۔۔۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۳۶ء

راجہ[3] صاحب سے سلام کہہ دیجیے گا[4]"

انگریزی مضمون حسب توقع شائع ہو گیا اور نیازی صاحب نے اُس کا اُردو ترجمہ شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں ایک اصطلاح زیرِ بحث آ گئی اور نیازی صاحب نے ان سے دریافت کیا جس کے جواب میں انھوں نے وضاحت فرما دی اور بھوپال جانے کے پروگرام سے بھی اُنھیں مطلع کر دیا۔

"ڈیر نیازی صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میرا حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے۔ انشاء اللہ وسط فروری میں بھوپال جانے کا قصد ہے۔ Major Occultation

---

[1] یہ مضمون بعد میں "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔

[2] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۱۵

[3] مراد راجہ حسن اختر جو ان دنوں دہلی میں میرے ہاں مقیم تھے۔ (نیازی)

[4] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۱۵۔ ۳۱۶

کا ترجمہ ہے غیبتِ کبریٰ۔

محمد اقبال۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۳۶ء لاہور[1]"

لاہور کی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ ساتھ بھوپال سے اُن کا قلمی ربط و تعلق بدستور قایم تھا اور وہ وقفہ وقفہ سے اپنے عزیز دوست راس مسعود اور خصوصی معالج ڈاکٹر سید عبد الباسط کو خط برابر لکھ رہے تھے۔ ذیل کا عکسی خط جو انھوں نے ۸ر فروری ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر سید عبد الباسط کو ارسال کیا ہے۔ راس مسعود کی علالت، اُن کے سفر کلکتہ اور فروری کے آخری ہفتہ میں بھوپال آنے کے قصد پر روشنی ڈالتا ہے:۔

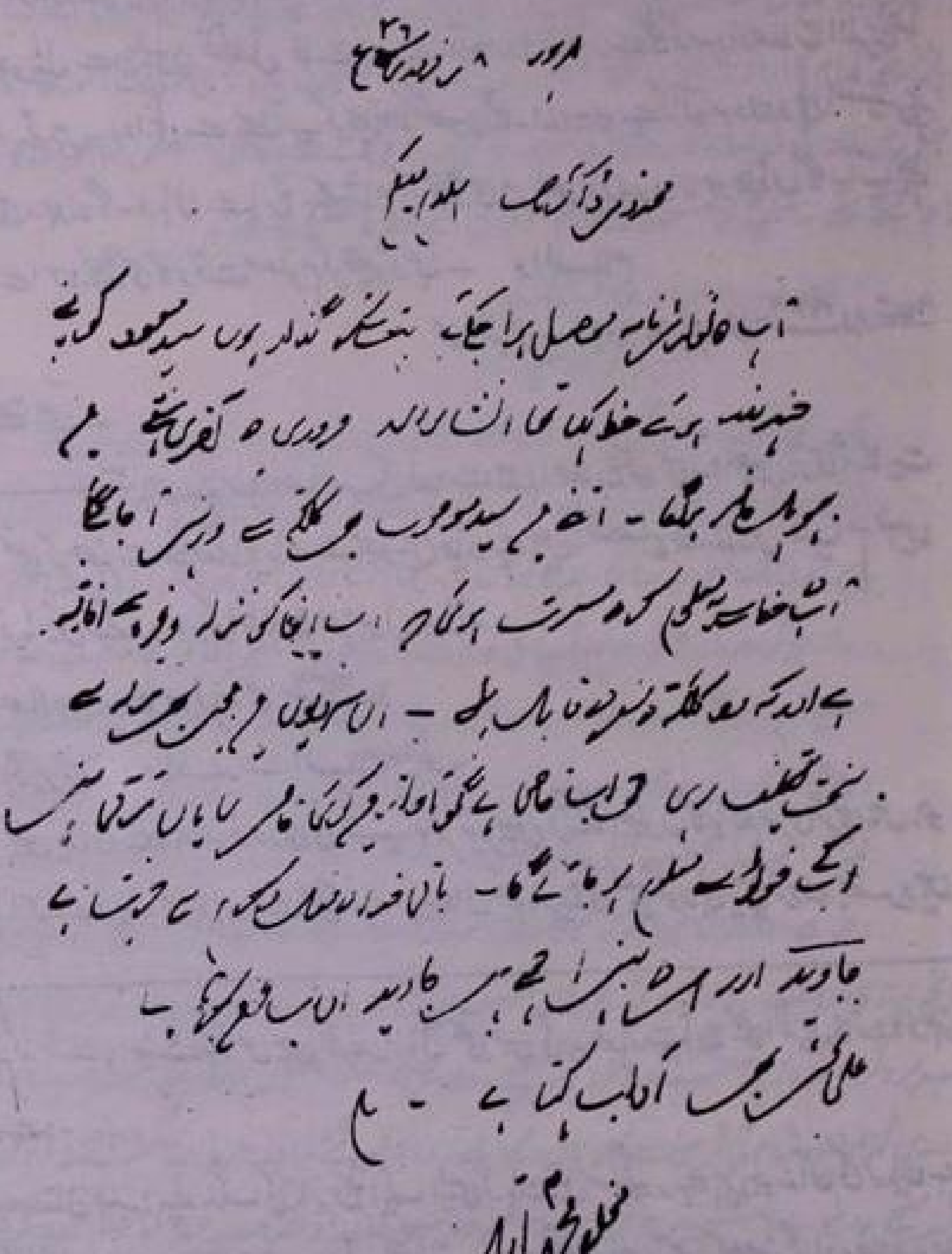

لاہور ۸ فروری ۳۶ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

[illegible]

محمد اقبال

---

[1] کلکتہ کا سفر۔ دراصل تعلیمی کانفرنس میں شرکت سے متعلق تھا جہاں راس مسعود نے ۔ر فروری ۱۹۳۶ء کو (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

نزلہ کی موسمی شکایات کے علاوہ اقبال کی عام صحت رو بہ ترقی تھی اور وہ فروری کے آخری ہفتہ میں بھوپال جانے اور بجلی کا مزید علاج کرانے کا پروگرام بنا چکے تھے جیسا کہ مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہے۔

۱۲ر اور ۱۵ر فروری ۱۹۳۶ء کے خطوط میں انھوں نے نذیر نیازی کو بھی بھوپال کے پروگرام سے مطلع کر دیا:

"میں فروری کے آخری ہفتہ میں بھوپال کا قصد رکھتا ہوں[لے]"

بالآخر بھوپال جانے کا پروگرام طے ہو گیا تو انھوں نے نیازی صاحب کو اطلاع دی:-

"ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں۔ ۲۸ر فروری یا یکم مارچ کو بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔ جاتی دفعہ دہلی نہ ٹھہروں گا۔ انشاءاللہ بھوپال سے واپسی پر قنصل خانے میں ایک آدھ روز قیام رہے گا کہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں۔ روانگی سے پہلے آپ کو پھر خط لکھوں گا۔ ارادہ یہ ہے کہ تمام دن دہلی اسٹیشن پر ہی رہوں گا۔ وہاں سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ پہلے سے اس گاڑی کا وقت معلوم کر چھوڑیں۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور ۱۹ر فروری ۱۹۳۶ء[لے]"

نیازی صاحب لکھتے ہیں:-

"۔۔۔۔۔۔ میں نے سردار صاحب کی خدمت میں اطلاع کر دی۔ انھیں بڑی شکایت تھی کہ حضرت علامہ براہِ راست بھوپال جا رہے ہیں۔ قنصل خانے میں قیام نہیں فرمائیں گے۔ ۲۶ر کو اطلاع موصول ہوئی۔

معہ لاہور ۔ ۲۵ر فروری ۱۹۳۶ء

ڈیر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم۔

میں یہاں سے ۲۹ر فروری کی شب کو فرنٹیر میل (سے[سے]) چلوں گا یا دوسری ٹرین میں جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دن بھر وہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سینٹ ہاؤس میں تقریر فرمائی تھی جس کی یہ عبارت آج بھی انگریزی زدہ ذہنوں کے لیے تازیانہ کی حیثیت رکھتی ہے:-

"ہندوستانی طلبہ اپنے ملک کی تاریخ ایک ایسی زبان میں سیکھ رہے ہیں جو نہ اُن کی زبان ہے نہ اُستاد کی۔ کیا کوئی بات اس سے بھی زیادہ مہمل ہو سکتی ہے؟ جو تعلیم اس قسم کے مصنوعی اور خلاف فطرت ماحول میں حاصل کی جائے وہ ہرگز قوم کے لیے ایک حیات بخش قوت نہیں بن سکتی ہے"

لے مرقع مسعود ۔ صفحہ ۱۸

لے اقتباس مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۱ و ۳۲۴

لے مکتوبات اقبال ۔ صفحہ ۳۲۵

سے "سے" سہواً رہ گیا۔

قیام کروں گا۔ ۴-۵ بجے بعد دوپہر جو ٹرین دہلی سے بھوپال کی طرف جاتی ہے۔ اس میں سوار ہو کر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا۔ اطلاعاً گذارش ہے۔ والسلام

محمد اقبال [1]"

نیازی صاحب کو بھوپال کی روانگی کے پروگرام سے مطلع کرنے کے علاوہ انھوں نے بیگم راس مسعود کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ ۲۹ فروری کو لاہور سے روانہ ہو رہے ہیں جیسا کہ اس خط سے معلوم ہوتا ہے۔ اس خط میں راس مسعود کو کئی خط لکھنے اور ان کے جواب نہ دینے کا شکوہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز ڈاکٹر سید عبدالباسط کو خط بھیجنے کا تذکرہ بھی ہے اور شعیب صاحب کو آمد کے پروگرام سے مطلع کرنے کا اظہار بھی۔ اس خط میں بیگم راس مسعود کی چند فرمائشوں کا ذکر بھی ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم راس مسعود بھی اقبال کو خط لکھتی رہتی تھیں۔ افسوس کہ سعی و تلاش کے باوجود بیگم راس مسعود اور اقبال کے خطوط دستیاب نہ ہو سکے۔ اسی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بار وہ ایک ماہ سے زیادہ بھوپال میں قیام کا ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ ایسٹر کی تعطیلوں میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا جس میں ان کی شرکت اور موجودگی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ بھی "بعض خاص حالات" کی بناء پر وہ جلد لاہور لوٹنا چاہتے تھے۔ "لیڈی مسعود کے نام" اقبال کے خط کا متن یہ ہے۔

"لاہور — ۲۵ فروری ۱۹۳۶ء

ڈیر بیگم صاحبہ۔

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ نان خطائی کے لیے تو میں نے کئی دن سے کہہ رکھا ہے۔ انشاءاللہ ۲۷ تک امرتسر سے تیار ہو کر آ جائے گی۔ قصور کی میتھی بھی اُمید [2] ہے کل تک یا پرسوں تک مل جائے گی۔ ہمراہ لاؤں گا۔ میں انشاءاللہ العزیز ۲۹ فروری شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲ مارچ کی دوپہر آپ کی خدمت میں پہنچوں گا۔ مہربانی کر کے شعیب صاحب کو مطلع کر دیجیے گا۔ مسعود صاحب سے بھی سلام کہیے۔ اُنھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ آج ڈاکٹر عبدالباسط صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ اب ایک ماہ سے زیادہ نہ ٹھیر سکوں گا کیونکہ ایسٹر کی تعطیلوں میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہے اور بعض خاص حالات کی وجہ سے ان دنوں میرا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ محمد اقبال [3]"

چنانچہ نیازی صاحب کے علاوہ لیڈی راس مسعود، ڈاکٹر عبدالباسط اور دیگر احباب اور نیازمندوں کو خطوط لکھنے کے بعد وہ حسب پروگرام یکم مارچ ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے۔ دن کا کچھ حصہ اسٹیشن پر اور کچھ وقت سردار صلاح الدین کی معیت میں قونصل خانے میں گذارا اور شام کی ٹرین سے بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو تیسری بار بسلسلہ علاج و قیام بھوپال پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر راس مسعود، ممنون حسن خاں، ڈاکٹر سید عبدالباسط اور دیگر نیازمندوں نے اُن کا استقبال کیا اور انھیں سرکاری قیام گاہ شیش محل لے گئے جسے دوسری بار شاعر مشرق کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔!

---

[1] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۵-۳۲۶

[2] ہے، سہواً رہ گیا

[3] اقبال نامہ۔ (جلد اول) صفحہ ۳۹۰-۳۹۱

بھوپال کا تیسرا قیام

۲ر مارچ تا ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء

شیش محل کی ویران فضا ایک بار پھر اقبال اور اُن کے نیاز مندوں سے آباد ہو گئی۔ بھوپال میں اُن کا یہ تیسرا اور آخری قیام تھا۔ اگرچہ بعض خطوط میں انھوں نے پھر بھوپال جانے کا تذکرہ کیا ہے لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

اس قیام کے دوران سب سے پہلے تو اُنھوں نے اپنے علاج پر توجہ مبذول کی۔ ڈاکٹر رحمن، ڈاکٹر باسط وغیرہ نے اُن کا تفصیلی معائنہ کیا اور بجلی کے علاج کا تیسرا کورس شروع ہو گیا۔ اس بار اُن کی عام صحت نسبتاً بہتر تھی۔

راس مسعود اور دیگر نیاز مندان بھوپال کو اقبال کے اس قیام سے پھر ایک بار قرب و استفادہ کا موقع مل گیا۔ عبدالحیٔ کا کہنا ہے کہ صبح کا بیشتر وقت حمیدیہ اسپتال کی نذر ہو جاتا تھا جہاں بڑی توجہ سے اُن کے علاج کا تیسرا کورس شروع ہو گیا تھا۔ دوپہر میں آپ آرام و مطالعہ فرماتے۔ آپ کا دیرینہ ملازم علی بخش آپ کے اس سفر میں بھی ہمراہ تھا۔ اس کے علاوہ سرکاری طور پر بھی کئی ملازمین اقبال کی خدمت، خبر گیری اور دیکھ بھال پر متعین تھے۔ ریاست کی طرف سے سواری (موٹر) وغیرہ کا بھی انتظام تھا اور علاج معالجہ کا بھی۔ سہ پہر کو آپ اکثر ہوا خوری کے لیے۔ کبھی شملہ پہاڑی، کبھی لملاپتی پارک[۱]، کبھی یادگار شاہجہانی[۲] تشریف لے جاتے۔ والد صاحب اکثر آپ کے ہمراہ جاتے۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ ہو لیتا۔ شام کو راس مسعود خود اقبال کی قیام گاہ پر یا اقبال راس مسعود کے دولت کدہ (ریاض منزل) پر تشریف لے جاتے رات۔ نو دس بجے تک راس مسعود، بیگم راس مسعود کی معیت میں دلچسپ موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی دیگر عمائد شہر بھی وہاں آ جاتے تو محفل گرم ہو جاتی۔ اکثر و بیشتر جو موضوع زیر بحث رہتا وہ اسلام کی عظمت، سلاطین اسلام کے کارناموں، ہندوستان کے مسلمانوں کی ابتری، انگریزی تسلط کے خاتمہ کی تدابیر اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی پر مبنی ہوتا تھا۔ اقبال کو ان دنوں سب سے زیادہ جس مسئلے سے دلچسپی تھی وہ ملتِ اسلامیہ اور تقسیم ملک کے مسئلے تھے اور سچ پوچھیے تو یہی مسئلے آگے چل کر تحریک پاکستان کی اساس قرار پائے۔ اور نواب حمیداللہ خاں جو اقبال کے الفاظ میں ؎

حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو\
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

۱-۲-۳ بھوپال کی مشہور اور دل آویز تفریح گاہیں۔

کی مجسم تفسیر تھے۔ تقسیم ہند کے سخت و عظیم مرحلے کے دوران قائداعظمؒ کے دست راست ثابت ہوئے اور بالآخر اس دستاویز پر انھوں نے گاندھی جی کے دستخط کرائے جس کی رو سے مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا۔ اور اس طرح پاکستان کا قیام عمل میں آسکا۔

مجھے اُس دستاویز کی مدت سے تلاش تھی جس پر قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی جانب سے اور گاندھی جی نے کانگریس کے نمایندہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔ نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کی صاحبزادی اور ولیعہد ریاست شہزادی عابدہ سلطان اگرچہ ملیر (کراچی) ہی میں سکونت پذیر ہیں لیکن تقریباً دو سال تک سعی و کوشش کے باوجود اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بالآخر ۱۶ر جولائی ۱۹۶۸ء کو بہ معیت جناب حسن عزیز جاوید مجھے شرف باریابی مل گیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اس تاریخی دستاویز کا کھوج لگایا بلکہ نواب صاحب اور اقبال سے متعلق بھی بعض ایسے واقعات دریافت کر لیے جن کا علم اس سے پہلے کسی کو نہ تھا۔ اس انٹرویو کی تفصیلات آیندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

بات کچھ دور جا پڑی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے باہمی روابط کے ابھی کتنے ہی گوشے تاریکی میں ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب اس موضوع سے محققین کی دانستہ یا نادانستہ بے تعلقی یا عدم دلچسپی رہی۔ پھر چالیس سال سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے باعث کتنی ہی متعلقہ اور اہم شخصیتیں ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اس طرح علم و آگہی اور تحقیق و تلاش کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور دنیا اقبال، نواب حمید اللہ خاں، بھوپال اور راس مسعود کے قریبی اور خصوصی تعلقات اور کتنے ہی مستند واقعات سے آج تک لاعلم ہے۔

بھوپال آتے ہی اقبال نے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع سب سے پہلے نیازی صاحب کو دی۔ اُنھیں نیازی صاحب کے رسالہ "طلوعِ اسلام" سے خصوصی دلچسپی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ رسالہ زندہ رہ کر اور مالی اعتبار سے مستحکم ہو کر ملک و قوم کی بیش از بیش خدمت کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے راس مسعود سے اس کا تذکرہ کیا اور سرکاری امداد کے لیے بھی اُن سے گفتگو کی۔ خود بھی نواب صاحب سے اس رسالہ کا تذکرہ کرنے کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں:۔

"بھوپال ــــ شیش محل۔ ۳ر مارچ[1]

"ڈیر نیازی صاحب۔

میں کل مع الخیر بھوپال پہنچ گیا۔ سید راس مسعود کے پاس کوئی نمبر طلوع اسلام کا آج تک نہیں پہنچا۔ ان کے نام تمام نمبر فوراً بھجوا دیجیے۔ مزید کوشش بھی کی جائے گی۔ سید صاحب کا نام بھی اپنے خریداروں میں لکھ لیجیے۔ میں نے ان سے آپ کی مدد کا وعدہ لے لیا ہے اور اعلیٰ حضرت سے خود بھی کہوں گا۔ افغانستان والے معاملے کو بھی Pursue کرنا چاہیے۔

باقی ہر معاملے میں خدا پر بھروسہ رکھنا مسلمان کا کام ہے۔ محمد اقبال[2]"

اس خط سے اقبال کی دردمندی کا اظہار ہی نہیں ہوتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قومی کارکنوں اور ملت کے

---

[1] "۱۹۳۶ء" سہواً رہ گیا۔

[2] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۲۶

خدمت گذاروں کی کتنی حوصلہ افزائی اور عملی ہمدردی کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔

اس خط کے بعد ۸ رمارچ کو انھوں نے پھر نیازی صاحب کو قدرے تفصیلی خط ارسال کیا جس میں عرض داشت کے مضمون وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس خط میں نواب صاحب بھوپال کے بارے میں اُن کی یہ گراں قدر رائے تھی۔

"اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والا صفات کے اور کون ہے؟"

اس سے واضح طور پر نواب صاحب کے ساتھ اُن کے دلی تعلقات اور جذبات محبت وعقیدت کی نشاں دہی ہوتی ہے۔ انھوں نے جس محبت سے نواب صاحب کے نام عرض داشت کے لیے یہ جملہ نیازی صاحب کو لکھ کر بھیجا ہے اُس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اُس وقت بلا خوفِ تردید۔ نواب حمید اللہ خاں کے سوا پورے ہندوستان میں واقعی کوئی ایسی دردمند، صاحبِ دل اور صاحبِ نظر شخصیت موجود نہیں تھی۔ "طلوعِ اسلام" کا مقصد جیسا کہ نیازی صاحب نے بھی لکھا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی ذہنی اور فکری تعمیر تھا۔ اور اقبال کو اس مقصد سے گہری وابستگی تھی چنانچہ وہ نیازی صاحب کی ممکنہ امداد بھی ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"بھوپال ــ ۸ رمارچ ۱۹۳۶ء

"ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم۔

اُمید ہے یہ خط آپ کو دہلی میں مل جائے گا۔ آپ ایک عرض داشت اعلیٰ حضرت کے نام رسالہ طلوع اسلام کی مدد کے لیے لکھیے۔ اور تینوں رسالے بھی ان کے نام ارسال کر دیجیے عرض داشت میں رسالہ کے اغراض ومقاصد اور اس کا نصب العین عمدہ الفاظ میں بیان کیجیے۔ نیز یہ بھی لکھیے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اداروں اور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والا صفات کے اور کون ہے ــ؟ یہ عرض داشت میرے نام ارسال کیجیے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ کر سید راس مسعود کے پاس بھیج دوں۔ والسلام محمد اقبال[1]"

اس خط کے سلسلے میں نیازی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اعلیٰ حضرت سے کس بناء پر "طلوع اسلام" کی امداد کے لیے درخواست کروں؟۔ عرض داشت کا مضمون بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ احباب سے ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا کہ یہ درباری کے معاملات ہیں۔ تم ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکو گے۔ ویسے حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔

بہر حال جوں توں کر کے ایک عرض داشت مرتب کی۔ لیکن گھر بار چونکہ لاہور منتقل ہو رہا تھا لہٰذا اس کی ترسیل میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ آخر مارچ میں، میں لاہور منتقل ہو گیا۔

ـــــ حضرت علامہ نے مجھے خاموش پایا تو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ کو خط لکھا۔ حضرت علامہ کو "طلوعِ اسلام" اور میرے مستقبل کا کس قدر خیال تھا۔

---

[1] مکتوبات اقبال ــ صفحہ ۳۲۷

ارشاد ہوا ہے :

" بھوپال ـــ ۲۸ مارچ ۱۹۳۶ء

ڈیر سلامت اللہ شاہ صاحب ۔

معلوم نہیں نیازی صاحب لاہور پہنچے یا نہ پہنچے ۔ میں نے جو خط ان کو لکھا تھا اس کا کوئی جواب انھوں نے نہیں دیا ۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ طلوع اسلام کی مدد کے لیے ایک عرض داشت اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کے نام لکھ کر میرے نام فوراً ارسال کردیں، عرض داشت کا مضمون بھی میں نے اس خط میں لکھ کر دیا تھا ۔ وہ اب تک خاموش ہیں ۔ اگر انھوں نے تساہل کیا تو معاملہ دوسرے سال پر پڑ جائے گا، اس وقت بجٹ تیار ہو رہا ہے ۔ اگر وہ فوراً عرض داشت بھیج دیں تو کام اسی سال ہو جائے گا ۔ جہاں کہیں بھی ہوں ان کو تاکید کردیں ۔ عرض داشت میں اعلیٰ حضرت کو ایڈریس کیا جائے اور میرے پاس بھیجا جائے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ سکوں ۔ والسلام

محمد اقبال[1] "

اقبال کو اپنے معاصرین، اہل علم، خدمت گذارانِ ملت اور اپنے نیازمندوں کی سود و بہبود، امداد و اعانت اور فلاح و صلاح کا کتنا خیال رہتا تھا ان خطوط سے اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے ۔

بھوپال کے قیام کے دوران ـــ اپنے نیازمندوں، دوستوں اور رفیقوں کو خطوط کے جوابات پابندی سے لکھنا بھی اُن کا ایک محبوب مشغلہ تھا ۔ کہاں کہاں کے ضرورت مند انھیں لاہور ـ حتیٰ کہ مختصر قیام کے دوران بھوپال تک خطوط بھیجتے جن کے وہ فوراً جوابات ارسال کرتے ۔ ایسے ہی ایک صاحب علم سید احمد عباس تھے جن کا شمار شرفائے عرب میں ہوتا تھا اور روضۂ حضور رسالت مآبؐ کے محافظ تھے ۔ وہ اقبال سے مدد کے طالب ہوئے اور انھیں اپنے حالات سے مطلع کر کے نواب صاحب تک پہنچنے اور ریاست کی سرپرستی حاصل کرنے کی خواہش کی تو شیش محل ہی سے انھوں نے ایک خط راس مسعود کو بطور تعارف تحریر کر دیا ۔

اس خط میں جن امور کا تذکرہ ہے ـ وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں ـ ہاں اقبال کی عظمت اور اُن کی دردمندی کے ضرور شاہد ہیں :ـ

ـــــ " ڈیر مسعود ـ ملفوفہ خط سید احمد عباس کا ہے جو مدینہ منورہ میں روضۂ حضور رسالت مآبؐ کے محافظ ہیں ـ میں نے پہلے بھی تم سے ان کا ذکر کیا تھا ـ نہایت عمدہ سفرنامہ ہندوستان کا لکھ رہے ہیں ـ عربی زبان کے ادیب ہیں اور شرفائے عرب میں اُن کا خاندان بلند مرتبت ہے ـ یہ خط ہز ہائی نس کی خدمت میں بھجوا دیجیے ـ چونکہ ان کو یہاں کے دستور کا علم نہیں اس واسطے انھوں نے اپنا خط میرے خط میں ملفوف کر دیا ہے ـ اگر اعلیٰ حضرت نے ان کو اجازت دی تو یہاں آئیں گے ـ پٹیالہ نے ان کی بڑی قدر افزائی کی اور بڑی خاطر مدارات[2]

---

[1] مکتوبات اقبال ـ صفحہ ۳۲ ـ ۳۲۸

[2] مکتوبات اقبال ـ صفحہ ۳۲۸ ـ ۳۲۹

کی ۔ اگر وہ آئیں تو تم بھی ان کو دعوت دینا اور کرنل رابنس سے بھی تو مجھے ملا دیجیے۔
تم کہتے تھے کہ وہ اب یہاں سے چلے جانے والے ہیں۔ والسلام
محمد اقبال۔ شیش محل۔ ۱ر مارچ ۱۹۳۶ء[1]"

(یہ خط بھوپال ہی میں لکھا گیا)

اہل علم وکمال کی عزت وتکریم اور اُن کی بجا قدردانی کا جذبہ اقبال کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔ وہ سعی وسفارش بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کرتے تھے۔ بھوپال سے اُن کی گہری وابستگی، نواب صاحب سے قربت اور راس مسعود ایسے سچے شیدائی کے ہوتے ہوئے اُنھیں اہلِ ضرورت کو متعارف کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ تھا۔ جیسا کہ اس خط کی عبارت سے مترشح ہے۔

(یہ) عربی زبان کے ادیب ہیں اور شرفائے عرب میں ان کا خاندان بلند مرتبت ہے۔
اگر وہ آئیں تو تم بھی ان کو دعوت دینا ———"

غرض وہ کسی بھی مستحق اور ضرورت مند کو پریشاں حال نہیں دیکھ سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی عنوان اُس کے کام آجائیں ۔ نیازی صاحب نے لاہور پہنچ کر جب نواب صاحب بھوپال کے نام عرض داشت ارسال کردی تو انھوں نے فوراً جواب دیا:۔

" بھوپال ——۳۱ر مارچ ۱۹۳۶ء

"ڈیر نیازی صاحب ۔ السلام علیکم
آپ کی عرض داشت پہنچ گئی ہے۔ میں انشاء اللہ ۹ر اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے ۔ والسلام
محمد اقبال ۔ بھوپال[2]"

پروگرام کے مطابق ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء کو اقبال بھوپال سے روانہ ہوکر ۹ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور واپس پہنچ گئے۔ نیازی صاحب خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنھیں پہلے سے کافی صحت مند پایا۔ فرماتے ہیں:۔

"——— ۹[3]ر اپریل کو حضرت علامہ واپس لاہور تشریف لائے۔ معلوم ہوتا تھا بھوپال کا قیام ان کی صحت کے لیے بہت اچھا رہا۔ آواز کی حالت بھی بہتر ہوگئی تھی اور چہرے پر بھی تندرستی کے آثار نمایاں تھے[4]"

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول)، صفحہ ۳۷۶ - ۳۷۷

[2] مکتوبات اقبال - صفحہ ۳۲۹

[3] اقبال ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال سے روانہ ہوکر ۹ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے ہیں جیسا کہ نیازی صاحب کے اس بیان اور اقبال کے ۳۱ر مارچ ۱۹۳۶ء کے خط سے ثابت ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی کتاب " اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" کے صفحہ ۴۶۲ پر لکھا ہے۔ " ۹ر اپریل ۱۹۳۶ء تک شیش محل میں ٹھہرے"۔ اسی غلطی کا اعادہ عبدالقوی دسنوی نے اپنے کتابچہ " علامہ اقبال بھوپال میں" بھی کیا ہے۔ صفحہ ۷۰ پر درج ہے " تیسری مرتبہ (قیام) ۲ر مارچ ۱۹۳۶ء سے ۹ر اپریل ۱۹۳۶ء تک" حالانکہ وہ ۹ر کو لاہور پہنچ چکے تھے۔

[4] مکتوبات اقبال - صفحہ ۳۲۹

نیازی صاحب کے اس بیان کے پس پردہ ایک عجیب و غریب داستان کا انکشاف خود اقبال کے اُس خط سے ہوتا ہے جو لاہور پہنچنے کے دو ماہ بعد انھوں نے پروفیسر سلاح الدین محمد الیاس برنی کے نام ۱۳ / جون ۱۹۳۶ء کو لاہور سے ارسال کیا ہے۔ نیازی صاحب نے اقبال کو بھوپال سے لوٹ کر کافی صحت مند پایا۔ آواز میں بھی بہتری کے آثار تھے اور چہرے پر بھی تندرستی نمایاں تھی۔ اور یہ سب کچھ بھوپال کے دوران قیام۔ شیش محل ایسی تاریخ ساز عمارت میں ۳ / اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو وقوع پذیر ہوا۔ یہ وہ خواب تھا جو انھوں نے بھوپال میں دیکھا اور پھر ان کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" معرضِ وجود میں آئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ خط ملاحظہ ہو:۔

"لاہور ۱۳ / جون ۱۹۳۶ء

مخدومی پروفیسر صاحب۔ السلام علیکم۔

نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے نہایت شکرگذار ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو طب میں بھی دخل ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو ضرور آپ کی خدمت میں لکھتا۔

دو سال سے اوپر ہو گئے، جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سوّیاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بہدانہ پینے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے مجھے بالآخر بیرسٹری کا کام چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطبا دونوں کا علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی قدر دمہ کی شکایت ہو گئی۔ حکیم نابینا صاحب نے فرمایا کہ تمھاری بیماری ایک ہلکا سا دمہ ہے۔ کھانسی اس شدت سے آتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اب یہ کیفیت نہیں ہے۔ صبح بلغم نکلتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کھانا کھانے کے بعد بھی سفید بلغم نکلتی ہے۔ جس کے نکلنے سے آواز نسبتاً بہتر ہو جاتی ہے۔ انگریز اطبا کی تشخیص یہ ہے کہ ایک رگ جسے Aorta کہتے ہیں اور جو قلب کے قریب ہے ایک مقام سے پھیل گئی ہے اس کا دباؤ ووکل کارڈ پر پڑتا ہے جس کے سبب سے بولنے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کی تشخیص یہ بھی ہے کہ طویل بیماری سے قلب کی رگیں کمزور ہو گئی ہیں اس واسطے عام کمزوری ہو گئی ہے اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس میں Excitement پیدا ہو۔ ذرا سی محنت کرنے سے دم پھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غسل کرنے میں اپنے ہاتھوں سے اپنا بدن بھی اگر ملوں تو دم چڑھ جاتا ہے۔ عام کمزوری بھی ہے۔ یہ مختصر کیفیت میری بیماری کی ہے۔ اگر آپ کوئی دوا تجویز کریں گے تو ضرور مفید ہو گی۔ آپ عاشقانِ رسولؐ میں سے ہیں۔ اس واسطے ایک بات اور آپ کے گوش گذار کرنے کے لائق ہے۔

۳ / اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سیّد علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو؟ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گذر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ

اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر جواب طویل ہو گئی ہے میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہو گی۔ ۴ر اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رِنگ (Ring) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ جسم میں بھی عام کمزوری ہے زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمد اقبال[1]"

سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھنے کا تذکرہ انھوں نے سر راس مسعود کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے۔ جو کتاب کی تکمیل کے دوران ۔ انجمن ترقی اُردو کراچی کے ترجمان ماہنامہ 'قومی زبان' میں اشاعت پذیر ہوا۔ خط کے آغاز میں انھوں نے "ضرب کلیم" کا تذکرہ بھی کیا ہے جس کی تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی گئی ہیں۔ خط کا متن یہ ہے :-

"لاہور ــــ ۲۹ر جولائی ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود۔ تمھارا خط ابھی ملا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اب خدا کے فضل و کرم سے بالکل اچھے ہو کیونکہ خط میں تم نے اپنی صحت کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ ضرب کلیم یا اعلانِ جنگ زمانہ حاضر کے خلاف، افسوس کہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ یہ میرا قصور نہیں پریس کا قصور ہے۔ اب چار جولائی کو کتاب کی طباعت ختم ہو گئی تو ـــــ Advance کاپی ارسال کر دوں گا۔ ۳ر اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمھارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمد للہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اس کا نام ہو گا "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" ضرب کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ تم اپنی خیریت سے اطلاع دو۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ علی بخش تم دونوں کو آداب عرض کرتا ہے۔ محمد اقبال[2]"

ان خطوط کے دو بہت نمایاں پہلو ہیں۔ پہلا اُن کی علالت کی ابتدا اور اس کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ دوسرا اُس خواب سے متعلق ہے جس کے زیر اثر۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ایسی معرکہ آرا مثنوی کی تخلیق کا بھوپال میں آغاز ہوا۔ اقبال کی کون سی تخلیق۔ کب، کہاں اور کن حالات میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس کے بارے میں تو اقبالیات کے

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۴

[2] ماہنامہ "قومی زبان"۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۳۱-۳۲

ماہرین ہی بجا طور پر تحقیق کرکے پر تخلیق کے پس منظر کو اُجاگر کریں گے۔ جہاں تک اس مثنوی کا تعلق ہے۔ خود اقبال کی تحریر سے ہمیں اس کی شہادت مل گئی اور یہ علم ہوا کہ خواب سے آنکھ کھلتے ہی اُن پر ایک الہامی کیفیت طاری ہوگئی اور حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے اشعار اُن کی زبان پر جاری ہوگئے۔ اس عالم میں انھوں نے کتنے شعر لکھے اس کا اندازہ اس خط سے نہیں ہوتا۔ اس عبارت سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ مثنوی طویل ہوگئی تھی۔

اسی مثنوی سے متعلق جس کا ۳ راپریل ۱۹۳۶ء کی شب کو شیش محل۔ بھوپال کے قیام کے دوران آغاز ہوچکا تھا۔ ایک اور عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف فقیر وحید الدین نے اپنی کتاب روزگار فقیر میں کیا ہے۔ ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے کسی طور علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ کچھ یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں :۔

پانچ سو آدمی

"ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم جس زمانہ میں انار کلی کے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے، انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے صرف واقعہ سمجھ کر سُن لینا اور پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ خود مرحوم کے اس شعر کے پس منظر میں کہ ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اس پر جتنا غور کیا جائے، ذہن و فکر کو نئی لذت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور شعور و احساس کی دنیا وجدان و وارداتِ قلبی کی آئینہ دار بن جاتی ہے یہ واقعہ شاعرِ مشرق کی شعر گوئی کے سب سے نمایاں پہلو کو پیش کرتا ہے۔ یہ سرسری طور پر گذر جانے کا نہیں، ٹھہرنے، غور کرنے اور لطف لینے کا مقام ہے۔

ہوا یوں کہ ایک بار رات گئے سوتے سوتے علامہ مرحوم کی آنکھ کھُل گئی۔ دیکھا بلکہ محسوس کیا کہ قلب پر شعر گوئی کی وہ خاص کیفیت طاری ہے جس کا ذکر انہی صفحات میں اجمالاً آچکا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جسے شاعری کی زبان میں "آمد" سے تعبیر کیا جاتا ہے!

ڈاکٹر صاحب مکان کی دوسری منزل پر استراحت فرما تھے۔ پاس نہ کاغذ تھا نہ پنسل، چپ چاپ اُٹھے۔ لالٹین ہاتھ میں اُٹھائی اور سیڑھیوں سے قدرے تیزی کے ساتھ اُتر کر نچلی منزل میں پہنچے۔ لالٹین ایک طرف رکھ دی۔ کاغذ اور قلم سنبھالا اور جس قدر اشعار اُس وقت موزوں ہوتے گئے، اُنھیں قلم بند کرتے گئے۔ یہاں تک کہ نزولِ شعر کی یہ کیفیت اختتام کو پہنچی۔ اُنھوں نے بالائی منزل پر جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک سفید ریش، طویل قامت، درویش صفت بزرگ نظر آئے، ڈاکٹر صاحب نے حسرت و استعجاب کے انداز میں دریافت کیا۔ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ درویش نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے جلدی جلدی کہا:۔

"پانچ سو آدمی پیدا کر ـــــ پانچ سو آدمی پیدا کر"

یہ کہتے ہوئے وہ بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف بڑھتے گئے۔ حالانکہ اُس طرف کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لالٹین اٹھائی اور زینہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے جہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ کہا۔ چلیے میں آپ کو راستہ دکھاؤں اور نیچے تک لے چلوں، لیکن اُن مردِ بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کی اس پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنا وہی فقرہ اُسی جوش اور تاکید کے ساتھ دُہراتے ہوئے نظر سے اوجھل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب زینہ کی طرف سے سیڑھیاں طے کر کے بازار میں آئے اور دور تک دیکھا مگر بزرگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جیسے وہ ڈاکٹر صاحب سے اپنا یہ جملہ ہی کہنے کے لیے تشریف لائے تھے اور وہ جملہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ اس اثنار میں ڈاکٹر صاحب کو رات میں گشت کرنے والا کانسٹبل نظر آیا۔ اُس سے دریافت کیا کہ تم نے اس وضع قطع، چال ڈھال، اور حلیہ کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا۔ کانسٹبل نے نفی میں جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ آئے اور پھر بستر پر سو گئے۔ صبح کو جب بیدار ہوئے تو رات کا واقعہ ذہن میں بالکل تازہ تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ شاید اُنھوں نے خواب دیکھا ہے لیکن جب نچلی منزل میں آکر رات کے لکھے ہوئے اشعار موجود پائے اور قریب ہی لالٹین رکھنے کا نشان بھی اُبھرا ہوا تھا تو ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ وہ خواب تھا یا بیداری تھی۔ بہر حال جو حالت بھی تھی اس کا ایک حصہ حقیقت بن چکا ہے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر چند دن کے بعد ڈاکٹر صاحب موسم گرما کی تعطیلات میں جب سیالکوٹ تشریف لائے تو اپنے والد بزرگوار سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ شیخ اعجاز احمد اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے واقعہ سنانے کے بعد اپنے والد ماجد سے دریافت کیا کہ "پانچ سو آدمی تیار کرنے سے" اس درویش کی کیا مراد تھی؟ "تو انھوں نے فرمایا ـــ" پانچ سو آدمی پیدا کرنے" کی فرمایش، پھر اس پر تاکید، اس کا حقیقی مفہوم تو میں نہیں بتا سکتا مگر تم ـــ "پانچ سو آدمی تیار نہیں کر سکتے، تو پانچ سو آدمی تیار کرنے والی پانچ سو اشعار کی کتاب ہی لکھ دو"

اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر، قارئین کرام ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مشہور مثنوی ـــــ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا تصور کریں بلکہ اسے ایک بار پڑھیں۔ اس کے شعروں کی تعداد ۵۳۱ ہے۔ یعنی پانچ سو اشعار سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ! خاص طور پر ذکر کے قابل بات یہ ہے کہ اس مجموعۂ کلام کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے ؎

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را　　جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

باں مقام رسیدم، چو در برش کردم   طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرداست

عجیب اتفاق ہے کہ ابھی یہ کتاب زیر ترتیب ہی تھی کہ اچانک ماہنامہ 'افکار' کراچی کے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں مدیر افکار جناب صہبا لکھنوی کے بزرگ محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم کا ایک نہایت قیمتی مقالہ بعنوان — "پس چہ باید کرد" نظر آیا راقم الحروف نے اس مقالہ کو بار بار پڑھا اور پھر اس کا پس منظر معلوم کرنے کے لیے مدیر افکار سے رابطہ قایم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقالہ پروفیسر نواب علی نے سب سے پہلے ۱۹۳۵ء[۱] میں شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ اور "افکار" نے کسی پرانے حوالے سے ہی اسے ۱۹۶۲ء میں نذر قارئین کیا ہے۔ پروفیسر نواب علی درجنوں کتابوں کے مصنف اور ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ احباب میں سے تھے۔ قیام بھوپال کے دوران ڈاکٹر صاحب سے اُن کی طویل ملاقاتیں رہیں۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" سے متعلق اُن کا یہ مقالہ ظاہر ہے اُن کے اور ڈاکٹر صاحب کے مابین دوستانہ تبادلۂ خیال کا نتیجہ ہے اور ممکن ہے "پانچ سو اشعار" کے موضوع پر انھیں انارکلی والے واقعہ کا پس منظر معلوم ہو لیکن بدقسمتی سے پروفیسر نواب علی گذشتہ سال (۳۰ جون ۱۹۶۱ء کو) کراچی میں انتقال کر چکے ہیں اور اب اُن کے زیر نظر مقالہ کے علاوہ "پانچ سو اشعار" والی کتاب کے لیے مزید شہادت موجود نہیں۔

مرحوم نے اپنے اس خیال افروز مقالہ کی تمہید کے طور پر جو سطور قلم بند فرمائی ہیں۔ ان کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں :-

> "ڈاکٹر محمد اقبال نے وفات سے دو سال پیشتر مولانائے رومؒ کی شہرۂ آفاق مثنوی کی پیروی میں پانچ سو اشعار کی ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھی جو اُن کے افکار عالیہ کا ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔ مولوی معنوی کی مثنوی کی طرح اس میں بھی وہی جوش، وہی سوز اور وہی تخیل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زبانِ پہلوی کے "قرآن" کا سورۂ اخلاص ہے[۲]"

"پانچ سو آدمی پیدا کر" کے بیان کردہ اس واقعہ کے پس منظر میں اب آپ پھر اقبال کے ۳ اپریل ۱۹۳۶ء کے خط کے اقتباس کو پڑھیے:-

"۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید

---

[۱] سہو کتابت ہے۔ یہ مقالہ پہلی بار انجمن اتحاد۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ "جوہر" کے 'اقبال نمبر' میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس کے بعد صرف "افکار" میں شائع ہوا۔

[۲] روزگار فقیر۔ صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۹۔

علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گذر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر، جواب طویل ہوگئی ہے۔ میری زبان پر جاری ہوگئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہوگی۔"

تو بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ انار کلی والے مکان میں بزرگ کا آنا اور شیش محل میں سر سید کا خواب میں نظر آنا اور حضورؐ کی خدمت میں عرض داشت پیش کرنے کی ہدایت کرنا۔ پھر مثنوی کے اشعار کا زبان پر از خود جاری ہو جانا۔ حقیقتاً ایک ہی الہامی فکر کے دو مربوط سلسلے معلوم ہوتے ہیں جن کے تحت "پس چہ باید کرد" ایسی معرکہ آرا مثنوی عالم وجود میں آئی اور اس طرح بھوپال کو اُس کی تخلیق و آفرینش کا فخر بھی حاصل ہوگیا۔ مثنوی کے اس پس منظر پر اس سے قبل شاید ہی کسی نے غور و فکر کی ضرورت محسوس کی ہو۔ کیونکہ یہ واقعہ ایک ایسی دور افتادہ ریاست میں وقوع پذیر ہوا جس کے در و دیوار کسی دور میں اسلامی شکوہ کے امین سمجھے جاتے تھے اور جو آج بھی اپنی عظمتِ رفتہ پر نوحہ کناں ہیں۔

اقبال اور پروفیسر سید نواب علی کے باہمی روابط کا آغاز کب ہوا اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی البتہ جن حقایق کا راقم الحروف کو علم ہے ان سے دونوں کے قریبی تعلقات کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ ریاست بھوپال کے تقریباً سبھی حکمرانوں کو علم و ادب سے خاص شغف تھا اور ہندوستان بھر کی بلند پایہ شخصیتیں ریاست بھوپال کے حکمرانوں کی علم پروری اور ادبی شغف کے سبب کھنچ کھنچ کر یہاں آ گئی تھیں اور ممتاز عہدوں پر فائز تھیں۔ دوسرے معنوں میں بھوپال اُن کا وطن ثانی بن گیا تھا۔ میرے والد سید محمد علی وکیل (مرحوم) بھی نواب شاہ جہاں بیگم خلد آشیاں کے دور حکومت میں غالباً ۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر بھوپال آ گئے تھے اور پھر یہیں رہ پڑے۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کا شمار ممتاز ترین اور سربرآوردہ وکلاء میں ہونے لگا۔ پروفیسر سید نواب علی میرے والد کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بھی لکھنؤ میں حاصل کی۔ کیننگ کالج سے ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم سے وابستہ ہوگئے اور دو سال تک وہاں خدمات انجام دیں لیکن ۱۹۰۳ء میں بڑودہ کے علم دوست مہاراجہ گیکواڑ کے ایماء پر آپ وہاں چلے گئے اور بڑودہ کالج کے پروفیسر مقرر ہوگئے جہاں مسلسل ۲۶ سال تک آپ کا قیام رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مولانا محمد علی جوہرؔ بھی بڑودہ کے کم سن ولی عہد کے اتالیق مقرر ہو کر وہاں تشریف لے آئے اور سات سال تک آپ کا اور اُن کا ساتھ رہا اور دونوں ایک دوسرے کے ہمدم و رفیق رہے۔ پروفیسر سید نواب علی کی ساری عمر درس و تدریس، علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں گذری۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں آپ نے بلند مرتبت معاصرین کے دوش بدوش اپنے مخصوص و پسندیدہ موضوع۔ اسلامی تاریخ پر جو بیش بہا اور نادر روزگار کتابیں لکھیں۔ وہ آج بھی اسلامیات میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن معاصرین سے آپ کے ذاتی اور قریبی روابط رہے۔ جن اکابر سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، جن حضرات سے تبادلۂ خیال کے مواقع میسر آئے ان کی فہرست طویل ہے۔ پھر بھی جن مشاہیر کا آپ ہمیشہ خصوصیت سے ذکر فرماتے تھے اُن میں مولانا حالیؔ۔ علامہ شبلی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ۔ علامہ سلیمان ندوی۔ عطیہ فیضی۔ علامہ اقبالؔ۔ اکبر الہ آبادی۔

مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا ابوالکلام آزاد قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر نواب علی اور اقبال ایک ہی سال یعنی ۱۸۷۷ء[1] میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر دونوں میں فکری اور علمی مذاق تقریبًا یکساں تھا۔ قرآن مجید اور سیرت رسولؐ۔ دونوں ہی کے محبوب اور پسندیدہ موضوعات تھے۔ مولانا محمد علی کی فرمایش پر جامعہ ملیہ دہلی کے لیے آپ نے ایک مختصر سی کتاب "ہمارے نبیؐ" نہایت آسان زبان میں لکھی جس کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ "تذکرۃ المصطفےٰ" سیرت پر آپ کی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ معارج الدین المعروف بہ اسلام اور سائنس ۱۹۱۳ء میں چھپی جسے آپ نے علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کیا تو اُنھوں نے اس کی بے حد تعریف کی اور اس نوع کی مزید تحقیقی کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں بھی اس کتاب کا بطورِ خاص توصیفی انداز میں تذکرہ کیا۔ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار "ہمدرد" اور مولانا عبدالحلیم شرر نے رسالہ "دل گداز" میں اس پر سیر حاصل تبصرے شائع کیے۔ اس کے فورًا ہی بعد ۱۹۱۹ء میں آپ نے "تاریخ صحف سماوی" ایسی مستند اور بلند پایہ کتاب تحریر کی جو آج بھی پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور نئی نسل اس سے اکتساب فیض کر رہی ہے۔ سیرت پاک پر جب مستشرقین کے پے بہ پے ناروا حملوں کا سلسلہ دراز ہوا تو آپ نے دوبارہ سیرت پر قلم اٹھایا اور ۱۹۳۱ء میں سیرت رسول اللہؐ ایسی محققانہ اور بلند پایہ کتاب شائع کی جس کا دوسرا ایڈیشن نظرِ ثانی اور اضافہ کے بعد "مکتبہ افکار" کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ بیک وقت انگریزی، عربی اور فارسی کے عالم تھے اور کسی حد تک عبرانی سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ آپ نے سیرتِ رسول اللہ کا علامہ شبلیؒ کی سیرت النبیؐ سے مختلف انداز میں احاطہ کیا۔ دونوں بزرگ و محترم شخصیتوں نے باہمی مشاورت سے کتاب کے جداگانہ موضوعات منتخب کر لیے تھے۔ چنانچہ آج بھی سیرت کی یہ دونوں کتابیں تحقیق و بصیرت اور سعی و کاوش کا بے بہا خزینہ ہیں جن سے سیرت پر کام کرنے والے مستفید ہو رہے ہیں۔

بھوپال سے پروفیسر سید نواب علی کی وابستگی کا سب سے بڑا سبب تو اُن کے بڑے بھائی سید محمد علی وکیل کا بھوپال میں قیام تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے والد صاحب کی تحریک و خواہش پر انھوں نے اپنی بڑی صاحبزادی یوسف النساء بیگم کی شادی مولوی شکر اللہ سہیل کے صاحبزادے سید وحید الحسن سے کر دی تھی۔ مولوی شکر اللہ سہیل یو۔پی کے رہنے والے اور ریاست میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ شعر و ادب سے اُنھیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ میرے والد صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے۔ اس رشتہ کے بعد دوستی کچھ اور مستحکم ہو گئی۔

پروفیسر سید نواب علی ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں بھوپال ضرور آتے تھے اور ایک ایک دو دو ماہ یہاں اُن کا قیام رہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کے حلقۂ احباب میں بھوپال کے عمائد شہر ہی نہیں۔ ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں بھی تھیں جن میں سے بیشتر ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھیں۔ ان میں سب سے پہلے تو خود ان کے سمدھی مولوی شکر اللہ سہیل تھے۔ ان کے علاوہ شعیب قریشی۔ راجا اودھ نرائن بسریا، سر لیاقت علی خان حمید عباسی محمد حیات۔ ماسٹر ولی محمد۔ منشی منصب علی۔ عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ تھے جو آپ کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔ خود والیٔ ریاست نواب سلطان بیگم، پروفیسر سید نواب علی کے تبحرِ علمی کی بڑی معترف تھیں اور ان کی کتابیں شائع ہوئے،

---

[1] جدید ترین تحقیق و دستاویزی ثبوت کی روشنی میں علامہ اقبال کا سن پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ ملاحظہ ہو۔ روزگار فقیر۔ صفحہ ۲۳۴۔

ریاست کے مدارس اور لائبریریوں کے لیے خرید فرما کر ہمیشہ سرپرستی کرتی تھیں۔ سلطان جہاں بیگم کے بعد نواب حمیداللہ خاں نے بھی پروفیسر سید نواب علی کی تصانیف کی قدردانی فرمائی۔

میرے والد صاحب نے ایک دو بار اس امر کی کوشش بھی کی کہ پروفیسر صاحب بھوپال مستقلاً آجائیں لیکن انھوں نے مہاراجہ بڑودہ کے اسلامی علوم سے غیر معمولی شغف کی بنا پر بھوپال آنا منظور نہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انھیں مہاراجہ نے بڑودہ کالج کی لائبریری کے اسلامی موضوعات پر ہر قسم کی بلند پایہ اور نادر کتابیں دنیا کے ہر ملک سے منگوانے کی ہر ممکن سہولت دے رکھی تھی۔ چنانچہ آپ نے مصر، یورپ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے اسلامی علوم پر شائع شدہ کتابیں بڑودہ کالج کی لائبریری میں جمع کر دی تھیں۔ اس قیمتی سرمائے سے آپ نے تو خیر استفادہ کیا ہی، آئندہ نسلوں کے لیے بھی شمعیں فروزاں کر دیں تاکہ وہ علم و تحقیق کی روایت کو برقرار رکھیں۔ کسی ہندو ریاست کے راجہ کا اسلامی علوم سے اتنا گہرا شغف۔ آج تو دیوانے کا خواب نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال اور پروفیسر سید نواب علی کے روابط کا آغاز جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے بڑودہ کے دوران قیام ہوا۔ جو قلمی ربط اور ذاتی ملاقاتوں کے بعد گہری وابستگی اور قلبی تعلق میں تبدیل ہو گیا۔ آپ نے بیشتر کتابیں بڑودہ کے قیام کے دوران ہی تحریر کیں۔

کتاب کی نظرثانی کے دوران خوش قسمتی سے رحیم بخش شاہین کی کتاب "اوراق گم گشتہ" میں اقبال کا ایک ایسا خط بھی مل گیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ پروفیسر سید نواب علی کے علمی کارناموں سے ۱۹۱۳ء میں واقف ہو چکے تھے اور یہ وہی زمانہ ہے جب آپ بڑودہ کالج کے پروفیسر تھے۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور بطور خاص قابلِ ذکر ہیں:

خواجہ حسن نظامی میرٹھ سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے جس کا نام "توحید" تھا۔ اس پر علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر لکھا ہوتا تھا:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اسی ہفت روزہ "توحید" نے ۸ر جون ۱۹۱۳ء کو "خواجہ نمبر" شائع کیا۔ خواجہ حسن نظامی نے اعلان کیا تھا کہ بہترین مقالہ، غزل یا نظم پر اوّل، دوم اور سوم انعامات تمغوں کی صورت میں دیے جائیں گے۔ منصفین میں علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی اور عبدالحلیم شرر کے نام شامل تھے۔ "توحید" کے شمارہ بابت ۲۴ر جولائی ۱۹۱۳ء میں علامہ اقبال کی رائے کے سلسلے میں یہ خط درج کیا تھا جس میں علامہ نے سید نواب علی کے مضمون کو سب سے زیادہ پسند کیا اور اسے "معنی خیز" قرار دیا۔ اس طرح گویا پہلی بار ایک ایسا خط دستیاب ہوا جس سے اقبال اور سید نواب علی کے ربط و تعلق کی نشاندہی ممکن ہو سکی:

السلام علیکم

"خواجہ نمبر" میں نواب علی صاحب، پروفیسر بڑودہ کالج کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند آیا کہ معنی خیز ہے۔ اس سے دوسرے نمبر پر "زلفِ خواجہ کا اسیر" اور "شہنشاہوں کی پیشانیاں اجمیری چوکھٹ پر"۔ مؤخر الذکر مضمون کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے۔

نظموں میں گرامی[۵۲] صاحب کی غزل سب سے اعلیٰ، اس کے بعد شفق[۵۳] صاحب کا ترانہ یا یوں کہیے کہ فارسی نظموں میں گرامی صاحب کی غزل اوّل نمبر اور اُردو نظموں میں شفق کا ترانہ۔

محمد اقبال[۵۴]

۲۶ سال تک بڑودہ میں خدمات انجام دینے کے بعد آپ ۱۹۲۹ء میں ریاست جوناگڑھ سے وابستہ ہوگئے۔ ابتداً بطور پرنسپل بہاء الدین کالج خدمات انجام دیں پھر کچھ ہی عرصہ بعد آپ وزیر تعلیمات و اوقاف مقرر ہوگئے اور بالآخر ۱۹۳۴ء میں ریاست جوناگڑھ سے پنشن لے کر مولوی شکر اللہ سہیل اور دیگر دوستوں کی خواہش پر جولائی ۱۹۳۴ء میں بھوپال آکر قیام پذیر ہوئے۔ یہاں چار ماہ کے قیام میں حیدر عباسی۔ راجہ اودھ نرائن بسریا۔ راس مسعود، شعیب قریشی، سر محمد لیاقت علی خاں۔ مولوی منصب علی۔ ڈاکٹر رحمن۔ محمد حیات اور کئی عمائد ریاست سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ خود راس مسعود سے بھوپال میں آپ کی پہلی ملاقات ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہوئی جس کا ذکر اُن کے قلمی روزنامچہ میں (جس کے مسودات راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں) ملتا ہے:۔

"۴ر رجب المرجب ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۴ء ....

سر راس مسعود سے مہمان خانۂ سرکاری میں ملاقات۔ میرے حالات جوناگڑھ دریافت کیے۔ کہا کہ علی گڑھ چلے آؤ۔ کانفرنس کے دفتر میں کام کرنا۔ انھوں نے اپنے حالات بیان کیے۔ کس طرح مخالفت ہوئی اور اب کیا قصد ہے۔"

اس روزنامچہ سے شعیب قریشی کے مشیر المہام اور سر راس مسعود کے ممبر تعلیمات مقرر ہونے کی صحیح تاریخ کا بھی علم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مسٹر شعیب سے ملا۔ مشیر المہام ہوگئے۔ سر راس مسعود ممبر تعلیمات مقرر ہوئے۔ شب کو مسٹر شعیب کے یہاں دعوت کھائی مع مولوی شکر اللہ ——— (سہیل)"

جولائی ۱۹۳۴ء سے ۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء تک پروفیسر سید نواب علی کا بھوپال میں قیام رہا۔ اُنھیں راس مسعود کے آنے سے قبل حیدر عباسی اور شعیب قریشی نے ملازمت کی پیش کش کی تھی۔ پھر جب راس مسعود بھوپال مستقلاً آگئے تو انھوں نے بھی پروفیسر سید نواب علی کی خدمات بھوپال کے لیے حاصل کرنے کی سعی و کوشش کی لیکن کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا تو آپ دسمبر ۱۹۳۴ء میں اپنے وطن لکھنؤ لوٹ گئے لیکن بھوپال آنے جانے کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

---

۵۱ ہفت روزہ "توحید" میرٹھ۔ بابت ۲۴ر جولائی ۱۹۱۳ء

۵۲ مولانا غلام قادر گرامی

۵۳ مولانا شفق عماد پوری

۵۴ اوراق گم گشتہ۔ صفحہ ۱۳ - ۱۴

میرے والد کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوگیا تو پروفیسر سید نواب علی نے مجھے اپنی سرپرستی اور کفالت میں لے لیا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں جب میری والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تو جولائی ۱۹۳۵ء میں مجھے انھوں نے اپنے پاس لکھنؤ بلا لیا اور اپنے بچوں سے زیادہ شفقت کے ساتھ میری تعلیم و تربیت پر توجہ فرمائی۔

"پس چہ باید کرد" والا مضمون جس کا حوالہ فقیر وحید الدین نے دیا ہے علامہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد شائع ہونے والے پہلا "اقبال نمبر" ہے جسے انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی کے رسالہ "جوہر" نے ۱۹۳۸ء میں مرتب کیا۔ رسالہ "جوہر" کے "اقبال نمبر" میں جن گرانمایہ شخصیتوں کے پیغامات ہیں اُن میں گاندھی جی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (جو انجمن اتحاد کے صدر تھے) ڈاکٹر سر اکبر حیدری۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ سر تیج بہادر سپرو۔ اور مولانا عبدالماجد دریابادی شامل ہیں۔ "اقبال نمبر" میں تاریخ اشاعت اگرچہ درج نہیں لیکن دو پیغامات بقید تاریخ و دستخط شائع ہوئے ہیں جن سے اس نمبر کی تاریخ اشاعت کا تعین ہوجاتا ہے۔

(۱) پیغام مہاتما گاندھی۔ مورخہ ۹ر جون ۱۹۳۸ء۔ گاندھی جی نے یہ پیغام اُردو میں لکھا ہے جو اُن کے قلمی عکس کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

(۲) پیغام ابوالکلام۔ کلکتہ۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء رسالہ "جوہر" کے اسی "اقبال نمبر" میں پروفیسر سید نواب علی کا مضمون "پس چہ باید کرد" صفحات ۱۵۸ تا ۱۶۶ پر شائع ہوا ہے۔ اسی نمبر میں ان کی ایک فارسی نظم بھی علامہ اقبال سے متعلق شامل ہے جس کا عنوان ہے۔ یاد اقبال۔ (صفحہ ۸۰)

پروفیسر سید نواب علی کا انتقال ۳۰ر جون ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ہوا جب اُن کے قلمی مسودات اور قیمتی کتابوں کو میں نے محفوظ کرنے کے لیے یک جا کیا تو رسالہ "جوہر" پر میری نظر پڑی اور اس مضمون پر بھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۲ء کے "افکار" میں میں نے ان کی پہلی برسی پر اس مضمون کو بطور تبرک دوبارہ شائع کیا۔ اشاعت کے کچھ عرصہ بعد جب فقیر وحید الدین نے "پس چہ باید کرد" والے مضمون کے سلسلے میں پروفیسر سید نواب علی سے معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھ سے رابطہ قایم کیا تو میں نے اُنھیں بتایا کہ اُن کے انتقال کو تو ایک سال بیت گیا۔ وہ کراچی ۱۹۴۸ء میں آگئے تھے۔ رسالہ "جوہر" کا "اقبال نمبر" بھی ان کے پاس محفوظ تھا۔ لیکن شاید فقیر وحید الدین کی نظر سے یہ رسالہ نہیں گذرا ورنہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۲ء کے دوران وہ پروفیسر صاحب سے یا راقم سے رابطہ قایم کرکے "پانچ سو آدمی پیدا کر" کی تفسیر و تشریح معلوم کرسکتے تھے۔ عجیب اتفاقات ہیں۔ ان واقعات کی تلاش و جستجو کا بھلا کسے علم تھا، ورنہ علم و ہنر کے سوتوں سے اُسی وقت استفادہ کر لیا جاتا جب وہ جلوہ فگن تھے۔

پروفیسر سید نواب علی ـــــ میرے چچا ہونے کے علاوہ ۱۹۵۸ء میں میرے خسر بھی ہو گئے۔ میں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا اور اُنھیں کے ساتھ آخر دم تک رہا۔ وہ اکثر رات کو کھانے کے بعد مولانا محمد علی ـــ علامہ اقبال۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر مشاہیر کے واقعات مجھے سنایا کرتے تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طور وہ ان یادداشتوں کو قلم بند کرا دیں یا مجھے لکھوا دیں۔ لیکن افتادِ زمانہ کہ اس کی نوبت نہ آسکی ـــ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے فوراً ان کی جونا گڑھ کی پنشن جو تقریباً ساڑھے تین سو روپے ماہوار تھی بند ہوگئی پھر نیوتنی (قصبہ لکھنؤ) میں ان کی کئی لاکھ کی جائداد جو اُنھیں دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ ختم ہوگئی۔ کراچی کے قیام کے دوران چند در چند مصائب اور وسیع کنبہ کی ذمہ داریوں نے ان کی یادداشت کو بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۵۸ء تک وہ اگرچہ برابر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ لیکن آخر آخر میں اُن کی یادداشت قطعی جواب دے گئی ـــ

ہرنیا کے پُرانے مریض تھے۔ بالآخر جون ۱۹۶۱ء میں یہ منارۂ نور بجھ گیا اور ہم اکتساب فیض سے محروم ہوگئے۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو بھوپال اور اقبال سے متعلق کچھ اور واقعات جن کا جستہ جستہ ذکر ان کے روزناموں میں ملتا ہے روشنی میں آجاتے۔ لیکن افسوس ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اقبال، راس مسعود اور ضربِ کلیم

بھوپال سے لاہور واپس پہنچ کر اقبال پھر اپنے معمولات و مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ ان مصروفیات میں سب سے مقدم "ضربِ کلیم" کی اشاعت تھی جو تکمیل کے آخری مرحلے میں تھی۔ اس کے باوجود راس مسعود سے قلمی ربط و تعلق بدستور قایم رہا۔ نیازی صاحب دہلی سے لاہور منتقل ہو چکے تھے اس لیے اب بھوپال سے متعلق اُن کے نام خط بھیجنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقبال نامہ میں ۱۹۳۶ء کے دوران ہمیں وقفے وقفے سے چار خطوط راس مسعود کے نام ملتے ہیں اور ایک خط سلیمان ندوی کے نام۔ جن سے اُس دور کی صرف چند جھلکیاں ہمارے سامنے آتی ہیں اور بس۔ ۹ راپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچنے کے بعد یقیناً اقبال اور راس مسعود کے درمیان خطوط کا تبادلہ ہوا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ یہ خطوط دستیاب نہیں ہو سکے صرف دو خط اقبال نامہ میں ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں دونوں کے درمیان قلمی ربط و تعلق قایم تھا:۔

"لاہور — ۲ رمئی ۱۹۳۶ء

ڈیئر مسعود

کئی دن سے تمھارا خط نہیں ملا۔ میں منتظر ہوں۔ خیر خیریت تو لکھ دیا کیجیے۔ اگر تم مصروف ہو تو ممنون صاحب سے کہہ دیجیے کہ دو حرف لکھ دیا کریں۔ میری صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس بیماری سے پہلے جو حالت تھی وہ عود کر آئی ہے البتہ آواز میں ابھی ترقی نہیں ہوئی جتنی کہ اُمید تھی۔ گو پہلے سے بہتر ہے۔ نیازی اور انجمن حمایت اسلام کی عرض داشت کا کیا ہوا؟ کیا تم نے سر آغا خاں والے معاملے کا اعلیٰ حضرت سے ذکر کیا تھا؟ یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔ معلوم نہیں اعلیٰ حضرت کیا خیال کریں۔

زیادہ کیا لکھوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا خط آیا تھا۔ آج کل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں اور یہاں کی مختلف پولیٹیکل پارٹیوں میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُمید کہ تم اور بیگم صاحبہ اچھے ہوں گے۔ محمد اقبال [1]"

---

[1] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۳۷۷-۳۷۸

اس خط کا ابتدائی ٹکڑا ۔۔۔ "کئی دن سے تمھارا خط نہیں ملا"۔ اس بات کا غماز ہے کہ ۹ / اپریل اور ۲ / مئی کے دوران خطوط کا تبادلہ ضرور ہوا لیکن راس مسعود کی طرف سے انھیں جواب نہیں ملا۔ چنانچہ ابتدائی سطروں میں اس کا اظہار کیا ہے ۔۔ "اگر تم مصروف ہو تو ممنون صاحب سے کہہ دیجیے کہ دو حرف لکھ دیا کریں"۔

اُن کی صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی تھی جس کا ذکر اس خط میں ملتا ہے۔ انھیں نیازی صاحب اور انجمن حمایت اسلام سے جو قربت اور وابستگی تھی اُس کا سبھی کو علم ہے۔ ان دونوں کے لیے انھوں نے نواب صاحب کی خدمت میں سفارش کے ساتھ عرض داشتیں بھی راس مسعود کے توسط سے پیش کرائی تھیں۔ چنانچہ اُن کے نتیجہ کی انھیں فکر تھی جیسا کہ اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے۔

"سر آغا خاں کا معاملہ" وہی ۔۔۔ وظیفہ کا ہے جس کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے "معلوم نہیں اعلیٰ حضرت کیا خیال کریں" کا ٹکڑا۔ اقبال کے قلندرانہ مزاج کا واضح نقش ہے۔ جو ایک محسن کے ہوتے ہوئے کسی اور کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتا۔ ویسے یہ معاملہ اُسی وقت ختم ہو چکا تھا۔

اسی خط میں پنڈت نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح کے تذکرے اس بات کے غماز ہیں کہ لاہور پھر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سربراہ صوبۂ پنجاب سے حمایت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

اس خط کے بعد بظاہر آخر جولائی تک خاموشی[1] رہی۔ لیکن واقعتاً وہ اس عرصے میں اپنے مشہور مجموعۂ کلام "ضرب کلیم" کی اشاعت میں مصروف رہے جس کا تذکرہ ہمیں عبدالمجید سالک کی کتاب "ذکر اقبال" میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ۔۔۔ "چونکہ برقی علاج کے لیے بھوپال جانا ضروری تھا اس لیے مارچ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں دہلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ ۹ / اپریل کو بھوپال سے واپس آگئے اور "ضرب کلیم" شائع فرمائی اور چند ماہ بعد ستمبر میں۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، کو مکمل کر کے شائع کر دیا[2]"

خود اقبال کے ایک خط بنام خواجہ غلام السیدین مورخہ ۱۸ / اپریل ۱۹۳۶ء سے ہمیں "ضرب کلیم" کے سلسلے میں ان کی مصروفیت کا علم ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "ضرب کلیم" کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ امید ہے مئی کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی[3]"

لیکن کتاب مئی کے بجائے جولائی کے آخر میں مکمل ہو سکی جیسا کہ یکم اگست کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے:۔

> "لاہور ۔۔۔ یکم اگست ۱۹۳۶ء
>
> "ڈیر مسعود ۔۔۔ آج میرے منشی طاہر دین آپ کی خدمت میں "ضرب کلیم" کی چھ مجلد کاپیاں ارسال کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کاپی آپ کی ہے اور باقی خاندان شاہی کے لیے۔ ایک اعلیٰ حضرت کے لیے۔ ایک ہز ہائینس کے لیے۔ ایک شہزادی ولیعہد کے لیے

---

[1] صرف ایک غیر مطبوعہ خط ۹ / جون ۱۹۳۶ء کا مل سکا جو گذشتہ صفحات میں شامل ہے۔

[2] ذکر اقبال۔ صفحہ ۲۰۲

[3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۱۷

اور دو اعلیٰ حضرت کے دونوں بھتیجوں کے لیے۔ اعلیٰ حضرت کے لیے جو کاپی ہے اس پر میرا نام کتاب کے صفحہ اپر ڈیڈی کیشن کے اشعار کے نیچے لکھا ہے۔ اگر کوئی اور کاپی مطلوب ہو تو اطلاع دیجیے۔

ڈاکٹر عبدالباسط صاحب اور شعیب صاحب کے لیے علیحدہ پارسل میں کاپیاں ان کے نام ارسال کی گئی ہیں۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ بیگم مسعود سلام قبول کریں۔ جاوید سلام عرض کرتا ہے۔

علی بخش بھی آداب کہتا ہے ——— والسلام محمد اقبال

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ شاید سردیوں میں بھوپال آؤں [1]"

"ضرب کلیم" شائع ہو گئی اور اس کی خصوصی آٹھ کاپیاں تیار ہو کر بھوپال پہنچ گئیں۔ راس مسعود کے علاوہ پانچ کاپیاں خاندان شاہی کے لیے انھوں نے ارسال کی تھیں۔ نواب صاحب بھوپال۔ بیگم صاحبہ بھوپال — شہزادی عابدہ سلطان۔ (ولی عہدہ ریاست) اور اعلیٰ حضرت کے دونوں بھتیجوں۔ سعید الظفر خاں اور رشید الظفر خاں کو۔ "ضرب کلیم" کے نسخے پہنچا دیے گئے۔ دو کاپیاں ڈاکٹر عبدالباسط اور شعیب قریشی کے نام اقبال نے علیحدہ پارسل میں روانہ کر دیں۔ ڈاکٹر عبدالباسط کے نام جو نسخہ اقبال نے اپنے دستخطوں سے بھیجا تھا۔ وہ اُن کے صاحبزادے عبدالحئی صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ جس کا عکس کتاب میں شامل ہے (اصل کتاب میں نے اقبال اکیڈمی میں محفوظ کرا دی ہے) "ضرب کلیم" اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے دستخطی نسخے شہزادی عابدہ سلطان (جو ملیر۔ کراچی میں سکونت پذیر ہیں) کے پاس محفوظ تھے جن کی فوٹو کاپیاں شاملِ کتاب ہیں۔ "ضرب کلیم" کی اشاعت سے فارغ ہو کر انھوں نے اپنی توجہ اس کتاب پر مبذول کر دی جس کا وعدہ اُنھوں نے نواب صاحب بھوپال سے کیا تھا۔

"شاید سردیوں میں بھوپال آؤں" یکم اگست ۱۹۳۶ء کے خط کا یہ ٹکڑا — اس بات کا غماز ہے کہ وہ جلد ہی پھر بھوپال جانے کا عزم رکھتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ذیل کا یہ خط اس امر کی مزید تصدیق کرتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے کے لیے کتنے مضطرب تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"لاہور —— ۷/ اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی السلام علیکم —— والا نامہ ابھی ملا ہے۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے۔ گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ بدورالبازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کرکے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمائیے اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۸ - ۳۷۹

الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں۔ مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے۔ میں بھی تیسرا بیان انشاءاللہ جلد لکھوں گا اس کا موضوع ہوگا "بروز"۔ لفظ بروز[1] کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیا کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیے۔ نہایت شکر گذار ہوں گا۔

موسیٰ جاراللہ[2] صاحب کی کتاب نہایت عمدہ ہے۔ ملنے کا پتہ کتاب پر یہ لکھا ہے۔

مکتبہ الخانجی۔ شارع عبدالعزیز۔ مصر

امید کہ مزاج والا بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام مخلص محمد اقبال[3]"

ان دنوں اقبال کی توجہ دو خاص امور پر مرکوز تھی۔ اول مسئلہ قادیانی جس کے متعلق ان کے دو بیانات چھپ چکے تھے۔ تیسرا وہ لکھ رہے تھے۔ اُن کی خواہش یہ بھی تھی کہ ندوی صاحب بھی اس سلسلے میں بیان شائع فرمائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اب وہ قرآن مجید کے حواشی کے لیے ضروری مواد بھی جمع کر رہے تھے۔ یہ کتاب وہ انگریزی میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی صاحب سے ممکنہ اعانت کے طالب تھے جیسا کہ مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہے۔ انھیں اپنے وعدے، اپنی ذمہ داری اور اپنے وقت کے صحیح مصرف کا کتنا خیال تھا اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

پنجاب میں فتنۂ قادیانی کا زور اگرچہ ٹوٹ گیا تھا لیکن اپنے نیازمندوں کی خواہش پر اقبال اپنے تیسرے بیان کی تیاری میں مصروف اور اس سلسلے میں سید صاحب کی رہبری اور اعانت کے طالب تھے۔ راس مسعود کے نام ۲ر مئی ۱۹۳۵ء کے خط میں پنڈت نہرو کا تذکرہ غالباً اقبال کے اس بیان سے متعلق معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے مسئلہ قادیانی کے بارے میں دیا تھا جس کے جواب میں پنڈت نہرو نے بھی ایک بیان شائع کر دیا جس میں کانگریس کے مفادات اور اپنے مخصوص خیالات و تصورات کے پیش نظر اقبال پر اعتراضات کیے تھے۔ مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے درمیان مسئلہ ختم نبوت کی نزاعی شکل سے پنڈت جی نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ کانگریس کا مفاد اسی میں تھا کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی نہ ہو سکے اور مذہبی فرقے آپس میں دست و گریباں رہیں۔ پنڈت نہرو کی اسلامی شعائر، اقدار و تعلیمات سے ناواقفیت کا اندازہ اُن کے بیان سے ظاہر تھا۔ چنانچہ اقبال نے اپنے تیسرے بیان میں ان امور کی وضاحت ضروری سمجھی۔ یہ بیان جب شائع ہوا تو کتنے ہی گوشے واضح ہو کر سامنے آگئے۔ اس سلسلے میں نیازی صاحب فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ دراصل پنڈت جی نے بلا وجہ ایک ایسی بحث میں دخل اندازی کی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ ان کی روش بھی طالب علمانہ نہیں تھی بلکہ معترضانہ۔ یوں بھی اُن کا خطاب ایک طرح سے حضرت علامہ ہی سے تھا اور اس لیے حضرت علامہ کے لیے بجز

---

[1] لفظ بروز کے معنی تو ظہور ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں۔

[2] موسیٰ جاراللہ مشہور روسی عالم و مفکر، یہ ہندوستان کئی بار آچکے ہیں۔ مجھ سے مکہ معظمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ترکی میں بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔۔۔ (سید سلیمان ندوی)

[3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۰۔

اس کے کہ ان سب حقائق کی تشریح فرمائیں جن کی طرف پنڈت جی نے اشارہ کیا تھا۔ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ پنڈت جی کے بیان کو بے جواب چھوڑ دینا ایک طرح سے اعترافِ شکست تھا جس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچتا۔ لہٰذا کچھ دنوں کی ردّ و کد کے بعد حضرت علامہ نے فیصلہ کیا کہ ایک طویل بیان شائع کریں۔ حالانکہ اُنھیں آرام کی ضرورت تھی اور حکیم صاحب بھی فرما چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو دماغی محنت سے احتراز کرنا چاہیے، بایں ہمہ حضرت علامہ نے یہ طویل بیان جس نے آگے چل کر ایک مضمون کی شکل اختیار کرلی رقم فرمایا۔ چنانچہ یہی بیان ہے جو بعد میں "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے شائع ہوا[۱]۔"

راس مسعود اور بھوپال سے ربط و تعلق اور خط و کتابت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ "ضربِ کلیم" پہنچنے کے بعد جب راس مسعود کا خط اُنھیں ملا تو اُنھوں نے فوراً جواب دیا۔

۲۷ راگست کا یہ خط ملاحظہ ہو:۔

"لاہور[۲] ۲۷ راگست ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود ـــ تمھارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میرا بھی یہی فیصلہ ہے جو تم نے کیا ہے۔ یہ واقعی اٹل ہے۔ میں نے تو پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے بھی استعفا دے دیا ہے۔ بورڈ کی میٹنگ کل ہوگی آج کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں جو نوٹ اس استعفا پر نکلا ہے ممکن ہے تمھارے ملاحظہ سے گذرا ہو۔ بورڈ کے ممبر اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لیے اسے ملتوی کردوں۔ بہرحال اس ماہ کے اختتام تک میں اس کی صدارت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ جس روز کتب تمھارے نام ارسال کی گئیں اُس روز صرف آٹھ کتابیں جلد ہوکر آئی تھیں۔ آٹھ کی آٹھ بھوپال ارسال کردی گئیں۔ بعد میں جو جلدیں ہوئیں وہ ـــ Inferior قسم کی جلدیں تھیں۔ اس واسطے لیڈی مسعود کے نام ارسال نہ کی گئی۔ اُمید ہے کل ایک اور عمدہ جلدیں بن کر آئیں گی تو اُنھیں ارسال کروں گا۔ مطمئن رہیے مجھے یاد ہے بھولا نہیں ہوں۔ اعلیٰ حضرت کا خط بھی نہایت تلطف آمیز تھا جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام اور "ناظرین" سے میں نے خود کہا ہے کہ "میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ"۔ نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی Epigrammatic Style سے کی گئی ہے۔ والسلام

محمد اقبال[۲]"

---

[۱] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۱۴

[۲] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۹ تا ۳۸۱

اس خط سے پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے استعفا کا حال ہی نہیں اُس کا پس منظر بھی واضح ہوجاتا ہے۔ پنجاب کی سیاسی فضا اقبال ایسے صاحبِ فکر و عمل کے لیے بالآخر ناساز گار ثابت ہوئی اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

لیڈی مسعود کو اقبال نے ضربِ کلیم نہیں بھیجی تھی چنانچہ راس مسعود نے بیگم کا شکوہ اُن تک پہنچا دیا وہ راس مسعود ہی نہیں، بیگم راس مسعود کے بھی بے حد مداح، قدرداں اور اُن کے اعلیٰ ادبی ذوق کے معترف تھے۔ ان کی شکایت پر بھلا کیوں نہ توجہ دیتے۔ وضاحتاً لکھا کہ صرف آٹھ جلدیں (اعلیٰ قسم کی) ابتداً تیار ہو کر آئی تھیں۔ باقی جلدیں معمولی قسم کی تھیں اس واسطے لیڈی مسعود کو نہیں بھیجی گئی۔ لیکن جلد ہی عمدہ جلد کی کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اس خط کا آخری حصہ خصوصیت سے قابلِ غور ہے۔ "ضرب کلیم" اگرچہ بقول اقبال "ٹاپیکل" یا موضوعاتی مجموعۂ کلام ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی قدر و اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بلکہ کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے انقلابی اور خلفشاری دور کا اندازہ کیجیے اور پھر اس مجموعہ کی تخلیقات پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان موضوعات پر صرف اقبال ہی قلم اٹھا سکتے تھے۔ اور سوئی ہوئی مسلم قوم کو بیدار کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ واقعی یہ مجموعہ زمانۂ حاضر کے نام اعلانِ جنگ تھا اور "ناظرین" سے اُن کا تخاطب یوں تھا۔

"میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ"

وہ نوائے چنگ کو غیر موزوں قرار دیتے ہیں البتہ کتاب کے 'ریلیٹیک' (حقیقت پسندانہ) ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں — اور نوائے چنگ کی تلافی کے لیے انھوں نے جو انداز اختیار کیا ہے اُسے 'ایپیگریمیٹک اسٹائل' (تلمیحاتی اسلوب) کا نام دیا ہے۔ ویسے بھی یہ مجموعہ اُن کے عام مجموعوں سے کئی اعتبار سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔ جیسا کہ ایک اور جگہ — "ضربِ کلیم" کی اشاعت کے دوران خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ رجون ۱۹۳۶ء میں جو انھوں نے لاہور سے بھیجا تھا۔ اس مجموعہ کے بارے میں خود اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو کئی لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:—

> —— "ضرب کلیم امید ہے جون کے آخر تک شائع ہوجائے گی اور میں آپ کو ایک نسخہ پیشگی بھیج سکوں گا۔ اس مجموعہ میں ایک حصہ تعلیم و تربیت کے لیے وقف ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس میں کوئی نئی بات نظر نہ آئے تاہم اگر کتاب آپ کو بروقت مل جائے تو محولہ بالا حصہ ضرور مطالعہ فرمائیے۔
>
> میں سمجھتا ہوں کہ آپ Leibnitz's Monadism کے تعلیمی نتائج سے واقف ہیں۔ اس قیاس کے مطابق انسانی مونیڈ خارج سے کوئی اثر قبول کرنے سے عاری ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسانی مونیڈ زیادہ تر تاثر پذیر نوعیت کا حامل ہے۔ زمانہ ایک بڑی ہی برکت و نعمت ہے (لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف وقت ہی آبادی و شادابی کا منبع ہے یہی اشیا، کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور ساکھ ہے"[۱]

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۱۵-۳۱۶

نامناسب نہ ہوگا اگر "ضربِ کلیم" کے پہلے اور انتساب کے صفحات پر ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ یہی وہ تاریخی مجموعہ ہے جو اقبال اور نواب صاحب کے ذاتی مراسم اور تعلقات کی دائمی یادگار ہے۔ کتاب کھولتے ہی "ضربِ کلیم" کا پہلا صفحہ ہمیں چونکا دیتا ہے:

ضربِ کلیم
یعنی
اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر (اقبال)

"ضربِ کلیم" کو انھوں نے نواب حمیداللہ خاں کے نام معنون کرتے ہوئے جس انداز میں اُنھیں خراجِ تحسین ادا کیا ہے اُس سے اُن کی ژرف نگاہی کا قائل ہونا پڑتا ہے:۔

اعلیٰ حضرت نواب سرحمیداللہ خاں فرماں روائے بھوپال کی خدمت میں

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیرِ من است
دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
'کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند'

اس انتساب کے دو مصرعے خصوصیت کے ساتھ نواب حمیداللہ خاں سے اقبال کی گہری عقیدت و وابستگی کے آئینہ دار ہیں ؎

تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیرِ من است
دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند

نواب حمیداللہ خاں کو جب یہ عظیم تحفہ اپنے دوست کی جانب سے موصول ہوا تو دیرینہ تعلق خاطر کی بنا پر انھوں نے اقبال کا رسمی نہیں بلکہ قلبی اور قلمی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ والیانِ ریاست میں ایسے صاحبانِ علم و نظر کتنے ہوں گے جو شاعرانِ باکمال کی اس طرح قدر دانی اور پذیرائی کے قائل ہوں یا اسے ضروری سمجھتے ہوں۔ نواب صاحب نے جس محبت سے اُنھیں خط لکھا۔ اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا اظہار خط کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہے۔

"_____ اعلیٰ حضرت کا خط بھی نہایت تلطف آمیز تھا جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا_____"

نواب صاحب کا یہ قلمی خط یقیناً کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ ہوگا۔ میں نے جاوید اقبال کو اس سلسلے میں دو تین بار توجہ دلائی لیکن افسوس کہ وہ اس خط کے بارے میں رہبری کرنے سے قاصر رہے۔ کاش یہ خط مل جاتا تو دونوں کے

ذاتی روابط اور مراسم کے کچھ اور پہلو سامنے آجاتے۔ اس کتاب (ضرب کلیم) اور انتساب کا ایک اور پہلو وہ فکری ہم آہنگی بھی ہے جو اقبال اور نواب صاحب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی جس کا اس مجموعہ کی نظموں میں موضوعاتی اعتبار سے جا بجا اظہار ملتا ہے۔ بعض کم نظروں اور کوتاہ بینوں نے اس انتساب پر اعتراضات بھی کیے۔ لیکن حقیقت شناس نگاہوں نے "ضرب کلیم" کو نواب حمید اللہ خاں کے نام معنون کرنے میں کسی مصلحت یا دنیاداری کی کوئی جھلک نہیں دیکھی۔

نواب صاحب اقبال کے گرویدہ و شیدا تھے۔ وہ ان کی عظمتِ فن اور ان کے فکر و فلسفہ کا بارہا اعتراف کر چکے تھے۔ اس لیے ان حقائق کا تجزیہ کیجیے تو انسانی سطح پر یہ انتساب حقیقت پسندی، جذبۂ نیازمندی و سپاس گزاری کے ماسوا کسی اور جذبہ کا غماز نظر نہیں آئے گا۔ دونوں کے اس جذبۂ مودت کا خوشامد، تملق، یا مدح سرائی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ ایک مخلص دوست کا دوسرے مخلص دوست کو خراجِ تحسین ہے اور بس!

"ضرب کلیم" کے انتساب پر اقبال کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد بھی کتنی ہی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ ان گنت اعتراضات ہوئے حتیٰ کہ اُن کے بعض شدت پسند پرستاروں نے جو انھیں انسان سے زیادہ پیغمبر اور مافوق البشر ہستی سمجھنے لگے تھے۔ اسے ان کی سُبکی قرار دیا اور طرح طرح سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اقبال کے ایک دیرینہ نیازمند پروفیسر یوسف سلیم چشتی (جن کے کئی مستند واقعات "روزگار فقیر" میں بھی شامل ہیں) اس تنقید و اعتراض پر خاموش نہ رہ سکے اور انھوں نے حقیقتِ حال کا اظہار کر دیا۔ لکھتے ہیں:-

> "میں نے اس انتساب کی علت پر بارہا غور کیا۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے اور میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص ان کے ساتھ جب کوئی سلوک کرتا تھا تو وہ اس کا تذکرہ ہمیشہ شکرگزاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھے [1]"

مولانا الیاس برنی کی دانست میں اس کا ایک جواز یہ تھا۔ فرماتے ہیں:-

> "فرماں روائے بھوپال نے علامہ مرحوم و مغفور کی آخری زمانے میں جو قدر شناسی فرمائی، تو علم پروری کی بڑی خصوصیت حاصل ہو گئی۔ بھوپال گویا اقبال کا میزبان بن گیا۔ یہ مہمان داری قابلِ یادگار ہو گئی [2]"

اور اس کا اعتراف تو ایک سے زائد بار خود اقبال نے راس مسعود کے خطوط میں کیا ہے۔ مثلاً ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کے خط بنام راس مسعود کا یہ اقتباس ہے:-

> "اعلیٰ حضرت کے مراحم خسروانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری آسایش کا ان کو اس قدر خیال ہے [3]"

اقبال کی وفات کے پورے چوبیس سال بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں، گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کے ایک طالبِ علم شبیر اقبال ایم۔ اے (علیگ۔ اردو) (ایم۔ اے۔ سال اول انگریزی) کا ایک مختصر سا مضمون کالج میگزین میں۔

---

[1] شرح ضرب کلیم۔ صفحہ ۲۱-۲۲

[2] گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین بھوپال ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۱۹

[3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۷۰

"اقبال اور بھوپال" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات سے "ضربِ کلیم" اُس کے انتساب اور اقبال اور نواب صاحب کے باہمی روابط پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"—— جہاں کسی شاعر کے پیغام کو سمجھنے اور اس کی روحِ فن کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس کے کلام کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ وہاں اس کے گرد و پیش کے حالات، اس کے زمانے کے سیاسی، تہذیبی، تمدنی شعور اور سب سے بڑھ کر خود اس کی دلی کیفیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ اقبال ہماری زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔

ان کے پورے کلام میں "ضربِ کلیم" کو جو حیثیت حاصل ہے اُس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس میں اقبال اپنے فن کے انتہائی عروج پر ہیں۔ فلسفہ، تصوف، اسلامیات اور بین الاقوامی اثرات، غرض "ضرب کلیم" میں وہ سب کچھ ہے جو اقبال کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے "ضرب کلیم" میں اُن مسائل پر بھی شعر کہے ہیں جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن عزیز ہند سے ہے اور نہ ان کی قوم سے۔ اس کی سب سے اچھی مثال "مسولینی" اور "جمعیت اقوام مشرق" ہیں۔ "ضرب کلیم" ان کی فلسفیانہ نظموں سے پُر ہے۔ انھوں نے تعلیم، معاشرت، سیاست، عورت، تعلیم نسواں وغیرہ مختلف عنوانات پر اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں بے شمار نکتے بیان کیے ہیں اور بعض نظمیں اس مجموعہ میں اس قدر بلند پائے کی ہیں کہ بقول پروفیسر سلیم چشتی — "ان کی سرحد الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

ابھی تک "ضرب کلیم" کو سمجھنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں ان میں بہت کم کامیابی نصیب ہوئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ — "فی الحال ہمارے سامنے اقبال کی نجی زندگی کے مختلف پہلو بے نقاب نہیں ہیں۔" (اقبال کی شاعری) کیونکہ اقبال نے کبھی اپنی باطنی و نفسی تحریک کے بغیر کوئی شعر نہیں کہا اور ان کا تمام کلام آمد کا نتیجہ ہے۔ آورد کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ اپنے متعلق خود فرماتے ہیں۔ ع

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

دراصل "ضرب کلیم" کو سمجھنے کے لیے علامہ اقبال کو بھوپال سے جو تعلق رہا ہے اُسے سامنے رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ "ضرب کلیم" کی تمام اچھی نظمیں ان کے قیام بھوپال کے زمانے کی یادگار ہیں اور یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان سب میں علامہ موصوف نے خود بھوپال کا حوالہ دینا ضروری سمجھا۔ اقبال کو بھوپال اور خصوصاً نواب حمید اللہ خاں مرحوم سے جو تعلق تھا وہ بعد میں اس قدر رنگ لایا کہ اس نے ان سے "ضرب کلیم" کو نواب صاحب کے نام معنون کرا کے چھوڑا[1]۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر اس انتساب کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:۔

---

[1] گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین۔ بھوپال۔ ۱۹۶۲ء نمبر ۶۔ صفحہ ۱۸

اس (انتساب) کی اہم وجہ ڈاکٹر اقبال کا ممنونِ احسان ہونا نہ تھا بلکہ اقبال اُن سے (یعنی نواب حمید اللہ خاں سے) ذاتی طور پر متاثر تھے اور اپنے سیاسی فلسفہ کی عملی جد وجہد کا ضامن نواب صاحب کو سمجھتے تھے اسی لیے اپنے ایک خطبہ میں جو دوسری گول میز کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نواب صاحب بھوپال پر کلی اطمینان ظاہر کرتے ہیں اور ان کی رائے کا ہمیشہ احترام کریں گے اور ان کے فیصلوں کے پابند رہیں گے۔

دراصل نواب صاحب سے اُن کے تعلقات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب دونوں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ وہاں آپس کی ملاقاتیں رنگ لائیں اور دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے۔

لندن سے واپسی کے بعد جب کشمیری عوام کی تحریک نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف زور پکڑا اُس وقت ڈاکٹر اقبال کے ایما اور مشورہ سے مہاراجہ نے نواب صاحب کو (کے) ثالث بننے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب کی منظوری لینے اور ضروری صلاح و مشورہ کے لیے ڈاکٹر اقبال دوبارہ بھوپال تشریف لائے اور یہاں لمبے عرصہ تک قیام کیا۔ اُس وقت اقبال کے دوست اور دستِ راست سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم تھے جس سے گویا اُن تعلقات کی تجدید ہوگئی۔ اُسی زمانے کی یادگار میں اقبال کی مشہور نظمیں "صبح"۔ "تصوف"۔ "وحی"۔ "مومن"۔ "مقصود حکومت" اور "نگاہ" وغیرہ ہیں۔ "سلطانی" جسے پروفیسر سلیم چشتی نے بلندیٔ افکار اور عمق معانی کے لحاظ سے "ضرب کلیم" کی بہترین نظم قرار دیا ہے وہ بھی اسی زمانۂ قیام کی یادگار ہے۔

اس کے بعد ان تعلقات نے اور بھی وسعت اختیار کی۔ اُسی زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا اور ڈاکٹر اقبال نواب صاحب (مرحوم) کے مشورہ سے تحریک میں عملی طور سے شریک ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ مستیِ کردار کے لحاظ سے اقبال کو 'حلاج' سے کوئی نسبت نہیں۔ دار و رسن تو بڑی چیز ہے وہ سیاسی دنیا میں محمد علی جوہر (داس، اجمل و نہرو) نہ بن سکے، پھر بھی ہر سیاسی تحریک کے وہ دماغ سمجھے جاتے تھے اور ہر فیصلہ نواب صاحب کے صلاح و مشورہ کے بعد ہوتا تھا۔

ان تعلقات کی انتہا اس وقت ہوئی جب سر آغا خاں کی تحریک اور سر راس مسعود کی تائید و حمایت پر ڈاکٹر اقبال کو نواب صاحب نے منسٹری[1] پیش کی، اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی خودداری، قناعت اور آزادی کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔

---

[1] بھوپال میں وزارت کی پیش کش کا اس اقتباس کے علاوہ کوئی اور ثبوت نہیں مل سکا۔

اور اس طرح انکار کر دیا کہ پھر سر راس مسعود کو اصرار کی ہمت نہیں ہوئی [۱]"

اس مضمون کا آخری اقتباس خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے جس میں نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں اقبال اور نواب صاحب کے گہرے روابط کا تجزیہ کیا گیا ہے:-

"رام پور، حیدر آباد اور بھوپال کی تاریخ ایسے صدہا واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ جب کسی ادیب یا شاعر کو بیش بہا عطیات اور گراں قدر انعامات و جاگیرات عطا کر کے اسیر کر لیا گیا ہو۔ رام پور سے غالب، حیدرآباد سے داغ اور امیر مینائی کو جو نسبت رہی ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں قابلِ ذکر ہے۔ مگر ڈاکٹر اقبال اور بھوپال کی نسبت اپنی نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ اور انوکھی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تعلقات ایک نواب اور ایک درباری شاعر کے تعلقات نہ تھے جس کا کام کلام پر اصلاح کرنا یا تہنیت اور تقاریب کے مواقع پر قصیدہ لکھنا ہو بلکہ ایک رازدار دوست اور سچے ساتھی کے تعلقات تھے جنھوں نے ایک دوسرے کو گرویدہ بنا لیا تھا اور جس نے اقبال کے کلام پر اور خصوصاً "ضرب کلیم" کی نظموں پر وہ اثرات چھوڑے ہیں جنھیں ہم بغیر ان دونوں کے تعلقات کو سمجھے ہوئے خیالات کی گہرائی اور روح تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اقبال کے وہ تمام خطوط منظرِ عام پر نہ آجائیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً نواب صاحب مرحوم، سر راس مسعود، وزیر تعلیم بھوپال اور ممنون حسن خاں کو لکھے ہیں [۲]"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال اور بھوپال کے سلسلے میں جتنا کچھ مواد مجھے کئی سال کی سعی و تلاش اور مسلسل جد و جہد کے بعد دستیاب ہو سکا۔ وہ اس کتاب میں پیش کر دیا گیا لیکن ابھی کتنا ہی دستاویزی مواد ایسا ہوگا جو ریاست بھوپال میں انضمام کے بعد ضائع ہو گیا یا منتشر ہو کر رہ گیا۔ نواب صاحب کے خطوط۔ اقبال کے نام اور اقبال کے خطوط نواب صاحب کے نام ہر ممکن کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے آیندہ کبھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ان کی تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رکھیں اور اُن حقائق کو بے نقاب کر سکیں جو اقبال کے نواب صاحب اور بھوپال سے گہرے روابط کی اساس تھے۔ پھر بھی جتنے کچھ واقعات اب تک علم میں آسکے ہیں اُن سے یہ حقیقت یقیناً بے نقاب ہو گئی ہے کہ اقبال اور نواب بھوپال کے تعلقات اگرچہ قطعی ذاتی بنیادوں پر تھے لیکن بالواسطہ اس دور کی سیاست سے بھی ان کا کچھ نہ کچھ ضرور تعلق تھا۔

"ضرب کلیم" بھوپال کے تیسرے قیام (۲ر مارچ تا ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء) کے بعد جولائی ۱۹۳۶ء کے آخر میں شائع ہوئی اور یکم اگست ۱۹۳۶ء کو انھوں نے اس کی پہلی آٹھ مطلاّ جلدیں بھوپال ارسال کیں۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ دو ماہ کے بعد ستمبر ۱۹۳۶ء میں ان کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" جس کا آغاز انھوں نے شیش محل بھوپال میں کیا تھا۔ مکمل ہو کر اشاعت پذیر ہوئی۔ اقبال نواب صاحب سے گہری

۱؎ گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین۔ بھوپال ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۱۹ - ۲۰

۲؎ گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین۔ بھوپال ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۲۰

وابستگی کے سبب صرف "ضربِ کلیم" کے انتساب پر ہی مطمئن نہ تھے بلکہ کچھ اور تحفہ بھی ان کی نذر کرنا چاہتے تھے جیسا کہ کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"لاہور ــــ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود ــــ ابھی تمھارا خط ملا۔ کیا خوب! میں گزشتہ رات علی بخش سے کہہ رہا تھا کہ مسعود کا خط کئی دن سے نہیں آیا۔ فکر و تردد ہے۔ آج دوپہر کو تمھارا خط مل گیا۔ الحمد للہ۔ میری صحت دن بہ دن ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی فرق آ رہا ہے۔ انشاء اللہ دربارِ رسالت میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے قبول ہوگا۔ امسال دربار حضور میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ انشاء اللہ امید کہ سال (آیندہ[1]) حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے۔ یہ تحفہ بھی اعلیٰ حضرت کی نذر کیا جائے گا۔ خدا تعالیٰ انھیں عمر دراز عطا فرمائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ لاہور میں الیکشن کی گرم بازاری ہے۔ پنجاب میں الیکشن کے سلسلے میں اب تک دو قتل کی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ سرحد پر پھر جنگ اور قصہ وہی مسجد شہید گنج کا۔ اُمید کہ لیڈی مسعود بخیریت ہوں گی۔ ان کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ علی بخش آپ دونوں کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہے۔ جاوید بھی جو ابھی اسکول سے آیا ہے سلام عرض کرتا ہے۔ فروری یا مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے۔ ممکن ہوا تو چند روز کے لیے بھوپال بھی آؤں گا۔

تمھارا مخلص۔ محمد اقبال[2]"

اس خط کا یہ حصہ ــــ "ابھی تمھارا خط ملا۔ کیا خوب! میں گزشتہ رات علی بخش سے کہہ رہا تھا کہ مسعود کا خط کئی دن سے نہیں آیا۔ فکر و تردد ہے۔ آج دوپہر کو تمھارا خط مل گیا ــــ" اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں میں برابر خطوط کے تبادلے کا سلسلہ جاری تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے زیادہ قریب تھے۔ یہ دونوں کی سچی دوستی، قلبی تعلق اور خلوص و محبت کی انتہا تھی۔ پھر اسی خط سے دربارِ رسالت میں حاضری کی خواہش اور وہاں سے غیر معمولی تحفہ لانے کی آرزو کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اس عظیم و یادگار تحفہ کو نواب صاحب بھوپال کی نذر کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ کس خلوص محبت سے لکھتے ہیں:۔

"ــــ انشاء اللہ ــــ امید کہ سال (آیندہ) حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے۔ یہ تحفہ بھی اعلیٰ حضرت کی نذر کیا جائے گا۔ خدا تعالیٰ انھیں عمر دراز عطا فرمائے ــــ"

۱؎ سہواً رہ گیا۔

۲؎ اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۱ ـ ۳۸۲

"ضرب کلیم" کے بعد ایک اور تحفہ کا نذر کرنا ۔ اور درازیٔ عمر کی دعا کرنا ۔ محض رسمی یا روایتی جملے نہیں ہیں بلکہ اس گہری عقیدت اور والہانہ وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں جو انھیں نواب صاحب سے تھی اور نواب صاحب کو اُن سے تھی!
" لاہور میں الیکشن کی گرم بازاری " " سرحد پر جنگ اور قصہ دہی مسجد شہید گنج کا " اس خط کے وہ اہم ٹکڑے ہیں جن سے اُس دور کی سیاسی فضا کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

خط کے آخر میں ۔ دہلی جانے کے قصد کا اظہار بھی ہے اور بھوپال جانے کا تذکرہ بھی ۔

" ممکن ہوا تو چند روز کے لیے بھوپال بھی آؤں گا ۔ "

اس عبارت سے تعلق خاطر ہی نہیں ۔ بھوپال سے ان کی خصوصی دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ اب ان کی صحت پہلے سے کافی بہتر تھی جیسا کہ خط کے شروع میں ہی لکھا ہے ۔ " الحمد للہ ۔ میری صحت دن بہ دن ترقی کر رہی ہے ۔ آواز میں بھی فرق آ رہا ہے "

وہ چوتھی بار بھوپال جانے کا عزم رکھتے تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کا موقع نہ دیا ۔ وہ اپریل میں دہلی ضرور گئے لیکن حکیم نابینا صاحب کو دکھا کر دوسرے ہی روز لوٹ آئے ۔ اس سفر کا تذکرہ ان کے ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کے خط میں ملتا ہے جو آیندہ صفحات میں شامل ہے ۔

نواب بھوپال اور ارمغانِ حجاز

نواب صاحب بھوپال کے نام ایک اور تحفہ نذر کرنے کا تذکرہ دراصل " ارمغانِ حجاز " کے بارے میں ہے ۔ یہ مجموعہ اُس وقت شائع ہوا جب راس مسعود بھی اس دنیا میں نہ رہے اور اقبال بھی ۔ شیخ عطاء اللہ ۔ مرتب اقبال نامہ لکھتے ہیں :-

" اقبال کی احسان مندی کا حال یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنی کتاب " ارمغانِ حجاز " بھی نواب صاحب ہی کی نذر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی اطلاع انھوں نے سر سید راس مسعود کو دی تھی ۔ سر راس مسعود اقبال سے پہلے فوت ہو گئے اور " ارمغانِ حجاز " اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی ۔ اس طرح اقبال کی اس خواہش و وعدہ کا جواب ایک گونہ وصیت کا حکم رکھتا ہے ۔ کسی کو علم نہ ہوا۔[1] "

نادرہ مسعود کی پیدائش پر تاریخی قطعہ

مارچ ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کو اللہ نے چاند سی بچی عطا کی جس کا نام اقبال نے نادرہ رکھا ۔ یہی نہیں بلکہ اس کی پیدائش پر تاریخی قطعہ بھی لکھا جو خوش نصیبی سے فقیر وحید الدین کو مل گیا اور اُنھوں نے محفوظ کر دیا ۔ اس کے بارے میں تفصیلات اُنھیں کی زبانی سنیے :-

" ڈاکٹر صاحب نے نادرہ مسعود کی پیدائش پر تاریخی قطعہ قلمبند کرایا ۔ یہ یکم مارچ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے ۔ یہ اشعار جواب سے تیئیس ۲۳ سال قبل کہے گئے تھے ، کسی کتاب یا رسالے میں آج تک شائع نہیں ہوئے ، پہلی بار اس کتاب کی زینت بنے ہیں ۔

ان اشعار کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کے پورے خاندان کو خراج تحسین

---

[1] دیباچہ اقبال نامہ ۔ جلد اول ۔ صفحہ غ

پیش کیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے گھرانوں میں
لڑکی پیدا ہونے پر جس سرد مہری اور بے دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اُس کا ازالہ
ڈاکٹر صاحب نے ان اشعار میں بڑے ہی حکیمانہ انداز میں فرمایا ہے ؎

راس مسعودِ جلیل القدر کو — جو کہ اصل ونسل میں مجدود ہے
یادگارِ سیدِ والا گہر — نورِ چشمِ سیدِ محمود ہے
راحتِ جان وجگر دختر ملی — شکرِ خالق، منتِ معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لا محدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دخترِ مسعود ہے

یکم مارچ ۱۹۳۷ء — بھوپال[1] — محمد اقبال[2]"

یہ قطعہ بھوپال بھیجنے کے بعد جب کئی دن تک راس مسعود کا جواب نہیں آیا تو انھوں نے ۱۹ ر اپریل کو خط لکھا۔ اُن کی۔ لیڈی مسعود کی اور نو مولود بچی کی خیریت دریافت فرمائی اور اُس افواہ کا تذکرہ بھی جو اُن کے کشمیر جانے سے متعلق تھی اور بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ لکھتے ہیں:۔

" لاہور — ۱۹ ر اپریل ۱۹۳۷ء

ڈیر مسعود — کئی دنوں سے تمھاری خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ لیڈی مسعود اور بچی خدا کے فضل وکرم سے مع الخیر ہوں گی۔ اُن کی خیریت سے مطلع کیجیے۔ میں ایک روز کے لیے دہلی گیا تھا۔ حکیم نابینا کی دوائی سے صحت بہت ترقی کر رہی ہے۔ تم اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ گرمی کا آغاز لاہور میں ہو گیا ہے۔ گو رات کو ذرا سردی ہو جاتی ہے۔ رات میں نے ایک کشمیری بزرگ سے سُنا کہ تم کشمیر کے ہوم منسٹر بننے والے ہو۔ کیا اس افواہ میں کوئی صداقت ہے؟ ۔ اُمید نہیں کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال تم کو بھوپال چھوڑنے کی اجازت دیں — والسلام۔ تمھارا مخلص

محمد اقبال

میں نے یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے معاف رکھنا۔ آنکھ کا معائنہ کرایا ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دوسرے معائنہ تک لکھنا پڑھنا بند کر دو۔ جاوید تم کو اور لیڈی مسعود کو سلام کہتا ہے۔ اور علی بخش بھی سلام عرض کرتا ہے[3]"

راس مسعود کے بھوپال چھوڑ کر کشمیر جانے کی افواہ حسب توقع غلط ثابت ہوئی۔

---

[1] یکم مارچ ۱۹۳۷ء کو اقبال لاہور میں تھے۔ لفظ "بھوپال" شاید اُس مسودہ میں لکھا ہوگا جو فقیر وحید الدین کی نظر سے گذرا ہوگا اس لیے سہواً کتاب میں بھی درج ہو گیا۔

[2] روزگار فقیر۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴

[3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۳ - ۳۸۴

مسلسل لکھنے پڑھنے اور دیگر علمی مشاغل میں لگاتار مصروفیت نے اُن کی بینائی کو متاثر کیا تھا، چنانچہ یہ خط وہ خود نہیں لکھ سکے بلکہ کسی دوست سے لکھوایا اور اُس کی معذرت بھی کر لی۔

موسم گرما میں نواب صاحب عموماً کشمیر یا نینی تال جاتے تھے جب سے راس مسعود بھوپال آگئے تھے۔ وہ بھی اکثر اُن کے ہمراہ جانے لگے تھے۔ اس خط میں اُن سے یہ دریافت کرنا ـــــ "کیا آپ کا اس دفعہ کشمیر جانے کا قصد ہے؟" اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن راس مسعود کشمیر نہیں جا سکے۔ کیونکہ آیندہ چند ماہ میں جو انقلابات رونما ہوئے ان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۸ رجون کا خط ملاحظہ ہو:۔

"لاہور ـــــ ۸ رجون ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود ـــــ تمھارا خط آج مل گیا۔ جسے پڑھ کر اطمینان ہوا۔ دعا ہے کہ خدا تعالےٰ تمھاری بچی کو جلد صحت یاب کرے۔ تاکہ تم دونوں کو اطمینانِ قلب حاصل ہو۔

جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظام کے لیے جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال عارضی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اُردو بول سکتی ہے، بلوایا ہے۔ پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔ جاوید کی عمر اس وقت قریباً تیرہ سال ہے۔ اور منیرہ کی قریباً سات سال۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں۔ اسی واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔ یہ جرمن لیڈی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے جو ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم رہی ہے۔ شاید تم انھیں جانتے ہوگے۔ باقی تمھارے خط سے مجھے بے انتہا تسلی ہوتی ہے۔ اور تمھارا وعدہ بھی مجھ کو اچھی طرح یاد ہے۔ زیادہ کیا لکھوں؟۔ گرمی شدید ہے۔ علی بخش سلام کہتا ہے۔ اور جاوید سلام عرض کرتا ہے۔

ہاں تم سن کر تعجب کرو گے کہ سر اکبر حیدری کا خط مجھ کو لندن سے آیا ہے اور بہت دل خوش کن ہے۔ والسلام محمد اقبال [1]"

راس مسعود کی بچی علیل ہو گئی تھی ـــ وہ اس کی علالت کے سبب پریشان تھے۔ راس مسعود کا خط ملا تو انھوں نے بچی کی صحت یابی کی دعا فرمائی۔ اور اپنے دونوں بچوں۔ جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے سلسلے میں جرمن خاتون کی خدمات حاصل کرنے کی تفصیلات بھی بیان کر دیں۔

اس خط کا یہ ٹکڑا ـــ "باقی تمھارے خط سے مجھے بے انتہا تسلی ہوتی ہے" رفاقت و دوستی کے اُن گہرے رشتوں کی نشان دہی کرتا ہے جو دونوں میں قایم و مستحکم تھے۔ اس خط میں سر اکبر حیدری کے خط کا بھی ذکر ہے جو انھیں لندن سے ملا تھا۔ اور "دل خوش کن" تھا"۔ اس کا تعلق حیدرآباد دکن کی کسی نئی پیش کش ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ بھوپال کے ساتھ وابستگی سے قبل حیدرآباد دکن سے انھیں جو تعلق خاطر رہا ہے۔ اُس کی تفصیلات نظر حیدرآبادی مرحوم کی کتاب

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۴ - ۳۸۵

"اقبال اور حیدرآباد" میں پیش کی گئی ہیں - اقبال ایسے مردِ قلندر کے لیے اب حیدرآباد دکن کی کسی نئی پیش کش میں صرف اتنی ہی کشش رہ گئی تھی کہ وہ اپنے عزیز دوستوں کو "دل خوش کن" ایسے الفاظ ہی لکھ سکے۔

۸ رجون کے فوراً ہی بعد ۱۰ رجون کو اُنھوں نے پھر راس مسعود کو خط لکھا - راس مسعود کے نام اُن کا یہ آخری خط ہے جس کا جواب بھی خوش قسمتی سے محفوظ رہ گیا اور اقبال نامہ میں شامل ہو گیا۔

"لاہور — ۱۰ رجون ۱۹۳۷ء

ڈیر مسعود — پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا - امید ہے کہ پہنچا ہوگا - اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا - جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کیے تھے - یہ ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے - جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں - (۱) شیخ طاہرالدین یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں - مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(۲) چودھری محمد حسین، ایم، اے - سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکرٹیریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں - اور نہایت مخلص مسلمان۔

(۳) شیخ اعجاز احمد بی - اے - ایل - ایل - بی سب جج دہلی[۱]

(۴) عبدالغنی مرحوم[۲] عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خاں صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے - میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو ــــ Guardians مقرر کردوں مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو - لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے Guardians تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں - باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے - لاہور کا درجۂ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے - لیڈی مسعود سلام قبول کریں - نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں - اُمید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا - کہتے ہیں کہ اس کے لیے بہت مفید ہے - ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیّال صورت میں - موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام - محمد اقبال[۳]"

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا - اُن کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو۔

---

[۱] برادرزادہ علامہ اقبال۔

[۲] جاوید اور منیرہ کے حقیقی ماموں۔

[۳] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۶ تا ۳۸۸۔

"بھوپال ــــ ۱۴ر جون ۱۹۳۷ء

نہایت پیارے اقبال ــــ تمھارا خط مورخہ ۱۰ر جون ابھی ۳ بجے میں نے بغور پڑھا۔ چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں نہ لاہور میں رہتا ہوں اور نہ کوئی اُمید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔ تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہوں۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی انشاء اللہ بائیس۲۲ برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو، ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلے میں، مَیں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے۔ یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمھارا چاہنے والا ــــ راس مسعود[1]"

دو سچے دوستوں اور عاشقان باصفا کے یہ خطوط ہماری ادبی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ اقبال کا اپنے بچوں کی سرپرستی کے لیے راس مسعود ایسے عزیز ترین دوست کو منتخب کرنا اور پھر راس مسعود کا محض سرپرست ہی نہیں بلکہ کفالت کا تمام تر بار اپنے سر لینے کا جذبہ ــــ محض سرسری طور پر پڑھنے والے واقعات اور حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک عہد اور ایک زمانے کی وہ صداقتیں ہیں جن سے ہر دور کا انسان درس تپش حاصل کر سکتا ہے۔

اُن کا یہ لکھنا ــــ "وصیت میں ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں، کیونکہ جب تک ان دونوں کی انشاء اللہ بائیس۲۲ برس کی عمر نہ ہو جائے ــــ میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے" اور آخر میں ــــ "میں ہوں تمھارا چاہنے والا ــــ راس مسعود ــــ" اس اقتباس کے یہ فقرے "بشرطیکہ میں خود زندہ رہا" اور "اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے" اور یا "میں ہوں تمھارا چاہنے والا" نہایت معنی خیز ہیں۔ اور راس مسعود کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر اسی خط میں ان کا یہ کہنا "اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلے میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے" اس

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۸۸ ــ ۳۸۹

حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ انھیں اقبال سے ہی عشق نہیں تھا۔ اُن کے بچوں سے بھی اپنی اولاد کی مانند محبت تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے بچے کسی طور مصائب کا شکار ہوں۔ اسی لیے انھوں نے حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اپنے سامنے ہی اقبال جائداد کا انتظام کر دیں تاکہ کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔ اقبال نامہ کے صرف یہی دو خط ایسے ہیں جن سے باہمی ربط و تعلق کی گہرائیاں منکشف ہو سکی ہیں۔ اس نوع کے وہ سارے خطوط جو اقبال نے راس مسعود کو اور راس مسعود نے اقبال کو تحریر کیے ہیں کسی طور دستیاب ہو جاتے تو ان دونوں کی زندگی اور شخصیت کے کتنے ہی اور روشن پہلو ہمارے سامنے آجاتے۔ افسوس کہ تمام تر کوششوں کے باوجود یہ قیمتی خطوط فراہم نہ ہو سکے۔

جولائی میں راس مسعود سخت بیمار ہوئے۔ چنانچہ ان کی جانب سے ممنون حسن خاں نے جواب ارسال کیا تو اقبال نے پریشانی کے عالم میں اُنھیں خط لکھا:۔

"لاہور—۱۶ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب—آپ کا خط مل گیا ہے میں بہت متردّد ہوں۔ بارہ دن کا ملیریا اور اس پر مسلسل سر درد۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مسعود بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔ میرا یہ خط وصول کرتے ہی آپ اُن کی خیریت سے آگاہ کریں۔ تاکہ تردّد رفع ہو۔ امید کہ لیڈی مسعود اور بچے دونوں تندرست ہوں گی۔ میری طرف سے دعا کہیے۔

اب کے لاہور میں بھی بخار کا زور رہا۔ اور اب بھی ہے گو نسبتاً کم ہے۔ لیکن اب برسات شروع ہو گئی ہے اور موسم بدل گیا ہے۔ باقی خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ سید مسعود کی خیر خیریت سے بہت جلد آگاہ کریں تاکید مزید ہے۔

بھوپال میں تو آج کل خوب بارش ہوتی ہوگی۔ جاوید میاں اچھے ہیں۔ آج کل ان کو آم کھانے سے کام ہے۔ صبح و شام یہی مشغلہ ان کا ہے۔ امتحان میں عربی میں فیل اور انگریزی میں فرسٹ۔ علی بخش کی طرف سے سید صاحب کو لیڈی مسعود صاحبہ کو آداب کہیے۔ جاوید بھی سلام عرض کرتا ہے۔ والسلام۔ محمد اقبال[1]"

راس مسعود کی رحلت

راس مسعود کی اچانک اور شدید علالت پر اقبال کی پریشانی اور تردّد حق بجانب تھا۔ بظاہر وہ بارہ دن تک مسلسل ملیریا اور درد سر میں مبتلا رہے جو بالآخر اُن کی جان لے کر گیا۔ مشیت کے اسرار و رموز کو کس نے آج تک سمجھا ہے؟ ابھی ۱۶ر جولائی کے خط کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو راس مسعود کارزارِ حیات کے کتنے ہی منصوبے اپنے ذہن و دماغ میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ گویا وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی زندگی پر سے اُن کا اعتماد اٹھ گیا تھا اور اقبال کے نام ۱۴ر جون ۱۹۳۷ء کے خط میں اُن کے قلم سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا تھا—"بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔" زندگی اور موت کا فلسفہ آج تک عقدۂ لاینحل ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پیمبروں سے لے کر عام انسان تک بے بس اور ناچار ہے۔ اور بقول اقبال ؎

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۶

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

اقبال پر راس مسعود کی المناک اور اچانک موت کا کتنا گہرا اور شدید اثر ہوا اس کا تھوڑا بہت اندازہ ممنون حسن خاں کے نام اس خط سے لگایا جا سکتا ہے:۔

"لاہور ۔۔۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون ۔۔۔ سید مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صبح اٹھتے ہی اخبار "زمیندار" سے معلوم ہوئی۔ میں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر آپ کے نام تار لکھا کہ اتنے میں "سول ملٹری گزٹ" سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ سخت پریشان ہوں۔ مفصل حالات سے مجھے آگاہ کیجیے۔ میرے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مرحوم کے ساتھ جو قلبی تعلقات میرے تھے وہ آپ کو معلوم ہیں۔ ابھی ان کی والدہ اور لیڈی مسعود کے نام تار دینے ہیں۔ آپ کے خط کا مجھے بے چینی سے انتظار ہے۔

والسلام ۔ محمد اقبال [1]"

اس خط کے ہر ہر لفظ سے ان کی پریشانی، بے چینی اور دلی کرب ظاہر ہے۔ چنانچہ اُسی روز وہ دوسرا خط بھی تحریر کرتے ہیں:۔

"لاہور ۔۔۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون ۔۔۔

صبح میں آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج صبح سے دوپہر تک مرحوم کے جاننے والے اور ان کے غائبانہ معترف تعزیت کے لیے آتے رہے۔ راس مسعود کا رنج عالم گیر ہے۔ یہ تار جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل جنرل افغانستان مقیم شملہ کا ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ مرحوم کے اعزا تک پہنچا دیا جائے۔ مہربانی کرکے آپ یہ تار لیڈی مسعود اور مرحوم کی والدہ کو دکھا دیں۔ والسلام محمد اقبال [2]"

واقعی راس مسعود کی موت۔ ایک فرد کی موت نہیں۔ ایک ادارہ کی موت تھی۔ وہ جو اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اب وہ ویران ہو چکی تھی۔ اقبال سے اُن کے قلبی تعلقات کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ لہٰذا اُن کی موت پر اقبال کی خدمت میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ غم اقبال کا ذاتی غم تھا۔ اور وہ بجا طور پر تعزیت کے مستحق تھے۔ زندگی کے آخری لمحوں تک راس مسعود نے اقبال کی جتنی سچی رفاقت و اعانت کی۔ اور جس جس طرح حقِ دوستی ادا کیا اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ چنانچہ جس پُر سوز انداز میں انھوں نے بیگم مسعود کو تعزیتی خط لکھا ہے اُس سے ان کے گہرے جذباتِ غم کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے:۔

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۷

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۷ - ۳۲۸

"لاہور ـــ یکم اگست ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر لیڈی مسعود ـــ میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیونکر کروں جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے ۔ مرحوم سے جو میرے قلبی تعلقات تھے ان کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے اس بنا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دُکھ درد میں شریک ہوں ۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دل نوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔

مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اُس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا۔ اور جب تک جیا اس دل و دماغ سے ملک و ملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اُسے غریق رحمت کرے ۔ کل شام کے اخباروں سے معلوم ہوا کہ مرحوم کی میت علی گڑھ لائی گئی ہے ۔ اس وجہ سے میں نے کل صبح آپ کو بھوپال کے پتہ پر تار دیا تھا اور والدہ ماجدہ مرحوم کو علی گڑھ کے پتہ پر ۔ اس کے بعد ہزاکسیلنسی سردار صلاح الدین خان سلجوقی قنصل جنرل افغانستان مقیم شملہ کا تعزیتی تار بھی میرے نام آیا جس میں انھوں نے خواہش کی تھی کہ ان کا پیغام ہمدردی مرحوم کے اعزہ تک پہنچا دیا جائے ۔ یہ تار بھی میں نے بھوپال ہی بھیج دیا تھا ۔ اُمید کہ آپ تک پہنچ جائے گا۔ والدہ ماجدہ تک بھی سردار صاحب کا پیغامِ ہمدردی پہنچا دیجیے ۔ زیادہ کیا لکھوں۔ ہم سب پریشان ہیں اور خدا تعالیٰ سے آپ کے اطمینانِ قلب کی دعا مانگتے ہیں۔

والسلام ۔ محمد اقبال ۔

علی بخش آداب کہتا ہے اور بے حد رنج و غم کا اظہار کرتا ہے [۱]"

اقبال اور راس مسعود کے گہرے تعلقات کا بیگم مسعود سے زیادہ بھلا اور کسے علم ہو سکتا تھا ؟ کئی سال کی مسلسل قربت و وابستگی اور اقبال و راس مسعود کی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت اور دوستی ۔ ایک ہی خاندان کے رشتے میں بدل چکی تھی ۔ اس لیے وہ بیگم مسعود کو صبر و شکر کی تلقین کیا کرتے اور کس طرح کرتے جبکہ خود انھیں اپنے رفیق و جان نثار دوست کی جدائی پر قدرت سے شکایت تھی ۔ راس مسعود جس طرح اقبال کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے اور ان کے دُکھ سُکھ کے ساتھی بن گئے تھے ۔ اقبال بھی اسی طرح راس مسعود اور ان کے افرادِ خاندان کے دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک تھے ۔ اُن کا یہ لکھنا "جب تک زندہ ہوں آپ کے دُکھ درد میں شریک ہوں" اُن کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے ۔ حقیقتاً راس مسعود کی دل نوازی، بلند نظری اور سیر چشمی سے سبھی متمتع ہوئے ۔ اور مرتے مرتے وہ اتنے گہرے نقش چھوڑ گئے جو صدیوں تک اُن کی عظمت، اُن کی اعلیٰ صلاحیت کار، اُن کے جذبۂ خدمت گذاری و ایثار پسندی اور اُن کی اعلیٰ خاندانی روایات کے امین رہیں گے جن کا اعتراف خود اقبال نے بھی اس خط میں کیا ہے ۔ دوسرے ہی روز انھوں نے پھر ممنون حسن خان کو خط لکھ کر حالات دریافت فرمائے :۔

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۱ - ۳۹۲

"لاہور — ۲ راگست ۱۹۳۵ء[1]

ڈیر ممنون

میں آپ کے خط کا کئی دن سے منتظر ہوں مہربانی کر کے مفصل خط لکھیے۔ علی گڑھ کے خطوط سے معلوم ہوا کہ راس مسعود کے صاحبزادے انور ہندوستان میں ہیں۔ مجھے یہ بات پہلے معلوم نہ تھی۔ آج میں نے انھیں بھی خط لکھا ہے اطلاع دیجیے کہ آیا انور اپنے مرحوم باپ سے مل سکا یا نہیں نیز یہ کہ لیڈی مسعود صاحبہ کیسی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے خدانخواستہ وہ علیل نہ ہوں۔ ان کی صحت و عافیت سے جلد اطلاع دیں۔ میں ذرا سفر کے قابل ہولوں تو سید مسعود کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے علی گڑھ جانے کا قصد رکھتا ہوں، وہاں سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک دو روز کے لیے شاید بھوپال بھی آسکوں۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ بہت پریشان ہوں۔ خط کا جواب بہت جلد دو۔ والسلام

محمد اقبال[2]"

ان کی پریشانی مسلم تھی۔ راس مسعود کی میت علی گڑھ دفنانے کے لیے لے جائی گئی تھی۔ اس لیے وہ فاتحہ خوانی کے لیے علی گڑھ جانے کا قصد کر رہے تھے۔ اِدھر بیگم مسعود بھوپال میں تھیں۔ ان کی جانب سے بھی وہ فکرمند تھے اور بھوپال جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خود اُن کی صحت اِن دنوں تسلی بخش نہ تھی۔ مسعود کی اچانک موت کا ان پر شدید اثر پڑا تھا۔ چند ہی دنوں بعد انھوں نے پھر بھوپال خط لکھا:-

"۷ راگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب

مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے میں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

یہ رباعی میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے لکھی تھی۔ لیکن تقدیرِ الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔

لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگِ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں

---

[1] سہو کتابت ہے یہ خط ۲ راگست ۱۹۳۷ء کا ہوگا کیونکہ اس سے پہلے ۳۱ رجولائی ۱۹۳۷ء کا خط درج ہے اور ۲ر اگست کے بعد ۷راگست ۱۹۳۷ء کا۔ اس خط میں سید راس مسعود کی رحلت کا ذکر ہے۔

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۸ - ۳۲۹

بہتر ہوگا۔

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

باقی خیریت ہے۔ مسعود کا غم باقی رہے گا۔ جب تک میں باقی ہوں۔ میرے پہلے خط کا مفصل جواب دیجیے۔ والسلام
محمد اقبال [۱]"

راس مسعود سے اقبال کی عقیدت و محبت کی یہ انتہا تھی کہ جو رباعی انھوں نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے لکھ رکھی تھی۔ اُسے راس مسعود کی نذر کر دیا تھا۔ کیونکہ جن صبر آزما حالات میں اُنھیں مسعود کی جدائی کا غم سہنا پڑا تھا۔ وہ ان کی ذات سے زیادہ راس مسعود کی زندگی اور موت پر صادق آگئے تھے۔

اُن کے خط کا یہ جملہ ــــ "مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں ــــ"

اُن کے شدید غم اور قلبی تاثر کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔ کتبۂ مزار کے لیے صرف ایک شعر میں جو کچھ انھوں نے کہہ دیا ہے۔ بڑے بڑے دیوان بھی اس کی ترجمانی سے قاصر ہیں ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

اسی کے ساتھ اُن کا یہ کہنا ــــ "تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا" اس گہرے رنج و غم اور نفسیاتی ردِّ عمل کا اظہار ہے جو زندگی کے ایک عزیز ترین ساتھی کے بچھڑ جانے کے سبب رونما ہوتا ہے۔

راس مسعود کی وفات کے بعد بھوپال میں لے دے کر صرف اُن کے سیکریٹری ممنون حسن خاں ہی ایک ایسے نیاز مند اور معتمد رہ گئے تھے جن سے وہ بیگم مسعود، اُن کی بچی نادرہ، اُن کے دونوں بچوں انور اور اکبر اور بھوپال کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس خط میں لکھتے ہیں:۔

"لاہور ــــ ۲۳ راگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون

مسعود مرحوم کی وفات پر جو اشعار میں نے لکھے تھے وہ آج میں نے رسالہ اردو میں چھپنے کے لیے حیدر آباد دکن بھیج دیے ہیں۔ مدیر رسالہ مولوی عبدالحق "مسعود نمبر" نکالنے والے ہیں۔ امید کہ یہ رسالہ آپ کو بھوپال میں مل جائے گا۔ خود بھی پڑھیے اور لیڈی مسعود کو بھی سنائیے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خیریت سے آگاہ کیجیے۔ اکبر ولایت سے آیا یا نہیں اور انور کیا اس وقت بھوپال میں ہے؟ رشید صاحب بھوپال میں ہیں یا اندور چلے گئے؟ تمام حالات و کوائف سے مفصل آگاہ کیجیے۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت بھوپال میں ہیں یا شملہ میں؟ آپ بھوپال میں رہیں گے یا اعلیٰ حضرت کے اسٹاف میں لیے جائیں گے؟ موخر الذکر جگہ آپ کے لیے بہتر ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت ہے ــــ والسلام۔ آپ کا۔ محمد اقبال [۲]"

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۹ ـ ۳۳۰ [۲] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۰ ـ ۳۳۱

اس خط میں جتنے سوالات کیے گئے ہیں۔ اُن کا تمام تر تعلق بھوپال ہی سے ہے۔ رشید صاحب، راس مسعود کے خسر تھے۔ انور اور اکبر اُن کی پہلی بیوی سے دو بچے تھے۔ اکبر ولایت میں زیرِ تعلیم تھے۔ انور بھوپال آچکے تھے۔ ممنون حسن خاں کے مستقبل کے بارے میں بھی انھیں فکر تھی۔ اُن کا مشورہ یہی تھا کہ وہ نواب صاحب کے اسٹاف ہی میں شامل رہیں۔ انھوں نے نواب صاحب کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ اور اس طرح بھوپال سے اُن کا ربط و تعلق قایم تھا۔ اسی خط میں انھوں نے راس مسعود مرحوم کی وفات پر جن اشعار کا ذکر کیا ہے وہ پہلی بار بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مرتبہ رسالہ اردو کے "مسعود نمبر" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے۔ یہی اشعار بعد میں "ارمغانِ حجاز" میں "مسعود مرحوم" کے عنوان سے شامل ہوئے اور بقول مرتب اقبال نامہ ان اشعار میں اقبال نے موت و حیات کی کشود میں انسانی بے بسی کا ماتم کرتے ہوئے براہِ راست سر سید راس مسعود مرحوم کی وفات پر اپنے رنج و قلق کا اظہار کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

"رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالات، احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اُس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مُرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود
"دلے کہ عاشق و صابر بود، مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" [۱] - سعدی

جب تک شعر و ادب کی تابندگی باقی ہے اقبال کا یہ مرثیہ دونوں کی اَمٹ اور لازوال محبت کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ ممنون حسن خاں کا جواب ملتے ہی انھوں نے۔ پھر ممنون حسن خاں سے دریافت حال فرمایا:۔

"لاہور ــــ ۴ ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون ــــ

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکریہ۔ میں لیڈی مسعود صاحبہ کی طرف سے بہت متفکر رہتا ہوں مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی صحت پر مرحوم کی موت کا بہت خراب اثر پڑے گا۔ بچی کی صحت اور پرورش کے لیے ان کا تندرست رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس خیال نے کہ راس مسعود کوئی وصیت نہ کر سکے میرے افکار میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ آپ مجھ کو باقاعدہ خط لکھتے رہیے۔ انور، ریاض منزل، ہی میں ہیں، یا کسی اور جگہ میری طرف سے انھیں دعا کہیے۔ لیڈی مسعود صاحبہ کی خدمت میں حاضر

---

[۱] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۲ - ۳۹۳

ہو کر میری جانب سے بہت بہت سلام کہیے اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے عرض کر دیجیے جاوید سلمہٗ تندرست ہے اور آداب کہتا ہے۔ لاہور میں یکم اگست سے لے کر اس وقت تک کہ ۱۴ ستمبر ہے مطلق بارش نہیں ہوئی۔ ہاں شعیب صاحب کی خدمت میں سلام کہیے۔ والسلام۔ محمد اقبال [1]"

بیگم مسعود کی صحت، بچی کی پرورش و پرداخت اور راس مسعود کے وصیت نہ چھوڑنے سے وہ جس ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ یہ خط بخوبی اس پر روشنی ڈالتا ہے۔ ممنون حسن خاں کو باقاعدہ خط لکھنے کی تاکید بھی اسی لیے تھی کہ وہ مسعود مرحوم کے متعلقین کی خیر خبر اور حالات سے آگاہ رہیں۔ ان دنوں حقیقتاً وہ بے حد فکرمند اور پریشان تھے۔ اور اس پریشانی کا واحد سبب راس مسعود کی ناوقت موت تھی۔ راس مسعود کی والدہ علی گڑھ میں تھیں اور ان کی خیر خبر وہ اپنے عزیز دوست خواجہ غلام السیدین کی معرفت معلوم کر رہے تھے۔ ۲۵ ستمبر کا یہ خط اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں اُس رُباعی کا بھی ذکر ہے جو انھوں نے مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے ممنون حسن خاں کو بھوپال ارسال کی تھی:۔

"لاہور۔۔۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیئر سیدین صاحب۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ میں نے مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے ایک رباعی رباعیات میں سے انتخاب کر کے مرحوم کے سکریٹری ممنون حسن خاں کو بھوپال بھیجی تھی۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے اب تک علی گڈھ کیوں نہیں بھیجی۔ یہ رباعی حقیقت میں میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے لکھی تھی۔ میں ابھی ممنون حسن صاحب کو ایک خط لکھ کر دریافت کرتا ہوں۔ چند اشعار مرحوم کی وفات پر بھی لکھے تھے۔ جو رسالہ اردو کے مسعود نمبر میں شائع ہوں گے۔ اگر وہ رباعی جو میں نے بھوپال لکھ کر بھیجی تھی پسند آ گئی تو بہتر ورنہ اور فکر کروں گا۔ میری طرف سے مسعود مرحوم کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کیجیے۔ ذرا موسم اچھا ہو جائے تو میں خود بھی تعزیت کے لیے اور مرحوم کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے علی گڈھ حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وائس چانسلر مسٹر۔۔۔ M. L. A. Darling - Financial Commissioner ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ گو گذشتہ تین سال سے بوجہ علالت ان سے نہیں مل سکا۔ آپ اُن سے اس بارے میں خط و کتابت کریں [2] اس کے علاوہ آپ مسٹر عبدالحیٔ وزیر تعلیم کو لکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو اور انتظام بھی ہو سکتا ہے، باقی خیریت ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔۔۔ محمد اقبال [3]"

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۱ - ۳۳۲

[2] اقبال کے فلسفہ تعلیم کے متعلق "توسیعی خطبات" دیے جانے کی تجویز بعض احباب نے پیش کی تھی۔

[3] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۳۔

اس خط سے اور ممنون حسن خاں کے نام مشمولہ دیگر خطوط سے بھی یہ حقیقت عیاں ہے کہ راس مسعود کی وفات کے بعد انھیں مرحوم کے متعلقین کی کتنی فکر اور پریشانی لاحق تھی - والدہ مسعود علی گڑھ میں تھیں اور بیگم مسعود اور بچے بھوپال میں - اس زمانے کے وہ تمام خطوط جو خواجہ غلام السیدین کو انھوں نے علی گڑھ ارسال کیے اور جو خطوط ممنون حسن خاں کو بھوپال بھیجے - اُن میں سے بیشتر میں راس مسعود کے متعلقین ہی کا تذکرہ ملتا ہے - وہ تعزیت کے لیے علی گڈھ اور بھوپال جانے کا قصد رکھتے تھے - لیکن موسمی حالات اور خود ان کی صحت اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی - کتبۂ مزار کی رباعی ابھی تک علی گڈھ نہیں پہنچی تھی اس لیے اُسی روز جس روز اُنھوں نے مندرجہ بالا خط تحریر کیا - ممنون حسن خاں کو بھی خط بھیجا۔

"لاہور — ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون —

میں نے آپ کو جو رباعی مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے لکھ کر بھیجی تھی اس کی ایک نقل مجھے بھیج دیں - شاید آپ نے وہ رباعی ابھی تک علی گڈھ نہیں بھیجی - میاں انور ملیس تو اُن سے کہیے کہ میں نے جو کچھ ان کو لکھا تھا اس کے جواب کا منتظر ہوں - اُمید کہ لیڈی مسعود کا مزاج اب اچھا ہوگا - میری طرف سے بہت بہت دُعا کہیے —

مخلص — محمد اقبال[1]"

رباعی کی نقل طلب کرنے کے علاوہ انھوں نے راس مسعود کے صاحبزادے انور مسعود کا ذکر بھی اس خط میں کیا ہے جنھیں انھوں نے خط لکھا تھا - افسوس کہ یہ خط بھی سعی و کوشش کے باوجود نہ مل سکا - لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس خط میں انھوں نے ایک شفیق و رفیق سرپرست کی حیثیت سے انھیں مفید مشورے دیے ہوں گے - واقعتاً ایک فرد کی موت سے ایک خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا -

—— راس مسعود جن کی ساری عمر دوسروں کی خدمت اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں گذری - آج اُن کے افرادِ خاندان بے سروساماں تھے - اقبال کے لیے اس سے زیادہ سوہانِ روح اور کیا حقیقت ہوسکتی تھی —؟

ممنون حسن خاں نے فوراً ہی جواب دیا تو اقبال نے خط کی رسید بھیجتے ہوئے صورتِ حال سے مطلع کیا :-

"لاہور — ۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء

ڈیر ممنون صاحب —

آپ کا خط مل گیا - الحمد للہ کہ خیریت ہے - میری حالت بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے - لیکن ابھی طویل سفر کے لائق نہیں - انور کا خط بھی آج آیا تھا - ابھی اس کا جواب لکھا ہے - رباعی اور شعر جو آپ نے خط میں لکھے ہیں - والدہ ماجدہ مسعود مرحوم کی خدمت میں بتوسط خواجہ غلام السیدین بھیج دیے گئے ہیں کیونکہ سیدین صاحب کا خط اس بارہ میں مجھے چند روز ہوئے آیا تھا -

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ریاست بھوپال میں اسلامی فیملی لا کے متعلق علما کے مشورہ کا

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۲۳

بعد ایک Enactment (ضابطہ) وضع کیا گیا تھا۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو شعیب صاحب سے معلوم کیجیے اور اس کی ایک کاپی لے کر مجھے بھیج دیجیے۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ مسعود نہیں بھولتا۔ ڈاکٹر عبدالباسط کہیں مل جائیں تو ان سے میرا اسلام کہہ دیجیے۔ علیٰ ہٰذا القیاس خان بہادر ڈاکٹر احمد بخش اور ڈاکٹر رحمٰن صاحب کو بھی۔

والسلام — محمد اقبال[1]"

وہ جلد سے جلد بھوپال جانا چاہتے تھے۔ لیکن جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے۔ ابھی طویل سفر کے قابل نہ تھے۔ انور کو جو خط انھوں نے لکھا تھا۔ اس کا جواب انھیں مل گیا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب بھی اسی خط کے ساتھ انھوں نے لکھ دیا تھا۔ رباعی اور شعر جو ممنون حسن خاں نے نقل کر کے بھیجے تھے۔ وہ علی گڑھ غلام السیدین کو ارسال کر چکے تھے۔ اسلامی فیملی لا کے سلسلے میں علماء کے مشورے سے بھوپال میں جو ضابطہ وضع کیا گیا تھا۔ وہ اُسے دیکھنا چاہتے تھے جو غالباً اُسی کتاب کے سلسلے میں ہوگا جس کا وعدہ اُنھوں نے نواب صاحب بھوپال سے کیا تھا۔

اس خط کا یہ نقرہ — "مسعود نہیں بھولتا" ان کے دلی درد و کرب کا آئینہ دار ہے۔ وہ بھوپال کے اُن قابلِ قدر اور مشفق معالجین کو بھی نہیں بھولے تھے جنھوں نے اُن کا بھوپال میں علاج کیا تھا۔

——— ڈاکٹر عبدالباسط، خان بہادر احمد بخش، اور ڈاکٹر رحمٰن کو بھی اس خط میں انھوں نے یاد کیا ہے اور ممنون حسن خاں کے توسط سے سلام پہنچایا ہے۔ بھوپال اور بھوپال کی ممتاز شخصیتوں سے ابھی تک ان کا ذہنی اور روحانی تعلق برقرار تھا۔ کچھ عرصے خاموشی رہی۔ آخر اکتوبر میں انھوں نے بیگم مسعود کو خط لکھا:۔

"لاہور — ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء

ڈیر لیڈی مسعود صاحبہ — میں نے انور کے خط کا جواب لکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر الحسن پروفیسر علی گڑھ سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ وارڈن نیو کالج کو خود لکھ سکتے ہیں۔ مسعود مرحوم نے نیو کالج ہی میں تعلیم پائی تھی اور کالج کے موجودہ وارڈن غالباً ان کو جانتے ہیں۔ اس بنا پر جو تجویز آخری میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ظفر الحسن مذکورہ بالا کالج کے وارڈن کو یہ لکھیں کہ وہ انور کے لیے سر ہیری ہیگ گورنر یو۔ پی کو لکھیں کہ وائسرائے ہند انور کے خاندان کی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اس نوجوان کو جو اپنے قد و قامت اور تعلیم کے لحاظ سے ہر طرح موزوں ہے امپریل پولیس سروس میں لیے جانے کی سفارش کریں۔ اور چونکہ انور اس وقت نواب صاحب بھوپال کی سروس میں ہے اس لیے وائسرائے، اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے مشورت فرمائیں۔ یہ مختصر مضمون وارڈن کے اس خط کا ہونا چاہیے جو نیو کالج کا وارڈن سر ہیری ہیگ کو لکھے —

اگر انور کی درخواست پر اعلیٰ حضرت، وائسرائے کی خدمت میں سفارش کرنے کو خود تیار ہو جائیں تو یہ بات سب سے اچھی ہے۔ اس صورت میں وارڈن نیو کالج صرف

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۳ - ۳۳۴

سر ہیری ہیگ کی خدمت میں یہ لکھیں کہ انور کی بابت وائسرائے سے خود سفارش کریں۔
اگر اس تجویز سے آپ کو اتفاق ہو تو آپ ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کو علی گڈھ خط لکھ دیں
کہ وہ نیو کالج خط لکھ کر سر ہیری ہیگ کے نام سفارشی خط جلد منگوائیں۔

محمد اقبال[1]

جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے۔ انور مسعود، نواب صاحب بھوپال کی ملازمت اختیار کر چکے تھے لیکن ان کے مستقبل کی بہتری کے لیے انھوں نے نہایت قیمتی مشورے دیے تھے۔

انور امپیریل پولیس سروس میں جانے کے خواہش مند تھے جس کی دو ہی صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ نواب صاحب بھوپال وائسرائے ہند سے سفارش کر دیں۔ دوسری یہ کہ ڈاکٹر ظفر الحسن ۔نیو کالج کے وارڈن کے ذریعہ سر ہیری ہیگ۔ گورنر یو۔پی سے درخواست کریں کہ وہ وائسرائے ہند کو سفارش لکھ بھیجیں تاکہ انور مسعود کے خاندان کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں امپیریل پولیس سروس میں لے لیا جائے۔

یوں تو برصغیر کی تاریخ کا کوئی دور بھی سعی و سفارش سے خالی نہیں رہا لیکن قدرت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ راس مسعود جن سے ہر شخص نے بلا امتیاز فیض اٹھایا تھا۔ آج اُن کی اولاد ملازمت کے سلسلے میں دست گیری، اعانت اور سفارش کی محتاج تھی۔

---

[1] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۹۴ - ۳۹۵

دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ

۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کا دن حیدر آباد دکن کی ادبی تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب اہل حیدر آباد دکن نے باغ عامہ[1] کے ٹاؤن ہال میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں "یوم اقبال" مناکر زندہ دوستی کی عظیم روایت کا آغاز کیا۔ اس پر شکوہ تقریب کی صدارت ولی عہد شہزادۂ برار نے کی اور ملک کی جن گراں مایہ شخصیتوں نے "یوم اقبال" کے لیے اپنے خصوصی پیغامات سے نوازا اُن میں نواب حمید اللہ خاں، ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، ہز ہائینس آغا خاں، مسز سروجنی نائیڈو اور پنڈت جواہر لال نہرو قابلِ ذکر ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں کے پیغام سے اُن کی اقبال شناسی اور دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ پیغام میں لکھتے ہیں:—

> "مجھے مسرت ہوئی کہ "یوم اقبال" ہز ہائینس پرنس آف برار ولی عہد خانوادۂ آصفی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قومیت کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کر ان میں احساسِ بیداری پیدا کر دیا[2]۔"

واقعہ یہ ہے کہ بھوپال کے علاوہ اگر ہندوستان کی کسی اور ریاست نے اقبال سے اپنی گہری وابستگی اور اقبال شناسی کی بنا ڈالی تو وہ صرف ریاست حیدر آباد دکن تھی۔ جہاں اقبال پر سب سے زیادہ کام ہوا۔ ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا۔ اُن کے افکار و خیالات سے حیدر آباد کے سرمائے میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اُن کی خدمات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن حالات اور قسمت نے یاوری نہ کی ورنہ اقبال حیدر آباد ہی کے ہو رہتے اور نواب حمید اللہ خاں کو وہ فخر و امتیاز نصیب نہ ہوتا جو راس مسعود کے توسط سے اقبال کو اپنا کر انھوں نے حاصل کیا۔

ابھی "یوم اقبال" کو بمشکل چار ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اقبال کی صحت نے جواب دیدیا۔ وہ گزشتہ چھ ماہ سے شدید بیمار تھے۔ راس مسعود کی موت نے انھیں گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا جس کا اندازہ اُن کے آخری دور کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اقبال نے اپنی وفات سے صرف دو روز پہلے کا ایک خط بھی بھوپال

---

[1] حیدر آباد دکن کا مشہور باغ۔

[2] اقبال اور حیدر آباد۔ صفحہ ۲۵۔

ہی روانہ کیا۔ جس کے متن سے اُن کی علالت، آنکھوں کے آپریشن اور دمے کی زیادتی کا علم ہوتا ہے۔ اس خط میں "بشرطِ زندگی" کا ٹکڑا نہایت معنی خیز ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اب زندگی پر سے اُن کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"جاوید منزل ۔لاہور

۱۹ را پریل ۱۹۳۸ء

ڈیر ممنون ۔

آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس کہ شدید علالت کی وجہ سے جواب نہ لکھوا سکا۔ دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا مگر اب خدا کے فضل سے کچھ افاقہ ہے مگر کلی طور پر ابھی صحت نہیں ہوئی۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا مگر دمے کی وجہ سے اُسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرطِ زندگی انشاء اللہ ستمبر میں ہوگا۔ حیات[1] صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہیے۔ اب آپ کے فرائضِ منصبی کیا ہیں۔ کیا آپ اعلیٰ حضرت کی پیشی میں ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص محمد اقبال[2]"

کسے معلوم تھا کہ مفکرِ اسلام، شاعرِ مشرق اور دانائے راز کا یہ آخری خط بھی اُسی بھوپال کا مقدر تھا جسے "دار الاقبال" بننے کا شرف نصیب ہوا۔ جس کے والیٔ ریاست کو اقبال کی ذاتی شفقت و محبت میسر آئی اور جس کی ریاست کے در و دیوار اقبال کی نغمہ سرائی سے گونجتے رہے۔

یہ وہی بھوپال تھا جس سے اقبال کی وابستگی کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ اور اب یہ وہی بھوپال ہے جس کے ایک فرزند ممنون حسن خاں کے نام وہ آخری خط ۱۹ را پریل ۳۸ء کو تحریر کرتے ہیں اور تیسرے روز اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ۲۱ را پریل ۱۹۳۸ء کی صبح یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مدارس، دفاتر، بازار بند ہو گئے اور پورے شہر نے ماتمی لباس پہن لیا۔ ایک بھوپال ہی پر کیا منحصر تھا۔ اُن کی موت نے تو پورے ہندوستان کو اور بیرونی دنیا کو سوگ میں لپیٹ لیا تھا۔ اتنے عظیم شاعر۔ اتنے بلند پایہ مفکر۔ اتنے بڑے انسان دوست اور مصلحِ قوم کی موت۔ ایک ایسا المیہ تھا جس نے ہر قلب کو متاثر کیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ سچ پوچھیے تو اقبال کی موت۔ ایک عہد کی موت تھی اور رونے والوں کے آنسو تک خشک کر گئی تھی۔

بلاشبہ اقبال اُن خوش نصیبوں میں شامل تھے جن کی زندگی میں ہی اُن کے قدرداں پیدا ہو گئے تھے جکیم یوسف حسن، مدیر ماہنامہ "نیرنگِ خیال" نے اُس زمانے میں جب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے تھے۔ "اقبال نمبر" شائع کیا تھا اور اس طرح اردو رسائل کی تاریخ میں زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کی روایت کا آغاز ہو گیا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں نے اُن کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں اُن کی ہر ممکن مالی اعانت کی تھی۔ وفات سے چار ماہ قبل حیدر آباد دکن کے اقبال شناسوں نے "یومِ اقبال" منا کر شاعرِ مشرق کو شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ لیکن آج پورے برِ صغیر میں اُن کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ سچ ہے موت برحق ہے اور اس پر کو

---

[1] حسن محمد حیات ۔ سکریٹری لیجسلیٹو کونسل بھوپال۔

[2] اقبال نامہ (جلد اول) صفحہ ۳۳۵

تح حاصل نہیں کرسکتا۔ اقبال بھی اپنی مسلسل گرتی ہوئی صحت اور کمزور وناتواں قویٰ کے ہاتھوں موت پر فتح نہ پاسکے لیکن پوری قوم کو بیدار کرکے جینے کا سلیقہ، حوصلہ اور درس عمل دے گئے۔ اُن کی موت پر جگہ جگہ تعزیتی جلسے اور قرار دادیں منظور کی گئیں۔ وفات کے تیسرے دن ایک بڑا اور یادگار تعزیتی جلسہ بھوپال میونسپلٹی کے وسیع میدان میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی صدارت اقبال کے ایک دیرینہ نیاز مند سلام الدین خاں (سابق مشیر المہام صیغۂ قانون وانصاف) نے فرمائی۔ جلسہ کی روداد ملاحظہ ہو:۔

"جلسہ کا افتتاح قرآن حکیم کے پارہ سیقول کے دوسرے رکوع سے کیا گیا۔

بعدازاں صاحب صدر کی اجازت سے جناب چودھری محمد اطہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بلدہ بھوپال نے ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ یقیناً درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ نے علامہ سر محمد اقبال تاج دار سخن کی زندگی پر مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کو انعقاد جلسہ کی غرض سے آگاہ فرمایا۔

اس کے بعد آفاق حسین صاحب۔ ہیڈ ماسٹر جہانگیریہ اسکول نے علامہ اقبال کی ذاتی خصوصیات اور شاعری سے بہت وضاحت کے ساتھ حاضرین کو متاثر فرمایا۔

تیسرا نمبر بھوپال کے ایک سنسکرت عالم پنڈت لچھمن جی آیا کا تھا۔ آپ کی تقریر کا موضوع اقبال کی مشرق سے محبت تھا۔ آپ نے ان شعروں سے تقریر کا آغاز فرمایا؎

دلا نا داتیٔ پروانہ تا کے	نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را ز سوزِ خویشتن سوخت	طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے

ازاں بعد جناب مولوی عبدالرزاق مؤلف "البرامکہ" اور جناب سعید رزمی نے ریزولیوشن کی تائید میں جو تقریریں فرمائیں اُن میں اقبال کی شاعری اور اُن کے نظریہ کی خصوصیات کی وضاحت میں خاص خاص چیزوں کو پُر سوز الفاظ میں دوسرے نامور شعراء سے مقابلہ کرتے ہوئے حالی مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ لیکن اقبال مرحوم کی اس خصوصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا کہ مرحوم نے فنی اور ذہنی حیثیت سے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ نظام قدرت نے جو فضا پیدا کر رکھی ہے اُس سے وہ متاثر تھے۔

دوسرا تعزیتی جلسہ بھوپال کے تمام خادمان علم وادب کا زیر صدارت مولانا سید حامد رضوی وکیل، دفتر ندیم میں ۲۴ر اپریل ۱۹۳۸ء بوقت ۶ بجے شام منعقد ہوا۔ ذیل کے حضرات نے جلسہ میں شرکت فرمائی:۔

۱۔ مولانا سید حامد رضوی صاحب۔ وکیل سابق ممبر لیجسلیٹو کونسل بھوپال۔

۲۔ مولانا ارشد تھانوی صاحب۔ وکیل۔ ۳۔ مولانا عبدالجلیل صاحب مائل نقوی۔

۴۔ مولوی محمد احمد سبزواری۔ بی۔ اے (عثمانیہ) ۵۔ محمود الحسن صدیقی۔ بی۔ اے علیگ۔ مدیر ندیم۔ ۶۔ مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم توخانہ ۷۔ ضیاء الملک

ملارموزی۔ ۸۔ ماسٹر ناصر علی صاحب ناصر آبادی ۹۔ ماسٹر سلیمان محمد خاں صاحب آرزو
۱۰۔ جناب سید حسن بی۔اے علیگ ۱۱۔ جناب مرزا مظفر سیفی۔ مدیر معاون ندیم۔
۱۲۔ منشی سید لطف علی صاحب اسسٹنٹ ریونیو سکریٹری دیوڑھی عیدگاہ کوٹھی۔
۱۳۔ مولوی عبدالقیوم صاحب ۱۴۔ منشی ظہورالحسن صاحب ۱۵۔ منشی محمد اسمٰعیل صاحب
ہاتف ۱۶۔ منشی مطلوب عالم صاحب فاروقی ۱۷۔ منشی رحم حسین صاحب
۱۸۔ مولانا احسان رسول صاحب ۱۹۔ جناب نفیس احمد فاروقی ۲۰۔ جناب مصباح الدین
احمد ۲۱۔ منشی نواب حسن صاحب ۲۲۔ منشی شبیر حسن صاحب ۲۳۔ منشی قریش میاں وغیرہ

جلسہ کا افتتاح تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مولانا احسان رسول صاحب نے سورۂ یٰسین کے تیسرے رکوع کی قرأت فرمائی۔ اس کے بعد ذیل کے تین ریزولیوشن جلسہ میں پیش ہو کر باتفاق رائے منظور ہوئے :۔

۱۔ بھوپال میں شیفتگان اور خادمان علم وادب کا یہ غیر معمولی جلسہ مشرق کے "شاعر اعظم" ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی۔ بارایٹ لا کے بے وقت اور پُرالم سانحۂ وفات پر اپنے انتہائی حزن وملال کا اظہار کرتا ہے اور اس کو ملتِ اسلامیہ کے لیے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ عالم اسلامی کو آپ کی حکیمانہ رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔

۲۔ یہ جلسہ ہندوستان کے بلند پایہ شاعر، مفکر اور قائد کے (کی) ان تمام علمی، ادبی اور ملی خدمات کا دلی جذبات محبت وعقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اور ان کو ملتِ اسلامیہ کے لیے خصوصاً اور تمام مشرقی اقوام کے لیے عموماً باعثِ احیاء وبیداری قرار دیتا ہے۔

۳۔ یہ جلسہ علامہ خلد آشیاں کے تمام اعزا اور پس ماندگان کے ساتھ اس ماتم خیز سانحہ پر دلی رنج والم کے ساتھ پُر خلوص ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

صاحبِ صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ "مجھ پر ایسے جلسۂ تعزیت کی صدارت کا بار رکھا گیا ہے جس سے ہمارا دل دردوغم سے نڈھال ہے۔ اس لیے کہ ہم سے آج وہ چیز چھین لی گئی ہے جس کی ابھی ہماری قومی وملی بلکہ ملکی اور سیاسی زندگی کے لیے سخت ضرورت باقی تھی اور جس کا بدل اس وقت مستقبل قریب میں ہم کو نظر نہیں آتا۔ اُن کی شاعری جو اپنے رنگ کی نرالی تھی نہ صرف مسلمانوں کے درد سے مملو تھی بلکہ سارے ہندوستان اور ایشیا کا اس میں درد بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔!

اس کے بعد جناب محمود الحسن صدیقی۔ اڈیٹر ندیم نے علامہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت پر روشنی ڈالی جو صحیح طور پر قابلِ تحسین وتشکر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

"مشرقی اقوام کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً زندگی کا نظریہ یہ ہے کہ حالات و واقعات نے انسان پیدا کیے یا انسان حالات و واقعات پیدا کرتا ہے ؟ اقبال کے مشن نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان حالات کو بدل لیتا ہے۔ اس بلند پایہ مفکر، بلند مرتبہ شاعر و ادیب نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس کے اندر زندگی اور جوشِ ملّی پیدا کیا۔ اس سلسلے میں حالی کا نام بھی لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ لیکن اقبال کی شاعری میں بلندی و عظمت اور انقلاب پیدا کرنے والی قوت مضمر ہے گو ہم اقبال کی خدمت کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن ہم اس کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔

جناب سبزواری نے فرمایا کہ اقبال کی وفات سے ملک و قوم اور ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ آپ نے اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اقبال نے اُردو ادب میں ایک جدید دور کا آغاز کیا۔

جناب ارشد تھانوی نے کہا کہ اقبال نے اس دور میں جنم لیا جب کہ شعر و شاعری میں داغ کے رنگ کو پسند کیا جاتا تھا اور ہر شاعر داغ کا تتبع کرتا تھا۔ اس وقت چند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اس پرانے رنگ کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی اس میں علامہ اقبال۔ مولانا حالی اور پروفیسر آزاد کا خاص حصّہ ہے۔ اقبال ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جناب مرزا مظفر سیفی نے کہا کہ اقبال بحیثیت شاعر نہ صرف اُردو شاعری کے لیے باعثِ افتخار تھے بلکہ اُن کی شخصیت ہندوستان کے لیے، ایشیا کے لیے اور عالمِ اسلام کے لیے بھی مایۂ ناز تھی۔ اقبال نے جس نظریہ کے تحت مسلم اقوام کے احیاء کا مسئلہ پیش کیا وہ دوسرے الفاظ میں خود اقبال پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔ یعنی قوم میں سے بعض جلیل القدر افراد آگے چل کر اپنی قوموں کو بنایا کرتے ہیں۔

دنیا کی تمام قوموں نے اقبال کی بین الاقوامی شخصیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جرمنی نے کہا "اقبال کی شاعری اور فلسفہ گوئٹے کا مرہونِ منت ہے" اطالیہ نے کہا "اقبال نے ہم سے سب کچھ سیکھا ہے" فرانس نے کہا "اقبال ہمارا ہے" حالانکہ اقبال وہی کہہ رہا ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کہا جا چکا ہے۔ غرض وہ بین الملّی اتحاد کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

پہلی مئی (۱۹۳۸ء) کے اخبار ندیم میں ایک طویل اداریہ لکھا گیا۔ جس میں علامہ کے انتقال پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی۔ اداریہ میں کہا گیا۔

"اقبال مرحوم اُن انقلاب انگیز شعراء میں سے ہیں جن کی تخلیق ہنگامی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں ایک عظیم الشان مشن لیے ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ اس مشن کو پھیلاتے ہیں۔ اس سبق کو خفتہ بخت قوم کو یاد دلاتے ہیں جو وہ بھول چکی ہوتی ہے۔ اس کے اجزائے قومیت میں ہم آہنگی پیدا کر کے، اس کے پریشان

اور منتشر شیرازہ کو یک جا کرتے ہیں، اس کی اساس ملت کو استوار اور مستحکم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ملہم غیبی کی آواز ہوتی ہے ان کا ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے، سوز و گداز ہوتا ہے اور وہ برق آشنا تڑپ ہوتی ہے جس سے ایک مضمحل اور پس ماندہ قوم کے قویٰ میں حیات کے شرارے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً قوم کے مستقبل کے بانی ہوتے ہیں۔ وہی ملت کے محسن، حقیقی راہبر اور صحیح معنوں میں مجدد اعظم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اقبال بھی ہندوستان بلکہ عالم مشرق کے زندۂ جاوید شعراء میں سے ہیں[۱]۔"

اقبال کی وفات کے بعد مقامی جریدوں میں اُن کی اعلیٰ شاعری اور اُن کے بلند نصب العین پر کئی مضامین شائع ہوئے جو افسوس کہ تلاش و کوشش کے باوجود نہ مل سکے۔ البتہ ہفت روزہ "ندیم" کے چند مضامین کا اشارہ آیندہ صفحات میں شامل ہے۔

اقبال کے سانحۂ ارتحال پر بھوپال کے جن مقتدر شعراء نے مرثیے لکھ کر اظہار عقیدت پیش کیا اُن میں علامہ محوی لکھنوی، جناب حامد سعید خاں حامدؔ، جناب مائل نقوی، جناب حبیب الحسن صاحب قادری، جناب اختر سعید خاں کے اسماء گرامی ہمیں عبدالقوی دسنوی کے کتابچہ "علامہ اقبال بھوپال میں" ملتے ہیں۔ ان تمام شعرائے گرامی کے مرثیے اُن کی نظر سے گزرے تھے۔ لیکن انھوں نے صرف ایک مرثیہ مائل نقوی کا شامل کتابچہ کیا۔ چنانچہ میں نے انھیں لکھا کہ دیگر حضرات کے مرثیے نقل کرا کر براہ کرم مجھے بھجوا دیں تاکہ میں اپنی کتاب میں محفوظ کر دوں۔ انھوں نے وعدہ کیا۔ لیکن افسوس کہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ جب میں خطوط لکھ لکھ کر مایوس ہو گیا تو میں نے اپنے وسائل سے کام لیا اور میری خوش نصیبی کہ مجھے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ بھوپال کی مایۂ ناز شاعرہ مہ جبین خمار کا اُن کے بھتیجے مسیح صدیقی کے توسط سے دستیاب ہو گیا اور دوسرا مرثیہ بھوپال کے بزرگ و محترم شاعر حامد سعید خاں حامدؔ کا ــ اُن کے صاحبزادے اظہر سعید خاں کے ذریعہ مل گیا۔ تلاش سے یہ بھی پتہ چلا کہ باسط بھوپالی اور احسن علی خاںؒ نے بھی اقبال پر معرکہ آرا نظمیں لکھی تھیں جو ہر ممکن کوشش کے باوجود مجھے نہ مل سکیں۔ ہفت روزہ ندیم کی فائلیں جن کی فراہمی کے لیے میں نے کوئی ۱۱ سال سعی وجہد کی کسی جگہ دستیاب ہو جاتیں تو وہ تمام سرمایہ یک جا ہو جاتا یا کم از کم اُن مضامین کی ایک مکمل فہرست ہی تیار ہو جاتی جو اقبال پر نظم و نثر کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اقبال پر بھوپال کے رسائل و جرائد میں اَن گنت قیمتی مضامین نظم و نثر شائع ہوئے تھے جو اب دست برد زمانہ کے ہاتھوں اوراق گم گشتہ بن چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھوپال کا کوئی ہونہار محقق اُس تمام ادبی سرمایہ کو تلاش و یک جا کر کے شائع کر دے جو رسائل و جرائد میں بکھرا پڑا ہے۔ اس طرح آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں گی۔

بھوپال علم و ادب کا ایک بڑا مرکز ہونے کے باوجود اخبارات و رسائل کی مسلسل اشاعت کے سلسلے میں بہت بدنصیب واقع ہوا تھا۔ یوں تو وہاں سے "ظل السلطان" "نگار" "افکار" "جادہ" "کردار" اور کتنے ہی رسالے شائع ہوئے لیکن کچھ مدت بعد بند ہو گئے یا بھوپال سے کہیں اور منتقل ہو گئے۔ بہر حال یہ ایک الگ داستان ہے۔

---

[۱] علامہ اقبال بھوپال میں۔ صفحہ ۵ تا ۶۲

۲۔۳۔۴۔ ان شعرا کی نظمیں اس باب کے آخر میں ملاحظہ ہوں۔

گزارش کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آج جب گزشتہ نصف صدی کے ادبی ذخیرے کی تلاش کی جا رہی ہے تو رسالوں اور جریدوں کی فائلیں نایاب ہوگئی ہیں جس میں کتنے ہی قیمتی ادب پارے اور کتنی ہی عظیم و پرمایہ شخصیتیں جو بجا طور پر بھوپال کے شعر و ادب اور علم و فن کی آبرو کہی جا سکتی تھیں۔ دفن ہو کر رہ گئی ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ مہ جبین خمار کا غیر مطبوعہ مرثیہ وفات کے فوراً بعد اُنھوں نے لکھا تھا جس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ مہ جبین خمار کے مختصر حالات زندگی آئندہ صفحات میں شامل ہیں۔ اُن کے مرثیہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ اقبال سے کتنی گہری عقیدت رکھتی تھیں۔ مرثیہ کا ہر شعر ان کے دلی جذبات غم کا آئینہ دار ہے۔ یہ مرثیہ اقبال کی وفات کے تقریباً ۳۵ سال بعد پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

فغانِ غم دریادِ اقبال

قرطاس کو تحملِ تحریرِ غم نہیں — اظہارِ اضطراب مجالِ قلم نہیں
اقبالِ سربلند کی رحلت کا سانحہ — کرب و بلائے یوم تغابن سے کم نہیں
طوفانِ نوح شدتِ گریہ سے آشکار — اشکوں پہ اختیار ذرا چشمِ نم نہیں
ہنگامۂ نشور بپا شورِ آہ سے — صد حیف! نالہ در خورِ ضبطِ الم نہیں
آئی ندا لحاظِ مشیت ضرور ہے — ترکِ حدودِ صبر، بساطِ قدم نہیں
حکمِ قضا ہے زندگیٔ نو کا راز دار — حیرت ہے آگہیٔ رموزِ حکم نہیں
عازم ہے روح منزلِ تکمیل کی طرف — اس مرحلہ پہ بحثِ وجود و عدم نہیں

ہستی کہ در ازل اثرِ ارتقا گرفت
در مرگ و زیست سعیِ جہادالبقا گرفت

اقبال کو ملی تھی سرافرازِ زندگی — جس پر ہمیشہ کرتی رہی ناز زندگی
پاکیزہ خو، بلند خصائل، نکو شعار — ان خوبیوں سے پائی تھی ممتاز زندگی
اسرارِ کائنات ہیں الہام و شعر میں — شاعر کا دل صحیفۂ صد راز زندگی
کب موت کے جمود میں تبدیل ہو سکا — وہ نغمہ تھا جو وقفِ تگ و تاز زندگی
انجام زیست نذرِ سکوتِ فنا نہیں — ہستیٔ نو کا کرتی ہے آغاز زندگی
کرتی ہے انکشاف عروجِ جہات کا — دائم بہ اوج مائلِ پرواز زندگی
فردوس کی فضائے درخشاں میں تابناک — دنیائے ارتقا کی عمل ساز زندگی

چوں نعمتِ بہشت بہ جہدِ رواں رسید
روحِ جبری بہ زندگیٔ جاوداں رسید

اقبال چوں بہ روضۂ جنت در آمدہ — گُکنوں بہارِ گلشن رحمت در آمدہ
گفتند حوریاں کہ زہے اوجِ قسمتم — نو بادۂ حدیقۂ عزت در آمدہ
چندیں عروجِ شوکتِ طوبیٰ بہم نہ یافت — آں سرو با تفاخرِ رفعت در آمدہ
بآں ساعتِ کہ محفل فردوس نظم جست — آں شمعِ دل نشیں بہ جلالت در آمدہ

بابوئے جاں دراز عنبر زمانہ بود — اکنوں بہ خلد آں گُلِ عظمت درآمدہ
از باغِ دہر قصدِ نعیمِ جناں گرفت — باصد ہزار شان و شہامت درآمدہ
در ظلِّ ایزدی شرفِ ذو المقام یافت
قدرش بہ بیں خمار فروغِ دوام یافت — (مہ جبین خمار)

اس مرثیہ سے اگر ایک طرف مہ جبین خمار کے ذاتی غم اور اُن کی دلی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ مرثیہ بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کے دلی رنج و غم کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

وہ اگرچہ اُس وقت بھوپال ہی میں تھیں لیکن ایک پردہ نشین خاتون تھیں اس لیے اُنھیں اقبال سے نیازمندی کا شرف تو حاصل نہ ہو سکا لیکن اقبال نے اُن کا کلام اُن کے بھائی معظم رسول صدیقی کی زبانی سے سُنا اور پسند کیا اور اُن کے مجموعہ کی اشاعت کے سلسلے میں انھیں مشورہ بھی دیا۔ آیندہ باب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

حامد سعید خاں حامد۔ بھوپال کے ایک جاگیردار خاندان کے ذی علم اور صاحب طرز شاعر تھے اور ان کا شمار بھوپال کے صفِ اول کے شعراء میں کیا جاتا تھا۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بھوپال سے ایک رسالہ "محسن الملک" بھی جاری کیا تھا جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ شہید ٹونکی سے آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا اور وسط ہند کے غزل گو شعراء میں بلاشبہ آپ کی حیثیت منفرد تھی۔ آپ کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری کی رائے ہے ——

"حامد بھوپالی کی شاعری صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے کلاسیکل قسم کی چیز ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جسے قدماء و متاخرین کے تغزل کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ ٹھہراؤ کے ساتھ متانت ان کی خاص خوبی ہے۔"

۱۹۴۱ء میں جب نواب حمید اللہ خاں نے بھوپال میں سالانہ مشاعروں کی طرح ڈالی تو اقصائے ہند کے بلند پایہ شعراء مثلاً جوش، فانی، جگر، سیماب، حفیظ، فراق وغیرہ ہر سال بھوپال آنے لگے۔ یہ مشاعرہ شہر کی حسین عمارت "صدر منزل" میں عرصہ تک منعقد ہوتا رہا۔

ان مشاعروں کے خصوصی کارپردازوں میں حامد سعید خاں کی ذاتِ گرامی بھی شامل رہتی تھی۔ اور بیشتر شعراء مشاعرہ کے بعد حامد صاحب کی ذاتی دعوتوں اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس طرح حامد صاحب کی ذات بھوپال کے لیے ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ افسوس کہ بھوپال کا یہ مایۂ ناز فرزند فروری ۱۹۶۰ء میں ہم سے جدا ہو گیا ورنہ اقبال سے ذاتی ملاقاتوں کا کچھ اور مستند حال احوال ہم تک پہنچ جاتا جن سے وہ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران متمتع ہوئے تھے۔ ذیل کا مرثیہ جو انھوں نے اقبال کی وفات پر لکھا ہے اُن کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں فنی پختگی ہی نہیں۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا پُرشکوہ اعتراف بھی ہے۔ یہ غیر مطبوعہ مرثیہ بھی پہلی بار شائع ہو رہا ہے ؎

اقبال

پیکرِ اقبال جب تخلیق فرمایا گیا!
یعنی بزمِ آب و گِل میں جب لے لایا گیا
نُطقِ جبریلِ امینِ معتبر بخشا اُسے
خود بنایا اور پھر خود غور سے دیکھا اُسے

کوثر و تسنیم کی موجوں سے نہلایا اُسے
خلعتِ پیغمبریٔ شعر پہنایا اُسے
روحِ سوزِ عشق اُس کے جسم میں پھونکی گئی
پیرِ رومی کی امانت سب اُسے بخشی گئی
شاعری کا تاج اُس کے فرق پر رکھا گیا
علم و حکمت کا خزانہ سب اُسے بخشا گیا
قوم کے جذباتِ دل کی ترجمانی دی گئی
ترجمانی دی گئی، جادو بیانی دی گئی
فرشِ پاانداز اُس کا آسمانوں سے بلند
آدمی لیکن فرشتوں کی صفوں میں ارجمند
طائرِ سدرہ نشیں کو دام میں لائے ہوئے
اور اس کے بعد بھی آغوش پھیلائے ہوئے
بلبلِ شیراز کے نغموں کو دُہراتا ہوا
زندگی کے راستوں میں پھول برساتا ہوا
جنت الفردوس کی ساری بہاروں کو لیے
شعر و نغمہ کے ہزاروں آبشاروں کو لیے
زندگی بھی ساتھ میں، تابندگی بھی ساتھ میں
بے خودی بھی ساتھ، اسرارِ خودی بھی ساتھ میں
آہ وہ شمعِ ضیا افروز اب ہم میں نہیں
ہم تو ہیں لیکن وہ ساز و سوز اب ہم میں نہیں

جسم ہے لیکن حقیقی روح رخصت ہو گئی
قوم پر قبل از قیامت اک قیامت ہو گئی

(حامد سعید خاں حامد)

عبدالجلیل مائل نقوی ۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ــــــ

ــــــ "بھوپال کے کہنہ مشق اور ذی علم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ سر راس مسعود کے خاص آدمی تھے ۔ سر راس مسعود کی ہی تحریک اور امداد سے انھوں نے سحر بھوپالی کا کلام جمع کر کے "بیاضِ سحر" کے نام سے شائع کیا ۔ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے ۔ غزل کے علاوہ قصیدہ اور تاریخ کہنے میں بھی مہارت کامل رکھتے ہیں ابھی بقیدِ حیات ہیں اور پاکستان منتقل ہو گئے ہیں ۔ ابتدا میں شعری بھوپالی نے انھیں سے اصلاح لی تھی ۔ بعد میں ذکی وارثی سے اصلاح لینے لگے"[1]

---

[1] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ ۔ صفحہ ۲۸۲

مائل نقوی۔ بیک وقت نظم و نثر پر قادر ہیں۔ نظامی بدایونی کا ایک مضمون بعنوان "سر راس مسعود اور اردو ادب" "مرقع مسعود" میں شامل ہے جس کا ایک اقتباس مائل نقوی کی ادبی حیثیت اور اُن کے راس مسعود سے قریبی تعلقات اور راس مسعود کے اُن کارناموں پر خاصی روشنی ڈالتا ہے جو انھوں نے بھوپال کی ملازمت کے مختصر سے عرصہ میں علم و ادب کے فروغ کے لیے انجام دیں۔ لکھتے ہیں:۔

"یہ مضمون ختم نہ کرنے پایا تھا کہ انجمن ترقی اردو بھوپال[1] کے معتمد حضرت مائل نقوی کا ایک مضمون "زمانہ[2]" میں نظر سے گزرا جس میں انھوں نے سر راس مسعود کی ان دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جو بھوپال کی ادبی فضا میں اُن سے ظہور میں آئیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے وہاں دار التصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور اس ادارہ کو وہ بڑے پیمانہ پر عملی صورت اس طرح دینا چاہتے تھے کہ کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر ایک درجن کوٹھیاں تعمیر کرائی جائیں اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کرکے اُسے جملہ لوازمات سے مکمل کردیا جائے۔ پھر ہر فن کے ماہر کی خدمت کم از کم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پر حاصل کی جائے اور اُن سے یہ معاہدہ کرلیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علایق سے منقطع ہوکر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کردیا کریں۔ انھوں نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ اس رقم کو آسانی سے جمع کرلیں گے۔ جگہ کا بھی انتخاب کرلیا تھا جس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ میری زندگی کا یہ آخری زمانہ ہوگا۔ لیکن مشیت کو یہ منظور نہ تھا۔

مائل صاحب کے اس مضمون کو پڑھ کر مجھے مرحوم کے اس خط کا خیال آگیا جو ۱۹۳۶ء[3] میں انھوں نے مجھے بھوپال بلانے کے لیے بھیجا تھا کہ ہو نہ ہو اس اسکیم کے متعلق مشورہ کے لیے میری طلبی ہوئی ہوگی[4]"

اقبال کی وفات کے فوراً بعد مکتبۂ جامعہ دہلی نے "جوہر" کا شمارۂ خصوصی بیاد علامہ اقبال شائع کیا تھا۔ اس جامع اور مستند خصوصی شمارے میں جن اکابر اور مشہور و ممتاز شخصیتوں کے مضامین نظم و نثر شامل ہیں اُن میں علامہ سید سلیمان ندوی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر سید نواب علی، پروفیسر غلام السیدین، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، مولانا محمد اسلم جیراج پوری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، ڈ

---

[1] "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں تقسیم سے قبل کے علمی و ادبی اداروں کی جو فہرست دی گئی ہے اُس میں مائل نقوی کے نام کے ساتھ "انجمن اردو" تحریر کیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۵۹

[2] یہ مشہور رسالہ دیا نرائن نگم کی ادارت میں کانپور سے شائع ہوتا تھا۔

[3] یہ وہی زمانہ ہے جب اقبال علاج اور قیام کے سلسلے میں بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے راس مسعود نے اپنی اس اسکیم کے سلسلے میں اقبال سے بھی مشورہ کیا ہو۔

[4] مرقع مسعود۔ صفحہ ۶۴ - ۶۵

مولانا سعید احمد اکبرآبادی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر سید نواب علی اسلامی تاریخ پر سند کا درجہ رکھنے کے علاوہ اردو اور فارسی میں شعر گوئی کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ خصوصی شمارہ جوہر کے "اقبال نمبر" میں اُن کا معرکۃ آرا مضمون مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" شامل ہے جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اسی نمبر میں آپ کی بلند پایہ فارسی نظم بھی صفحہ ۸۰ پر شریکِ اشاعت ہے۔ جو پیشِ خدمت ہے۔ عنوان ہے :۔

یادِ اقبال

بلند پایہ سخن ور حکیمِ ہند اقبال — چو بانگ "ارجعی" بشنید گشت محوِ جمال
چہ گفت؟ گفت کہ از مرگِ من نمی ترسم — چو مسلمِ متبسم روم بہ بزمِ وصال
خدا رسیدہ 'خودی راست' کاشفِ اسرار — رموزِ بے خودیش "اُنظروا الیٰ ما قال"
چہ جرأت است کہ از حق شکایت است اورا — جوابِ شکوۂ او دادِ ایزدِ متعال
شکستِ ضربِ کلیمش فرنگ را نیرنگ — پیامِ مشرقِ او نزد بانِ اوجِ کمال
فگندہ غلغلہ جاوید نامہ اش بہ فلک — چو رفت زمزمہ خواں تا سرادقِ اجلال
سر آمدہ شبِ دیجور خفتۂ ملت — زِ نَو نمود چو از بالِ جبرئیل ہلال
چو مست بانگِ درائے الست شد لاریب — کلامِ او شدہ تا روزِ حشر حسنِ مقال
حیاتِ او سبق آموز ملک و ملت را — چراغِ بیتِ عتیق است و دیرِ تمثال
دماغِ مغربی و قلبِ مشرقی اورا — بشرق و غرب ضیا پاش بود مہرِ مثال
نمودِ سادہ دلاں را نگاہِ حق بینش — وطن پرستیِ مغرب چو فتنۂ دجّال
درست ہست کہ "حب الوطن من الایمان" — مگر پرستشِ او جانِ خلق راست وبال
چو پیرِ روم بیامیخت فلسفہ با دین — زِ خاکِ سجدہ برافروخت آتشِ سیال
بہ بیں بہ دورہ "باشین" چو حدی خوان است — جنوں نوازیِ او عقل را کشید عقال
"حسن زبصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم" — بیا بہ بیں کہ چساں بود پورِ ہند اقبال
نہ شاعرے کہ بہ ہر وادی است سرگرداں — نہ شاعرے کہ زِ اقوالِ او جدا افعال
ترانہ اش ہمہ عشق و سرودِ او ہمہ درد — زِ نَو بگفت کہن داستانِ ہجر و وصال
فدائے ملت و پیک رجا و خضرِ طریق — سوار اشہبِ دوراں، وحیدِ عصر اقبال

"فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر"
بہ یادِ او دل نواب مست بادہ حال

(پروفیسر سید نواب علی)

(پروفیسر سید نواب علی)

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے کہ اقبال کی وفات پر جن معتقد شعرا نے مرثیے لکھے تھے ان میں احسن علی خاں، اختر سعید خاں اور باسط بھوپالی بھی شامل تھے۔ پہلے ایڈیشن کی تکمیل کے دوران ہر ممکن کوشش کے باوجود ان شعرا کی نظمیں نہیں مل سکی تھیں جو خوش قسمتی سے دوسرے ایڈیشن کی نظرثانی کے دوران دستیاب ہو گئیں اور پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔

احسن علی خاں اور اختر سعید خاں اُس دور میں بھوپال کی نئی نسل کے نمایندہ شاعروں میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان دونوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور تعلیم مکمل کر کے بھوپال آگئے اور علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شروع ہی سے یہ دونوں حضرات جدید خیالات اور انقلابی نظریات کے حامل تھے اور اقبال کی مقصدی اور تعمیری فکر سے متاثر۔ چنانچہ ان کی نظموں میں بھی اقبال کے اثرات آپ محسوس کریں گے۔

اختر سعید خاں — آج بھی بھوپال میں ہیں اور شہر کے ممتاز ایڈوکیٹ ہی نہیں — بلند پایہ شاعروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ کُل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری اور مرکزی حکومتِ ہند کے تحت قایم کردہ اقبال سینٹینری کمیٹی کے رکن بھی ہیں اور اس امر کے لیے کوشاں کہ شیش محل — قیام گاہِ اقبال کو مستقلاً یادگارِ اقبال کی حیثیت عطا کر دی جائے۔ ان کی نظم بہ عنوان "بیادِ اقبال" ان کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

احسن علی خاں — عرصۂ دراز تک ملٹری کالج کاکول میں استاد کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان دنوں وہ اسلام آباد میں ہیں اور وزارتِ خارجہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائض۔ ان کی نظم کا عنوان ہے "اقبال"

باسط بھوپالی کا شمار بھوپال کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ نظم و غزل پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ بھوپال کی نئی نسل کی ذہنی اور فکری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ باسط بھوپالی بھی اقبال کے پرستاروں میں تھے۔ چنانچہ ان کی معرکہ آرا نظم کے مطالعہ سے آپ کو بھی یہ اندازہ ہوگا کہ وہ افکارِ اقبال سے کس حد تک متاثر تھے۔

باسط بھوپالی — بھوپال اور وسط ہند کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کا کلام حاصلِ مشاعرہ قرار پاتا تھا — ان کا یہ شعر تو آج بھی بھوپال میں زبانِ زد ہے:

سارا عالم آئینہ باسطؔ
جیسی نگاہیں ویسے نظارے

ان کا پہلا نمایندہ مجموعۂ کلام "کاروانِ غزل" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں بھوپال سے شائع ہوا تھا اور اسی سال افسوس کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی درد انگیز نظم "نوحۂ اقبال" کی فراہمی بھی ایک دلچسپ اتفاق کی رہینِ منت ہے۔ باسط مرحوم کے ایک عزیز شاگرد حبیب بھوپالی جو خود بھی ایک خوش فکر اور خوش آواز شاعر ہیں — نومبر ۱۹۷۶ء میں اپنے عزیزوں سے ملنے کراچی آئے اور ایک روز اپنے چھوٹے بھائی فہیم رضا کے ہمراہ ملاقات کے لیے دفترِ افکار بھی آگئے۔ باتوں باتوں میں — میں نے باسط مرحوم کی اقبال سے متعلق نظم کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ نظم آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی نہ باسط صاحب کے مجموعہ میں شامل ہے۔ لیکن انھیں زبانی یاد ہے۔ اقبال کے تعزیتی اجلاس میں یہ نظم باسط بھوپالی کی جانب سے انھوں نے ہی سنائی تھی۔ وہ اسے لکھ کر دے دیں گے۔

چنانچہ یہ یادگار نظم حبیب بھوپالی کے دلی شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کی جا رہی ہے:

اقبال

کونسا طائر فضا میں ارتعاش انداز ہے / فکر کی پرواز ہے یا روح کی پرواز ہے
اُڑنے والا عرش کی جانب کوئی نغمہ نہیں / آہ اے اقبال یہ تو ہے ترا شکوہ نہیں
جی میں کیا آئی یکایک آشیاں سے اُڑ گیا / تو بھی اے قمری نوا شاہیں جہاں سے اُڑ گیا
اب سنائے گا چمن میں نغمۂ شیرازہ کون؟ / اب دکھائے گا جہاں کو فکر کی پرواز کون؟

ایک ساعت جس نے دیکھی گردشِ دورِ جہاں / وہ شہابِ زندگی ہے زیبِ سقفِ آسماں
اے شہابِ زندگی، اے شاعرِ فکرِ حسیں / بھول کر بھی یاد آتا ہے تجھے خوابِ زمیں؟
تیرے شایاں جو نہ تھا ایسے جہاں کو بھول جا / میرے شکووں پر نہ جا، ہندوستاں کو بھول جا
حسن کا پیارا ہے تو اور عشق کا پیارا ہے تو / بہرِ نظارہ بتادے کونسا تارا ہے تو؟

ساری دنیا طور سے بے طور ہے تیرے بغیر / عالمِ بزمِ نگاراں اور ہے تیرے بغیر
تیری مونس آج سے بیمارِ ہجراں ہو گئی / فرطِ غم سے لیلیٰ شب مو، پریشاں ہو گئی
خوبصورت آنسوؤں کا حسن ماتم ہائے ہائے / نازنینِ صبح کے عارض پہ شبنم ہائے ہائے
ہائے وہ دھیمے سُروں میں نوحہ گر جوئے رواں / جیسے کوئی لے رہا ہو ہچکیوں پر ہچکیاں
سینۂ رنگینِ گل تیرے الم میں چاک چاک / شبنمی چہرہ کلی کا فرطِ غم سے تابناک
گلستاں میں کس لیے اتنی پریشاں ہے شمیم / کیا خبر پائی ہے جو گھبرا گئی بادِ نسیم

تیرے غم میں ہو گئی بزمِ چمن بزمِ عزا !!
پھر کسی صورت سے اس ویراں چمن میں لوٹ آ

(احسن علی خاں)

بیادِ اقبال

اے شہپرِ جبریل امیں طائرِ افلاک / جاتے ہوئے فردوس کو للہ ادھر دیکھ
ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے جہاں میں / تجھ بن یہ زمیں ہو گئی کیا ایک نظر دیکھ
اشکوں کا تلاطم، کہیں آہوں کا دھواں ہے / خاکسترِ دل، شعلۂ جاں، زخمِ جگر دیکھ
خاموش ہے کیوں اے لبِ اعجازِ مسیحا! / جی اٹھیں گے ہم پھر، ہمیں تو بارِ دگر دیکھ
افلاک پہ غل ہے، تری بیباک نظر کا / سہمی ہوئی مجبور غلاموں کی نظر دیکھ
دیکھ آج بھی دہقاں کو میسر نہیں روزی / خرمن ہے وہی سیرگہِ برق و شرر دیکھ
مرمر کی سلیں آج بھی ہیں سجدہ گہِ خلق / مٹی کا حرم آج بھی ہے خاک بہ سر دیکھ

جلنے کو تو جلتا ہے چراغِ حرم و دیر روشن کسی اللہ کے بندے کا ہے گھر دیکھ
تفریق ابھی تک ہے وہی محنت و زر میں یہ قصر، یہ ایواں، یہ گھروندے یہ کھنڈر دیکھ
مشرق کی زمین اب بھی ہے بازیچۂ اطفال
اب تک ہے وہی سلسلۂ شام و سحر دیکھ

——— (اختر سعید خاں)

نوحۂ اقبال

حیف اے بزمِ جہاں اے انقلابِ کائنات
ہر نفس پر ختم ہو جاتا ہے اِک دورِ حیات
زندگی سی قیمتی شے اور اتنی بے ثبات
آہ اے معمورۂ آفات و بزمِ حادثات
سب شہود و غیب فانی ، باطن و ظاہر فنا
منزلِ اوّل فنا اور منزلِ آخر فنا
کیا غم و اندوہ ، کیا سرمایۂ عیش و نشاط
کیا طلسمِ رنجِ پیہم ، کیا فریبِ انبساط
کیا خیالِ پیش بینی ، کیا جنونِ احتیاط
کیا یہ دنیا اور کیا دنیا کا نظمِ ارتباط
کیا گدا کی زندگانی اور کیا شہ کا وجود
حاصل افسانۂ ہستی نہیں جُز رفت و بود
منزلوں کی کچھ خبر ہے اور نہ راہوں کا پتا!
کچھ نہیں ہے سامنے دھندلے نشانوں کے سوا
گردِ منزل ہی نہیں ملتی ہے منزل تو کجا!
ہر طرف بس اِک سَراب اندر سَراب اُف اے خدا
جا رہے ہیں کس طرف ہم کو خبر کچھ بھی نہیں
زندگی محوِ سفر ہے اور سفر کچھ بھی نہیں
کاروانِ ماہ و انجم صبح تک رخصت ہوا
پھول گلشن میں کِھلا، مہکا مگر مرجھا گیا
کیسا نغمہ، کس کا بادہ ، کیا بہارِ جاں فزا؟
ہر حقیقت میں، بجز نامِ حقیقت کچھ نہ تھا
جاگتے ہی موج آغوشِ فنا میں سو گئی
شکلِ طوفاں رفتہ رفتہ محوِ دریا ہو گئی

جھونپڑوں میں موت اور دولت کے کاشانوں میں موت
خلوتوں میں، جلوتوں میں اور زندانوں میں موت
محفل شادی میں اور غم کے سیہ خانوں میں موت
دشت و در میں موت، شہروں اور ویرانوں میں موت
ٹل نہیں سکتی کہ حکمِ آخرِ تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی بس موت ہی تعبیر ہے

موت بہتر ہے ضعیفوں، ناتوانوں کے لیے
بے ثبات و بے ہنر اور بے نشانوں کے لیے
آفتوں میں مبتلا بے تاب جانوں کے لیے
خانماں برباد فاقہ کش جوانوں کے لیے
لیکن اک کامل کا اُٹھ جانا جہاں سے ہائے ہائے
ہائے اب اقبال کو لائیں کہاں سے ہائے ہائے

صرف اے اقبال تو ہی شاعرِ اسلام تھا
تیرا جامِ فکر لبریزِ مئے الہام تھا
عاشقِ فطرت تھا تو، قدرت کا اک انعام تھا
قلبِ مسلم کے لیے تسکین کا پیغام تھا
تو وہ شاعر تھا کہ روحِ دہر جس سے شاد تھی
درد کی بستی تری تخئیل سے آباد تھی

فارسی تک ہی نہ تھا محدود تیرا فیضِ عام
کشتِ اردو کے لیے آبِ رواں تیرا کلام
تو امامِ شاعراں تھا، فلسفہ تیرا غلام
آسمانِ شاعری کا تو ہی تھا ماہِ تمام
تجھ پہ اہلِ ہند کو اک فخر تھا اک ناز تھا
جس پہ یورپ رقص کرتا تھا تو ایسا ساز تھا

مست ہے مسلم مگر بدذوق بالکل ہی نہیں!
اس کے ہر انداز میں پیدا ہیں سوزِ حسن و یقیں!
اس کی رگ رگ میں ہے پنہاں ایک عزمِ آتشیں
کاش یہ خاموش چنگاری بھڑک اُٹھے کہیں
کاش تیرا وعظ و تلقیں پُر اثر بن کر رہے
جو خس و خاشاکِ مسلم میں شرر بن کر رہے

تونے اسرارِ ید اللّٰہی بتائے قوم کو
تونے عبرت خیز افسانے سنائے قوم کو
تونے جینے کے طریقے بھی سکھائے قوم کو
کون اب تیری طرح دیکھیں جگائے قوم کو
اے خطیبِ بے بدل، اے شاعرِ عالی مقام
تا ابد محفوظ رکھا جائے گا تیرا کلام

——— (باسط بھوپالی)

ملفوظات قدسی اور نیاز مندان بھوپال

حضرت شاہ اسدالرحمٰن قدسی مدظلہٗ کا مختصر احوال اس کتاب کے دوسرے باب "اقبال کے بھوپال سے روابط" کے ذیل میں درج کر چکا ہوں۔ آپ کا اسم گرامی ناصرالدین اسدالرحمٰن اور تخلص قدسی ہے۔ آپ بمقام بھوپال ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی حبیب الرحمٰن علیہ الرحمۃ صاحبِ رُشد و ہدایت اور صوفیائے کرام کے اعلیٰ مسلک سے فیضیاب ہو چکے تھے اور حضرت وارث علی شاہ دیوہ شریف کے خلیفہ تھے۔

قدسی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سنِ شعور کو پہنچے تو آیندہ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیے گئے۔ سات برس بعد بھوپال لوٹے۔ آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہو چکا تھا اس لیے آپ خاندانی سلسلۂ رُشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ چار پانچ برس تک صحراؤں، پہاڑوں اور ریاضت شاقہ میں بسر کیے۔ آخر میں بھوپال کی مشہور ٹیکری "منوا بھانڈ" پر چلہ کشی فرمائی۔ یہ سنسان اور ویران پہاڑی شہر بھوپال سے تقریباً پانچ میل دور ہے۔ پھر ریت گھاٹ پر قیام فرمایا۔ وہاں سے منشی حسین خاں کی مسجد میں فروکش ہو گئے۔ اس زمانہ میں بڑی رجوعات ہوئیں۔ بھوپال کے تمام صاحبزادگان اور اخوانِ ریاست کے علاوہ اطرافِ ہند کی سیکڑوں عورتیں اور مرد خدمت میں حاضری دینے لگے۔ بعدہٗ شملہ کوٹھی۔ جو بھوپال کی ایک بلند ترین پہاڑی پر واقع تھی اُس کے نیچے "ثمرستان عبید" آپ کو پیش کیا گیا اور نواب زادہ سعید الظفر خاں، نواب زادہ رشید الظفر خاں (نواب حمید اللہ خاں کے بھتیجے) اور ان کی والدہ محترمہ مرحومہ حلقہ بگوش اور مرید خاص ہو گئے۔ ثمرستان میں آستانہ قایم ہوا۔ مسجد اور عمارات تعمیر کی گئیں۔ تقسیم ہند و پاک تک یہیں قیام فرما رہے ۱۹۴۹ء میں بھوپال سے ہجرت کی اور کئی لاکھ کا اثاثہ وہیں چھوڑ دیا۔ پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے کراچی کے بولان ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر حیدر آباد کالونی۔ کراچی میں ڈیڑھ سال تشریف فرما رہے۔ یہاں سے لاہور روانہ ہوئے اور کوئی چار سال وہاں رہے۔ پھر بہاول پور میں قیام ہوا۔ وہاں سے کوٹری تشریف لے آئے۔ معتقدین نے بلا طلب دریائے سندھ کے کنارے ایک نو تعمیر بنگلہ پیش کیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر چکوال (جہلم) سے آٹھ میل دور قصبہ بھون تشریف لے گئے۔ جہاں جلد ہی ایک وسیع و عریض احاطہ میں آستانہ تعمیر ہو گیا۔ جب سے وہیں قیام ہے۔ آپ کا شمار بھوپال کے بزرگ و ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی متعدد نظم و نثر کی تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ تصانیف کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

حضرت موصوف کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ آپ کے اقبال سے دیرینہ روابط رہے ہیں چنانچہ اپنی کتاب کے بارے میں

تو نے اسرارِ یداللّٰہی بتائے قوم کو
تو نے عبرت خیز افسانے سنائے قوم کو
تو نے جینے کے طریقے بھی سکھائے قوم کو
کون اب تیری طرح دیکھیں جگائے قوم کو
اے خطیبِ بے بدل، اے شاعرِ عالی مقام
تا ابد محفوظ رکھا جائے گا تیرا کلام

——— (باسط بھوپالی)

ملفوظات قدسی اور نیازمندان بھوپال

حضرت شاہ اسدالرحمٰن قدسی مدظلہٗ کا مختصر احوال اس کتاب کے دوسرے باب "اقبال کے بھوپال سے روابط" کے ذیل میں درج کرچکا ہوں۔ آپ کا اسم گرامی ناصرالدین اسدالرحمٰن اور تخلص قدسی ہے۔ آپ بمقام بھوپال ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی حبیب الرحمٰن علیہ الرحمۃ صاحبِ رُشد و ہدایت اور صوفیائے کرام کے اعلیٰ مسلک سے فیضیاب ہوچکے تھے اور حضرت وارث علی شاہ دیوہ شریف کے خلیفہ تھے۔

قدسی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سنِ شعور کو پہنچے تو آیندہ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیے گئے۔ سات برس بعد بھوپال لوٹے۔ آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہوچکا تھا اس لیے آپ خاندانی سلسلۂ رُشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ چار پانچ برس تک صحراؤں، پہاڑوں اور ریاضت شاقہ میں بسر کیے۔ آخر میں بھوپال کی مشہور ٹیکری "منوا بھانڈ" پر چلّہ کشی فرمائی۔ یہ سنسان اور ویران پہاڑی شہر بھوپال سے تقریباً پانچ میل دور ہے۔ پھر ریت گھاٹ پر قیام فرمایا۔ وہاں سے منشی حسین خاں کی مسجد میں فروکش ہوگئے۔ اس زمانہ میں بڑی رجوعات ہوئیں۔ بھوپال کے تمام صاحبزادگان اور اخوانِ ریاست کے علاوہ اطرافِ ہند کی سیکڑوں عورتیں اور مرد خدمت میں حاضری دینے لگے۔ بعدہٗ شملہ کوٹھی۔ جو بھوپال کی ایک بلند ترین پہاڑی پر واقع تھی اُس کے نیچے "ثمرستان عبید" آپ کو پیش کیا گیا اور نواب زادہ سعید الظفر خاں، نواب زادہ رشید الظفر خاں (نواب حمیداللہ خاں کے بھتیجے) اور ان کی والدہ محترمہ مرحومہ حلقہ بگوش اور مرید خاص ہوگئے۔ ثمرستان میں آستانہ قایم ہوا۔ مسجد اور عمارات تعمیر کی گئیں۔ تقسیم ہند و پاک تک یہیں قیام فرما رہے ۱۹۴۹ء میں بھوپال سے ہجرت کی اور کئی لاکھ کا اثاثہ وہیں چھوڑ دیا۔ پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے کراچی کے بولان ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر حیدرآباد کالونی۔ کراچی میں ڈیڑھ سال تشریف فرما رہے۔ یہاں سے لاہور روانہ ہوئے اور کوئی چار سال وہاں رہے۔ پھر بہاول پور میں قیام ہوا۔ وہاں سے کوٹری تشریف لے آئے۔ معتقدین نے بلا طلب دریائے سندھ کے کنارے ایک نو تعمیر بنگلہ پیش کیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد یہاں سے روانہ ہوکر چکوال (جہلم) سے آٹھ میل دور قصبہ بھون تشریف لے گئے۔ جہاں جلد ہی ایک وسیع و عریض احاطہ میں آستانہ تعمیر ہوگیا۔ جب سے وہیں قیام ہے۔ آپ کا شمار بھوپال کے بزرگ و ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی متعدد نظم و نثر کی تصانیف شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ تصانیف کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

حضرت موصوف کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ آپ کے اقبال سے دیرینہ روابط رہے ہیں چنانچہ اپنی کتاب کے بارے میں

آپ کو تفصیلات سے مطلع کیا اور گزارش کی کہ اس بارے میں مطلوبہ معلومات سے نوازدیں چنانچہ ۱۹۶۳ء میں حضرت موصوف نے کمال شفقت سے جواب عنایت کیا:۔

"۱۶ ۱۲/۶۳ء عزیزم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ
میری صحت بتقاضائے عمر اب اچھی نہیں رہتی ۔ ایک ماہ سے سخت نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار ہے ۔ اللہ پاک انجام بخیر فرمائے۔
میں خود اب کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں ۔ یادداشت بھی خراب ہو چکی ہے ۔ مکاتیب سب ایک عزیز کے پاس محفوظ ہیں ۔ اقبال مرحوم کا خط حاصل کر کے آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔
آستانہ بھون (جہلم) قدسی [۱]"

اس کے فوراً بعد آپ کی ہدایت پر صوفی خدا بخش ۔ متوسل آستانۂ قدسی نے مجھے اقبال کا قلمی خط بھیجتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

" مکرمی — السلام علیکم
آپ کا خط موصول آستانہ ہوا ۔ حضرت مرشدنا عرصہ سے علیل ہیں ۔ ایک ماہ سے زیادہ تکلیف ہے ۔ اللہ کریم صحت و سلامتی عطا فرمائے۔
آپ نے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے بھوپال سے تعلقات کے بارے میں معلومات کی درخواست کی ہے ۔ حضرت مدظلہ بہ سبب علالت جواب سے معذور ہیں ۔
راقم الحروف کی نظر میں علامہ اقبال کی فقیر دوستی اس سے ظاہر ہے کہ جب کبھی بھوپال میں شاہی مہمان ہوئے حضرت مرشدنا اسد الرحمٰن قدسی مدظلہ العالی کے آستانہ پر ضرور حاضری دی ۔ افسوس ہے کہ علامہ علیہ الرحمۃ کے ایک مکتوب کے سوا جو حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ کے انتقال کی خبر سے متعلق ہے ۔ دیگر علمی و روحانی خطوط جو مختلف وقتوں میں بھیجے گئے دستیاب نہ ہو سکے ۔ بطور یادگار وہی ایک خط [۲] ارسال ہے ۔ بعد نقل واپس بھیج کر ممنون فرمائیں — خیراندیش صوفی خدا بخش
مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۳ء متوسل آستانۂ قدسی [۳]"

حضرت قبلہ کی مزاج پُرسی کرتے ہوئے میں نے اپنی کتاب کے سلسلے میں چند در چند مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے خصوصی اعانت کی پھر درخواست کی ۔ بھوپال سے خاندانی تعلق کا حوالہ دیا اور یہ عرض کیا کہ اگر قبلہ موصوف اس اہم کام میں اپنی یادداشتوں سے کچھ عطا فرمادیں گے تو اس کتاب کی قدر و اہمیت بڑھ جائے گی ۔ میرے تفصیلی عریضہ کے جواب میں حضرت موصوف نے میری کامیابی کی دعا فرمائی ۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زیر ترتیب کتاب " نقوشِ ماضی " سے چند ایسے واقعات بھی بھجوادیے جو اقبال کے بھوپال سے روابط کے سلسلے میں ہمیشہ یادگار رہیں گے ۔ ان واقعات کا اس سے پہلے کسی کو

---

[۱] ذاتی خط بنام راقم الحروف ۔ مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۳ء
[۲] اس خط کا تذکرہ " اقبال کے بھوپال سے روابط " کے سلسلے میں آچکا ہے ۔
[۳] ذاتی خط بنام راقم الحروف ۔ مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۳ء

علم نہیں تھا۔ گرامی نامہ کا متن ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :۔

"۱۲ رجنوری ۱۹۶۷ء

عزیز مکرم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محبت نامہ موصول ہوا۔ آپ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے بھوپال سے تعلق کے بارے میں معلومات کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ یہ بڑی اہم یادگار رہوگی۔ دعا ہے کہ آپ کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو۔

میری معلومات میں یہ ہے کہ بھوپال سے بطور قدردانی وعزت افزائی چند نامور مشاہیر ملک کے وظائف مقرر تھے۔ اسی سلسلے میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو بھی وظیفہ ملتا تھا اور اسی سبب سے موصوف کا بھوپال آنا جانا ہوا۔

علامہ علیہ الرحمۃ جہاں ایک ممتاز شاعر، ادیب، فلسفی، مفکر و محقق اور سیاست داں تھے۔ اُسی کے ساتھ فقیر منش اور صوفی بھی تھے۔ مسلک ومشرب قلندرانہ تھا، گوشہ نشین فقراء سے مخلصانہ محبت رکھتے تھے۔ ملک کے اکثر عزلت گزینوں سے مراسلت بھی تھی بعض مواقع پر مجھے بھی خطوط لکھے جو افسوس ہے محفوظ نہیں رہے۔ ایک خط خدا جانے کس طرح کاغذات میں مخلوط ہو کر بچ گیا تھا جو بطور یادگار "نقوش ماضی" میں شامل کر لیا گیا۔

میں نے صوفی خدا بخش صاحب کو توجہ دلائی ہے کہ جو معلومات اقبال اور بھوپال سے متعلق یادداشت میں محفوظ ہوں قلم بند کر کے آپ کو ارسال کر دیں۔

یہ معلوم ہو کر آپ ہمارے وطن عزیز کے ایک خوش خصال فرزند ہیں مسرت ہوئی۔ اللہ رب العزت آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی حفظ وامان میں رکھے اور عزت و سرفرازی عطا فرمائے۔

میری عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ ضعیف العمری کے ساتھ عرصہ دراز سے علیل بھی ہوں، چراغ سحری ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ انجام بخیر فرمائے۔

خیر طلب دعاگو

فقیر قدسی[1]"

آستانہ بھون۔ ضلع جہلم

اس گرامی نامہ کے فوراً بعد حضرت قبلہ کی ہدایت پر صوفی خدا بخش صاحب نے آپ کی یادداشتوں سے جو اقتباسات ارسال فرمائے۔ اُن کی تفصیلات یہ ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں یہ اچھوتے واقعات قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں :۔

"۷۸۶

۱۴ رجنوری ۱۹۶۷ء

جناب محترم — السلام علیکم

عنایت نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ کے افکار عالیہ میں ایک دلچسپ موضوع —— "اقبال اور بھوپال" منتخب ہو کر کتابی صورت میں منظر عام پر آنے والا ہے ——

---

[1] ذاتی خط بنام راقم الحروف مورخہ ۱۲ رجنوری ۱۹۶۷ء

علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور شخصیت کی مختلف حیثیات پر روشنی ڈالی گئی ہوگی اور ملک کی بلند پایہ ہستیوں پر بھوپال کی شاہانہ نوازشات سے متعلق بھی کافی مواد فراہم کیا گیا ہوگا۔ عنوان "اقبال اور بھوپال" سے مترشح ہوتا ہے کہ اقبال کا تعلق بھوپال سے صرف شاہانہ نوازشات تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ بھوپال کی مایۂ ناز ہستیوں سے بھی مربوط ہے۔ امید ہے اس سلسلے میں بھی معلومات مہیا کی گئی ہوں گی۔ میں آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے بھوپال کی نہایت ممتاز اور بزرگ ہستی حضرت شاہ اسدالرحمٰن قدسی اعلی اللہ مقامہم سے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ارتباط کا تذکرہ پیش کرتا ہوں۔

بھوپال میں آستانۂ عالیہ پر ملک کی اکثر نمایاں شخصیتوں نے حاضری دی ہے جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی۔ مہاراجہ کشن پرشاد۔ علامہ سیماب اکبرآبادی۔ ساغر نظامی۔ جگر مرادآبادی۔ حفیظ جالندھری۔ مضطر خیرآبادی۔ سلیمان ندوی اور حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت اقبالؒ ریاست بھوپال کے وظیفہ یاب ہونے سے سالہا سال قبل حضرت مرشدنا مدظلہ العالی سے متعارف تھے اور سلسلۂ مکاتبت جاری تھا۔ حضرت علامہؒ وظیفہ یاب ہونے کے بعد جب آخری بار بھوپال میں شاہی مہمان ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں حضرت مرشدنا مدظلہٗ شہر بھوپال سے چار میل فاصلہ پر باغِ ثمرستان میں رونق افروز تھے۔ حضرت علامہ جب حضرت مرشدنا سے ملنے ثمرستان پہنچے تو خوش منظر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے مقام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور نہایت ذوق سے یہ قطعہ پڑھا ؎

چشمۂ فیض تشنہ لب کے لیے مرکزِ رشد بہرِ اہلِ صفا
کوئی سمجھے تو ہے مقامِ قدس آستانہ جنابِ قدسی کا[1]

جب حضرت خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمۃ حاضر آستانہ ہوئے اور قطعہ سنا تو اس دل کشا و پُر فضا مقام کو "وادیٔ ایمن" سے موسوم کرکے اپنے اخبار "منادی" دہلی میں تذکرہ شائع کیا۔

جگر مرادآبادی مرحوم نے بارہا آستانہ پر حاضری دی ہے۔ ایک نظم بھی آستانہ کی تعریف میں لکھی تھی جو گم ہوگئی۔ بعض لوگوں کو ایک شعر آج تک یاد ہے ؎

منزلِ قدس وادیٔ ایمن
آستانہ ہے خیر کا مخزن

ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی جب نواب زادہ عماد الدولہ یمین الملک محمد رشید الظفر خاں بہادر مرحوم کے ساتھ حاضر آستانہ ہوئے تو خوش نما قدرتی مناظر سے بہت متاثر ہوئے

---

[1] یہ غیر مطبوعہ قطعہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں اور پہلی بار اس کتاب میں شائع ہو رہا ہے۔

اور اپنے جذبات چند اشعار میں لکھ کر نواب زادہ موصوف کو پیش کیے جو محفوظ نہیں ہے۔
مشاہیرِ ملک کی آستانہ پر حاضری مختلف وجوہ سے تھی۔ بعض حضرات تو حضرت مرشدنا مدظلہٗ کے عارفانہ و حکیمانہ کلام کے شائق تھے، بعض لوگ حضرت مدظلہٗ کی روحانی تقاریر کے مشتاق تھے، بعض اصحاب حضرت کی باوقار متوکلانہ گوشہ نشینی کے گرویدہ تھے۔ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ربط و اُنس کا سبب حضرت مرشدنا مدظلہٗ کا قلندرانہ مسلک تھا۔
خط بند کرتے وقت شبیہ مبارک والا واقعہ یاد آ گیا:۔ علامہ اقبال بھوپال میں شاہی مہمان تھے۔ نواب زادہ فخر الملک محمد سعید الظفر خان بہادر ملاقات کے لیے مہمان خانہ پہنچے تو عمائدین ریاست کے علاوہ وہاں شمس العلما سید احمد صاحب دہلوی بھی تھے۔ فرمایا کل بعد نماز جمعہ میں بھی حضرت اقبال کے ساتھ آپ کے باغ ثمرستان میں حضرت قدسی صاحب کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مشاہدہ ہوا کہ شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ کس طرح قلندرانہ معاشرت ہو سکتی ہے کیونکہ دنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کا تصور بعید از قیاس تھا۔ حضرت علامہ نے فرمایا، جناب مولانا کیا آپنے عارف رومی علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر نہیں سنا ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

آپ کو تو صرف دنیا میں ترکِ دنیا کا مشاہدہ ہوا مگر میرے دل میں آستانہ میں قدم رکھتے ہی انشراح صدر کے ساتھ رجوع الی اللہ کا جذبہ اُبھر آیا اور منکشف ہوا کہ بے شک فقرا، حق پر انوار ربانی کا نزول ہوتا ہے اور لطائف روشن ہوتے ہیں۔ پھر نواب زادہ فخر الملک کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ کل سے ابھی تک جناب قدسی کی شبیہ مبارک نظر کے سامنے ہے کیا آپ تصویر مہیا کر سکتے ہیں، اپنے علمی ذخیرہ میں رکھوں گا۔ نواب زادہ تصویر کی فراہمی کا وعدہ کر کے واپس ہوئے اور آستانہ پر حاضر ہو کر تصویر کی درخواست کی۔ ارشاد ہوا ؎

دل کے آئینہ میں ہو تصویرِ دوست
کاغذی تصویر ہے مانند پوست

سفرِ حج و ممالک اسلامیہ کے پاسپورٹ پر جو تصویر ہے اُس کا عکس حاصل کر لیا جائے۔ متعدد عکس اُتارے گئے۔ ایک عکس خوش نما فریم میں حضرت علامہ کو نواب زادہ موصوف نے پیش کر دیا اور بطور "یادگارِ اقبال" متوسلین آستانہ میں تحفتہً تقسیم ہو گئے۔ جب سے آج تک بعض مخلص احباب ہر سال حضرت مرشدنا مدظلہٗ کی سال گرہ کی تقریب کے موقع پر بطور "یادگارِ اقبال" عکس کشی کی تجدید کرتے ہیں۔ ایک کاپی[1]

[1] یہ شبیہ مبارک اسی کتاب میں شامل ہے۔

تحفۃً آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ جوانی کی تصویر کلام قدسی میں ہے۔
یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔ ایک جلد پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا :-
مسعود علی وارثی اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال نے رباعیات عمر خیام کا انگریزی میں ترجمہ کر کے طبع کرایا تھا۔ کسی نے راس مسعود کے توسط سے ایک جلد حضرت علامہ کو پیش کی۔ یہ وہ نسخہ تھا جو وارثی مرحوم نے جب گاندھی جی بھوپال میں شاہی مہمان تھے خود پیش کر کے سرورق پر اُن کے دستخط بطور اعزاز کرا لیے تھے۔ حضرت علامہ نے یہ کہہ کر نسخہ واپس کر دیا کہ یہ تو اپنے ہی گھر میں رکھنے کی چیز ہے، تحفۃً پیش کرنے کی نہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کا تذکرہ چل نکلا۔ حاضرین میں سے کسی نے رباعیات سرمد شہید کی تعریف کی۔ حضرت علامہ نے فرمایا۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق رباعیات عمر خیام اور رباعیات سرمد شہید بہت بلند پایہ کلام ہے۔ ہر زمانے میں بہ تقاضائے حالات و ماحول مذاق میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جیسا کہ مثنوی مولانائے روم اور میری مثنوی سے ظاہر ہے۔ مجھے تو حالات حاضرہ اور موجودہ ماحول کے مذاق میں جناب قدسی کی رباعیات میں بڑی معنی آفرینی نظر آتی ہے۔ بعض رباعیاں بے حد دل کش ہیں۔ ایک رباعی تو اکثر زبان پر آتی ہے ؎

ہر ذرہ بہ وسعتے بیابانے ہست ‏ ‏ ہر گل بہ لطافتے گلستانے ہست!
در دیدۂ مردمانِ اہلِ بینش ‏ ‏ ہر قطرہ بہ جوشِ گریہ طوفانے ہست ‏ (قدسی)

رباعیات قدسی اور نغمات قدسی بھی اب نایاب ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے دہلی والے بکڈپو میں چند نسخے موجود تھے۔ کتابت و طباعت کی گرانی کے پیش نظر ارادہ ہے کہ اگر حالات سازگار رہے تو انتخاب کلام شائع کیا جائے۔

خیر طلب۔ صوفی خدا بخش
آستانہ بھون ضلع جہلم "

ان نئے واقعات کا علم ہونے پر میں نے قدسی صاحب مدظلہ کا دلی شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ یادداشتوں سے اگر کچھ اور تفصیلات مل جائیں تو عطا فرما دیں۔ کچھ ہی دنوں بعد صوفی خدا بخش کا گرامی نامہ مجھے نئی معلومات کے ساتھ موصول ہو گیا۔ اس کے مطالعہ سے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے اقبال کی شخصیت کے کچھ اور نئے رُخ ہمارے سامنے آتے ہیں :-

" ۷۸۶

۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء

جناب محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ
عنایت نامہ اور دو کتابیں[1] موصول آستانہ ہوئے۔ شکریہ۔ حضرت مرشد نامدظلہ کی

---

[1] یہ دو کتابیں میرے عم محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم کی تھیں "تاریخ صحف سماوی" اور "معارج الدین" جنھیں میں نے آستانہ کے لیے نذر کیا تھا۔

عمر شریف پچھتر برس کے قریب پہنچی۔ عرصۂ دراز سے علیل ہیں۔ یکم جنوری سے یہاں بارش و ژالہ باری اور سرد ہواؤں کا سلسلہ جاری ہے۔ چند بار برف باری بھی ہوئی ہے۔ موسم نہایت سرد ہو رہا ہے جو حضرت مرشدنا مدظلہٗ جیسے ضعیف العمر کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ صحت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ بھوپال سے اپنے حقیقی عزیزوں کو طلب فرمایا ہے۔ اللہ کریم خیر رکھے۔ مجھے ہدایت فرمائی کہ آپ کے خط کا مفصل جواب لکھوں۔

مخلص۔ صوفی خدا بخش

پہلے خط میں شبیہ مبارک والے واقعہ میں ایک بات لکھنا بھول گیا تھا۔ علامہؒ کے ساتھ شمس العلما سید احمد صاحب دہلوی بھی حاضرِ آستانہ ہوئے تھے۔ حضرت مرشدنا مدظلہٗ نے ان کو نہایت بیش قیمت ایک ایرانی غالیچہ عنایت فرمایا اور کہا جمعہ کے دن جامع مسجد دہلی کے منبر پر بچھا دیا جایا کرے۔ یہ غالیچہ ولیعہد ریاست ٹونک نے منجانب نواب صاحب والیٔ ٹونک آستانہ میں پیش کیا تھا۔ حضرت علامہؒ نے شمس العلما سے کہا "یہ یادگارِ قدسی ایک تاریخی چیز رہے گی۔" یہ سب واقعات و حالات مجھے حضرت مرشدنا مدظلہٗ کے خادم خاص حضرت حافظ عبدالمتعال خاں صاحب غوالی سے معلوم ہوئے جو حضرت مدظلہٗ کے پاکستان میں تشریف آوری سے قبل ضروری سامان کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ ابھی چند ماہ ہوئے کراچی میں انتقال ہوا۔ بافیض بزرگ تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا جو اگرچہ علمی/ادبی نہیں مگر معلوماتی ضرور ہے۔ علامہ اقبالؒ کے قیام بھوپال کے زمانے میں نواب خسرو جنگ حیدر آباد سے دہلی جاتے ہوئے ایک دن کے لیے شاہی مہمان ہوئے۔ موصوف کو کشمیر کے قیام کے سبب مرغ مسلم اور کباب ماہی بہت پسند تھے۔ کشمیر کا مرغ مسلم اور کباب ماہی بہت مشہور ہے۔ احباب کو معلوم تھا کہ موصوف کو مرغ و ماہی بہت مرغوب ہے اس لیے شاہی دعوت میں مرغ مسلم اور کباب ماہی کا خصوصیت سے اہتمام کیا گیا۔ نواب زادہ فخرالملک سعید الظفر خاں، نواب زادہ یمین الملک رشید الظفر خاں اور کرنل اقبال محمد خاں شریک طعام تھے۔ نواب زادہ فخرالملک نے کہا۔ لاہور کے بازار مسجد وزیر خاں کی مچھلی بہت مشہور ہے۔ علامہ علیہ الرحمۃ نے کہا۔ کئی من مچھلی روزانہ تلی جاتی ہے۔ قابل تعریف ہوتی ہے۔ سنا ہے شاہی مطبخوں میں ایسے رکاب دار ہوتے تھے جو مچھلی کے کانٹے پکانے سے قبل نکال لیتے تھے۔ نواب زادہ فخرالملک نے کہا۔ حضرت مرشدنا قدسی مدظلہٗ کے آستانہ پر امانت خاں نامی خانساماں پکانے سے قبل مچھلی کے کانٹے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اکثر باورچی اس کی خوشامد کرتے ہیں، کسی کو نہیں سکھاتا۔ آستانہ کا نام سن کر نواب افتخار الملک حمید اللہ خاں مرحوم نے فرمایا آستانہ میں کبھی قلندری دیگ بھی پکتی ہے جو عجیب پُرلطف چیز ہے۔ حضرت قدسی صاحب ہماری والدہ محترمہ (نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ) فرماں روائے بھوپال کے لیے بھی حصہ بھیجتے ہیں۔ اس کے پکانے کا راز بھی آستانہ تک محدود ہے۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا

تحفۃً آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ جوانی کی تصویر کلام قدسی میں ہے۔
یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔ ایک جلد پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا:۔

مسعود علی وارثی اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال نے رباعیات عمر خیام کا انگریزی میں ترجمہ کر کے طبع کرایا تھا۔ کسی نے راس مسعود کے توسط سے ایک جلد حضرت علامہ کو پیش کی۔ یہ وہ نسخہ تھا جو وارثی مرحوم نے جب گاندھی جی بھوپال میں شاہی مہمان تھے خود پیش کر کے سرورق پر اُن کے دستخط بطور اعزاز کرا لیے تھے۔ حضرت علامہ نے یہ کہہ کر نسخہ واپس کر دیا کہ یہ تو اپنے ہی گھر میں رکھنے کی چیز ہے، تحفۃً پیش کرنے کی نہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کا تذکرہ چل نکلا۔ حاضرین میں سے کسی نے رباعیات سرمد شہید کی تعریف کی۔ حضرت علامہ نے فرمایا۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق رباعیات عمر خیام اور رباعیات سرمد شہید بہت بلند پایہ کلام ہے۔ ہر زمانے میں بہ تقاضائے حالات و ماحول مذاق میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جیسا کہ مثنوی مولانائے روم اور میری مثنوی سے ظاہر ہے۔ مجھے تو حالات حاضرہ اور موجودہ ماحول کے مذاق میں جناب قدسی کی رباعیات میں بڑی معنی آفرینی نظر آتی ہے۔ بعض رباعیاں بے حد دل کش ہیں۔ ایک رباعی تو اکثر زبان پر آتی ہے ؎

ہر ذرہ بہ وسعتے بیابانے ہست ہر گل بہ لطافتے گلستانے ہست!
در دیدۂ مردمانِ اہلِ بنیش ہر قطرہ بہ جوشِ گریہ طوفانے ہست (قدسی)

رباعیات قدسی اور نغمات قدسی بھی اب نایاب ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے دہلی والے بکڈپو میں چند نسخے موجود تھے۔ کتابت و طباعت کی گرانی کے پیش نظر ارادہ ہے کہ اگر حالات سازگار رہوئے تو انتخاب کلام شائع کیا جائے۔

خیر طلب ۔ صوفی خدا بخش
آستانہ بھون ۔ ضلع جہلم "

ان نئے واقعات کا علم ہونے پر میں نے قدسی صاحب مدظلہٗ کا دلی شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ یادداشتوں سے اگر کچھ اور تفصیلات مل جائیں تو عطا فرما دیں۔ کچھ ہی دنوں بعد صوفی خدا بخش کا گرامی نامہ مجھے نئی معلومات کے ساتھ موصول ہو گیا۔ اس کے مطالعہ سے جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے اقبال کی شخصیت کے کچھ اور نئے رُخ ہمارے سامنے آتے ہیں:۔

"۷۸۶

۲۰ر جنوری ۱۹۶۹ء

جناب محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ
عنایت نامہ اور دو کتابیں[1] موصول آستانہ ہوئے۔ شکریہ۔ حضرت مرشد نا مدظلہٗ کی

---

[1] یہ دو کتابیں میرے عم محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم کی تھیں "تاریخ صحف سماوی" اور "معارج الدین" جنھیں میں نے آستانہ کے لیے نذر کیا تھا۔

عمر شریف پچھتر برس کے قریب پہنچی۔ عرصۂ دراز سے علیل ہیں۔ یکم جنوری سے یہاں بارش و ژالہ باری اور سرد ہواؤں کا سلسلہ جاری ہے۔ چند بار برف باری بھی ہوئی ہے۔ موسم نہایت سرد ہو رہا ہے جو حضرت مرشدنا مدظلہٗ جیسے ضعیف العمر کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ صحت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ بھوپال سے اپنے حقیقی عزیزوں کو طلب فرمایا ہے۔ اللہ کریم خیر رکھے۔ مجھے ہدایت فرمائی کہ آپ کے خط کا مفصل جواب لکھوں۔

مخلص۔ صوفی خدا بخش

پہلے خط میں شبیہ مبارک والے واقعہ میں ایک بات لکھنا بھول گیا تھا۔ علامہؒ کے ساتھ شمس العلما سید احمد صاحب دہلوی بھی حاضر آستانہ ہوئے تھے۔ حضرت مرشدنا مدظلہٗ نے ان کو نہایت بیش قیمت ایک ایرانی غالیچہ عنایت فرمایا اور کہا جمعہ کے دن جامع مسجد دہلی کے منبر پر بچھا دیا جایا کرے۔ یہ غالیچہ ولیعہد ریاست ٹونک نے منجانب نواب صاحب والیٔ ٹونک آستانہ میں پیش کیا تھا۔ حضرت علامہؒ نے شمس العلما سے کہا "یہ یادگارِ قدسی ایک تاریخی چیز رہے گی۔" یہ سب واقعات و حالات مجھے حضرت مرشدنا مدظلہٗ کے خادم خاص حضرت حافظ عبدالمتعال خاں صاحب غوالی سے معلوم ہوئے جو حضرت مدظلہٗ کے پاکستان میں تشریف آوری سے قبل ضروری سامان کے ساتھ پاکستان آگئے تھے سا بھی چند ماہ ہوئے کراچی میں انتقال ہوا۔ بافیض بزرگ تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا جو اگرچہ علمی ادبی نہیں مگر معلوماتی ضرور ہے۔ علامہ اقبالؒ کے قیام بھوپال کے زمانے میں نواب خسرو جنگ حیدرآباد سے دہلی جاتے ہوئے ایک دن کے لیے شاہی مہمان ہوئے۔ موصوف کو کشمیر کے قیام کے سبب مرغ مسلم اور کباب ماہی بہت پسند تھے۔ کشمیر کا مرغ مسلم اور کباب ماہی بہت مشہور ہے۔ احباب کو معلوم تھا کہ موصوف کو مرغ و ماہی بہت مرغوب ہے اس لیے شاہی دعوت میں مرغ مسلم اور کباب ماہی کا خصوصیت سے اہتمام کیا گیا۔ نواب زادہ فخر الملک سعید الظفر خاں، نواب زادہ یمین الملک رشید الظفر خاں اور کرنل اقبال محمد خاں شریک طعام تھے۔ نواب زادہ فخر الملک نے کہا۔ لاہور کے بازار مسجد وزیر خاں کی مچھلی بہت مشہور ہے۔ علامہ علیہ الرحمۃ نے کہا۔ کئی من مچھلی روزانہ تلی جاتی ہے۔ قابل تعریف ہوتی ہے۔ سنا ہے شاہی مطبخوں میں ایسے رکاب دار ہوتے تھے جو مچھلی کے کانٹے پکانے سے قبل نکال لیتے تھے۔ نواب زادہ فخر الملک نے کہا۔ حضرت مرشدنا قدسی مدظلہٗ کے آستانہ پر امانت خاں نامی خانساماں پکانے سے قبل مچھلی کے کانٹے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اکثر باورچی اس کی خوشامد کرتے ہیں، کسی کو نہیں سکھاتا۔ آستانہ کا نام سن کر نواب افتخار الملک حمید اللہ خاں مرحوم نے فرمایا آستانہ میں کبھی قلندری دیگ بھی پکتی ہے جو عجیب پُرلطف چیز ہے۔ حضرت قدسی صاحب ہماری والدہ محترمہ (نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ) فرماں روائے بھوپال کے لیے بھی حصہ بھیجتے ہیں۔ اس کے پکانے کا راز بھی آستانہ تک محدود ہے۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا

جب میں اور ڈاکٹر انصاری میرٹھ میں حضرت گل حسن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُس دن اتفاق سے خانقاہ میں قلندری دیگ پکی تھی۔ ہم کو شریک طعام فرمایا۔ میں نے مدت العمر اتنی لذیذ چیز نہیں کھائی۔ ہم نے عرض کیا۔ حضرت یہ تو بہت ہی لذیذ کھانا ہے۔ فرمایا۔ قلندری دیگ سے موسوم ہے، فقراء کا خاص کھانا ہے۔ نواب صاحب والیٔ ٹونک بھی ۱۲ ربیع الاول کی دعوت میں قلندری دیگ پکواتے ہیں۔ مجھے اس کی ترکیب حیدرآباد دکن میں حضرت شاہ عبدالرحیم قلندر سے حاصل ہوئی تھی جو قدسی صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب الرحمٰن قلندر قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔

علامہ اقبالؒ اوائل عمری سے تصوف و روحانیت کی طرف میلان رکھتے تھے۔ انگلینڈ میں جب زیر تعلیم تھے حضرت شاہ سلیمان پھلواری رحمۃ اللہ علیہ سے مسائل تصوف پر مراسلت جاری تھی۔ جب یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر واپس ہوئے تو حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے عقیدت مندانہ تعلق پیدا ہوا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ و جانشین تھے اور بڑے عارفِ کامل بزرگ تھے۔ تذکرۂ غوثیہ مشہور و معروف کتاب میں اپنے مرشد حضرت غوث علی شاہ قلندر علیہ الرحمۃ کے ارشادات جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب بہت مقبولِ عام و خاص ہو کر متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

حضرت مرشدنا اسدالرحمٰن قدسی مدظلہٗ العالی بھی قلندرانہ مسلک کے پیرو ہیں۔ بتوسط علامہ اقبالؒ حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے تعارف و تعلق قائم ہوا تھا۔ نواب ابراہیم علی خاں والیٔ ریاست ٹونک (راجپوتانہ) حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ سے ارادت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور اُن کے ولی عہد نواب عبدالحفیظ خاں مرحوم بھی معتقد تھے۔ جب علامہ اقبالؒ کے توسط سے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ۔ حضرت مرشدنا قدسی مدظلہٗ سے متعارف ہوئے تو حضرت شاہ صاحب نے نواب عبدالحفیظ خاں ولی عہد ریاست ٹونک کو ہدایت فرمائی کہ حضرت قدسی صاحب سے روحانی تعلق قائم کریں۔ چنانچہ ولی عہد مرحوم حسب ہدایت حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ ــــ مرشدنا اسدالرحمٰن قدسی مدظلہ العالی کے معتقد ہو گئے۔

حضرت مرشدنا مدظلہٗ طویل عرصہ تک متواتر سیر و سیاحت میں رہے۔ جب واپس اپنے مستقر بھوپال آئے تو علامہ اقبالؒ سے شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا حال دریافت کیا جس کے جواب میں علامہؒ نے لکھا۔ "گل حسن شاہ صاحب قریباً ایک سال ہوا۔ رحلت فرما گئے"۔

بہت پُرانی بات ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک نظم بنام "شکوہ" انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی، اور ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اخبار

"زمیندار" نے بڑے اہتمام سے شائع کی۔ مرحوم نے چند نسخے حضرت مرشدنا قدسی مدظلہٗ کو تحفۃً بھیجے اور حضرت نے ایک نسخہ بطور تحفہ شمس العلما حافظ سید محب الحق صاحب عظیم آبادی علیہ الرحمۃ کو بھیجا۔ حافظ صاحب نے سخت اعتراض لکھ کر بھیجا۔ حضرت مدظلہٗ نے حافظ صاحب کا اعتراض نامہ علامہ علیہ الرحمۃ کو ارسال کیا جس کو پڑھ کر علامہ علیہ الرحمۃ نے "جواب شکوہ" لکھا جو اسی اہتمام سے شائع ہوا۔ اُن دنوں حضرت گل حسن شاہ قلندر علیہ الرحمۃ ریاست ٹونک میں قیام فرما تھے۔ وہ زمانہ ولی عہد ٹونک کی طالب علمی کا تھا۔ کلام اقبال سے بہت دلچسپی تھی۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" ولی عہد موصوف نے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے حضور میں پیش کیے۔ حضرت شاہ صاحب نے مطالعہ فرما کر علامہؒ کو خوشنودی و پسندیدگی اور دعائے خیر لکھی۔ جس کے جواب میں علامہؒ نے چند مدحیہ شعر بطور ساقی نامہ لکھ کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں ارسال کیے اور لکھا کہ جواب شکوہ کے محرک[1] جناب قدسی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے بعد ملاحظہ خط اور ساقی نامہ ولی عہد موصوف کو عنایت فرما دیا۔ جب ولی عہد موصوف حسب ہدایت حضرت شاہ صاحب بعد فراغت تحصیل علم حضرت مرشدنا قدسی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ علیہ الرحمۃ کا ساقی نامہ اور اپنے والد نواب ابراہیم علی خاں صاحب مرحوم کے نعتیہ کلام کا مجموعہ پیش کیا جو محفوظ ذخیرہ میں شامل کر دیا گیا۔ یہ محفوظ ذخیرہ اقبال علیہ الرحمۃ کے خطوط۔ علامہ شبلی علیہ الرحمۃ کے خطوط۔ علامہ ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کے خطوط اور چند مشاہیر ملک کے مرسلہ مضامین کا مجموعہ تھا جس میں خود حضرت مرشدنا مدظلہٗ کے اہم علمی مسودات بھی تھے جو افسوس ہے سب ضائع ہو گئے۔ صورت یہ ہوئی کہ جب حضرت مرشدنا مدظلہٗ نے ہندوستان سے پاکستان کی طرف مراجعت کا قصد فرمایا تو وہ زمانہ حضرت مدظلہٗ کی سخت علالت کا تھا۔ حکم دیا کہ آستانہ میں ضرورت سے زیادہ جس قدر بھی سامان ہے وہ سب عزیزوں، دوستوں اور مریدوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کتابیں جن کی تعداد گیارہ سو تھی اہل علم لوگوں کو اُن کے مذاق کے مطابق تقسیم کر دی جائیں۔ دو ماہ تک تقسیم کا سلسلہ جاری رہا۔ خادموں کی غفلت سے کتابوں کے ساتھ محفوظ ذخیرہ بھی نکل گیا۔ جب پاکستان پہنچ کر ساتھ آنے والے سامان کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ محفوظ ذخیرہ بھی تقسیم ہو چکا۔ معلوم نہیں یہ نہایت اہم اور بیش بہا یادگار کہاں منتقل ہوئی۔ استعمالی کپڑوں میں سے ایک بستہ لپٹا ہوا نکلا جس میں چند مشاہیر ملک کے خطوط اور کچھ یادداشتیں تھیں اور آستانہ ایگریکلچر فارم کے کاغذات میں سے علامہ اقبالؒ کا وہ خط ملا جس میں حضرت گل حسن شاہ صاحب کے انتقال کی خبر تھی۔ اب یہ مجموعہ 'نقوش ماضی' کے نام سے مرتب ہو رہا ہے۔"

---

[1] "جواب شکوہ" کا یہ پس منظر شاید پہلی بار دنیائے ادب کے سامنے آیا ہے۔ ع ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی

راقم الحروف نے مکتوب اقبال کا عکس اپنی اس کتاب کے لیے محفوظ کر کے واپس کر دیا تو ۲۴ مارچ ۱۹۶۴ء کو صوفی خدا بخش صاحب نے اس کی وصولی کی رسید بھیجتے ہوئے ایک ایسی نظم کا ذکر بھی فرمایا جس کا تعلق بھوپال سے تھا اور جو یقیناً قیام بھوپال ہی کی یادگار کہی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف نے اپنے طور پر اس نظم کا ہر ممکن سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ صوفی صاحب لکھتے ہیں:

"۷۸۶

۲۴ ۳/۶۴ جناب مکرم — السلام علیکم

عنایت نامہ معہ مکتوب اقبال موصول ہوا۔ شکریہ۔ حضرت مدظلہٗ عرصہ سے علیل ہیں۔ آپ کے لیے دعائے خیر فرماتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک نظم "سیر بھوپال" راس مسعود مرحوم کے پاس تھی جس میں تاج المساجد، موتی مسجد، جامع مسجد، تالاب، شملہ پہاڑی، آستانۂ قدسی اور آبشار بھد بھدا کے علاوہ بیرون شہر کے قدرتی مناظر کا نہایت دلچسپ اور پُر وقار تذکرہ تھا۔ افسوس کہ باوجود سعی بلیغ وہ تاریخی نظم دستیاب نہ ہو سکی۔ ایسے ہی اور بھی اہم واقعات، جو علامہ مرحوم کے قیام بھوپال سے متعلق ہیں۔ بعض لوگوں میں "علم سینہ" ہو کر رہ گئے ہیں جن کا حصول چاند تک رسائی کی کوشش سے کم نہیں۔ بہرحال آپ کی دلچسپی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جستجو جاری رہے گی اور جو حالات بھی معلوم ہو سکے۔ انشاء اللہ ارسال خدمت کیے جائیں گے۔ بھوپال کے اکثر ادبی مذاق والے وفات پا کر یاد رفتگاں کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں۔ جو لوگ رہ گئے ہیں وہ بھی ہجوم افکار کے سبب سب ادبی، علمی اور تاریخی یادگاریں فراموش کر چکے ہیں ؎

اک محویت سی طاری اے شادؔ ہو رہی ہے
بھولے ہوئے فسانے کچھ یاد آ رہے ہیں (شادؔ عظیم آبادی)

آستانہ
بھون۔ ضلع جہلم

راقم
صوفی خدا بخش"

اس خط کے بعد صوفی خدا بخش صاحب کے چند خطوط اور آئے لیکن ان میں اقبال سے متعلق کوئی نئی بات تحریر نہیں تھی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حضرت مرشدنا قدسی صاحب مدظلہٗ العالی کی خیر و عافیت دریافت کرتا رہا اور اپنی اس کتاب کی تکمیل میں مصروف رہا۔ آپ بفضل خدا بھون میں بقید حیات ہیں۔ عمر ۱۰۳ سال کے لگ بھگ ہے۔ دعا ہے کہ خدا ئے بزرگ و برتر آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے اور آپ کے طفیل رُشد و ہدایت کا چشمۂ فیض جاری رہے۔ قدسی صاحب مدظلہٗ کی وساطت سے آپ کے جن عزیز و محترم مریدین سے مجھے اقبال کے سلسلے میں نئے واقعات کا علم ہوا اُن میں ایک تو اقبال حسین خاں[1]، ندیم خاص فرماں روائے بھوپال اور دوسرے مشہور ادیب و صحافی حسن عزیز جاوید[2] ہیں جنھوں نے قدسی صاحب کا ایک

---

[1] اقبال حسین خاں بفضلِ خدا بھوپال میں بقید حیات ہیں۔

[2] حسن عزیز جاوید کا افسوس کہ ۱۹۶۸ء کے دوران کراچی میں انتقال ہو گیا۔

قلمی خط بھی عطا کر دیا جو دفتر آستانہ مبارک سے ۱۴ رمارچ ۱۹۴۱ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ اس خط میں کسی پُر فضا مقام پر "دارالسلام" کے قیام کا منصوبہ درج تھا۔ قدسی صاحب اور اقبال کے درمیان اس سلسلے میں مراسلت بھی ہوئی تھی اور اقبال کے مشورہ پر ہی صحرا میں "دارالسلام" کے تحت دارالعلوم کا قیام تفصیلی پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ اگر اسلامی وروحانی نوآبادی کسی صحرا میں قایم ہوگئی تو وہ ہر سال چند ماہ وہاں گزارا کریں گے۔ قدسی صاحب کے اس منصوبہ سے اقبال کی دلچسپی بلاشبہ اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی منصوبہ سے ملتا جلتا ایک منصوبہ راس مسعود نے بھی تیار کیا تھا اور اقبال نے بھی، جس کا تذکرہ مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب "ذکر اقبال" میں ملتا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان تینوں حضرات یعنی قدسی صاحب، راس مسعود اور اقبال میں اس سلسلے میں ضرور تبادلۂ خیال ہوا ہوگا۔ قدسی صاحب کی تجویز ۱۹۴۱ء کی ہے۔ راس مسعود اور اقبال نے ۱۹۳۷ء میں ان تجویزوں کو روبہ عمل لانے کا عزم کیا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

> "ایک علمی اسلامی ادارہ" مدت دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قایم کیا جائے جہاں دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کیے جائیں اور ماہرین کو خورد ونوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلامی اور شرع اسلام پر ایسی کتابیں لکھیں جو دین کے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں۔ چنانچہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انھوں نے ریاست بھاول پور میں سرکار بہاول پور کے زیر سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سروسامان درست کیا لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اس کا سُراغ نہ ملا۔
>
> آخر ۱۹۳۷ء میں ایک دین دار مخلص، صاحب ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خاں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) کے رہنے والے تھے اور پٹھان کوٹ سے کوئی ایک دو میل دور اُن کی زرعی اراضی موجود تھی۔ چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں گزارش کی میں نے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی آپ کے مجوزہ ادارے (دارالسلام) کے لیے وقف کر دیا ہے تاکہ اس پر کتب خانہ، دارالمطالعہ، مکانات برائے مصنفین اور دوسرے ضروری مساکن تعمیر کر دیے جائیں۔ جتنے علماء و مصنفین اس ادارہ میں رہ کر علوم اسلامی کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں گے، میری جائداد زرعی کی آمدنی ان سب کی معاش کی کفیل ہوگی۔ وہ ہر طرف سے بے فکر ہو کر امن وسکون کی فضا میں اپنا کام انجام دے سکیں گے۔ حضرت علامہ چودھری نیاز علی خاں کی اس روشن خیالی اور دین پروری سے بے حد خوش ہوئے اور انھیں "دارالسلام" میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی"[1]

شہزادی عابدہ سلطان سے میری ملاقات تقریباً ایک سال کی سعی وکوشش کے بعد حسن عزیز جاوید کی معیت

---

[1] ذکر اقبال۔ صفحہ ۲۱۲۔۲۱۳

میں اُن کی کوٹھی واقع ملیر سٹی (کراچی) میں ہوئی۔ انھوں نے میرے ہر سوال کا نہایت تسلی بخش جواب عنایت فرمایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے جاوید صاحب اور مجھے اقبال کی حسب ذیل چار کتابیں بھی دکھائیں جو اقبال نے بھوپال کے قیام کے دوران بہ نفس نفیس شہزادی صاحبہ کو پیش کی تھیں:۔

(۱) بانگ درا (۲) بال جبریل (۳) ضرب کلیم (۴) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

ان کتابوں کی خصوصی جلدیں بنوائی گئی تھیں۔ اندرونی صفحہ پر اقبال کا قلمی انتساب تھا۔ چنانچہ ملاقات کے بعد اُن کی اجازت سے میں نے ضرب کلیم اور مثنوی کے صفحات کا نوٹو لے لیا جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ ان نسخوں کو انھوں نے بڑی حفاظت سے رکھا تھا جیسا کہ اُن کے دیکھنے سے ظاہر ہوا۔ میں نے گفتگو کا آغاز نواب حمید اللہ خاں اور اقبال کے باہمی روابط سے کیا اور دریافت کیا کہ ان کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی تھی؟ شہزادی عابدہ سلطان نے بتایا کہ ان کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب نواب صاحب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ وہ اقبال کے پیام و کلام سے پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے۔ علی گڑھ کے دوران قیام انھوں نے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور جب وہ تعلیم مکمل کر کے بھوپال آئے اور انصرام حکومت میں اپنی والدہ نواب سلطان جہاں بیگم کا ہاتھ بٹانے لگے تو اقبال کے علاوہ اُن کے رابطے قائد اعظم محمد علی جناح، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خاں، گاندھی جی، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ سے قایم ہو گئے۔ اُن کی تعلیم چونکہ ایک ممتاز عوامی ادارہ میں ہوئی تھی۔ اس لیے اُن میں عوامی شعور کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور جمہوری اقدار کا صحیح احساس بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جب زمام حکومت سنبھالی تو بھوپال کے دیگر والیان ریاست کی طرح انھوں نے بھی ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشہور و ممتاز شخصیتوں کو اپنے اردگرد جمع کر لیا۔ شعیب قریشی۔ حسن محمد حیات۔ سلام الدین خاں۔ علی حیدر عباسی۔ سر راس مسعود۔ ماسٹر ولی محمد۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن۔ ڈاکٹر عبدالباسط۔ محمد احمد خاں۔ حکیم سید ضیاء الحسن۔ محمد خلیل اللہ خاں۔ مولوی شکر اللہ سہیل۔ ڈاکٹر سلطان۔ ڈاکٹر بوس وغیرہ باقاعدہ ریاست کے مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز ہو کر ریاستی امور میں اُن کا ہاتھ بٹانے لگے۔ خلافت تحریک کی بنیاد بھوپال میں پڑی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، قائد اعظم اور اقبال بھوپال آنے جانے لگے۔ ریاست کی طرف سے ان حضرات کو ہر ممکن اخلاقی اور مالی اعانت پیش کی گئی اور اس طرح ریاست بھوپال نے ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں جلد امتیاز و اعزاز حاصل کر لیا۔ انگریزوں کی پالیسی کے تحت نوابین اور راجہ مہاراجہ عملی سیاست میں حصہ لینے کے مجاز نہیں تھے لیکن نواب صاحب کی تنہا ایسی شخصیت تھی جو بلا خوف و خطر سیاست میں دخیل ہو گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ ایک بڑے سیاست داں، مدبر، اسلام کے شیدائی اور مسلمانوں کے سچے بہی خواہ کی حیثیت سے آج بھی عقیدت و احترام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ پرنسز چیمبر کے چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے ریاستوں کی جو خدمت کی ہے اور مسلمانوں کے تحفظ اور پاکستان کے قیام کے سلسلے میں جو مساعی انجام دی ہیں وہ دنیا جانتی ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ جب پاکستان کے قیام کے لیے آخری کوششیں ہو رہی تھیں۔ کیا اُس وقت تنہا نواب صاحب ہی کی ذات تھی جس پر کانگریس اور مسلم لیگ کو برابر کا اعتماد حاصل تھا اور کیا آپ بھی اُن کے ساتھ دہلی میں موجود تھیں ــــ؟

شہزادی صاحبہ نے فرمایا کہ میں اُس وقت بطور ولی عہدہ خدمات انجام دے رہی تھی اور نواب صاحب کے ہمراہ دہلی گئی تھی۔ شعیب قریشی اور حسن محمد حیات بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قائد اعظم اور گاندھی جی کے درمیان نواب صاحب ہی مصالحت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ صبح کی ملاقات کے بعد جب وہ دوپہر کے کھانے کے لیے قیام گاہ پر تشریف لائے

تو میں نے نتیجہ کے بارے میں دریافت کیا جس پر انھوں نے فرمایا:۔

——— "ان دونوں بڈھوں نے میرا دماغ خراب کردیا ہے۔ نہ ایک مانتا ہے نہ دوسرا مانتا ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد پھر ملاقات ہوئی اور نواب صاحب کی سعی بلیغ سے گاندھی جی نے یہ تسلیم کرلیا کہ مسلم لیگ انڈیا کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔ اس اصول کے تسلیم ہونے کے بعد ہی پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اور اس طرح اقبال کے "تصور پاکستان" کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکا۔ یہ اتنی بڑی تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ وسط ۱۹۴۷ء کے تمام اخبارات نواب صاحب کی خصوصی کدوکاوش اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں اُن کے عملی کارناموں سے بھرے پڑے ہیں ویسے اس واقعہ کا ذکر چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں بھی تفصیل سے کیا ہے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو اُس دستاویز کا کچھ علم ہے جس پر قائد اعظم اور گاندھی جی نے دستخط کیے تھے اور جس میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم کیا گیا تھا۔

انھوں نے فرمایا کہ نواب صاحب کے ساتھ شعیب قریشی بحیثیت پرائیویٹ سکریٹری اس گفت و شنید میں شریک ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ تحریر جس پر قائد اعظم اور گاندھی جی نے دستخط کیے تھے شعیب قریشی کے پاس محفوظ تھی۔ افسوس کہ اُن کا انتقال ہوگیا لیکن اُن کی صاحبزادی خالدہ شعیب سے معلومات کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ قیام پاکستان کا اصول تسلیم کرلینے کے بعد گاندھی جی کی سیاست ختم ہوکر رہ گئی۔ ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں بھی یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے الحاق کا جو اعلان کیا تھا اُس میں نواب صاحب بھوپال کی ذاتی مساعی کو بھی دخل تھا کیونکہ کشمیر کی مسلم آبادی تقریباً ۸۰ فی صدی تھی۔

میں نے جب اقبال کے بھوپال آکر قیام کے بارے میں خود اُن کی اور نواب صاحب کی ملاقاتوں کا حال اور وظیفہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ نواب صاحب اقبال کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ انھوں نے قیام و طعام، علاج و معالجہ کی تمام سہولتیں فراہم کرنے کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ ایک دوبار میری موجودگی میں اقبال نواب صاحب سے ملنے کے لیے محل پر تشریف لائے تھے۔ زیادہ تر گفتگو مسلمانوں کے عام حالات اور سیاسی مسائل پر ہوئی۔ نواب صاحب اور اقبال کے سیاسی مسلک میں بڑی ہم آہنگی تھی اور دونوں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حامی تھے۔ نواب صاحب نے آرام و آسایش کی جو سہولتیں مہیا کی تھیں۔ اقبال نے اُن کا دلی شکریہ بھی ادا کیا اور جب وہ رخصت ہونے لگے تو باہر کار تک اُنھیں رخصت کرنے آئے۔

۱۹۳۳ء سے میں والد صاحب کے ساتھ ریاستی فرائض انجام دینے لگی تھی۔ میری تعلیم و تربیت بھی اسلامی شعائر کے مطابق کی گئی تھی لہذا میرے دل پر بھی اقبال کے پیام و کلام کا گہرا اثر تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب اُن کے وظیفہ کے احکام محکمہ صرف خاص[1] سے جاری ہوگئے تو پہلا چیک میرے دستخطوں سے ہی شیش محل روانہ کیا گیا تھا جہاں اقبال قیام فرما تھے۔ چیک ملنے کے بعد وہ میرا شکریہ ادا کرنے تشریف لائے تو میں نے اُن کی مزاج پرسی کی اور عرض کیا کہ اس سلسلے میں زحمت کی

---

[1] یہ محکمہ نواب صاحب بھوپال کی ذاتی جائداد و املاک سے متعلق تھا جس کا ریاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کیا ضرورت تھی ۔ کچھ دیر ٹھہر کر وہ رخصت ہوگئے ۔ اُن کے چہرے سے کافی تھکن اور اضمحلال ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں جب وہ بھوپال آئے تو میرے لیے چار کتابیں بطور خاص تیار کرا کر ملاقات کے لیے تشریف لائے ۔ یہ کتابیں آپ کے سامنے ہیں ۔

جاوید صاحب اور میں نے دونوں کتابوں کے قلمی انتسابات کو پڑھنے کی کوشش کی کیونکہ اقبال کی تحریر[1] کے نقوش کافی مدھم ہو گئے تھے ۔

"ضرب کلیم" پر تحریر تھا:-

"تقدیم والاجناب علیا حضور نواب گوہر تاج بیگم صاحبہ ولی عہد
دارالاقبال بھوپال
بندۂ اخلاص کیش محمد اقبال لاہور
یکم اگست ۱۹۳۶ء"

اور مثنوی ۔"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" پر یہ عبارت مرقوم تھی :-

تقدیم علیا حضور نواب گوہر تاج بیگم صاحبہ
ولی عہد دولت علیہ بھوپال ایدﷲ نصرہٗ
بندۂ اخلاص کیش محمد اقبال لاہور
۲۶ راکتوبر ۱۹۳۶ء

شہزادی عابدہ سلطان سے ہم نے آخری سوال یہ کیا کہ آپ نے ریاست بھوپال کی جانشینی کو خیرباد کہہ کر پاکستان کو اپنا وطن کیوں بنایا ۔" تو اُنھوں نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ اس کا جواب بہت آسان ۔ اپنے والد کی طرح مجھے بھی مسلمانوں کی جداگانہ مملکت ۔ پاکستان کے قیام سے دلچسپی تھی ۔ میرے والد نے سیاست اور ادب میں قائداعظم اور اقبال کو اپنا رہنما بنایا تھا ۔ اس لیے قدرتی طور پر میں نے بھی اُنھیں کے اثرات کو قبول کیا اور اسلامی فکر و اقدار کے تحفظ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا اور بھوپال کی جانشینی کو چھوڑ کر پاکستان چلی آئی ۔ اب یہی میرا وطن ہے !

محمد احمد سبزواری ۔ بھوپال کے بلند پایہ اہلِ قلم ہیں ۔ ۱۹۱۵ء میں بمقام بھوپال پیدا ہوئے ۔ بچپن سے ہی علم و ادب کا ذوق تھا ۔ ۱۹۳۲ء میں الگزنڈر[2] اجہانگیریہ ہائی اسکول کے پہلے اردو ماہنامے "گہوارۂ ادب" کے پہلے مدیر مقرر ہوئے ۔ آپ کی طالب علمانہ زندگی قابلِ رشک رہی ہے ۔ تحریر و تقریر کے متعدد مقابلے جیتے ۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے اورنگ آباد چلے گئے ۔ وہاں کئی سال تک کالج کے سہ ماہی میگزین "نورس" کی ادارت کی ۔ معاشیات میں بی ۔ اے کیا اور جامعہ میں اول آئے ۔ ۱۹۳۹ء میں فرسٹ ڈویژن میں ایم ۔ اے پاس کیا اور جامعہ عثمانیہ میں اول آئے ۔ دو سال کے لیے ریسرچ اسکالر شپ ملا ، لیکن ایک سال بعد ہی خانگی حالات کی بنا پر بھوپال آگئے اور ریاست میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے ۔ پھر پانچ برس بطور ریسرچ اسپشلسٹ آٹھ سال تک اکیڈیمی برائے ترقی دیہات میں فرائض انجام دینے کے بعد مرکزی محکمہ اعداد و شمار میں اعلیٰ افسر شماریات کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا ۔

---

[1] اقبال کی قلمی تحریروں کے عکس شامل کتاب ہیں ۔

[2] حمیدﷲ خاں کے دورِ حکومت میں اس کا نام حمیدیہ جہانگیریہ ہائی اسکول کر دیا گیا ۔ یہ بھوپال کا سب سے قدیم اور بڑا اسکول تھا جس سے دنیائے ادب کی کتنی ہی ممتاز شخصیتیں بطور استاد یا طالب علم وابستہ رہ چکی ہیں ۔

دومرتبہ اعلیٰ تعلیم اور ٹریننگ کے لیے امریکہ گئے۔ اس کے علاوہ یورپ اور مشرق بعید کے متعدد ملکوں کا بھی آپ نے دورہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں آبادی کی عالمی کانفرنس منعقدہ روم میں آپ نے پاکستان کی نمایندگی کی اور ۱۹۶۳ء میں ایشیائی آبادی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

آپ متعدد اردو انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عرصہ تک بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا اور اُن کے مشہور رسالہ "معاشیات" کے مدیر رہے۔ اردو ادب میں معاشیات کے موضوع کو مقبول بنانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کی کتاب "ہمارے بنک" جو اردو زبان میں بنکاری پر پہلی کتاب ہے، ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو دہلی سے شایع ہوئی۔ اسی طرح اردو ادب میں بھی آپ نے نام پیدا کیا۔ اس کتاب کی تیاری کے دوران پتہ چلا کہ جن دنوں اقبال بھوپال میں مقیم تھے اُن دنوں محمد احمد سبزواری نے اُن سے نیاز حاصل کیا تھا اور اپنی ملاقاتوں کا احوال پشاور یونیورسٹی کے مجلہ "خیابان" کے "اقبال نمبر" میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نمبر کی تلاش شروع کی گئی۔ کراچی کی تقریباً ہر لائبریری دیکھ لی۔ لیکن "خیابان" کا مطلوبہ شمارہ نہ مل سکا۔ کراچی سے مایوس ہونے کے بعد میں نے افکار کے رفیق وشفیق محمد طاہر فاروقی۔ صدر شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی کو خط لکھا اور اپنے کام کی نوعیت بتائی اور درخواست کی کہ جس طرح بن پڑے یہ خاص شمارہ مجھے فراہم کر دیں۔

انھوں نے فوراً جواب دیا اور لکھا کہ یہ شمارہ ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا اور اب نایاب ہے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ دستیاب ہو گیا تو فوراً بھیج دوں گا۔ میری خوش نصیبی کہ کچھ عرصہ کے بعد مطلوبہ شمارہ انھوں نے مجھے کہیں سے حاصل کرکے عطا کر دیا۔ "خیابان" کا شمارہ ۴ "اقبال نمبر" تھا جو ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا۔ اس میں محمد احمد سبزواری کا مضمون بعنوان "نژاد نو" شامل تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ سبزواری صاحب اقبال کے نیازمندوں میں شامل تھے۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنی ملاقات کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ کئی اعتبار سے نئی اور اچھوتی بھی ہیں۔ یہ مضمون نہ صرف اُن کے اعلیٰ ادبی مذاق اور اقبال شناسی کا آئینہ دار ہے۔ بلکہ اقبال کی اُن ادبی محفلوں کا ترجمان بھی۔ جن سے بھوپال کے نیازمند متمتع ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

> "وسط ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ علامہ اقبال علیل تھے۔ جب آپ کی علالت کا علم فرماں روائے بھوپال کو ہوا تو تبدیل آب وہوا اور علاج کی غرض سے انھیں بھوپال بلا لیا۔ اس زمانہ میں سر راس مسعود ریاست کے وزیر تعلیم تھے۔ اُن کے اور علامہ کے دیرینہ مراسم تھے چنانچہ آپ کچھ عرصہ اُن ہی کے بنگلہ "ریاض منزل" میں مقیم رہے۔ یہ بنگلہ شہر سے کافی دور تھا۔ پھر نواب بھوپال نے ایک شاندار عمارت موسومہ "شیش محل" کے ایک حصہ میں علامہ کی رہائش کا بندوبست کر دیا۔ "شیش محل" وسط شہر میں واقع تھا۔ جب مقامی باشندوں کو اس بات کا علم ہوا کہ مفکر مشرق اُن کے شہر کے بیچ ٹھہرا ہوا ہے تو لوگ وہاں پہنچنے لگے۔ علامہ کی علالت کے باوجود عام طور پر رات کو ۸، ۸½ بجے "شیش محل" میں شاعروں، ادیبوں اور سخن فہموں کا اچھا خاصا اجتماع ہونے لگا۔ سر راس اور ریاست کے دوسرے اکابر بھی یہاں آیا کرتے تھے۔ میں اُس وقت کالج میں پڑھتا تھا۔ علامہ کا اردو فارسی کلام

کورس میں داخل تھا۔ وہیں علامہ کا یہ شعر پڑھنے کا اتفاق ہوا ؎

بیا بجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

بھوپال سے لاہور کا فاصلہ —— ہزار میل سے کم نہ ہوگا لہٰذا کبھی مجلس اقبال میں شرکت کا تصور ہی نہ آیا لیکن اب منزل کا بُعد ختم ہو چکا تھا پھر یہ دعوت عام تھی اور اس سے استفادہ نہ کرنا بڑی بد قسمتی ہوتی۔ نیز مصرعۂ ثانی میں قلندریت کا جو مرقع پیش کیا گیا وہ بھی کچھ عجیب تھا۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرنے والے، گپھاؤں میں بیٹھنے والے اور خانقاہوں میں ہوحق کرنے والے قلندروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر ایک ایسے مردِ قلندر کا تصور بھی نہ تھا جو مغربی تعلیم یافتہ ہو، یورپ میں کافی وقت گزار چکا ہو، اقتصادیات کا معلم رہ چکا ہو، حکومت کا اعلیٰ ترین اعزاز پا چکا ہو۔ چنانچہ یہی شوق کشاں کشاں مجھے بھی ایک رات اس کوچے میں لے گیا۔ مجھ میں یہ طاقت وجرأت نہ تھی کہ کوئی ساغر اٹھا سکتا مگر پرانے بادہ کشوں کو سرشار ہوتے اور نئے بادہ کشوں کو جھومتے دیکھنے کا نظارہ ہی اس قدر وجد آور تھا کہ میں اکثر ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔

یہ محفلیں ادبی اور سیاسی رنگ لیے ہوتی تھیں۔ یہاں شعر و شاعری ہوتی، لطائف و ظرائف بیان کیے جاتے، قصے کہانیاں اور آپ بیتیاں سنائی جاتیں۔ سیاست حاضرہ اور ملکی مسائل پر تبصرے ہوتے۔ زیادہ تر گفتگو کا موضوع یورپ اور مشرق وسطیٰ کی سیاست ہوا کرتا تھا کیونکہ یہی وقت کی آواز تھی۔ اس وقت سیاسیات عالم پر یورپ چھایا ہوا تھا۔ وہاں نئی نئی طاقتیں اُبھر رہی تھیں۔ روس میں اشتراکی حکومت ۱۹۲۸ء سے منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنی قوم اور معیشت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھی۔ جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی جماعت ۱۹۳۳ء میں برسرِ اقتدار آ چکی تھی جس نے دو سال بعد معاہدۂ ورسائی کے پُرزے پُرزے کر دیے۔ اطالیہ میں مسولینی کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ اس کی خونی آنکھیں حبشہ پر لگی ہوئی تھیں۔ برطانیہ اور فرانس دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہ اطالیہ کے کسی غیر مستحسن اقدام پر خاموش تماشائی نہ بنیں گے۔ اِدھر مشرق وسطیٰ میں پہلی جنگ عظیم کے تجربے، بڑی طاقتوں کی چال بازیوں اور پیرس صلح کانفرنس میں عربوں کے مطالبات کی نامنظوری نے اس علاقہ میں ایک نئے قومی احساس کو جگا دیا تھا جس میں علاقائی خود مختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔ ترکی میں اُس وقت اتاترک کمال اور اُن کی جماعت برسرِ اقتدار تھی۔ جہاں نئی نئی اصلاحات ہو رہی تھیں، جن میں خلافت کا خاتمہ (۱۹۲۴ء) دستور سے اسلامی مملکت کی دفعہ کا حذف، عربی کے بجائے لاطینی رسم الخط کا نفاذ شامل تھا۔ ۱۹۳۴ء میں بلقان کی چار حکومتوں میں اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ ایران میں رضا شاہ اول نئی اصلاحات میں مصروف تھے۔ ۱۹۳۳ء

میں افغانستان میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نیا آئین نافذ کیا جس میں صوبوں کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دی گئی۔ غرض کہ گفتگو کا مواد اتنا تھا کہ اس کے لیے ہر نشست مختصر نظر آتی تھی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ میں اس محفل میں شریک ہوا تو یورپی سیاست موضوعِ بحث تھی۔ اس سلسلے میں علامہ نے اپنی ایک تازہ نظم "مسولینی" سُنائی جس کے کچھ شعر مجھے آج تک یاد ہیں۔ تبرکاً آپ کو بھی سُنائے دیتا ہوں ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار، تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

حاضرین نے اس کلام بلاغت نظام پر جو حقایق سے معمور تھا دل کھول کر داد دی۔ ذاتی طور پر مجھے علامہ کی سیاست دانی کا اُس وقت قایل ہونا پڑا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا اور مئی ۱۹۳۶ء میں اس کی فوجیں عدیس بابا میں داخل ہو گئیں۔ اُس وقت جمعیت اقوام زندہ تھی۔ اطالیہ اور حبشہ دونوں اُس کے رُکن تھے مگر وہ اطالیہ کے خلاف معاشی پابندیاں لگانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔ یہ پابندیاں بھی صرف کاغذی تھیں۔ نہر سویز برطانیہ کے قبضہ میں تھی، اطالوی فوجوں کے لیے تیل، فولاد، کوئلہ حتیٰ کہ زہریلی گیس تک اسی نہر سے گزرتی رہی[1]۔ داستان اس قدر دل فریب ہے کہ جی چاہتا ہے اس کو طول دیے جاؤں مگر عنوان کی پابندی بھی لازمی ہے۔

علامہ اقبال ۱۸۷۳ء[2] میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کا یہ عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا۔ لینن (۱۸۷۰ء) مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ء) سرونسٹن چرچل اور مشہور ناول نگار سمرسٹ ماہم (۱۸۷۴ء) مشہور ناول نگار تھامس مین (۱۸۷۵ء) رضا شاہ اول (۱۸۷۶ء) مغربی جرمنی کا موجودہ[3] چانسلر ایڈی نار (۱۸۷۸ء)۔ مولانا محمد علی، کمال اتاترک اور قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۸۱ء) ٹراٹسکی، اسٹالن اور آئن اسٹائن (۱۸۷۹ء) سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں[3]۔ گویا قدرت دنیا کے

---

[1] دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، ایچ۔ جی۔ ویلز۔ گارڈن سٹی بک نیویارک۔ جلد دوم۔ صفحہ ۹۲۳
[2] جدید تحقیق کے مطابق علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔
[3] دی کولمبیا وائکنگ ڈیسک انسائیکلوپیڈیا، وائکنگ پریس نیویارک ۱۹۵۳ء جلد اول و دوم۔ مختلف صفحات۔
(محمد احمد سبزواری)

مختلف گوشوں اور شعبوں میں جو انقلاب لانا چاہتی تھی اُس کی داغ بیل اسی عشرے میں ڈال دی۔

علامہ کا علی گڑھ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا مگر جس زمانے میں اُنھوں نے آنکھ کھولی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن و افکار مثبت یا منفی طریقے پر سرسید کے خیالات و افکار سے متاثر ہو رہے تھے۔ سرسید کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کے واسطے علٰحدہ کالج کی بنیاد رکھی بلکہ بقول مولوی عبدالحق مرحوم :-

"لوگ کہتے ہیں کہ سرسید نے کالج بنایا، کالج نہیں اُس نے قوم بنائی، قومیت کا تصور پیدا کیا۔ مردہ دلوں میں روح پھونکی، زندگی کے ہر شعبہ کو بنایا اور سنوارا۔ تعلیم، علم و ادب، زبان، سیاست، صحافت، مذہب سب کو جدید نظر سے دیکھا۔ وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قمع کیا اور اپنے ہم قوموں کی عقلیت اور تحقیق کی طرف رہنمائی کی جسے وہ بے جا تقلید کی فرماں برداری میں بھول چکے تھے۔"[1]

اس وقت کے مسلمان یا تو سرسید کے حامی تھے یا اُن کی تحریک و خیالات کے مخالف۔ اقبال بھی اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سرسید کی براہ راست اتباع سے گریز کیا ــــ مگر شیخ محمد اکرام اپنی کتاب موج کوثر میں اقبال کے متعلق لکھتے ہیں :-

"ـــ وہ علی گڑھ تحریک اور سرسید کا دلی قدردان تھا۔ سرسید کا جہاں کہیں اس کی تصانیف میں ذکر آیا ہے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہوتا ہے۔ سرسید کی نسبت اقبال کے تحت الشعوری خیالات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ جب ایک دفعہ اقبال سخت بیمار پڑے اور سب علاج معالجہ بیکار ثابت ہو رہا تھا تو سرسید خواب میں آئے اور کہا تو اپنی مشکل سرورِ کائناتؐ کے حضور میں عرض کر۔"[2]

معلوم نہیں کہ شیخ صاحب نے یہ واقعہ کہاں سے لیا[3] لیکن اقبال نے "سید کی لوح تربت" میں صاف صاف اُن کی نیک نیتی کا اعتراف کیا ہے۔ اُن کو "بندۂ مومن" کے لقب سے یاد کیا ہے لیکن جس طرح اکبر الہ آبادی مغربی تعلیم کے اثرات کو قومی مفاد کے خلاف

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ "سرسید کا اصل کام" برگ گل (سرسید نمبر) مجلہ اردو کالج۔ کراچی ۵۵-۱۹۵۴ء صفحہ ۱۴

[2] شیخ محمد اکرام۔ ایم۔ اے۔ موج کوثر۔ مطبوعہ فیروز سنز ۱۹۵۴ء صفحہ ۳۳ (محمد احمد سبزواری)

[3] یہ واقعہ شیش محل بھوپال میں پیش آیا تھا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

سمجھتے تھے اسی طرح اقبال بھی نئی نسل کو مغربی تعلیم کے مُضر اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور جا بجا اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم؛ کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

یا فردوس میں سعدی شیراز کو ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کے الحادی رجحان سے حالی کی زبان میں یوں واقف کراتے ہیں ؎

دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں ساز

یہ کہنا تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف اسلام پرستی کے قایل تھے لیکن وہ یہ ضرور سمجھتے تھے کہ ہماری موجودہ کمزوریوں اور خرابیوں کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے اُس راہ کو قطعاً خیرباد کہہ دیا جو ہمارے اجداد نے متعین کی تھی جس کی وجہ سے دونوں نسلوں میں بڑی تفریق پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا حالی نے "مسدس" میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ نے ان خیالات کو اپنی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں بڑی عمدگی سے سمویا ہے۔ وہ نوجوانوں کا اپنے اجداد کے فقر، شجاعت، غیرت و حمیت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ

دنیا کا ہر شاعر کائنات کے روح پرور نظاروں سے متاثر ہوتا ہے اور گوناگوں ذاتی تاثرات کو نغمات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ انگریزی ادب میں بعض شعرا نے اس طرف اتنی زائد توجہ دی کہ وہاں دبستان شاعرِ فطرت پیدا ہو گیا۔ فارسی شاعری بھی گل و بلبل، سرو قمری، کبک و دری، آہوئے ختن کی داستانوں سے معمور ہے۔ جہاں ان کی خصوصیات کا طرح طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال بھی اس رنگ سے متاثر ہیں۔ اُن کے ہاں بھی مرغ و ماہی، پروانہ و جگنو، زاغ و زغن اور شہباز و شاہین کا ذکر ملتا ہے لیکن ان میں شاہین کا ذکر بار بار اور بہ کثرت آیا ہے۔ اقبال سے پہلے کسی شاعر نے شاہین کا وہ تخیل پیش نہیں کیا جو اُن کے ہاں ملتا ہے۔ پُرانے اساتذہ نے اس کی چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے مگر اقبال نے اس کی بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ اقبال نے قدیم جرمنی یا نازی جرمنی کے عقابی پرچم سے یہ کنایہ مستعار لیا ہے اور وہ اسے فسطائیت کی نشانی سمجھتے ہیں کیونکہ شاہین بڑا جنگجو اور شکاری پرندہ ہے جو کمزور پرندوں کو مار کھاتا ہے حالانکہ اقبال نے یہ تشبیہ اس لیے استعمال کی کہ اس پرندہ میں اسلامی فقر کی متعدد خصوصیات مثلاً خودداری، غیرت مندی، آشیانے سے بے تعلقی، خلوت پسندی، تیز نگاہی اور دوسروں کے مارے ہوئے شکار سے گریز وغیرہ[1] پائی جاتی ہیں اور کہیں

[1] عزیز احمد ۔ اقبال نئی تشکیل ۔ ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۰۳ (محمد احمد سبزواری)

علامہ نے اس کی وضاحت بھی کی ہے مگر "اقبال اور سیاست ملی" کے مؤلف نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اگر کلام اقبال کا تاریخ وار مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تشبیہ ارتقائی صورت رکھتی ہے۔ بانگ درا مرحوم کا سب سے پہلا مطبوعہ مجموعہ ہے۔ اس میں سارے کلام کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شاہین کا لفظ آخری دور میں جو ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے صرف تین جگہ آیا ہے۔ سب سے پہلے "محاصرہ اورنہ" میں یا دو جگہ "طلوع اسلام" میں۔ نظم "اسیری میں" حافظ کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے۔ تضمین میں یہ لفظ ہے مگر خود شاعر نے صرف دو ایک خصوصیات پر اکتفا کی ہے۔

لیکن جیسے جیسے اقبال کے بعض خیالات اور رجحانات میں پختگی ہوتی گئی وہ وطن پرستی اور اسلامی شاعری کے دور سے گزر کر انقلابی دور میں داخل ہوئے تو ان کے شاہین کے تصور نے بھی ایک ارتقائی کیفیت حاصل کرلی جس کا اندازہ بعد کے کلام سے ہوتا ہے۔ بال جبریل میں "شاہین" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں اقبال نے اپنے شاہین کی تمام خصوصیات کو ایک جگہ سمو دیا ہے ؎

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارا جہاں رزق کا نام ہے آب ودانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم ادائیں ہیں اُن کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کی رہبانیت اور دوسرے ادیان یا مسلکوں کی رہبانیت میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رہبانیت اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔ اقبال کے ہاں دین و دنیا دونوں کا امتزاج ہے۔ چنانچہ اُس نے صاف صاف اعلان کردیا ؎

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

اس کے فقر میں اگر ایک جانب جرأتِ رندانہ، جذبِ کلیمانہ، فکرِ حکیمانہ ہے تو دوسری جانب اندازِ ملوکانہ، شکوۂ شاہانہ، شانِ سکندری اور دبدبۂ قیصری بھی نظر

---

[1] رئیس احمد جعفری۔ اقبال اور سیاست ملی۔ اقبال اکیڈمی کراچی۔ صفحہ ۱ (محمد احمد سبزواری)

آتا ہے۔ اس نے فقر کی دو واضح قسمیں کی ہیں ے

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

وہ اس فقر کا قائل نہیں، جو صیاد کو نخچیری سکھائے یا قوموں میں مسکینی اور دلگیری پیدا کرے بلکہ اُس کے نزدیک ے

فقر کے معجزات تاج و سریر و سپاہ!
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

اور اسی فقر کو وہ علم سے بلند و بالا سمجھتا ہے۔ چنانچہ علم و فقر کا مقابلہ کرتے ہوئے اس فرق کو بہت اچھی طرح واضح کردیا ہے ے

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ!
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

لیکن محض اونچی ہواؤں میں اُڑنے سے وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوتیں جو شاہیں کو دوسرے پرندوں سے ممیز کرتی ہیں ے

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

یا

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اَور
پرواز ہے دونوں کی اُسی ایک فضا میں

اقبال کے شاہین میں نہ صرف غیرت اور خودداری ہے بلکہ وہ قوت، طاقت اور جوانمردی کا مظہر بھی ہے۔ اقبال کے شاہین کو دنیا میں رہنا ہے۔ خلوت پسندی اور آشیانے سے بے تعلقی کے باوجود وہ دنیا سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکتا ہے اور دنیا میں وہی زندہ رہ سکتا ہے جس میں ذاتی قوت اور طاقت ہو۔ دوسروں کے سہارے یہاں رہنا مشکل ہے اس لیے وہ کہتا ہے ے

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لیکن یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ اقبال نے اپنے شاہین کو جبر و استبداد سے وابستہ کردیا ہے یا وہ جنگل کا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ طاقت و قوت کو ذاتی تحفظ کے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ قوتِ پرواز اسی وقت بڑھتی ہے جب کہ قوت تحفظ پیدا ہو جائے۔ بغیر ذاتی صلاحیت کے اس جہانِ رنگ و بو میں امتیاز حاصل کرنا دشوار ہے۔ پھر قوت و طاقت حرکت کا سبب ہے اور حرکت زندگی کا نشان۔ کائنات کی ہر شے میں حرکت نظر آتی ہے اور اس کے بعد ہی وہ مقام آتا ہے جہاں قوت کی جولانی کا مظاہرہ مقصود بالذات بن جاتا ہے اور وہ حمام و کبوتر کا

بھوکا نہیں رہتا بلکہ ۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ! لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں[۱]"

اقبال کے قیام بھوپال کی یادگار ادبی محفلوں سے فیضان حاصل کرنے والے بھوپال کے مایۂ ناز فرزند محمد احمد سبزواری کے مندرجہ بالا خیالات اُن کی بصیرت افروزی، اقبال فہمی اور ژرف نگاہی پر دلالت کرتے ہیں۔ انھوں نے جس خوبی اور خوبصورتی سے فکر اقبال کا اپنے اس قیمتی اور نایاب مضمون میں احاطہ کیا ہے وہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے۔

جب سبزواری صاحب کراچی آ گئے تو میں نے اُن سے رابطہ قایم کیا اور اس مضمون کے پس منظر کے بارے میں اُن سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ شیش محل بھوپال کی وہ محفلیں اور صحبتیں جن کا نقش آج تک میرے دل پر قایم ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ ہے۔ میں نے بچپن سے ہی اقبال کی فکر و حکمت کے گہرے اثرات قبول کیے تھے۔ جب اُن سے نیاز کا شرف بھی حاصل ہو گیا اور اُن کے حکیمانہ اور عالمانہ انداز فکر کا ذاتی طور پر بھی مجھے اندازہ ہوا تو عقیدت و احترام کا جذبہ کچھ اور سوا ہو گیا۔ چنانچہ اس مضمون میں وہی کچھ پیش کیا گیا ہے جو میں نے بزم اقبال کی صحبتوں میں حاصل کیا۔ وہ بلاشبہ نئی نسل کے لیے اپنے دل میں گہری دردمندی اور تڑپ رکھتے تھے۔

بھوپال میں — بزم اقبال کی کچھ اور تفصیلات کے سلسلے میں میرے ایک سوال پر انھوں نے کہا کہ جس دور میں اقبال بھوپال آنے جانے لگے تھے یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں نہ ریڈیو اس قدر مقبول تھا جیسا کہ آج کل ہے اور نہ چھوٹے شہروں سے روزانہ اخبار نکلا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں روزناموں کی تعداد بس گنی چنی تھی۔ اردو کے کچھ روزنامے کلکتہ، بمبئی، دہلی، لاہور اور لکھنؤ وغیرہ سے نکلا کرتے تھے مگر انگریزی روزانہ اخباروں کے مقابلے میں اُن کا حلقہ محدود تھا کیونکہ یہ تیسرے یا چوتھے روز دور دراز مقامات پر پہنچا کرتے تھے۔ لہٰذا اُس زمانے میں مقامی خبروں کی فراہمی، تبادلۂ خیال یا اپنے علمی اور فنی ذوق کو تسکین دینے کے لیے لوگوں کے گھروں پر نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ غیر رسمی اجتماع یوں تو ہر شخص کے لیے کھلے ہوتے تھے مگر عام طور پر واقف، ہم خیال اور ہم ذوق افراد ہی ان میں شریک ہوتے تھے۔

برصغیر کی علمی اور سماجی زندگی میں ان نشستوں اور محفلوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ بھوپال میں بھی ایسی ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ آیندہ جب بھی کبھی بھوپال کی تہذیبی و ثقافتی تحریکات کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ان کے کردار اور اثرات ناقابل فراموش ہوں گے۔ مثال کے طور پر ماسٹر ناصر علی ناصر اشادی کے مکان پر بلاناغہ ہر رات ایک نشست ہوا کرتی تھی جس میں اسکولوں کے اساتذہ، محکمۂ تعلیم کے ملازمین، سرکاری افسران، شاعر، صحافی، وکیل اور طلبہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ان نشستوں میں مقامی حالات پر تبصرے سے لے کر ہندوستان کی سیاست، شعر و شاعری، علمی موضوعات اور لطیفہ گوئی تک ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ نشست برسوں ہوتی رہی اور ناصر اشادی کے انتقال کے بعد ہی اس کا شیرازہ بکھرا۔ اسی طرح بعض نشستیں مقامی شاعروں اور سربرآوردہ افسروں کے مکانوں پر ہوتی تھیں۔ خود راس مسعود جمعہ کے روز — جب کہ ریاست میں تعطیل ہوتی تھی بہ پابندی صبح سے نماز جمعہ سے قبل تک اور اکثر بعد نماز جمعہ سے شام تک ایسی نشستیں منعقد کرتے تھے۔ اکثر جگہوں پر دیگر تعطیلات میں بھی شعر و شاعری کی محفلیں ہوا

---

[۱] "خیاباں" پشاور۔ اقبال نمبر۔ صفحہ ۴۵ تا ۵۸۔ خیاباں کا یہ خصوصی شمارہ ۱۹۶۶ء میں "خیابان اقبال" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شایع ہو چکا ہے۔

کرتی تھیں۔ راس مسعود نے بھوپال میں رہ کر یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور اہلِ علم کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ وہ ریاست میں بہت مقبول تھے۔ اُن کا بنگلہ "ریاض منزل" شہر سے کوئی تین سوا تین میل دور تھا پھر بھی جمعہ کی خاص نشستوں میں جہاں تک یاد پڑتا ہے محمود الحسن صدیقی، عبدالجلیل مائل نقوی، ملا رموزی، سید حامد رضوی، مولینا ارشد تھانوی، مولینا محمد یوسف قیصر، مولوی عبدالرزاق، حامد سعید خاں حامد، محمد خلیل اللہ خاں، منشی سید لطف علی، استاد ذکی وارثی، حکیم علی کوثر چاندپوری، عبدالحلیم آرٹسٹ، پنڈت لکشمن ایا جی، رائے زادہ منشی گوبند پرشاد آفتاب، سیٹھ وٹھل داس، مولوی سید احمد سبزواری وغیرہ پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ خود میں بھی قیام بھوپال کے دوران اکثر و بیشتر "ریاض منزل" جاتا تھا۔ سرراس نے ندیم ہفت روزہ کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ بنا دیا تھا اور تمام لکھنے والوں کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سرراس نے مجھ سے کہا کہ تم بیکار بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو۔ ندیم کے دفتر میں جاکر ترجمہ کیا کرو۔ چنانچہ میں دوسرے ہی دن سے اخبار کے دفتر جانے لگا اور قلم کی سب سے پہلی آمدنی مجھے اسی ندیم اخبار سے ہوئی۔

سرراس اگرچہ علامہ کو صرف "اقبال" کہا کرتے تھے مگر وہ اُن کی بے حد عزت کرتے تھے۔ علامہ سے اُن کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی نجی محفلوں میں اکثر ان ہی کا تذکرہ کیا کرتے اور اُن کے اشعار سنایا کرتے تھے اور بعض اوقات متقدمین اردو اور فارسی کے وہ شعر بھی سنا دیتے تھے جن کے مضامین میں مماثلت ہوتی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علامہ نے آخری دو بار شیش محل میں قیام فرمایا جہاں اکثر اقبال شناسوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ اگر کسی شب علامہ کی طبیعت ناساز ہوتی تو آنے جانے والے مزاج پرسی کر کے رخصت ہوجاتے اور نشستوں کا سلسلہ چند دن کے لیے منقطع ہوجاتا۔ پھر جب سرراس جو اُن کی ہمہ وقت خبرگیری کرتے تھے۔ یہ بتا دیتے کہ اب اقبال اچھے ہیں یا کسی کو مخاطب کر کے فرما دیتے کہ آج رات شیش محل میں اس موضوع پر بات ہوگی۔ وہاں آجاؤ تو نیازمندوں کا یہ حلقہ شیش محل میں جمع ہوجاتا۔ عام طور پر وہی لوگ ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے جن کا ذکر اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ مجھے علامہ کی محفلوں میں بھی راس مسعود کے یہاں جمع ہونے والے افراد نظر آئے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر سلطان کو بھی میں نے وہاں موجود پایا۔ یہ دونوں اُن کے معالج تھے۔ اور خصوصی ہدایات کے تحت رات کو علامہ کی خیریت دریافت کرنے آتے تھے۔ ممنون حسن خاں بھی پابندی سے وہاں آتے تھے اور ماسٹر ولی محمد صاحب بھی جو نواب صاحب کے استاد رہ چکے تھے۔ برابر آتے تھے۔ چند مقامی ادیب و شاعر بھی شریک محفل ہوا کرتے تھے۔ کبھی خود راس مسعود بھی آجاتے تھے اور اُن کی آمد سے محفل میں جان پڑ جاتی تھی۔ زیرِ لب مسکراہٹیں بلند قہقہوں میں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ اُن کی شخصیت بلاشبہ بڑی باغ و بہار تھی۔ علامہ اقبال مجھے کم گو نظر آئے۔ ہوسکتا ہے اس کا سبب اُن کی علالت اور گلے کی تکلیف ہو۔ پھر بھی وہ اپنے پسندیدہ موضوعات پر ضرور اظہارِ خیال کرتے تھے۔

عام طور پر میں نے انھیں قمیص شلوار میں دیکھا۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے۔ وہیں ایک چھوٹا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا جس کے سہارے وہ کبھی نیم دراز ہوجاتے۔ ایک دن آرام کرسی پر بھی دیکھا جس پر دونوں پاؤں اٹھا کر رکھ لیے تھے۔ حقہ البتہ ہر جگہ آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ خادم خاص علی بخش بھی سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہتا تھا۔

پہلی مرتبہ میں تنہا گیا تھا۔ دوسری بار اپنے ایک دوست سید حسن کو ساتھ لے گیا۔ یہ مجھ سے کچھ سینئر تھے۔ باتیں بہت دلچسپ انداز میں کرتے تھے۔ میرے اصرار پر انھوں نے چند مضامین تغزل کے رنگ میں لکھے تھے۔ جو لاجواب تھے۔ اُس دن ترقی پسندی کی باتیں ہورہی تھیں۔ سید حسن کہنے لگے۔ "میں ترقی پسندی کا قایل ضرور ہوں مگر شاعری میں ترقی پسندی مجھے بالکل پسند نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک مصرعہ تو مولینا سہا اور دوسرا مصرعہ جوش ملیح آبادی۔"

(واضح رہے کہ مولینا سہا مجددی نہایت پستہ قد بزرگ تھے) لوگ یہ فقرہ سُن کر خوب ہنسے، علامہ اقبال بھی مُسکرائیے۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس فقرہ سے کافی لطف اندوز ہوئے۔ اب تو ان محفلوں کی صرف یادیں ــــ یادگار بن کر رہ گئی ہیں!!

بھوپال میں اقبال کے خاص معالج ڈاکٹر عبدالباسط کا تفصیلی ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ عبدالحئ ڈاکٹر عبدالباسط کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں بمقام دہرہ دون پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں وہیں سے میٹرک کر کے بسلسلۂ تعلیم دہلی گئے اور ۱۹۲۸ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے علی گڑھ بھیج دیے گئے جہاں سے ۱۹۳۰ء میں آپ نے بی اے کیا اور ۱۹۳۳ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دے کر فرسٹ ڈویژن حاصل کیا اور ۱۹۳۴ء میں میرٹھ جا کر وکالت شروع کر دی لیکن جب آپ کے والد صاحب ۱۹۳۵ء میں بھوپال منتقل ہو گئے تو آپ بھی بھوپال آ گئے اور دو سال تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ جوڈیشیل افسر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک آپ نے سب جج اور سب ڈویزنل مجسٹریٹ بلدیہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں استعفیٰ دے کر کراچی آ گئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ عرصہ اسسٹنٹ کسٹوڈین رہے اُس کے بعد ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ، ایڈیشنل رینٹ کنٹرولر، کلیمس آفیسر، ڈپٹی سیٹلمنٹ کمشنر اور ڈپٹی کسٹوڈین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

عبدالحئ صاحب سے میری اتفاقیہ ملاقات سیٹلمنٹ کے دفتر میں ہوئی۔ میں اپنے عم گرامی پروفیسر سید نواب علی کے کلیم کے سلسلے میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ دوران گفتگو بھوپال کا ذکر آ گیا تو آپ نے بتایا کہ میرے پاس علامہ اقبال کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط اور "ضرب کلیم" کا دستخطی نسخہ محفوظ ہے۔ چنانچہ میں گھر کا پتہ لے کر دوسرے روز حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے ازرہ اقبال شناسی مجھے وہ خطوط اور نسخہ عطا کر دیا۔ میں اپنے کام کی تفصیل اُنھیں بتا چکا تھا۔ چنانچہ میری خواہش پر آپ نے اپنے والد صاحب اور اقبال کے خصوصی تعلقات کی تفصیلات بھی مجھے بتائیں جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ اپنے والد صاحب کی طرح عبدالحئ بھی اقبال کے گرویدہ و شیدا نکلے۔ چنانچہ انھوں نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں کی انتہائی دلچسپ اور اچھوتی روداد سنائی۔ پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ۱۹۳۵ء میں میں اپنے والد صاحب کے ساتھ علامہ اقبال سے ملنے "ریاض منزل" گیا تھا۔ اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ بہت بڑے شاعر اور فلسفی ہیں۔ نہایت سادہ لباس پہنے تھے۔ سر راس مسعود بھی موجود تھے۔ انھوں نے والد صاحب کا اور میرا تعارف کرایا اور خاندانی رشتے کا تذکرہ بھی کیا۔ اقبال نہایت دھیمے لہجہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ والد صاحب کو اُنھوں نے اپنے مرض کی تفصیلات بتائیں اور دریافت کیا کہ کیا بجلی کے علاج سے فائدہ ہوگا۔ والد صاحب نے اُنھیں تسلّی دی اور یقین دلایا کہ اس علاج سے انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔ میں خاموش بیٹھا گفتگو سنتا رہا۔ کچھ دیر ٹھہر کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ والد صاحب برابر "ریاض منزل" جاتے رہے۔ تقریباً ایک ماہ قیام کر کے علامہ اقبال واپس چلے گئے۔ اس دوران میں والد صاحب سے اُن کی برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔

دوسری بار جب ۱۹۳۶ء میں وہ بھوپال آئے تو اُن کا قیام شیش محل میں ہوا جو ہمارے مکان قدسیہ محل کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ مجھے تقریباً روزانہ ہی اُن سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اگر کسی روز میں نہ جاتا تو علامہ کسی کو بھیج کر بلوا لیتے۔ شام کو جب سرکاری موٹر آ جاتی تو وہ والد صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر سیر کے لیے جاتے۔ یہ تقریباً روز ہی کا معمول تھا۔ شہر کی تمام تفریح گاہیں ہم نے اُنھیں دکھائیں۔ ایک دو بار شہر سے دور اسلام نگر بھی گئے۔ یہ تاریخی اور پُر فضا جگہ علامہ اقبال کو

بہت پسند آئی۔ شملہ کوٹھی، یاٹ کلب، بڑا تالاب، چھوٹا تالاب اور تمام باغات کی سیر سے علامہ بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اتنا قرب ہونے کے باوجود میں نے اُنھیں بہت کم گو پایا۔ زیادہ تر وہ کسی خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ ممکن ہے یہ استغراق فکر شعر کے سلسلے میں ہو۔ کبھی کبھی وہ والد صاحب سے گلے کی تکلیف کے بارے میں پوچھ گچھ کرلیتے تھے۔ کبھی ادبی موضوعات پر بھی مختصر لیکن جامع انداز میں اظہار خیال کرتے۔ میرے والد صاحب کو بھی شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر گفتگو کے دوران اُنھیں کا کلام سُنا دیتے تھے لیکن خود علامہ اقبال اپنا کلام سُنانے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ دوسروں کے اچھے شعر سُن کر ضرور داد دیتے تھے شیش محل میں شام کو کئی لوگ ملنے کے لیے آجاتے اُن میں بڑے افسران اور اقبال کے پرستار بھی ہوتے تھے اور عام لوگ بھی۔ وہ سب سے یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔ تقریباً روزانہ کی ملاقات نے مجھے خاصا بے تکلف کردیا تھا۔ ایک روز میں نے سوال کرلیا کہ آپ کے کلام کی اتنی شہرت و عظمت ہے پھر کیا سبب ہے جو آپ کو نوبل پرائز نہیں ملا۔؟

یہ سُن کر علامہ نے کچھ دیر توقف کیا پھر فرمایا:۔

"میرے یہاں سب کچھ مغرب کے خلاف ہے اس لیے وہ مجھے نوبل پرائز کیسے دے سکتے ہیں!"

اُن کا جواب سُن کر مجھے اُن کی حقیقت پسندی کا قایل ہونا پڑا۔ ایک بار میں نے اُنھیں کا ایک شعر پڑھا ؎

نقش دگر طراز دہ عالم پختہ تر بیار
طالب خاک ساختن مے نہ سزد خدائے را

اور دریافت کیا کہ اس شعر میں آپ کس حد تک سنجیدہ تھے؟

آپ نے فرمایا:۔

"یہ تو آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہر شاعر پوری فکر کے بعد شعر کہتا ہے۔ اُس کے مافی الضمیر، شعری صداقت اور صحیح مفہوم کو سمجھنا ہر پڑھنے والے کی ذمہ داری ہے۔

ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟

فرمایا "بعض اوقات مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور میں بے اختیار شعر کہتا چلا جاتا ہوں۔ لیکن اگر بالارادہ کبھی شعر لکھنا چاہوں تو نہیں لکھ سکتا۔ عام طور پر جس طرح لوگ مجھے شاعر سمجھتے ہیں میں اُس طرح کا شاعر نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ایک پیغام ہے جسے میں عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں چنانچہ اپنا پیغام منظوم صورت میں پہنچا رہا ہوں۔ محض شعر کہنے کے لیے شعر کبھی نہیں کہتا جب تک کہ کوئی خاص تحریک نہ ہو۔"

علامہ اقبال اکثر گفتگو کے دوران اسلامی اقدار کا ذکر کرتے تھے اور رسولؐ مقبول کا جب تذکرہ فرماتے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے۔ ایک روز مغرب کے بعد ہم سب شیش محل میں بیٹھے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ایک نوجوان طالب علم اُن سے ملنے آیا اور آتے ہی علامہ کے قدموں پر گر پڑا۔ آپ نے سہارا دے کر اُسے اٹھایا۔ تو وہ علامہ کی ایک نظم جس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا بے اختیار سنانے لگا، جسے سُن کر آپ آب دیدہ ہو گئے۔ اُس سے نہایت شفقت سے دریافت کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ اُس نے نہایت عقیدت سے کہا کہ وہ صرف نیاز حاصل کرنے کا آرزو مند تھا اور اسی جذبہ کے تحت لاہور گیا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھوپال علاج کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ چنانچہ لاہور سے چل کر بھوپال آپ سے ملنے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سُن کر آپ بہت متاثر ہوئے۔

میرے اس سوال پر کہ شیش محل کی عام فضا میں اقبال کس طرح اپنا وقت گزارتے تھے۔ عبدالحیٔ نے کہا کہ شیش محل اگرچہ شاہی محل کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب بھی علامہ اقبال وہاں قیام فرما ہوتے تھے۔ ایک عام دربار کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ ہر شخص بلا امتیاز اُن سے ملاقات کے لیے آتا تھا۔ رات کو اکثر ادیبوں، شاعروں اور اقبال کے نیازمندوں کے اجتماع ہوتے تھے۔ دن میں وہ فرصت کے لمحوں میں مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے علامہ کو مطالعہ کا بہت شایق پایا۔ بھوپال کی مشہور حمیدیہ لائبریری سے برابر کتابیں منگواتے رہتے تھے اور ایک دو دن میں انھیں پڑھ کر لوٹا دیتے تھے اور نئی کتابیں حاصل کرلیتے تھے۔ جب بھی کسی کتاب کے بارے میں میں نے اُن سے کچھ سوالات کیے۔ وہ نہایت تفصیل سے اُس کے بارے میں جواب دیتے تھے۔ مجھے اُن کی یادداشت پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی جلد ضخیم کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں اور کس طرح اُن کے موضوعات کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ دو کتابیں علی الخصوص اُن کے سرہانے میں نے ہمیشہ دیکھیں۔ ایک مثنوی مولینا روم اور دوسری کلام عبدالقادر بیدلؔ۔ دریافت پر علامہ نے بتایا کہ یہ دونوں کتابیں سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ اُن کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" مجھے بہت پسند تھی۔ جب میں نے وہ نظم سُنائی تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ علم و مطالعہ میں اضافہ کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

اُن کے رہن سہن میں بڑی سادگی تھی۔ کبھی تہمد، قمیص پہنتے۔ کبھی شلوار قمیص۔ جب باہر کہیں جاتے تو کوٹ پہن لیتے۔ سوٹ میں نے اُن کو بہت کم پہنے دیکھا۔ علی بخش[۵] ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ وہ علامہ سے بہت محبت کرتا تھا اور حقہ ہمیشہ گرم رکھتا تھا۔

جاوید اقبال ۱۹۳۶ء میں لاہور سے ساتھ آئے تھے۔ اُس زمانہ کی ایک دو تصویریں جواب دھندلا گئی ہیں آج بھی محفوظ ہیں۔ میری درخواست پر وہ تصویریں انھوں نے مجھے عنایت کر دیں۔ جن کے ممکنہ بہتر پرنٹ میں نے بنوا کر اس کتاب میں شامل کر دیے ہیں تاکہ بھوپال کی یہ یادگار تصویریں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ جاوید کے بارے میں عبدالحیٔ نے بتایا کہ وہ زیادہ وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزارتے تھے اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اکثر تو دن دن بھر وہ ہمارے گھر ہی میں کھیل کود میں مصروف رہتے۔ علامہ اقبال جاوید سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت پر اُن کی خاص توجہ تھی۔ بھوپال کے ایک تجربہ کار ماسٹر اُن کو پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ شام کو وہ روزانہ ہی سیر کے لیے ساتھ جاتے۔ دن کے بیشتر حصے میں وہ بلا تکلف ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔

میرے والد صاحب تو علامہ اقبال کے بے حد مداح اور قدرداں تھے وہ اُن کی خصوصی دیکھ بھال ہی نہیں کرتے تھے۔ فرصت کے بیشتر لمحے بھی انھیں کی قربت میں صرف کرتے تھے۔ شام کا کھانا میرے والد صاحب اکثر علامہ اقبال کے ساتھ کھاتے تھے۔ مجھے بھی بارہا شرف طعام نصیب ہوا۔ ہم نے گھر پر بھی کئی بار اُن کی دعوت کی۔ انھیں کباب بے حد مرغوب تھے

۵۔ افسوس کہ اُن کا یہ دیرینہ خادم و عقیدت مند بھی اب اس دنیا میں نہیں۔

اور ہم ہر دعوت میں خصوصیت کے ساتھ کباب تیار کرتے تھے۔

آخری بار جب وہ بھوپال تشریف لائے ہیں تو اُن کی صحت بہت گر چکی تھی۔ آواز بھی صاف نہیں نکلتی تھی اور کچھ دمہ کی شکایت بھی بڑھ گئی تھی۔ میرے والد صاحب اور بھوپال کے دیگر معالجین بڑی توجہ اور احتیاط سے اُن کا علاج کر رہے تھے۔ اور اس علاج سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوا تھا۔ لیکن اُن کے ذاتی حالات بھوپال میں زیادہ قیام کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لیے آخری قیام بہت مختصر رہا اور وہ جلد بھوپال آنے کا وعدہ کرکے لاہور واپس تشریف لے گئے۔ اس قیام کے دوران اُنھوں نے اپنا زیادہ وقت قرآن مجید کے حواشی پر صرف کیا۔ اس کتاب کے لیے نواب صاحب بھوپال نے اُن سے فرمائش کی تھی اور اس سلسلے میں ہر ممکنہ اعانت بھی کی تھی۔ لیکن قدرت کا عجب تماشا ہے۔ ادھر راس مسعود کا انتقال ہوگیا۔ اُدھر علامہ کی صحت اور گر گئی اور وہ کوشش کے باوجود پھر بھوپال نہ آسکے۔

اقبال کے ایک اور نیاز مند محمد خلیل اللہ خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال نے راس مسعود سے کہہ رکھا تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ہونہار اور ذہین نوجوانوں کو ملازمت کے لیے بھوپال بھیج دیا کریں۔ چنانچہ راس مسعود کی سفارش پر آپ ۱۹۳۳ء میں بھوپال آگئے اور مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر نیک نامی اور شہرت حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں آپ سکریٹری فوڈ اینڈ ایگری کلچر اور فوڈ کمشنر کے عہدے سے سبک دوشی حاصل کرکے بھوپال سے کراچی منتقل ہوگئے اور یہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وابستہ رہ کر درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

۱۹۶۴ء میں اتفاقیہ آپ سے میری ملاقات کراچی میں ہوگئی۔ ملاقات کے دوران میں نے اُن سے اپنے کام کی مشکلات کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ کسی روز وقت ہو تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں اور آپ مجھے اقبال کے قیامِ بھوپال اور اپنی ملاقاتوں کی تفصیلات سے بہرہ مند فرمائیں۔ انھوں نے بخوشی آمادگی ظاہر کی۔ وقت مقررہ پر میں اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تو انھوں نے اپنی یادداشتوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ۳۶-۱۹۳۵ء میرے لیے واقعی خوش قسمت سال تھا جب مجھے شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ وہ ہز ہائی نس نواب محمد حمید اللہ خاں کے الطاف خسروانہ اور ذاتی عقیدت کی بناء پر بسلسلہ علاج بھوپال تشریف لاتے رہے اور نواب صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بناء پر بھوپال کے مشہور و ممتاز ڈاکٹروں اور اطبا نے اُن کے خصوصی علاج پر ہر ممکن توجہ مبذول کی۔ میرے مکان اور شیش محل کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ اگر میں اپنی رہائش کو ہمسائگی پر محمول کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ شاعرِ مشرق اُس زمانے میں اپنے دیرینہ ملازم علی بخش کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔ ظاہر ہے بیماری کی حالت میں تنہائی مرض کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ چنانچہ اُن کی بحالیٔ صحت کے لیے ڈاکٹروں اور اطباء کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ کچھ صاحبانِ ذوق وقتاً فوقتاً اُن سے ملتے رہیں۔ میں اُس زمانے میں ریاست بھوپال میں بعہدۂ تحصیل دار متعین تھا اور سر راس جن کی ذاتی کوششوں سے علامہ اقبال بھوپال آکر علاج کرانے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اُس وقت وزارت تعلیمات پر مامور تھے۔ چنانچہ جب علامہ اقبال بھوپال تشریف لے آئے تو انھوں نے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے اور اُن کی خبر گیری کرنے کے لیے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ جس سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔ علامہ اقبال کے احساسِ تنہائی کو کم کرنے کے لیے راس مسعود مرحوم نے میرے علاوہ اپنے سکریٹری اور میرے دوست ممنون حسن خاں اور میرے محب اور دوست مسیح الدین سے بھی جو بھوپال کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ اور نہایت خوش مذاق انسان تھے علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے کہہ دیا۔۔۔ چنانچہ ہم تینوں کبھی تنہا اور کبھی ایک ساتھ علامہ

کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور اُن سے فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُن کے معالجین میں جنھیں نواب صاحب نے متعین فرمایا تھا۔ خاص طور پر ڈاکٹر عبدالباسط، ڈاکٹر عبدالرحمن، چیف میڈیکل آفیسر، ڈاکٹر سلطان، حکیم ضیاءالحسن افسر الاطباء، حکیم سلطان محمود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بھوپال کے قیام نے علامہ مرحوم کی صحت کی بحالی میں بڑی مدد دی اور بھوپال چھوڑنے سے قبل وہ بڑی حد تک صحت یاب ہو چکے تھے۔ اپنے قیام کے آخری دنوں میں۔ مجھے خود اُن کی زبان سے اُن کا بصیرت افروز کلام سننے کا موقع بھی ملا۔ وہ لمحے میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں جو میں نے اُن کی قربت میں گزارے۔ اُن کا کلام سُن کر دل میں جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا تھا اور عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی تھیں۔ اُس دور میں بھوپال کی جن ممتاز ادبی شخصیتوں کو اکثر میں نے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر پایا اُن میں ملا رموزی، سید محمد یوسف قیصر، سہا مجددی، اذکی وارثی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جب بھی میں حاضرِ خدمت ہوتا وہ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے اور جب رخصت ہونے لگتا تو آیندہ جلد آنے کے لیے ضرور ارشاد فرماتے۔ اِن الفاظ سے مجھے حقیقی خوشی ہوتی تھی اور میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا تھا کہ اس طرح علامہ مرحوم کا کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے اور وہ اپنی بیماری اور تکلیف کو کچھ عرصے کے لیے بھلا دیتے ہیں۔ میں اکثر شام کو حاضرِ خدمت ہوتا تھا اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی شاعری کے اعلیٰ مقاصد پر، کبھی ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر، کبھی مسلم قوم کی زبوں حالی پر، کبھی ملتِ اسلامیہ کی فلاح و ترقی پر۔ علامہ مرحوم کے دل میں مسلمانوں کی سود و بہبود کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ تقریباً ہر ملاقات میں وہ قوم کی بدحالی کا ذکر ضرور کرتے اور ملت کی ترقی کے لیے شیرازہ بندی کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ساری زندگی اور اُن کا سارا سرمایۂ فکر و حکمت علم و عمل سے عبارت ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو جذبہ میں نے علامہ اقبال کے دل میں موجزن پایا۔ کہیں اور اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

مسیح الدین سے بھی میری ۱۹۶۲ء ہی میں ملاقات ہوگئی۔ وہ افکار کے پہلے خریدار، میرے چچا پروفیسر سید نواب علی کے عزیز شاگرد اور ایک ممتاز زمیندار تھے۔ محمد خلیل اللہ خاں کے بیان کردہ واقعات کی انھوں نے بھی تائید و تصدیق کی اور کہا کہ شاعرِ مشرق کا ریاست بھوپال اور بھوپال کے عوام نے جس کھلے دل سے استقبال کیا اور اُن کی قدر و منزلت کی۔ اردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ علامہ مرحوم کو بھوپال کی آب و ہوا، تفریح گاہیں، اسلامی ریاست کا شکوہ، حکمران وقت کی اعلیٰ خدمات۔ سبھی کا دل سے اعتراف تھا۔ وہ جتنے عرصے بھی بھوپال میں رہے۔ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہے۔ یہاں اُن کے نیازمند بھی اُن کی آمد سے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ شیش محل کے قیام میں اُنھیں ہر ممکن سہولت نواب صاحب کی جانب سے مہیا کی گئی تھی اور وہ اگرچہ ایک شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے لیکن شاعرِ مشرق کا دربار عام تھا اور ہر شخص بلا تکلف اُن سے ملنے اور فیضیاب ہونے کے لیے آسکتا تھا۔ اکثر جمعہ کی نماز وہ جامع مسجد یا موتی مسجد میں جا کر پڑھتے اور وہاں بھی جاننے والے اُن سے عزت و تکریم اور عقیدت و محبت سے ملتے۔ خواص سے زیادہ اُنھیں عوام عزیز تھے اور وہ ہر آنے والے سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

بھوپال کی ادبی فضا کے سلسلے میں رشید احمد ارشد تھانوی اور سید محمد یوسف قیصر کا تذکرہ ابتدائی ابواب میں۔ ”سبعہ سیارہ“ کے ذیل میں آچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں بھوپال کے ادبی اُفق پر ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔ یہ دونوں بزرگ و محترم بیک وقت نظم و نثر پر حاوی تھے اور بھوپال میں نئے رجحانات کو فروغ دینے اور نظم کی

روایت کو برقرار رکھنے میں ان دونوں کا بڑا حصہ ہے۔

مجھے خوش نصیبی سے دونوں شخصیتوں سے نیاز اور قرب حاصل تھا۔ قیصر صاحب مرحوم نے تو اس کتاب کے سلسلے میں "آئینہ مشاعرہ" ایسی دستاویزی تالیف عطا کر کے اقبال کے بھوپال سے روابط کا آغاز کرایا۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء میں شایع ہوئی تھی۔ ارشد تھانوی صاحب مرحوم سے بھوپال میں بھی ہمیشہ قریبی تعلق قایم رہا اور کراچی میں بھی۔ وہ جب ریڈیو پاکستان کے دفتر واقع بندر روڈ پر تشریف لاتے تو مجھ سے ملنے کے لیے دفتر افکار بھی آجاتے۔ جو ریڈیو پاکستان سے نزدیک ہی ہے۔

ارشد تھانوی اکثر و بیشتر اقبال سے بھوپال کے قیام کے دوران ملتے رہتے تھے اور ان کے بڑے مداح و قدر دان تھے۔ لیکن اُن کا تعلق نیاز فتحپوری کے ادبی گروہ سے تھا اس لیے وہ کسی اختلاف کی صورت میں اظہار رائے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ چنانچہ ارشد صاحب نے مجھے بتایا کہ "اقبال اور میں" کے عنوان سے انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا جو ہفت روزہ ندیم میں شایع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے اقبال کے کلام کے بعض فنی نقائص پر روشنی ڈالی تھی۔ جس زمانے میں یہ مضمون "ندیم" میں چھپا۔ اقبال بھوپال ہی میں مقیم تھے۔ انھوں نے تو اسے پڑھ کر خاموشی اختیار کرلی۔ لیکن اُن کے ایک بھوپالی نیاز مند اور "تاریخ اندلس" کے مشہور مصنف قاضی ولی محمد نے اس کا جواب لکھا جو ندیم میں شایع ہوا۔ راس مسعود نے دونوں مضامین دیکھے تو ارشد صاحب کو ملاقات کے لیے بُلایا۔ ساتھ ہی انھوں نے اقبال کو بھی شیش محل سے سواری بھیج کر "ریاض منزل" بلوالیا اور دونوں کی موجودگی میں ارشد صاحب کی غلط فہمی کو بھی دور کیا اور اقبال کی کدورت کو بھی اور اس طرح خوبصورتی سے اعتراض اور جواب اعتراض کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ارشد صاحب نے کہا کہ اس مضمون کے بعد انھوں نے سولہ قسطوں میں "بھوپال کی فضائے شعری" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اُس میں اقبال کی شاعری اور اُن کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اقبال کو وظیفہ دے کر نواب صاحب بھوپال نے انھیں مالی اور ذہنی پریشانیوں سے نجات ہی نہیں دلائی انھیں زندہ رہنے کا حوصلہ اور آسودگی بھی بخشی تاکہ وہ فکر و تخلیق میں مصروف رہیں۔ اُن کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جائے گا۔

سید محمد یوسف قیصر مرحوم ۱۹۶۴ء میں اپنے صاحبزادے سے ملنے کراچی آئے تھے تو میں نے انھیں رات کے کھانے پر مدعو کیا اور اُن کی زندگی اور اُن کے کاموں کے بارے میں متعدد سوالات کیے۔ اور اُن کے تفصیلی حالات افکار کے "فن اور فن کار" کے عنوان سے شایع کیے۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال سے ذاتی نیاز مندی اور عقیدت کے علاوہ جن بلند مرتبت شخصیتوں سے اُن کی خط و کتابت رہی ہے اُن میں غالب کے پوتے خواجہ قمرالدین خاں راقم، اکبر الٰہ آبادی، مہدی الافادی، سروجنی نائیڈو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسوس کہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے اور اُن کا سارا ادبی سرمایہ چوری ہوگیا۔

اقبال کے نیاز مندوں کی تلاش کے دوران پتہ چلا کہ نواب صاحب بھوپال کی کابینہ کے ایک ممتاز رُکن علی حیدر عباسی سابق مشیر المہام صیغۂ سیاسیہ کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ پہلی فرصت میں میں نے اُن سے رابطہ پیدا کیا اور ازرہِ شفقت انھوں نے مجھے ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔ میں جون ۱۹۶۷ء میں اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور اُس دور کے حالات، اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل اور بھوپال سے اُن کے تعلق خاص کے بارے میں

نگار، شمارہ ۱۵۱ - مارچ ۱۹۶۴ء - صفحہ ۸۱ - ۸۲

سوالات کیے تو آپ نے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۲۱ء میں بھوپال آگیا تھا اور وزیر خارجہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا۔ راس مسعود میرے خاص دوستوں میں تھے۔ نواب صاحب انھیں بھوپال بلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی ہدایت پر خط وکتابت میں نے ہی کی اور اُنھیں وزارتِ تعلیمات کا عہدہ قبول کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ وہ بھوپال آگئے۔ اقبال کے وہ بے حد عقیدت مند تھے۔ میں بھی اُن کا ایک ادنیٰ پرستار تھا۔ راس مسعود کی دلی خواہش تھی کہ اقبال علاج کے لیے بھوپال آجائیں۔ نواب صاحب کی بھی یہی آرزو تھی۔ چنانچہ اقبال کو اُنھوں نے خط لکھ کر بھوپال آنے کے لیے آمادہ کرلیا اور وہ ۱۹۳۵ء میں علاج کے لیے بھوپال تشریف لے آئے۔ اُن کا قیام راس مسعود کی کوٹھی 'ریاض منزل' میں ہوا۔ ریاض منزل اور میرا بنگلہ نزدیک ہی واقع تھے۔ چنانچہ پہلی بار ریاض منزل ہی میں اقبال سے مجھے نیاز حاصل ہوا۔ اور میرا جذبۂ عقیدت کچھ اور بڑھ گیا۔

نواب صاحب بھوپال کے خاص معالج دہلی کے مشہور ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے اور ڈاکٹر رحمٰن اُن کے اسسٹنٹ تھے جو اکثر بھوپال آتے تھے۔ بعد میں اُن کے نواب صاحب سے خصوصی تعلقات پیدا ہو گئے اور اُن کی خواہش پر وہ چیف میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے بھوپال آگئے۔ چنانچہ نواب صاحب کے ایما پر ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر عبدالباسط نے اقبال کے علاج پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ اسی دوران راس مسعود نے اقبال کی اطلاع کے بغیر اُن کے وظیفہ کی کوشش شروع کردی جس کی منظوری میں مَیں نے بھی عملاً حصہ لیا اور جلد ہی محکمۂ صرفِ خاص سے پانچ سَو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ راس مسعود اقبال سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ اقبال اپنے ناگفتہ بہ معاشی حالات پر کسی عنوان جلد قابو پالیں اور اُن کی صحت جلد بحال ہو جائے تاکہ وہ تمام پریشانیوں سے نجات پاکر تخلیقی کاموں میں مصروف رہیں۔ اسی سلسلے میں راس مسعود نے اپنے طور پر نواب صاحب بھوپال سے سفارش کرکے سر آغا خاں کو بھی پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ دینے پر آمادہ کرلیا تھا۔ اس بات کا اقبال کو علم تک نہ تھا اور جب راس مسعود نے اقبال کو اس سلسلے میں خط لکھا تو خوش ہونے کے بجائے وہ فکرمند ہو گئے۔ اُن کے اعلیٰ ظرف نے نواب حمیداللہ خاں کی خصوصی عنایت کے بعد کسی اور کا احسان اٹھانا گوارا نہ کیا۔ جس پر راس مسعود نے یہ کوشش کی کہ سر آغا خاں کے وظیفہ کا ٹرسٹ قایم ہو جائے یا یہ رقم اقبال کے بچوں کے نام کردی جائے۔ لیکن اس کام کی تکمیل سے پہلے ہی راس مسعود کا انتقال ہو گیا اور اُن کی مساعی بارآور نہ ہو سکیں۔

ایک بار میری موجودگی میں اقبال کے قیام بھوپال کے دوران راس مسعود نے اُن سے کہا کہ نواب صاحب بھوپال نے ایک ملاقات میں فرمایا ہے کہ نظام حیدرآباد دکن سے بھی پانچ سو روپے وظیفہ مقرر کرا دوں گا۔ یہ سُن کر اقبال نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ مجھے اب کسی اور وظیفہ کی ضرورت نہیں۔ نواب صاحب نے میرے لیے جو کچھ مقرر کر دیا ہے۔ وہ میری ضروریات کے لیے بہت کافی ہے۔ اُن کی اس شانِ استغنا سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے۔

اکثر شام کو کبھی ریاض منزل میں کبھی میرے بنگلہ پر اقبال سے میری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ہم لوگ اکثر و بیشتر کھانا ساتھ ہی کھاتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اقبال کو چھیڑنے کے لیے ایک بار اُن سے کہا کہ آپ اردو میں شعر کہتے ہیں اور اس زبان کا دنیا کی زبانوں میں کوئی خاص مرتبہ نہیں۔ فرمایا ــــ وقت آنے پر اس کی قدر و اہمیت ضرور تسلیم کی جائے گی۔

ویسے ذاتی طور پر مجھے اُن کے فلسفہ۔ مولانا روم کے پیرو کی حیثیت سے اُن کے بلند پایہ اور اثر انگیز کلام اُن کے عالمانہ خطبات سے گہری دلچسپی تھی۔ جہاں تک مسلمانوں اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا تعلق ہے اقبال کا مرتبہ دوسرے اکابر سے کسی طور کم نہیں۔ اُنھوں نے اپنے ولولہ انگیز پیغام اور اپنی عملی کوششوں سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اقبال کا قیام دو بار شیش محل میں ہوا۔ وہاں بھی میں کثر و بیشتر ملاقات اور خیریت دریافت کرنے جاتا تھا۔ آخری قیام (۱۹۳۶ء) کے دوران اُن کی تمام تر توجہ قرآن مجید کے حواشی لکھنے پر مبذول تھی۔ ان حواشی کے لیے فرماں روائے بھوپال نے اُن سے درخواست کی تھی۔ لیکن اُن کی صحت دن بہ دن خراب رہنے لگی تھی۔ بھوپال کے علاج سے وقتی فائدہ ضرور ہوا لیکن اپنے خانگی حالات کی بنا پر وہ زیادہ عرصے تک بھوپال میں قیام نہیں کر سکے۔ راس مسعود کے انتقال کے بعد اپنے ایک سچے اور مخلص دوست اور عقیدت کیش کی جدائی نے انھیں بھی نڈھال اور کمزور کر دیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ شاعرِ مشرق اپریل ۱۹۳۸ء میں ہم سے جدا ہو کر معبودِ حقیقی سے جا ملے اور دنیائے علم و ادب نورِ بصیرت سے محروم ہو گئی۔

پروفیسر سید نواب علی مرحوم کے ایک صاحبزادے سید احمد علی نیشنل بنک آف پاکستان کراچی میں مینیجر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُنھیں میری اس کتاب کا علم تھا۔ جولائی ۱۹۶۷ء میں اُنھیں اپنے بنک کی جانب سے آڈٹ کے لیے ڈرگ کالونی کراچی کی برانچ میں متعین کیا گیا۔ عجب اتفاق ہے کہ وہاں اُن کی ملاقات چودھری خاقان حسین سے ہو گئی۔ جن کا اکاؤنٹ بھی اسی برانچ میں تھا اور رہائش بھی اسی کالونی میں تھی۔ دورانِ گفتگو جب خاقان حسین نے اپنے قریبی عزیز علی حیدر عباسی کا ذکر کرتے ہوئے قیام بھوپال کی کچھ تفصیلات بتائیں تو سید احمد علی کو دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے میرے کام کا ذکر کیا اور ملاقات کے لیے اُن سے طے کر لیا۔ چنانچہ سید احمد علی کے ساتھ میں چودھری خاقان حسین سے اُن کے دولت کدہ پر ملا تو اُنھوں نے اپنے قیام بھوپال کی نہایت دلچسپ تفصیل سنائی۔ ۱۹۳۴ء میں کس طرح وہ بھوپال گئے۔ ۱۹۳۷ء تک وہاں کیوں مقیم رہے۔ اقبال سے اُنھیں کیونکر شرف نیاز حاصل ہوا۔ راس مسعود اور بیگم راس مسعود اُن سے کس قدر شفقت فرماتے تھے؟ وغیرہ

کوئی دو گھنٹے تک وہ تمام تفصیلات سناتے رہے اور ہم دونوں حیرت زدہ اُن کی دلچسپ و معلومات افزا باتیں سنتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا مختصر احوال قلم بند کر دیں تو عنایت ہوگی اس طرح میری کتاب میں کچھ اور نئے واقعات کا اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ حسب وعدہ اُنھوں نے تحریری یادداشتوں سے مجھے نوازا۔

چودھری خاقان حسین بھی مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۷ء آپ اپنے چچا علی حیدر عباسی (سابق وزیر صیغۂ سیاسیہ ریاست بھوپال) کے ساتھ مقیم رہے اور اُن کی وسیع غیر آباد زمین کو قابلِ کاشت بنایا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب آپ کی ملاقاتیں "ریاض منزل" میں اقبال سے برابر ہوتی رہیں۔ راس مسعود سے اُن کے خاندانی تعلقات تھے اس لیے "ریاض منزل" میں وہ برابر جاتے آتے تھے۔ راس مسعود اور بیگم راس مسعود اُن سے بڑی محبت کرتے تھے۔ آپ نے بتایا کہ راس مسعود کی دوسری بیگم امۃ المسعود، عبدالرشید صاحب سابق وزیر ریاست اندور کی صاحبزادی تھیں۔ اُن کا پہلا لڑکا فوت ہو گیا۔ دوسری صاحبزادی نادرہ مسعودؔ ہیں جن کی شادی پروفیسر رشید احمد صدیقی کے صاحبزادے ڈاکٹر احسان رشیدؔ سے ہوئی ہے۔

بؔ، افسوس کہ ۱۹۷۰ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ ؎ ۵۲ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

اقبال سے بھوپال میں اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے چودھری خاقان حسین نے بتایا کہ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بسلسلہ علاج بھوپال تشریف لائے تھے اور "ریاض منزل" میں قیام کیا تھا۔ اس بنگلہ کے نچلے حصہ میں مسعود صاحب کا دفتر، ہال، بیٹھنے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ اور استقبالیہ کمرے تھے۔ اوپر کی منزل میں خواب گاہ کے کمرے تھے۔ ایک کمرہ کا رُخ بھوپال کے مشہور بڑے تالاب کی جانب تھا۔ اور اُسی سمت میں شملہ کوٹھی اور ارد گرد کی خوبصورت پہاڑیاں دور تک پھیلی تھیں۔ وہیں سے یاٹ کلب، گھنے جنگلات اور شاداب پہاڑی سلسلے نظر آتے تھے۔ اسی کمرے میں سر محمد اقبال ٹھہرائے گئے تھے جہاں ایک بڑا پلنگ، کچھ صوفے، چند کرسیاں، ایک میز وغیرہ سلیقے سے رکھی تھی۔ خصوصی نشست زیادہ تر اسی کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ سر محمد اقبال اپنے پلنگ پر تشریف فرما ہوتے۔ سر راس مسعود، چچا صاحب (علی حیدر عباسی) اور میں دوسری نشستوں پر بیٹھتے۔ اُن کا مخصوص حقہ پلنگ کے پاس داہنی جانب رکھا رہتا اور اُن کا خاص ملازم علی بخش قالین پر قریب ہی بیٹھتا اور وقتاً فوقتاً حقہ کو تازہ کرتا رہتا۔ علامہ اقبال برابر گفتگو کرتے رہتے اُن کی گفتگو سُن کر یوں محسوس ہوتا جیسے علم و حکمت کا دریا بہہ رہا ہے۔ گفتگو ہر موضوع پر ہوتی تھی۔ اکثر رات کو کھانے کے بعد ہم لوگ اُن کے کمرے میں جمع ہوتے اور دس گیارہ بجے رات تک اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔

ایک بار کھانے کا ذکر آیا تو آپ نے بے اختیار فرمایا کہ مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کے دوران جیسا کھانا راجہ صاحب محمود آباد نے کھلایا ہے۔ ایسا تو شاید ہی پھر نصیب ہو۔ ہر ڈیلیگیٹ کے لیے مختلف اور لذیذ ترین کھانوں کے چھ خوان دونوں وقت آتے تھے۔

ایک روز آپ نے اپنے سفر اسپین کا ایک اچھوتا واقعہ سُنایا جس کے پس منظر کا شاید ہی کسی کو علم ہو۔ فرمانے لگے کہ لندن کے قیام میں نواب صاحب بھوپال سے ملنے گیا تو انھوں نے فرمایا — "اقبال اسپین کیوں نہیں جاتے —؟"

میں نے عرض کیا — "اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہو آیا ہوتا —"

بات آئی گئی ہوئی — دوسرے روز مجھے میرے ہوٹل میں نواب صاحب بھوپال کا ایک چیک چھ ہزار روپے کا ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سفر کے لیے ہے۔ چنانچہ میں نے اخبار میں ایک سیکریٹری کی ضرورت کا اشتہار دیا اور ایک موزوں لیڈی سکریٹری انتخاب کرکے اس کو سفر کی تفصیلات بتا دیں اور یہ ہدایت کی کہ روانگی سے اختتام سفر تک وہ اُن سے کوئی گفتگو نہیں کرے گی۔ چیک کی ساری رقم میں نے اُس کے حوالہ کر دی۔ اور سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ اس قدر کارگزار سکریٹری ثابت ہوئی کہ مجھے سفر میں کہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اُس نے میری رہائش، قیام اور سفر کا بہت ہی اچھا انتظام کیا — اسی سفر کے دوران میری ایک نوٹ بک جس میں نئے اشعار اور چند نظمیں درج تھیں۔ کہیں گم ہو گئی۔ بہت تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہو سکی — اس کلام کے گم ہونے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

ایک شب آپ نے فرمایا کہ جب تک میں نے عربی زبان پر عبور حاصل نہیں کیا تھا — میرا علم ناقص تھا۔ عربی سیکھنے کے دوران میری ملاقات دہلی میں مقیم عرب کے سفیر سے ہو گئی اور انھوں نے اپنی لائبریری کی تمام عربی کتب مجھے استفادہ کے لیے عنایت کر دیں جن سے میں نے بہت کچھ علم حاصل کیا۔

ایک دن ڈاک سے کسی جرمن دوست کا خط علامہ اقبال کو ملا جس کا مضمون انھوں نے مسعود صاحب کو سُنایا۔ میں وہاں موجود تھا۔ اُس خط کا ایک جملہ جو اُس وقت کی یورپی سیاست سے متعلق تھا مجھے یاد رہ گیا۔

۱۔ ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی

۳۰۰۷۰۱

" The storm is in the air and
it is not long in breaking. "

میں جب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ادب سے سلام کرکے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اُن کی خدمت میں حاضر رہتا۔ اُن کی اور مسعود صاحب کی بات چیت خاموشی سے سُنتا رہتا۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت فرماتے تھے۔ چچا صاحب کی زمینوں کے سلسلے میں کچھ دن میں بھوپال سے باہر رہا۔ گھر لوٹا تو بیگم مسعود کا فون آیا اور انھوں نے فرمایا کہ علامہ اقبال دریافت کر رہے تھے کہ خاقان کئی دِنوں سے کیوں نہیں آئے۔؟ میں نے عرض کیا۔ بھوپال میں نہیں تھا۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ اُسی وقت ریاض منزل پہنچا اور علامہ کی خدمت میں حاضر ہوکر صحیح صورتِ حال سے اُنھیں مطلع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاض منزل کی وہ یادگار صحبتیں میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ اور جب بھی وہ لمحے مجھے یاد آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی شفقت و محبت، اُن کا تبحرِ علم، اُن کی انسان دوستی، اُن کا اعلیٰ کردار اور اُن کی عظیم المرتبت شخصیت۔ میری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔

شیش محل کے قیام کے دوران بھی جب مجھے وقت مل جاتا ضرور حاضرِ خدمت ہوتا۔ اس قیام میں جاوید اقبال بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ اُس وقت وہ بہت کم سن تھے۔ خود علامہ کی صحت پہلے سے کافی کمزور نظر آتی تھی۔ بھوپال کے تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹر اُن کے علاج معالجہ پر ہر ممکن توجہ صرف کر رہے تھے اور انھیں تھوڑا بہت فائدہ بھی ہوگیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ۱۹۳۶ء کے بعد چند در چند حالات کی بنا پر وہ پھر بھوپال نہ آسکے۔

بھوپال کے ایک اور ادیب مسیح صدیقی جو اقبال کے نیازمندوں میں شامل ہیں خوش قسمتی سے مجھے کراچی میں مل گئے۔ انھوں نے اقبال سے متعلق جو واقعات سُنائے اُن کی نوعیت نہایت دلچسپ ہے۔

مسیح صدیقی ۱۹۵۴ء میں پاکستان آ گئے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہ بھوپال کے واحد معیاری ہفت روزہ "ندیم" سے وابستہ رہ چکے تھے اور اُن کے متعدد مضامین ہفت روزہ ندیم اور بیرونِ بھوپال کے ممتاز جرائد میں شایع ہو چکے تھے۔

اقبال سے ملاقاتوں کے سلسلے میں آپ نے بتایا کہ میرے والد معظم رسول صدیقی اقبال کے خاص نیازمندوں میں تھے اور میری حقیقی پھوپھی مہ جبین خمار بھوپال کی ایک ممتاز شاعرہ تھیں اور اقبال کی پرستار۔ اُن کا کلام شایع ہوکر ہر طبقہ سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا تھا۔ وہ اردو عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتی تھیں ــــــ سر راس مسعود نے اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر بھوپال کے مشہور سلطانیہ گرلس اسکول میں بحیثیت مدرس اُن کا تقرر کردیا تھا۔ جب بھوپال میں آل انڈیا مشاعرے ہونے لگے تو اُن کی غزلیں بھی مشاعرے میں سُنائی جانے لگیں اور خوب مقبول ہوئیں۔ اُس دور میں پردہ کا سخت رواج تھا۔ مہ جبین خمار بھی پردہ کرتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئیں اور مشرقی پاکستان منتقل ہونے کے بعد ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ اُن کے کلام میں اسرار و رموزِ فطرت اور فلسفیانہ فکر ملتی ہے۔ اُن کا غیر مطبوعہ مرثیہ جو انھوں نے اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھا تھا۔ اور اُن کے مسودات میں محفوظ تھا۔ گزشتہ صفحات میں شامل ہے۔ مسیح صدیقی نے بیان کیا کہ جب اقبال بھوپال آکر شیش محل میں قیام فرما ہوئے تو بھوپال والوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ علامہ اقبال کو بھوپال اور بھوپالیوں سے جس قدر خلوص و محبت اور قلبی لگاؤ تھا اُس کی ایک دو نہیں اَن گنت مثالیں موجود ہیں۔ آپ کے تعلقات صرف فرماں روائے بھوپال اور عمائدینِ ریاست سے ہی نہیں بلکہ بھوپال کے عام لوگوں سے بھی پیدا ہو گئے تھے شیش محل

کے دورانِ قیام ہر شخص اُن سے بلا روک ٹوک ملنے جاتا تھا۔

سرزمین بھوپال ہمیشہ سے صاحبانِ علم و فضل کی آماج گاہ اور اُن کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہوتی رہی ہے۔ بالخصوص دورِ حمیدی میں برصغیر کی مشہور و معروف ہستیاں کسی نہ کسی سلسلے میں بھوپال سے وابستہ رہ چکی ہیں اور یہ اُنھیں کا فیض تھا کہ مقامی حضرات میں علوم و فنون کے حصول کا شوق پیدا ہوا اور پروان چڑھا جس کے نتیجہ میں خود بھوپال نے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والی شخصیتیں پیدا کیں۔

میرے والد معظم رسول صدیقی مرحوم کو بھی علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور اُن کا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، علامہ سلیمان ندوی، سر سید راس مسعود اور مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ وغیرہ سے والد صاحب کے خصوصی تعلقات تھے۔ وہ اکثر و بیشتر ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ علامہ اقبال سے بھی اُنھیں دلی عقیدت تھی۔ جب وہ بھوپال آنے لگے تو یہ جذبۂ عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گیا اور وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال آخری بار شیش محل میں قیام فرما ہوئے تھے۔ میری عمر کوئی چودہ سال کی تھی اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ علامہ اقبال تشریف لے آئے ہیں اُن سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا مجھے بھی لے چلیے، وہ تو ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ میں بھی اُن کا نیاز حاصل کرلوں گا۔ چنانچہ والد صاحب کے ساتھ ایک شام کو ہم شیش محل پہنچے اور علامہ اقبال سے شرف نیاز کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس سے قبل والد صاحب کے ہمراہ میں سر راس مسعود، سر سید لیاقت علی اور شعیب قریشی وغیرہ کے دولت کدوں پر حاضر ہو چکا تھا اور ان حضرات کی شاہانہ زندگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ علامہ اقبال بھی اسی شان اور کرّوفر کی زندگی بسر کرتے ہوں گے لیکن جب اُن کے کمرے میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ اور میرے تصورات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سادہ سی مسہری پر علامہ اقبال گاؤ تکیہ کے سہارے سادہ قمیص شلوار میں ملبوس بیٹھے ہیں۔ حقہ اُن کے پاس رکھا ہے۔ گاؤ تکیہ کے آس پاس کچھ کتابیں رکھی ہیں۔ ایک نوٹ بک اور قلم بھی وہیں موجود ہے۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور چند گدّے دار کرسیاں رکھی ہیں۔ اللہ اللہ کیا نظارہ تھا۔ اتنا عظیم انسان اور اس حد تک سادگی پسند۔ سلام کر کے ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور والد صاحب نے مزاج پُرسی کے بعد نہایت ادب سے عرض کیا کہ اُن کی چھوٹی بہن مہ جبین خمار کو بچپن سے شاعری کا شوق ہے اور وہ آپ کے کلام کی پرستار ہی نہیں بلکہ آپ سے متاثر ہو کر بیشتر نظمیں ہی کہتی ہے۔ اُسے اسرار و رموز فطرت سے خاص لگاؤ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اُس کی ایک نظم سنادوں تاکہ آپ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازدیں۔ وہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرانا چاہتی ہے۔

علامہ نے بخوشی نظم سنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ والد صاحب نے وہ نظم سنائی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:-

نظامتِ عقل کارفرما جہاں کے نظم و نسق کے اندر
تمام عالم کی حکمرانی اسی کے سیف و ورق کے اندر
بصارتِ عقل نکتہ بیں ہے، سماعتِ عقل رمز شنوا
نئے نئے راز پا لیے ہیں زمیں کے ہر ہر طبق کے اندر

یہ بحرِ زخار کے تموّج میں شورِ قطروں کا سُن رہی ہے
شکوہ ذرّوں کا دیکھ لیتی ہے وادیٔ لق و دق کے اندر
ضیا کے آثار ڈھونڈھتی ہے یہ ظلمتِ شب کی تیرگی میں
فروغِ ماہِ مبیں کی جویا غلس کے اندر غسق کے اندر
یہ زندگی پاشیوں سے واقف فضائے ہستی پہ مہر کی ہے
فیوضِ باراں سے کشت سرسبز دیکھتی ہے زحق کے اندر
کشاکشِ اندروں سے اپنی جوہرِ مہیا کو کھینچتی ہے
طلب کی قوت یہ مانتی ہے ضرورتِ مستحق کے اندر
حقیقتِ انقلاب سے یہ حِسوں کو آگاہ کر رہی ہے
بہار کی لالہ کاریاں ہیں خزاں کے کہنہ خلق کے اندر
سُنی نوائے سروش اُس نے منازلِ ارتقا کی جانب
کتابِ فطرت میں جانچتی ہے نکات اپنے سبق کے اندر
رہِ ترقی پہ گام فرسا ہوئی مگر فطرتِ فطانت!
یہ دیکھتی ہے فراز و پستی ہر ایک سہل و ادق کے اندر
مذاق کی اہمیت کو تسلیم کر چکی عقلِ نکتہ پرور!
دُجائے شب میں فروغِ ظلمت سحر کی رونق فلق کے اندر
ہیں کارفرمائیاں ہمیشہ نظامِ فطرت کی ضابطے میں
عطا ہوئی جذبۂ نظر کو حسِ بصارت حدق کے اندر
اثر جو ماحول کا ہے اس کو فراستِ فہم مانتی ہے
ہوئی ہے ماحول میں نمی کے ہوا کی خلقت لثق کے اندر
نگاہِ منظر پرست کو دے چکیں مگر دعوتِ نظارہ
محِل کے شام و سحر کی رعنائیاں حجابِ شفق کے اندر
چھپے ہوئے رازِ روزِ روشن سحر کی تابندہ طلعتوں میں
بہار کا جلوۂ نگاریں گلوں کے رنگیں ورق کے اندر
نہ ہوگا خورشیدِ علم لامع خیال میں تابشیں نہ ہوں گی
تضرّمِ آتشی کی شوکت رہی نمایاں حُرق کے اندر
قوائے علمی کی پرورش کو غذائے درسِ جدید فطرت
اگر کتابوں میں عقل اُلجھی گرے گی قعرِ حُمق کے اندر
کتابِ فطرت کے سارے اوراقِ منتشر کو کرے فراہم
ہے قوائے خرد جہادِ شعور میں باطل و حق کے اندر
بساطِ علمِ جدیدِ فطرت اگر بچھی ساحتِ جہاں پر
حواسِ رفعت کی چیرہ دستی کمند ڈالے گی لامکاں پر

علامہ اقبال نے نظم سُن کر پسند فرمائی[۱] اور کہا کہ شاعرہ کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ آگے چل کر بلند مقام حاصل کرے گی۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسرار و رموز فطرت سے متعلق تمام نظموں کو یکجا کر لیں اور دیگر موضوعات کی نظمیں علیحدہ ترتیب دے لیں۔ اس طرح شاعر کی فکر کا صحیح طور پر احاطہ کرنا آسان ہوگا۔

مسیح صدیقی کہتے ہیں کہ علامہ کی باتیں مجھے آج تک یاد ہیں اور یہ تاثر آج بھی دل پر نقش ہے کہ اگر علامہ کا بھوپال سے تعلق پیدا نہ ہوتا تو بھوپال کے شعراء میں ذہنی اور فکری انقلاب اتنی جلد رونما نہ ہوتا۔ بھوپال میں تو ہمیشہ سے غزل اور قصیدے کا رواج چلا آ رہا تھا۔ لیکن علامہ کی شاعری نے جہاں پورے ہندوستان کے شعراء کو متاثر کیا۔ وہیں بھوپال کے ذی شعور شعراء نے بھی اُن سے گہرے اثرات قبول کیے۔

اقبال کے بھوپالی نیازمندوں کی تلاش کے دوران چند اور نامکمل اور ادھورے واقعات کا بھی علم ہوا۔ کاش تفصیلات بھی فراہم ہو جاتیں۔

بھوپال کے جواں سال محقق شمیم احمد کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک تفصیلی خط[۱] میں لکھا کہ بھوپال کے ایک بزرگ استاد کا پتہ چلا ہے جو علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کو شیش محل کے دوران پڑھانے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال شام کے وقت کملا[۲] پارک کی طرف چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہاں اکثر ایک صاحب سے جنھیں کشتی رانی کا شوق تھا علامہ کی برابر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ایک صاحب بھوپال میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے کلام پر علامہ اقبال سے اصلاح لی ہے۔ نیز مولنا شعری بھوپالی کے پاس "ضرب کلیم" کا وہ نسخہ ہے جو علامہ اقبال نے اپنی تحریر اور دستخط سے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ایک اور صاحب محمود الحسن۔ سابق ایگزیکیٹو آفیسر میونسپل بورڈ سیہور (بھوپال) کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی پرائیویٹ اور نجی بیٹھکوں میں شرکت کرتے تھے۔ وہ اقبال کی سیرت کے بہت سے گوشوں سے واقف ہیں اور انھیں اقبال کے بہت سے لطائف یاد ہیں۔ اُن کے متعلق پتہ چلا ہے کہ اب سیہور یا بھوپال میں نہیں ہیں۔ شاید پاکستان میں ہوں۔ اگر پاکستان میں ہوئے تو پتہ لے کر بھیج دوں گا۔

افسوس کہ شمیم احمد تعلیم ختم کر کے اورنگ آباد کے کسی کالج میں لکچرار ہو کر چلے گئے اور یہ تشنہ اطلاعات تشنہ ہی رہ گئیں۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ جاوید اقبال کے استاد کا کیا نام ہے؟ نہ کملا پارک کے اُن صاحب کا پتہ چل سکا جنھیں کشتی رانی کا شوق تھا اور جن کی اقبال سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یہ اطلاع بھی راز ہی رہی کہ نواب صاحب بھوپال کو بھیجا ہوا "ضرب کلیم" کا خاص دستخطی نسخہ مولنا شعری کے ہاتھ کس طرح لگا۔ محمود الحسن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی کہ وہ بھوپال چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ ہو سکتا ہے آیندہ کوئی اور محقق ان امور کی چھان بین کر سکے۔

ابراہیم یوسف بھوپال کے ممتاز نوجوان ادیبوں اور افکار کے قلمی معاونین میں سرِفہرست ہیں۔ اپنی کتاب کے سلسلے میں میں نے انھیں بھی توجہ دلائی۔ وہ بھوپال سے باہر تھے۔ کافی مدت کے بعد مجھے اُن کا جواب ملا۔ اس خط میں اقبال سے متعلق سرسری سی اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی نامناسب نہ ہوگا۔ اُن کے

۱ے خط بنام راقم الحروف مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۳ء

۲ے بھوپال کی ایک مشہور تفریح گاہ

خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اقبال کے متعلق عبدالقوی صاحب کا مقالہ تم کو مل گیا اچھا ہوا۔ وہ تمھارے کام میں ضرور مدد دے گا۔ مگر موضوع کے لحاظ سے شاید عبدالقوی صاحب نے زیادہ انصاف نہیں کیا ہے کیونکہ انھوں نے اقبال اور راس مسعود کے ذاتی تعلقات پر زیادہ زور دیا ہے۔ ویسے میرے ذاتی علم میں ہے کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو میرے والد کے استاد کے یہاں جو فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اقبال بذاتِ خود آیا کرتے تھے اور کئی کئی گھنٹے اُن کے گھر گزارا کرتے تھے۔ چونکہ میری عمر اس وقت بہت کم تھی۔ ممکن ہے چوتھی یا پانچویں جماعت میں رہا ہوں۔ چونکہ مولوی صاحب درویشانہ زندگی گزارتے تھے اس لیے ممکن ہے اقبال کا تعلق اس سلسلے میں اُن سے رہا ہو۔ بھوپال جانے پر والد صاحب سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کروں گا۔ ممکن ہے وہ کوئی کام کی بات بتلا سکیں۔ اگر کوئی کام کی بات معلوم ہو گئی تو تم کو لکھوں گا، لیکن جہاں تک اقبال کا مولوی صاحب کے یہاں آنے جانے کا سوال ہے یہ مسلّم ہے کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خود اقبال کو اُن کے گھر پر دیکھا تھا مگر بچپن کے نقوش ہیں، جو اس قدر دھندلے ہو گئے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

عبدالقوی صاحب نے شاید اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف راس مسعود اور نواب بھوپال سے اُن کے تعلقات کا ذکر کر کے چھوڑ دیا۔"

لیکن اس نامکمل روداد کی کوشش کے باوجود مجھے مزید تفصیل نہ مل سکی کیونکہ ابراہیم یوسف اس جگہ سے کہیں اور تبدیل ہو گئے اور جب میرے خطوط بھی اُن کے پتہ سے لوٹ آئے تو صبر کرنا پڑا۔

"اقبال اور بھوپال" کی اشاعت کے بعد بھوپال کے ممتاز ادیب و شاعر جیب فخری نے جو گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں اردو کے استاد تھے مجھے لکھا کہ پنجاب کے ملک محمد اشرف نے اپنے زمانۂ قیام بھوپال میں علامہ اقبال کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا انگریزی میں ترجمہ اور اس پر حواشی لکھے تھے۔ میری درخواست پر انھوں نے محمد اشرف صاحب سے رابطہ قایم کیا اور اشرف صاحب نے مجھے اپنی کتاب کا دوسرا ایڈیشن عطا فرما دیا۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ یہ کتاب پہلی بار "دی ڈیولز کانفرنس" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا ایڈیشن "دس کنفرڈ ستیان" کے عنوان سے نظر ثانی اور اضافے کے بعد ۱۹۷۴ء میں شایع ہوئی۔ یہی نسخہ محمد اشرف نے گجرات سے مجھے ارسال فرمایا۔ اس ایڈیشن میں جہاں اطالوی پروفیسر بوسانی کی رائے، سر شیخ عبدالقادر مرحوم کا تعارف اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا پیش لفظ شامل تھا وہیں بھوپال کی بعض مقتدر شخصیتوں کی آراء بھی شامل تھیں جن میں علامہ موسیٰ جار اللہ (جو بھوپال میں نظر بند تھے) علامہ سید سلیمان ندوی (قاضی ریاست بھوپال) اور مولانا سہا مجددی (جو آخر عمر میں مستقل قیام کے لیے لاہور سے بھوپال آ گئے تھے) بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ محمد اشرف نے اپنا مکمل پتہ نہیں لکھا تھا اور اپنی کتاب بھی جیب فخری کے توسط سے مجھے بھیجی تھی اس لیے افسوس کہ براہِ راست ان سے ربط و تعلق اور مزید معلومات نہ حاصل ہو سکیں لیکن اسی ایڈیشن کے پہلے پیش لفظ نومبر ۱۹۴۶ء میں انھوں نے بھوپال کی ایک معزز شخصیت سید زاہد علی جعفری کے خصوصی تعاون کا شکریہ ادا کیا تھا چنانچہ

بھوپال کے مشہور اور بزرگ ادیب محمد احمد سبزواری سے میں نے جعفری صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ جعفری صاحب تو کراچی میں ہی رہتے ہیں ان کا پتہ معلوم کر کے تفصیل بتاؤں گا۔ چند روز کی تلاش کے بعد جعفری صاحب سے ملاقات ہوگئی اور جب انھیں محمد اشرف کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن دکھایا تو انھوں نے اس کے پس منظر پر تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ محمد اشرف بچپن میں ہی اپنے والد کے ساتھ بھوپال آگئے تھے۔ اُن کے والد محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ایس۔ ڈی۔ او تھے۔ محمد اشرف نے ابتداً بھوپال کے پبلسٹی آفس میں ملازمت کی جہاں جعفری صاحب بھی ملازم تھے۔ بعد میں دونوں نے یہ ملازمتیں چھوڑ دیں۔ اشرف صاحب نے کچھ عرصے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں بھی کام کیا۔ اوائل ۱۹۴۲ء میں ان کو یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور زاہد صاحب کے مشوروں سے انھوں نے بھوپال کی مشہور حمیدیہ لائبریری اور دیگر لائبریریوں سے استفادہ کے بعد اپنے مسودے پر موسیٰ جار اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا سہا مجددی سے آرا حاصل کیں اور یہ مسودہ لے کر ۱۹۴۵ء میں لاہور واپس آگئے اور کتاب کا پہلا ایڈیشن انگریزی کتابوں کے مشہور پبلشر محمد اشرف نے ۱۹۴۶ء میں شایع کر دیا۔

جعفری صاحب کے بقول پہلے ایڈیشن میں علامہ اقبال، گوئٹے، دانتے، ڈارون اور چنگیز خاں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ دوسرا ایڈیشن جسے بک ہاؤس۔ لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شایع کیا ہے اس میں یہ تصاویر شامل نہیں ہیں۔

حبیب فخری کی اطلاع کے مطابق بھوپال کے ایک اور نوجوان جو عربی کے اسکالر تھے۔ ابو النصر احمد الحسینی نے مصر کے مشہور علمی و ادبی ماہنامہ "المقتطف" میں علامہ اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۳۸-۳۹ء میں ان کی فنی عظمت کے مختلف پہلوؤں پر تین طویل مقالے عربی میں تحریر کیے تھے جو شایع ہو کر عرب دنیا میں کافی مقبول ہوئے۔ راقم الحروف نے "المقتطف" کو کراچی، لاہور حتیٰ کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی تلاش کرایا لیکن اس کی فائل دستیاب نہ ہو سکی۔ آیندہ شاید بھوپال کا کوئی محقق اسے ڈھونڈ نکالے۔

کتاب کی نظرِ ثانی کے دوران ہی جب حمید الدین شاہد نے کراچی سے ماہنامہ "سب رس" کا جنوری ۱۹۷۸ء میں اجرا کیا اور پہلے شمارے کو "اقبال نمبر" کی صورت میں پیش کیا تو خود محمد احمد سبزواری کو اپنا فراموش اور گم کردہ مضمون "شاعرِ باکمال" دستیاب ہو گیا جو انھوں نے علامہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھا تھا اور ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد دکن کو بھیج دیا تھا۔ جس کے نگران مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم اور مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش مرحوم تھے۔ یہ مضمون پہلی بار ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد دکن کے "اقبال نمبر" شمارہ جون ۱۹۳۸ء میں شایع ہوا تھا جسے "سب رس" حیدر آباد دکن نے "اقبال نمبر" میں شایع کیا ہے۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھوپال کے اہلِ قلم اور بھوپال سے کسی عنوان ربط و تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی متعدد تخلیقات ہندوستان کے مختلف رسائل میں یقیناً بکھری ہوئی ہیں۔ بھوپال کے ناقدین اور محققین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسی تمام تخلیقات کو تلاش و تجسس کے بعد یکجا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کر دیں۔

بھوپال میں مقیم چند نیاز مندوں کا مختصر احوال عبد القوی دسنوی نے بھی اپنے کتابچہ میں تحریر کیا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"پروفیسر محمد زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی حمیدیہ کالج (بھوپال) کا بیان ہے کہ علامہ نے جب شیش محل میں آکر قیام کیا تو وہ آٹھویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علامہ کو جو سرکاری موٹر ملی تھی اُس کے ڈرائیور جسیم حیدر تھے۔ وہ زبیر صاحب کے ملاقاتی تھے، چنانچہ وہ اسکول سے واپسی پر اس موٹر پر بیٹھ جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک روز ڈاکٹر صاحب مکان سے باہر آئے، غالباً وہ شملہ کی طرف جا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر جسیم حیدر سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ جسیم حیدر نے بتایا کہ میں قاضی صاحب کا پوتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور دریافت کیا کہ کیا پڑھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ عربی پڑھتا ہوں تو انھوں نے عربی کی گردان پوچھی اور مختلف قسم کے سوالات کیے۔ زبیر صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد اکثر اس طرح علامہ سے ملاقات ہوتی رہی۔

جناب حکیم قمرالحسن صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ ندیم، بھوپال فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں علامہ اقبال کا قیام شیش محل میں تھا وہ حکیم اولاد حسین صاحب کے ساتھ علامہ سے ملنے گئے۔ حکیم اولاد حسین، قمرالحسن صاحب کے رشتے کے بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ وہ بانی کے علاج میں کافی تجربہ کار تھے۔ علامہ اقبال اُن سے طبی مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک تو علاج کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد حکیم اولاد حسین صاحب نے قمرالحسن صاحب کا تعارف کرایا۔ اُس وقت قمرالحسن صاحب کی عمر مشکل سے بائیس سال کی ہوگی۔ علامہ نے اُن سے مختلف سوالات کیے اور دریافت کیا کہ "کیا لکھتے ہو"۔ اس زمانے میں حکیم قمرالحسن صاحب افسانے اور انشائے لطیف لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئی پود ٹیگور کی انشاءنگاری سے متاثر تھی۔ چنانچہ جب انھیں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو افسانے اور انشائے لطیف کا شوق ہے تو فرمایا کہ انشائے لطیف بے مقصد چیز ہے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ کوئی صحت مند اور تعمیری ادب پیش کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ طلبہ کو چاہیے کہ پہلے علم حاصل کریں اس لیے کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

ممنون حسن خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ اقبال نے سر راس مسعود سے کہا کہ حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی قایم ہو چکی ہے۔ آپ کا تعلق مہاراجہ اندور سے ہے۔ آپ کوشش کیجیے کہ اندور میں ہندی یونیورسٹی قایم ہو جائے۔ سر راس مسعود نے علامہ کی یہ بات بہت پسند کی اور کہا کہ بھوپال میں ہر جمعہ کو اندور اور اُجین سے سنسکرت اور ہندی کے علماء آتے ہیں اور آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یہاں ترجمہ کا کام بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ میگھ دوت کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اب کالیداس کے مشہور ڈرامہ شکنتلا کے ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔

علامہ بھوپال میں تعلیم کے خواہاں تھے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ سرراس مسعود یہاں وزیر تعلیم ہیں اور اس لیے امید کرتے تھے کہ یہاں تعلیم عام ہو گی۔ وہ نواب صاحب سے بھی خوش تھے اس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ نواب صاحب اچھے دل اور روشن دماغ حکمراں ہیں اس لیے اُنھیں اُمید تھی کہ قوم اور ملک کو اُن کی ذات سے فائدہ پہنچے گا۔

بھوپال کے مایۂ ناز مصور جناب عبدالحلیم انصاری جن کی کوٹلہ کی بنائی ہوئی تصویر ہم اس مقالہ کے ساتھ شایع کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال سے دورانِ قیام بھوپال دو بار ملے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ سر محمد اقبال سے پہلی مرتبہ سرراس مسعود مرحوم کے یہاں دریاض منزل، میں ملاقات ہوئی اور دوسری مرتبہ جب وہ 'شیش محل' میں مقیم تھے۔ چونکہ سرراس مسعود نے خاص طور سے انھیں علامہ اقبال کے کمرے میں لے جاکر تعارف کرایا تھا اس لیے علامہ نے بھی خاص التفات فرمایا۔ چنانچہ عبدالحلیم انصاری صاحب جب علامہ سے ملنے کے لیے شیش محل گئے تو اُنھوں نے انھیں شلوار پہنے پلنگ پر بیٹھا پایا۔ حقہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر فرمایا:۔

"سرراس مسعود نے آپ کے بارے میں کئی پسندیدہ باتیں بتلائی ہیں۔ میں چونکہ اُن کے مزاج سے واقف ہوں اس لیے آپ کو اچھی طرح سمجھا اور خوش ہوا"

عبدالحلیم انصاری صاحب نے کہا:۔

"آپ سے شرف نیاز میرے لیے اعزاز ہے اور خوش نصیبی بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ مجھ کو آرٹ کے متعلق بہت سے مسائل سمجھنا اور بہت سے مراحل حل کرنا ہیں منزلِ عرفان کے"

اتنی باتیں انھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ کہی تھیں۔

علامہ اقبال نے دریافت کیا: "آپ کا سبجیکٹ کیا ہے۔؟"

عبدالحلیم صاحب نے جواب دیا: "فطرت کشی اور مطالعۂ فطرت" اور یہ بھی کہا کہ "میں عام آرٹسٹوں کی طرح فطرت کو پینٹ ہی نہیں کرتا بلکہ اُسے پڑھتا ہوں ۔ فطرت میرے نزدیک ایک کتاب ہے الہامی جس کے مطالعہ سے روشنیاں حاصل ہوتی ہیں۔ الہام وعرفان کی اور رموز و نکات واشگاف ہوتے ہیں علوم وفنون کے"

حلیم صاحب فرماتے ہیں کہ "میرے خیالات سے علامہ نے دلچسپی لی" اور فرمایا۔

"آپ نے دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے۔ میں چونکہ آج کل معالجین کی ہدایت کا پابند ہوں اس لیے پھر باتیں کروں گا"

اس زمانے میں علامہ بجلی کے علاج کا ایک خاص کورس پورا کر رہے تھے اس لیے عبدالحلیم صاحب نے بھی احتیاط برتی۔ اگرچہ اُنھیں اس کا بہت افسوس ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر اُس وقت کچھ مواقع حاصل ہوجاتے تو اس "دیدہ ور" کی بدولت حقائق ومعارف کے بہت سے سربستہ راز وا ہوجاتے۔ الوان فطرت کی تعلیم وتشریح، آیات فطرت کی نگارش واشاعت ایک نئے اسلوب وانداز سے عمل میں آتی ہے

جس کے سبب انسان آرٹ اور فطرت کے قدیم اور روحانی رشتہ کو سمجھ سکتا اور ان کے الہامی پیغام کو جان سکتا۔"

میں نے جب دریافت کیا کہ علامہ سے ملاقات کا اس قدر اشتیاق کیوں تھا تو فرمایا۔ "اس لیے کہ مجھے ایسے عارف کامل کی تلاش تھی جس کے پاس تسخیر کائنات کا عمل بھی ہو اور وہ واقفِ اسرارِ ازل بھی ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اور حصولِ زندگی کی خاطر ذوق و وجدان کو ساتھ لیے جستجو کی منزل پر تھا۔ علامہ اقبال سے ملنے کے لیے اس لیے بھی میرا جذبۂ شوق مچل رہا تھا کہ وہ فن کا نقاد اور قدرداں تھا۔ قدرداں وہی ہو سکتا ہے جو نقاد بھی ہو سچا۔ سچا نقاد وہی ہو سکتا ہے جو ماہر ہو فن کا۔ عدل و انصاف اس کی صداقت رائے کا مظہر ہو۔ چونکہ وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھا اس لیے اس نے فن کی تخلیق و نمود کو معجزۂ فن سے تعبیر کیا ہے ع

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

جہاں وہ ایک اچھا نقاد و فن کار تھا۔ اچھا سازندۂ فطرت بھی تھا۔ اس لیے میں نے بربطِ قلب پر اسے کچھ راگ سنائے تھے اس یقین اور اعتماد پر ؎

جس روز دل کے رمزِ مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

علامہ سے ملاقات کی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ فطرت اور آرٹسٹ کے فطری تعلق اور روحانی رشتے کو سمجھتا تھا۔ دونوں کے مزاج اور مذاق سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ فطرت اپنی جگہ پر حسین ہے، بے شک، لیکن اس کو حسین سے حسین تر بنانے والا آرٹسٹ ہے اسی لیے اس نے کہا بھی ؎

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود
رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود

اقبال رمز ہائے فطرت کا امین و معتمد بھی تھا اور ترجمان فطرت بھی جس نے بہ پاس اعتماد و دیانت بہت سی چیزیں مصلحتاً رمز و کنایہ میں ادا کی ہیں اور اپنی اس مصلحت کو ظاہر بھی کیا ہے یہ کہہ کر ع

حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اور جب میں نے دریافت کیا کہ آپ نے علامہ کی تصویر کس جذبہ کی وجہ سے بنائی تو انھوں نے جواب دیا کہ علامہ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران جتنا اشتیاقِ ملاقات تیز ہوتا گیا جذبۂ عقیدت بھی بڑھتا گیا۔ اسی نے میرے دل میں علامہ کی تصویر بنانے کی بنا ڈالی جس کی وجہ سے میں اپنی عقیدت کیشی کو قلم کاری کے ذریعہ ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا جو شبیہ اس وقت مقالہ کی زینت ہے وہ قلم مصور کا نقشِ عقیدت ہے۔"[1]

---

[1] علامہ اقبال بھوپال میں۔ صفحہ ۴۹ تا ۵۳

عبدالحلیم انصاری بھوپال کے مایۂ ناز آرٹسٹ ہی نہیں۔ اُن کا شمار ممتاز اہلِ قلم میں بھی ہوتا ہے۔ اُن کے مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ افکار کے جوش نمبر (پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۵۹ء) میں انصاری صاحب کا معرکہ آرا مضمون جوش ملیح آبادی پر جب شایع ہوا تو مجھے کئی تعریفی خطوط ملے۔ انصاری صاحب کو میں نے بھی توجہ دلائی کہ وہ اتنے اچھے آرٹسٹ ہیں۔ مجھے راحت منزل، ریاض منزل اور شیش محل کی تصاویر نہیں مل رہی ہیں۔ میرے دیرینہ رفیق اور مشہور ادیب رشدی (اڈیٹر روزنامہ افکار۔ بھوپال) تلاش کر رہے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اپنے موئے قلم سے ان عمارتوں کا نقش اُبھار دیں، تاکہ میں انھیں کتاب میں محفوظ کر دوں۔ کیونکہ یہی وہ تین شاہانہ عمارتیں ہیں جن کو شاعرِ مشرق کی سکونت کا شرف نصیب ہوا ہے۔ عبدالحلیم انصاری نے وعدہ کیا اور اپنی سی کوشش بھی کی۔ لیکن افسوس کہ اپنی شدید علالت اور چند در چند وجوہ کی بنا پر وہ مجھے زیرِ بحث عمارتوں کی قلمی تصویریں نہ بھیج سکے۔ البتہ اپنی کوٹلہ سے بنائی ہوئی تصویر کو شاملِ کتاب کرنے کی بخوشی اجازت عطا فرمادی۔ یاٹ کلب بھوپال کا ایک غیر مطبوعہ حسین ورنگین کارڈ جو انصاری صاحب کے موئے قلم کا شاہکار ہے۔ دورانِ خط وکتابت انھوں نے مجھے بھیج دیا تھا۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ بہت خوبصورت جگہ ہے اور اقبال اکثر سیر کے لیے یاٹ کلب جایا کرتے تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔

بھوپال کے ایک اور مایۂ ناز فرزند اور بلند پایہ ادیب ڈاکٹر سید محمد یوسف۔ صدر شعبۂ عربی جامعہ کراچی کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنھیں اقبال سے قیامِ بھوپال کے دوران شرفِ نیاز تو حاصل نہ ہو سکا لیکن اُنھوں نے اقبال کے فکر و فن سے استفادہ بھی کیا اور ان پر کئی یادگار مضامین بھی اردو، عربی اور انگریزی میں تحریر کیے جو لاہور، کراچی اور قاہرہ کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہو کر کافی پسند کیے گئے۔

کراچی میں ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر سید محمد یوسف نے اُن خطوط کی نشان دہی فرمائی جنھیں ممنون حسن خاں نے شیخ عطاء اللہ (مرتب اقبال نامہ) کو علی گڑھ بھیجے تھے۔ اقبال نامہ میں دس خط ممنون حسن خاں کے نام ہیں، چوبیس خط راس مسعود کے نام، تین خط لیڈی مسعود کے نام اور ایک خط راس مسعود کا اقبال کے نام شامل ہے۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف ۱۹۱۶ء میں بمقام بھوپال پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے، وہیں سے عربی میں ایم۔ اے اور پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد قاہرہ چلے گئے، کئی سال تک قاہرہ میں رہے پھر سیلون کی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۱۹۵۹ء میں کراچی آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ جب سے یہیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اقبال نامہ کے خطوط کی تفصیلات، اقبال سے عقیدت مندی، بھوپال سے ربط و تعلق کے بارے میں جب میں نے متعدد سوالات اُن سے کیے تو انھوں نے بیان کیا کہ میرا بچپن بھوپال میں گزرا جہاں میرے والد سید احسان حسین مرحوم الگزینڈرا جہانگیریہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور نواب حمیداللہ خاں کی شہزادیوں کے اتالیق تھے۔ اُس وقت یہ ہائی اسکول بھوپال کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ بھوپال کے تمام بچوں کی طرح میں نے بھی اسی اسکول میں تعلیم پائی۔ اسکول سے باہر والد مرحوم نے عربی فارسی کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا جس کے نتیجہ میں میرا شعر و ادب کا شوق اسکول کے ساتھیوں کی بہ نسبت تیز تر ہو گیا۔ جب ذرا استعداد پیدا ہوئی اور ذوق آگے بڑھا تو "شکوہ" اور "نالۂ یتیم" کی گونج کان میں پڑی۔ اقبال سے ایک اسکول کے طالبِ علم کا یہ پہلا تعارف تھا۔ دینی علوم سے واقفیت ہوئی تو اقبال سے عقیدت بڑھ گئی۔ اقبال کے کلام نے یہ یقین عطا کیا کہ دین کوئی فرسودہ شے نہیں۔ دین کے علم کو جلا دی جائے تو عصرِ حاضر کی روشنی ماند پڑ جائے۔

۱۹۳۵ء و ۱۹۳۶ء میں جب اقبال بھوپال آئے گئے تو میرے شعور میں پختگی آچلی تھی اور اقبال سے عقیدت والہانہ حد تک پہنچ چکی تھی مگر عاشق کو تابِ نظارہ کہاں۔ ملاقات کا نہ موقع آیا نہ ہمت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد میں علی گڑھ پہنچا تو ہر صحبت میں "ضربِ کلیم" کا چرچا سُنا۔ جیسے جیسے مسلم لیگ نے زور پکڑا۔ اقبال کے سیاسی افکا

بالخصوص ملت اور وطن کے تصورات، ابھرتے گئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ویسے بھی مسلم لیگ کی سیاست کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ یہاں کی نئی نسل نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن حصہ لیا۔ مسلم لیگ کی شاخ قایم ہوئی، اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جس نے نوجوانوں میں ایک نیا عزم، نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کر دیا ــــ متعدد جلسوں کی صدارت قائداعظم نے فرمائی، اور انھوں نے علی گڑھ کے باحوصلہ نوجوانوں کو ہمیشہ پُر امید نگاہوں سے دیکھا۔ ۶ر مارچ ۱۹۴۰ء کی پرجوش تقریر کا حوالہ نامناسب نہ ہوگا جس میں قائداعظم نے یونین میں تشریف لاکر سیاسی حالات پر تقریر فرمائی، اور آخر میں کہا:

> "میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جائیں اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ایک مستحکم اور مضبوط پیکر فولاد کی طرح اپنی جگہ پر قایم رہیے۔ اپنی قوم کی تنظیم و تربیت کیجیے اور اُن کو ادب و تادیب کا خوگر بنایئے۔ ہماری قوم ہمارے ساتھ ہے۔ آپ رکاوٹوں سے پراگندہ خاطر نہ ہوں۔ ہاں مسلمانوں کو منظم اور یک جا کریں اور فوجی قواعد کی طرح پابند کار بنائیں۔ اس طرح آپ اُن کو ایک ایسے حیرت افزا لشکر سیاسی میں تبدیل کر لیں گے جسے چشم ہند نے کبھی نہیں دیکھا۔
>
> اس طرح ہم جلد تر آزادی کی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے [۱]"

حکیم الامت کی وفات کی خبر آئی تو علی گڑھ والوں کے دل میں اُن کے افکار کو جمع کرنے اور تعمیر ملت میں اُنھیں بروئے کار لانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت میں مسلم یونیورسٹی میں مسلم لیگ کی شاخ کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس سلسلے میں منجملہ دیگر اساتذہ شیخ عطاء اللہ صاحب، جن کا تعلق شعبۂ معاشیات سے تھا، رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ہم طلبہ اُن کو ایک باوقار استاد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ جوشیلے بالکل نہ تھے۔ بڑے پُرسکون، سادہ مگر صائب الرائے اور پختہ یقین رکھنے والے تھے۔ شعر و ادب سے اُن کے لگاؤ کا کبھی اندازہ نہ ہوا ــــ حتیٰ کہ اقبال کے شعر بھی بہت کم پڑھتے تھے، البتہ ملت کے مستقبل کی بابت برابر سوچتے رہتے تھے اور جیسا کہ بعد کو ظاہر ہوا یہی وجہ تھی کہ اُنھیں اقبال کے ساتھ سچی عقیدت تھی۔ اُن کی اصابت رائے دیکھیے کہ اُنھوں نے سب سے پہلے اقبال کے مکاتیب جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اُن کی تواضع اور انکسار یہ کہ اُنھوں نے دوسروں کو یہ کام کرنے کی دعوت دی اور کئی سال انتظار کرتے رہے کہ کوئی اُٹھے۔ جب کوئی نہ اٹھا تو انھوں نے محض اپنے عزم صادق اور خلوصِ نیت سے یہ خدمت انجام دی۔ خطوط جمع کرنے کے لیے انھوں نے جہاں مشاہیر سے رابطہ قایم کیا وہاں چھوٹوں کو بھی مامور کیا۔ مجھے تاکید کی کہ بھوپال جاؤ تو ممنون حسن خاں صاحب سے ذاتی طور پر گزارش کرو۔ مجھے ممنون حسن خاں صاحب سے نیاز حاصل تھا۔ میں نے شیخ عطاء اللہ صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور ممنون حسن خاں صاحب نے بخوشی وہ خطوط جو اُن کے پاس تھے، شیخ صاحب کو بھجوا دیے۔

اقبال نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو علوم اسلامیہ کے متعلق ایک اہم نوٹ لکھ کر بھیجا تھا جس کا اردو ترجمہ شیخ عطاء اللہ نے "سہیل" سے نقل کر کے اقبال نامہ جلد دوم (صفحہ ۲۱۲-۲۲۵) میں شامل کیا ہے۔ اس کی انگریزی اصل بھی میں نے مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے تلاش کر کے نکالی تھی جو میرے پاس رہ گئی۔ اسی عرصہ میں میرا تقرر نو ادیونیورسٹی میں ہو گیا اور میں قاہرہ جانے کی تیاری میں ایسا مصروف ہوا کہ عطاء اللہ صاحب کو نہ پہنچا سکا۔

---

[۱] علی گڑھ (کتابچہ ۱۸۷۵ء تا اگست ۱۹۴۷ء) صفحہ ۲۸-۲۹

یہ انگریزی اصل بعد کو میں نے "اقبال ریویو" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع کی۔

میں مصر چلا گیا۔ ادھر قیام پاکستان کے نتیجہ میں اندوہناک حالات رونما ہوئے۔ شیخ عطاء اللہ علی گڑھ چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور معاون حضرات کی رفاقت سے بھی محروم ہو گئے مگر اُن کی اقبال دوستی اور ہمت دیکھیے۔ کہ تن تنہا اقبال نامہ کی دوسری جلد بھی مرتب کر کے شائع کر دی اور جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اُسے بحسن و خوبی انجام کو پہنچایا۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف سے میں نے خطوط کی اہمیت اور اقبال کے بعض ذاتی خطوط کی اشاعت پر اُن کے مداحوں کی جھجک کے بارے میں رائے دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ مکاتیب کی اہمیت یہی ہوتی ہے کہ اُن میں انسان کی سیرت سادہ و بے تکلف جلوہ گر ہوتی ہے۔ انسان کھل کر خط لکھتا ہے۔ اس لیے تحریر کی سچائی، سادگی و پُرکاری ہمیں متاثر کرتی ہے۔ میرے خیال میں کسی مکتوب کو حذف کر دینا یا ایک مکتوب میں سے کسی کا نام حذف کر کے اس کی جگہ نقطے رکھ دینا علمی دیانت کے خلاف ہے۔ اقبال ایک انسان تھے۔ انسانی ضروریات اور انسانی جذبات رکھتے تھے۔ اس کے اظہار سے اُن کی انسانی عظمت کو بٹہ نہیں لگتا اس لیے مجھے معترضین سے اتفاق نہیں۔ اقبال جیسے عظیم انسان کے دل میں ذرا بھی خلش ہو تو اس کا اعتراف و اظہار کم از کم اپنے مخلص دوستوں سے کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کا اُسے حق تھا۔ چنانچہ راس مسعود کے نام جتنے خطوط ہیں اُن میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت سے جھجک نہ ہونا چاہیے۔ ان پر اعتراض کا کوئی جواز بھی پیدا نہیں ہوتا بلکہ میری دانست میں یہ رجحان افسوسناک ہوگا اگر ہم اپنے تصورات بلکہ تعصبات کے مطابق اقبال کا بُت تراشیں۔

ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے دوسری طرف شاعر کے وہ ابیات ہیں جنھیں اُس نے اپنی زندگی میں مسترد زد قلمزد کر دیا یا بالقصد نظر انداز کر کے اپنے مجموعہ میں اُنھیں شامل نہیں کیا۔ لیکن اُن کا کھوج لگا کر۔ بڑے طمطراق اور زور و شور کے ساتھ وہ تمام غیر اہم کلام اُس کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ فرض کیجیے میں ایک مضمون کا مسودہ تیار کرتا ہوں، اُسے شائع کرتے وقت اگر اس میں سے چند سطریں نکال دیتا ہوں تو کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ردی کی ٹوکری سے کاغذ کا پرزہ نکال کر وہ سطریں میرے ذمہ لگائے۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف نے بھوپال کے ناتے اقبال کے افکار و خیالات پر اب تک جو مضامین لکھے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :-

اُردو

① عقل و عشق
② اقبال کے کلام میں روایت و جدت
③ اقبال اور عبدالرحمٰن الداخل
④ مسجدِ قرطبہ کا مرکزی خیال
⑤ اقبال اور شعر
⑥ اقبال کی سیاسی بصیرت
⑦ جمالیات سے متعلق اقبال کے افکار

6030

عربی

(۱) فلسفۂ اقبال
(۲) آراء اقبال عن المرأة و وظیفتہا فی الحیاۃ
(۳) الامامۃ فی رای اقبال
(۴) پیام مشرق (نقد)
(۵) ضرب الکلیم (نقد)

انگریزی

" A study of Iqbal's views on Ijma "
-studies in Islamic History and culture.

بھوپال کے ایک اور جواں سال وجوان فکر ادیب و محقق ڈاکٹر حنیف نوق بھی اُن حضرات میں شامل ہیں۔ جنھوں نے علامہ اقبال کی ذاتِ گرامی سے بلا واسطہ اثر قبول کیا۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول بھوپال سے پاس کرنے کے بعد کانپور کا رُخ کیا اور وہاں کے حلیم کالج سے انٹر کیا پھر وہ لکھنؤ چلے گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے آنرز اور ایم۔اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ وہ ڈھاکہ چلے گئے اور ۱۹۵۰ء سے ہی وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو۔فارسی سے منسلک ہو گئے۔ تقریباً ۱۲ سال وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ وہیں سے انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد وہ دوسرے استاد ہیں جنھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے انگریزی میں مقالہ لکھا۔ اُن کے مقالہ کا عنوان تھا:۔

" The social analysis of Urdu
Poetry during and after 1857 "

اُن کے انگریزی مقالہ کا ایک باب تمام تر علامہ اقبال سے متعلق تھا۔
اس کے علاوہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے متاثر ہو کر بھی انھوں نے کئی اور قیمتی مضامین تحریر کیے اور ڈھاکہ کی مختلف ادبی تقریبات میں اقبال پر تقریریں بھی کیں۔ تفصیلات یہ ہیں:۔

(۱) اقبال کی ادبی شخصیت ـــــ مطبوعہ "نگار" ۔ لکھنؤ
(۲) اقبال ـــــ مطبوعہ "افکار" ۔ کراچی
(۳) اقبال اور جمہوریت ـــــ " "جائزہ" ۔ کراچی
(۴) Iqbal and the heritage of western thoughts.
(۵) Internationalism in Iqbal's poetry.
(۶) اقبال ڈے کے موقع پر مختلف اداروں مثلاً پاکستان کونسل ڈھاکہ۔ بلبل اکیڈیمی، ڈھاکہ یونیورسٹی کے مختلف ہال۔ بزمِ فنون اور دوسری ادبی انجمنوں میں جو تقاریر کیں یا مضامین پڑھے وہ علامہ اقبال کی متنوع شخصیت، زندگی اور فن سے متعلق تھے۔

ان کے ترجمے بنگلہ زبان کے ممتاز جرائد سنگباد۔ آزاد اور سوغات
میں بھی شائع ہوئے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے بھوپال کے قیام نے سبھی ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو بے حد متاثر کیا۔ میرا وطن بھی بھوپال ہے۔ چنانچہ کانپور، لکھنؤ اور ڈھاکہ کے قیام کے دوران جب بھی میرا بھوپال جانا ہوتا۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ربط و تعلق قایم ہوجاتا۔ بھوپال میں اقبال شناسوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ چنانچہ اقبال سے میرا متاثر ہونا بھی فطری تھا۔

اختر جمال ـــــ ممتاز ادیب و صحافی اور ہفت روزہ "ندیم" کے اولین مدیر محمود الحسن صدیقی کی صاحبزادی اور بھوپال کے آتش نفس اور مشہور شاعر احسن علی خاں کی بیوی ہیں اور ان دنوں اسلام آباد میں ہیں۔ اختر جمال سے رابطہ قایم ہونے پر میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا اُنھوں نے علامہ اقبال کو دیکھا تھا، یا اُن سے کوئی اثر قبول کیا تھا۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا:۔

"ـــــ جہاں تک اثرات کا تعلق ہے میں تو کیا کوئی ادیب و شاعر ایسا نہ تھا جس نے علامہ اقبال کے قیام بھوپال سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ میرے پاس "ندیم" بھوپال کے کچھ پرچے آج بھی محفوظ ہیں۔ ان پرچوں اور عبدالقوی دسنوی کے مضمون۔ "علامہ اقبال بھوپال میں" سے استفادہ کرکے میں نے ایک مضمون "اقبال اور بھوپال" ماہنامہ فنون۔ لاہور میں لکھا تھا۔ وہ بھیج رہی ہوں۔ شاید آپ کے کسی کام آسکے"

مضمون پڑھ کر کچھ نئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ چنانچہ اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ اس مضمون سے یہ بھی پتہ چلا کہ کم سنی کے زمانے میں وہ ایک بار علامہ اقبال سے ملنے بھی اپنے والد محمود الحسن صدیقی کے ساتھ گئی تھیں۔ مضمون کے آغاز میں انھوں نے جو اظہار خیال کیا ہے اُس کے مطالعہ سے بھوپال میں علامہ اقبال کے اثرات پر بھی روشنی پڑتی ہے ـــــ ملاحظہ ہو:ـــــ

"ـــــ بھوپال کے مدارس میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ اردو دفتری، عدالتی اور سرکاری زبان تھی۔ شہر میں اردو کے بڑے بڑے کتب خانے تھے رسالے اور اخبارات نکالے جاتے تھے اور بھوپال کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں اقبال کا اتنا چرچا تھا اور وہاں کے لوگ اقبال سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اُسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر یہ ماحول دیکھا تھا اور اقبال کی محبت مجھے مقدس ورثے کی طرح ملی تھی۔

اُس زمانے میں بھوپال جدوجہد آزادی کا بھی ایک مشہور گڑھ تھا۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی جو جمال الدین افغانی کے دستِ راست تھے۔ افغانستان میں ہندوستان کی انقلابی حکومت کے وزیر اعظم تھے۔ برکت اللہ بھوپالی ۱۹۲۷ء میں انتقال فرما چکے تھے لیکن بھوپال میں اُن کی تحریک کے گہرے اثرات تھے اور کئی سیاسی جماعتیں تھیں۔ نواب صاحب ہندوستان کی سیاسیات میں ایک اہم حیثیت رکھتے تھے ـــــ وہ اعتدال پسند تھے۔ ان کے تعلقات برطانوی ہند کے حکمرانوں اور سیاسی رہنماؤں دونوں سے دوستانہ تھے۔ اس لیے جب بھی باہمی بات چیت ہوتی نواب صاحب ثالث کا کام کرتے۔

اقبال سے بھوپال کا جو تعلق رہا، اس کی بہت سی یادیں خطوطِ اقبال، روزگارِ فقیر اور گنج ہائے گرانمایہ میں محفوظ ہیں۔ اس لیے میں اپنے اس مضمون میں اُن باتوں کا تذکرہ نہیں کروں گی۔ میں وہ باتیں ہی لکھ رہی ہوں جو میں نے اپنے بزرگوں سے سُنی ہیں یا جو یادیں اور باتیں اقبال کی وفات کے بعد ہفتہ وار "ندیم" میں شایع ہوئیں اور جو اتفاق سے اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ میرے والد محمود الحسن صدیقی مرحوم "ندیم" کے ایڈیٹر تھے۔ ندیم ویکلی والد صاحب نے سر راس کے ایما پر جاری کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ماہنامہ "ظل السلطان" کے مدیر تھے۔ والد کا علی گڑھ کی طالبِ علمی کے زمانے سے ہی سر راس مرحوم سے تعلق تھا اور اُن کے بھوپال کے دورانِ قیام یہ تعلق بہت بڑھ گیا تھا۔ والد کہا کرتے تھے کہ سر راس کے فیضِ صحبت سے جو کچھ انھیں حاصل ہوا وہ زندگی کے تمام تجربات سے زیادہ قیمتی تھا۔ جس زمانے میں علامہ اقبال بھوپال تشریف لائے والد کو بھی بارہا اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور جب وہ اُن دنوں کی باتیں سنایا کرتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔

نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کے تعلقات بہت قریبی اور دوستانہ تھے۔ وہ غالبًا اپنے علی گڑھ کے زمانۂ قیام سے ہی علامہ اقبال کے قریب آئے تھے۔ نواب صاحب نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی اور ایک عرصۂ دراز تک وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے ہیں۔ علامہ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ علی گڑھ کے طلبہ اُن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کے ایک خط سے جو غلام بھیک نیرنگ کے نام ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۹۲۶ء سے قبل ہی نواب صاحب بھوپال سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک چندے کے سلسلے میں انھیں نواب صاحب کی مدد کا یقین تھا۔ ۳ر جنوری ۱۹۲۷ء کو لکھتے ہیں کہ "اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی تو والیٔ بھوپال سے مدد کی التجا بہتر ہوگی۔"

اخترجمال اپنے مختصر سے مضمون میں آگے چل کر لکھتی ہیں:

"علامہ اقبال کے بھوپال آنے کی خبر کئی دن سے مشہور تھی۔ جس گاڑی سے علامہ بھوپال تشریف لائے وہ رات کو پہنچتی تھی۔ بھوپال کے عوام اور خواص سب ہی اقبال کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھے۔ عمائدینِ شہر اسٹیشن پر موجود تھے۔ نواب صاحب نے اپنے نمایندے کے طور پر اپنے ملٹری سکریٹری سر اقبال محمد خاں کو بھیجا تھا۔ سر راس وقت سے بہت پہلے اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور وہاں بے تابی سے ٹہل ٹہل کر ریل کا انتظار کر رہے تھے۔ جب گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو ایک صاحب افغان ٹوپی، شلوار قمیص اور ڈھیلے سے کوٹ میں ملبوس اسٹیشن پر اُترے۔ والد صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ سر راس تقریبًا دوڑ کر علامہ کے قریب گئے اور (محبت) سے گلے ملے اور اُن کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ وہ اتنی محبت اور گہرے خلوص سے ملے کہ اسٹیشن پر کھڑے ہوئے لوگ بھی

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

سر راس نے عمائدین اور معززین شہر کا علامہ سے تعارف کرایا اور پھر علامہ کے خادم علی بخش کو بلا کر اُن سے مصافحہ کیا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔ علامہ کے پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس کی گاڑی کے پیچھے ہی آ گیا۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ علامہ شاہی مہمان خانے میں قیام کریں لیکن علامہ نے فرمایا کہ اس بار تو وہ اپنے دوست سے ہی ملنے آئے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ وہ سر راس کے ساتھ قیام کریں یہ علامہ صاحب کا قیام "ریاض منزل" میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال کے مشہور بڑے تالاب کے کنارے پر ہے۔ "ریاض منزل" کے بالائی کمرے سے جہاں علامہ کو ٹھہرایا گیا۔ اس تالاب کا منظر بے حد حسین نظر آتا تھا۔ ایک طرف شملہ کی سرسبز پہاڑیاں اور روشنیاں نظر آتی تھیں اور تالاب کا دور تک پھیلا ہوا پانی طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک عجیب و غریب طلسماتی فضا پیدا کرتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کمرے میں اس منظر کو دیکھ کر اقبال نے اپنی مشہور نظم "نگاہ" کہی جس کا آخری شعر ہے ؎

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں\
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

ممنون حسن خاں صاحب اس زمانے میں سر راس کے پرسنل سکریٹری تھے۔ سر راس نے اُن کو علامہ کی خدمت میں رہنے کا حکم دیا تھا اور دفتر سے اُن کی حاضری معاف کر دی تھی۔ علامہ سے سر راس نے کہا تھا کہ انھیں جس چیز کی ضرورت ہو اور جو کام ہو وہ ممنون حسن خاں کو اطلاع دے دیں۔ وہ اُن کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ممنون حسن خاں علامہ کی اس خدمت پر فخر کرتے ہیں اور اسے اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:۔

"ممنون حسن خاں کے ذمے خط و کتابت کا کام بھی تھا۔ علامہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ہندوستان کے کونے کونے سے خطوط آتے تھے اور سر راس کی طرح ان کا علیحدہ "میل بیگ" جاتا تھا۔ تمام خطوط ممنون حسن خاں صاحب اپنے پاس رکھتے تھے۔ صبح کے وقت تمام خطوط علامہ کو سناتے، پھر علامہ جو کچھ جواب میں لکھواتے وہ اسے پنسل سے نوٹ کر لیتے اور بعد میں صاف کر کے یا ٹائپ کر کے علامہ کو دستخط کے لیے پہنچا دیتے تھے۔ ان خطوط میں سب سے زیادہ خط علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کے ہوتے تھے جو علامہ کی خیریت جاننے کو بے چین ہوتے تھے اور اُن کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔"

علامہ اقبال کی بھوپال میں مصروفیات اور اپنی علامہ سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

"علامہ — بھوپال میں زیادہ تر آرام ہی کرتے تھے۔ باہر بہت کم نکلتے تھے مگر جامع مسجد

(اور اکثر موتی مسجد میں بھی) نماز پڑھنے ضرور جاتے تھے۔ سر راس کے گھر پر اقبال کے مداح اور عقیدت مند برابر جاتے رہتے تھے۔ علامہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس ملاقاتی کو نہ ہونے دیتے تھے۔ جن لوگوں کو اس زمانے میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے وہ انتہائی محبت اور احترام سے اس زمانے کی باتیں یاد کرتے ہیں۔

مرحوم رائے زادہ آفتاب جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے والد مرحوم کی معیت میں علامہ کی خدمت میں اکثر جاتے تھے اور علامہ سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ علامہ سے عقیدت اور محبت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔

میں اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ نہ صرف یہ کہ میں نے اُن میں سے بہت سے لوگوں سے علامہ کی باتیں سُنی ہیں بلکہ بچپن میں علامہ کی دید کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا ہے۔ اُن دنوں مجھے پڑھنا نہیں آتا تھا، اسکول میں داخل نہیں ہوئی تھی مگر گھر میں رشتے کے دوسرے بڑے بہن بھائیوں سے علامہ اقبال کی نظمیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور "ایک مکڑا اور مکھی" سُنی تھیں۔

ایک دن صبح جب ابا جان سر راس کے ہاں جا رہے تھے، میں نے اور میری بہن نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی۔ انھوں نے کہا آج کل علامہ اقبال وہاں آئے ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ تمھیں اس شرط پر لے جائیں گے کہ سلام کروگی ——

'ریاض منزل' میں بڑے تالاب کے کنارے بہت مزا آتا تھا۔ مچھیرے مچھلیاں پکڑتے نظر آتے۔ کشتیاں چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اور پھر سر راس کا باغ بہت بڑا تھا جس میں خوبصورت تتلیاں تھیں اس لیے ہم دونوں بہنوں نے سلام کرنے کا پکا وعدہ کر لیا اگرچہ راستہ بھر سلام کے خیال سے دل دھڑکتا رہا۔

'ریاض منزل' کے برآمدے میں پہنچ کر ایک بزرگ کو آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے سر راس سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے تھے۔ کندھوں پر چادر لپٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی حقہ رکھا تھا۔ ہم نے جھجک کر مری مری سی آواز میں "آداب" کہا۔ سر راس نے کہا "یہ محمود کی بچیاں ہیں، بہت شرماتی ہیں۔" علامہ نے دعا دی اور نام پوچھے۔ اب تو ہماری آواز حلق میں بالکل ہی اٹک گئی۔ ابا جان نے ہم دونوں کے نام بتائے۔ اس کے بعد ہم نے فوراً باغ کی راہ لی۔ جب گھنٹہ بھر بعد ابو نے ہمیں چلنے کو بلوایا تو پھر ایک بار سلام کا مرحلہ طے کرنا پڑا۔ واپسی میں ابو نے کہا "تم بڑی ہو کر اس بات پر فخر کیا کروگی کہ ہم نے بچپن میں علامہ اقبال کو دیکھا تھا۔"

—— اور آج جب ابو کی اتنی بہت سی محبت بھری باتیں یاد آتی ہیں تو یہ بات بھی اُن کا بہت بڑا احسان معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی شرمیلی اور بیوقوف بچیوں کو اپنے ساتھ علامہ کے حضور میں لے گئے تھے۔"

—— "ممنون صاحب مہینے میں دو بار ضرور علامہ اقبال کو خط لکھتے تھے اور وہ بڑی

باقاعدگی سے ان کے خطوں کا جواب دیتے تھے۔ انتقال سے صرف دو دن پہلے ممنون صاحب کو اُن کا آخری خط ملا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا:۔

"ـــــــ مائی ڈیر ممنون۔ آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس کہ شدید علالت کی وجہ سے جواب نہ لکھوا سکا۔ دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا مگر اب خدا کے فضل سے افاقہ ہے۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا مگر دمہ کی وجہ سے اُسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی انشاء اللہ ستمبر میں ہوگا۔"

ممنون حسن خاں کے نام جو خطوط آتے تھے ان کا اقبال کے سب ہی عقیدت مند بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور اُن کو سنتے تھے۔ "یوم اقبال" پر مجھے بچپن کا ایک واقعہ اکثر یاد آجاتا ہے۔ ایک دن جب میں کسی کام سے باہر کے مکان میں گئی تو میں نے وہاں ابو اور اُن کے عزیز دوست ممنون حسن خاں کو زور زور سے روتے دیکھا۔ ابو کو اس سے پہلے میں نے روتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اندر کے مکان میں آکر امی اور نانا میاں کو بتایا کہ "ابو اور اُن کے دوست عورتوں کی طرح رو رہے ہیں۔" سب میری بات سُن کر حیران ہو گئے۔ جب ابا خود اندر آئے تو انھوں نے بتایا کہ ممنون حسن خاں یہ اطلاع لے کر آئے تھے کہ علامہ اقبال کا آج صبح پانچ بجے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

یہ بات تو بہت بعد میں میری سمجھ میں آئی کہ ابو اور ممنون حسن خاں اس روز اس قدر تڑپ کر کیوں رو رہے تھے۔ بچپن میں تو یہ واقعہ یاد رکھنے کی وجہ صرف ابا کا رونا تھا۔[1]"

میری درخواست پر اختر جمال نے ہفت روزہ "ندیم" میں شایع شدہ مضامین کا مختصر سا اشاریہ لکھ بھیجا جو درج ذیل ہے۔ افسوس کہ "ندیم" کی پوری فائل نہ اختر جمال کے پاس محفوظ ہے۔ نہ تلاش و تجسس سے بھوپال میں کسی جگہ مل سکی ورنہ تمام شایع شدہ مضامین کا مکمل اشاریہ شامل کتاب ہو جاتا۔ پھر بھی یہ چند حوالے اس امر کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں کہ بھوپال میں اقبال سے اثرات قبول کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔

اشاریہ ہفت روزہ "ندیم"

۱۔ اقبال کا نظریۂ شاعری از۔ مائل نقوی ـــــــ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۷ء

۲۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال (اداریہ) از: محمود الحسن صدیقی ـــــــ ۱۵ر اپریل ۱۹۳۸ء

۳۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ـــــــ از:۔ محمد احمد سبزواری ـــــــ ۱۵ر مئی ۱۹۳۸ء

۴۔ علامہ اقبال کی یاد میں ـــــــ از:۔ ممنون حسن خاں ـــــــ ۲۲ر مئی ۱۹۳۸ء

۵۔ اقبال کی تعلیم ـــــــ از:۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن ـــــــ یکم جولائی ۱۹۳۸ء

ان مضامین کے علاوہ "ندیم" میں علامہ اقبال کی متعدد نظمیں بھی شایع ہوئی ہیں۔ صرف ایک نظم کا حوالہ مل سکا ہے جو علامہ نے سر راس مسعود کی رحلت پر لکھی تھی۔

۱۔ "مسعود مرحوم" ـــــــ از:۔ علامہ اقبال ـــــــ ۲۲ر فروری ۱۹۳۸ء

---

[1] فنون۔ مئی۔ جون ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۵ تا ۱۰

اقبال کے تاثرات

دنیا کی عظیم المرتبت اور لافانی شخصیتوں کے کارناموں پر نظر ڈالیے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ قدرت اُنھیں کسی نہ کسی بلند نصب العین کی تکمیل کے لیے ہی خلق کرتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جب تک زندہ رہتی ہیں ملک وملت کو زندگی کے صحیح اور بلند تر مقصد کا پیغام پہنچاتی ہیں اور جب دنیا سے رخصت ہوجاتی ہیں تو اُن کے چھوڑے ہوئے نقوش یا قوموں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ آفاق گیر شخصیتوں کا ہر دور اور ہر زمانے میں یہی مشن رہا ہے۔ اقبال ایسی ہی بلند گو بزرگ ومحترم اور زندۂ جاوید شخصیتوں میں سرِفہرست ہیں جنھوں نے زندگی بھر فکر وعمل کا پیام دیا اور جب وہ جدا ہوئے تو ملک وملت کو اتنا کچھ قیمتی سرمایہ دے گئے جس سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ آزادی اور بیداری کی وہ لہر جس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سچ پوچھیے تو اقبال کے انقلاب انگیز اور حیات افروز پیغام ہی کا نتیجہ تھا۔ برصغیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر شخص اقبال کا دل دادہ تھا اور یہ خوش نصیبی غالب کے بعد اگر برصغیر کے کسی اور باکمال شاعر کے حصہ میں آئی تھی تو وہ صرف اقبال کی ذات ستودہ صفات تھی۔ کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، کیا دیگر مذاہب والے۔ سبھی اقبال کے فکرانگیز اور بصیرت افروز کلام کے گرویدہ وشیدا تھے۔ بظاہر وہ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے لیکن برصغیر میں ہر جگہ اُن کی یاد میں جلسے منعقد ہورہے تھے اور یادگاریں قایم ہوچکی تھیں۔ کہیں اُن کے فلسفۂ خودی پر کام ہو رہا تھا۔ کہیں اُن کی انقلاب آفریں تقاریر کے ترجمے ہورہے تھے۔ کہیں اُن کے کلام کے دوسری زبانوں میں ترجمے کیے جارہے تھے۔ کہیں اُن کی یاد میں ادارے قایم ہورہے تھے۔ بھوپال بھی اُن زندہ و باعمل شہروں میں شامل تھا جہاں پہلی بار اُن کی عظمت کے اعتراف میں "اقبال لائبریری" کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہ اقبال کی ذات سے اہلِ بھوپال کی وابستگی کا پہلا عملی قدم تھا جو بھوپال کے چند سرپھرے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اٹھایا۔ اس لائبریری کے بارے میں بھوپال کے جواں سال محقق شمیم احمد[1] نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں اُن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔

اقبال لائبریری کا قیام وافتتاح۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو عمل میں آیا۔ اس کے بانی عبداللطیف خاں تھے سابقہ مجلس انتظامیہ میں جو حضرات شامل تھے اُن کے نام یہ ہیں:۔

۱؎ ذاتی مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۷۲ء

① سید آفتاب الدین۔ ایم۔ اے (صدر) ② ظفر علی خاں۔ ایم اے (نائب صدر)
③ سید ساجد علی۔ (جنرل سکریٹری) ④ احمد مصطفےٰ (سکریٹری) ⑤ حیات صدیقی۔ (سکریٹری نشر و اشاعت) ⑥ محمد عمر انصاری (منتظم) ⑦ سید حامد جعفری (معتمد) ⑧ عبداللطیف خاں (خازن)
⑨ عبدالباسط (رُکن) ⑩ سید شوکت علی (رُکن) ⑪ عبدالعلیم انصاری (رُکن)

ان حضرات کے بعد بھوپال کے جن اقبال شناسوں نے اقبال لائبریری کی مجلس عاملہ اور مجلس انتظامیہ میں شمولیت اختیار کی اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں [1]:-

مجلسِ عاملہ: ① سید آفتاب الدین ② سید ساجد علی
③ محمد انصاری ④ سید حامد جعفری ⑤ عبداللطیف خاں

مجلسِ انتظامیہ: ① سید سلیمان نقوی (سکریٹری) ② انعام الدین (جوائنٹ سکریٹری)
③ واحد علی (سکریٹری نشر و اشاعت) ④ رشید انجم (خازن) محمد خالد (منتظم)
⑤ سید عزیز الدین (رُکن)

نامزد ممبران: ① سید مسعود علی۔ بی۔ اے ② محمد اُنس خاں بی۔ اے
③ عتیق احمد صدیقی۔

اقبال لائبریری میں کل کتابوں کی تعداد ——— ۳۰۰۰

اردو کی کتابیں ——— ۲۳۰۰
ہندی کی کتابیں ——— ۳۰۰
انگریزی کی کتابیں ——— ۴۰۰
اقبال کی تصانیف ——— ۱۵ (بہ تفصیل ذیل)

(۱) ضرب کلیم (۲) زبور عجم (۳) پیام مشرق (۴) ارمغانِ حجاز (۵) جاوید نامہ (۶) بالِ جبریل۔ (۷) اسرار و رموز (۸) بانگ درا (۹) باقیات اقبال (۱۰) اقبال اور نونہال (۱۱) انتخاب دیوان اقبال (مرتبہ تاج آفس) (۱۲) خطبات اقبال (مرتبہ رضیہ فرحت بانو) (۱۳) اسلام کے سیاسی تصورات (۱۴) کلیات اقبال (ناشر نیو تاج آفس) (۱۵) فلسفۂ عجم۔

ان کے علاوہ اقبال پر کتابیں ——— ۲۵ (بہ تفصیل ذیل)

۱۔ فکر اقبال ——— غلام دستگیر
۲۔ آثار اقبال ——— غلام دستگیر
۳۔ اقبال پر ایک نظر ——— سید محمد شاہ
۴۔ مضامین اقبال ——— محمد حسین تاج

---

[1] ان حضرات کے علاوہ آصف شاہمیری بھی ان نوجوانوں میں شامل تھے جنھوں نے اقبال لائبریری کو کئی سال تک بخیر و خوبی چلایا۔ افسوس ۱۹۶۸ء کے دوران ان کا انتقال ہو گیا۔

۵۔ تصوف اقبال ـــــــ حبیب النساء بیگم
۶۔ ملفوظات اقبال ـــــــ محمود نظامی
۷۔ رموز اقبال ـــــــ ڈاکٹر میر ولی الدین
۸۔ اصلاحات اقبال ـــــــ بشیر الحق دسنوی
۹۔ اقبال کی شاعری ـــــــ عبد المالک
۱۰۔ اقبال (انگریزی میں) ـــــــ عظیم بیگ
۱۱۔ اقبال کا نظریۂ فن ـــــــ عزیز احمد
۱۲۔ اقبال ـــــــ محمد حسین خاں
۱۳۔ اقبال ـــــــ شائع کردہ انجمن ترقی اردو
۱۴۔ اقبال ـــــــ مجنوں گورکھپوری
۱۵۔ حیات اقبال ـــــــ شایع کردہ تاج آفس
۱۶۔ اقبال اور ٹیگور ـــــــ عارف بٹالوی
۱۷۔ روح اقبال ـــــــ ڈاکٹر یوسف حسین خان
۱۸۔ رسالہ نیرنگ خیال ـــــــ اقبال نمبر
۱۹۔ مقام اقبال ـــــــ اشفاق حسین
۲۰۔ اقبال ـــــــ مولوی احمد الدین
۲۱۔ سیرتِ اقبال ـــــــ یکتا حقانی
۲۲۔ اقبال۔ امام ادب ـــــــ رئیس احمد جعفری
۲۳۔ اقبال۔ قرآنِ حکیم کی روشنی میں ـــــــ محمد یوسف
۲۴۔ اقبال، اس کی شاعری اور پیغام ـــــــ علی اکبر
۲۵۔ شرح اسرارِ خودی ـــــــ پروفیسر محمد یوسف

اقبال لائبریری اور پبلک دارالمطالعہ شاعر مشرق کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو معرض وجود میں آیا۔ یہ وسط شہر کے مشہور بازار ابراہیم پورہ میں واقع تھا اور قیام سے آج تک نہایت خاموشی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ابتدائی دور میں عبد اللطیف خاں کے ساتھ بھوپال کے ایک سیاسی و سماجی کارکن آصف شاہمیری نے بھی عملاً اس کی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔ کئی سال تک پابندی سے ۲۱ اپریل کو یوم اقبال منایا جاتا رہا۔ کبھی کبھی یوم اقبال پر کل ہند پیمانے پر مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی اقبال لائبریری کی عملی سرگرمیاں جاری رہیں۔ مختلف مواقع پر لائبریری کے زیر اہتمام بچوں کے لیے خصوصی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ایک نیا سلسلہ کارپردازان لائبریری نے یہ شروع کیا ہے کہ وہ شہر کے معزز حضرات اور سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو ہر ماہ مدعو کرتے ہیں اور اُن سے مفید مشورے حاصل کرتے ہیں اور اقبال لائبریری کے مختلف پروگراموں کا تعارف کراتے ہیں۔ اب تک جن مقتدر اور ممتاز شخصیتوں نے اقبال لائبریری کے بارے میں اپنی گراں قدر آراء اس لائبریری کو بہ نفسِ نفیس دیکھ کر تحریر کی ہیں۔ اُن میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

"میرے لیے لائبریریاں ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے قوم کے شعور کا اُفق روشن ہوتا ہے اور مطالعہ کا شوق نہاں خانے میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ "اقبال لائبریری" کے دیکھنے اور اس کے مخلص کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتب خانہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرے گا اور ایسی ترقی کرے گا کہ بھوپال کا دل بن جائے۔ دھڑکتا ہوا دل۔"

———— (پروفیسر احتشام حسین)

"آپ نے ایک شمع جلائی ہے۔ ضرورت ہے کہ چراغاں ہو۔ اگر جگہ بہتر ہو، آرام دہ کرسیاں، میزیں عمدہ قسم کی ہوں تو آپ اس نیک کام یعنی علم کی ترویج و ترقی کو زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آپ حکومت مدھیہ پردیش[1] سے کہیے کہ اس لائبریری کو گرانٹ دے۔ اربابِ زر سے کہیے کہ چندہ دیں۔ اس طرح لائبریری کو اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔"

———— (سجاد ظہیر)

"میں مجبور ہو گیا کہ وہ سب کچھ کہوں جو ایک بہترین کتاب گھر کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ آج میں لائبریری میں دوسری بار آیا ہوں۔ پہلے دن کی حاضری روا روی کی تھی۔ خدائے بزرگ کارپردازان کے حوصلے بڑھائے۔"

———— (حامد سعید خاں حامد)

"لائبریریاں عوام کو علم و ادب سے روشناس کرانے کا اور اُن کے ذوق کو بلند کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "اقبال لائبریری" اسی طرح رواں دواں کام جاری رکھے گی۔ میری دلی اور نیک دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔"

———— (عادل رشید)

"عوام کے لیے اچھے کتب خانوں کی بڑی ضرورت ہے جو اُنھیں اچھی کتابیں بہم پہنچائے۔ "اقبال لائبریری" کے کارکنان مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اُنھوں نے ایک اچھی لائبریری تیار کی۔"

———— (علی سردار جعفری)

"بھوپال کی تہذیبی سطح کو بلند کرنے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں اس لائبریری کا بھی نمایاں حصہ ہے جسے فراموش کرنا نہ مناسب ہے نہ آسان۔ اس کے لیے تمام کارکنان مبارک باد کے لائق ہیں۔"

———— (کیفی اعظمی)

---

[1] ۱۹۵۶ء میں بھوپال مدھیہ پردیش کا صدر مقام بن گیا۔ مدھیہ پردیش میں ریاست بھوپال کے علاوہ ریاست دھار اور ریاست گوالیار وغیرہ بھی شامل کر دی گئیں اور وسط ہند کی ان ریاستوں کے وفاق کو مدھیہ پردیش کا نام دیا گیا۔

"بھوپال اپنے مخصوص نظریات وافکار کا گہوارۂ علم وادب رہا ہے، جو مخلص اس گنجینۂ علوم کے کارکنانِ عظمت و بقا ہیں اُن کی جدوجہد کا یہ آغاز ہی دورِ مستقبلِ بلند کا خود ضامن ہے"

(انور صابری)

"اردو کی لائبریریاں یوں تو بہت کم نظر آتی ہیں۔ اب تو اور بھی کم ہیں۔ اس پس منظر میں مدھیہ پردیش کی راج دھانی میں یہ عمدہ لائبریری دیکھنے آیا تو مسرت ہوئی"

(حبیب تنویر)

"ملک و قوم کے لیے صالح ادب کی سخت ضرورت ہے۔ "اقبال لائبریری" اس سلسلے میں فالِ نیک ہے۔ عوام کی ادبی خدمت کرنے والوں کو میں اُن کی ادبی سرگرمیوں کے لیے مبارک باد دیتا ہوں"

(عرش ملسیانی)

"عوام کو آج مطالعہ کے لیے صالح ترقی پسند ادب کی ضرورت ہے اور "اقبال لائبریری" جو عرصے سے عوام کی ادبی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کرے گی"

(جاں نثار اختر)

"اقبال لائبریری" بھوپال کی شاندار علمی وادبی روایات کا ایک زندہ و متحرک ادارہ ہے۔ اس کے مخلص منتظمین اور پُرجوش کارکن اقبال کے فلسفہ اور اس کی تعلیمات سے سرشار ہوکر جس اعتماد، حوصلہ، اُمنگ اور لگن سے ایک معیاری لائبریری بنانے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں وہ اس کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہ لائبریری صرف ایک کتاب گھر ہی نہیں۔ ایک ثقافتی مرکز بھی ہے۔ اس ترقی پذیر ادارہ کی ضروریات کی تکمیل ایک قومی ضرورت ہے۔

سرِدست لائبریری کے پیشِ نظر ایک موزوں عمارت کی تعمیر، نادر مخطوطات، کتب کی فراہمی اور ایک معیاری مجلہ کا اجراء ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں عوام کی عملی دلچسپی اور حکومت کے حقیقی تعاون و سرپرستی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں"

(سید قمر الحسن چیف ایڈیٹر روزنامہ "ندیم" بھوپال)

"بھوپال کی ادبی تحریکات پر کچھ لکھتے وقت "اقبال لائبریری" کو نظرانداز کرنا مشکل ہے اور لائبریری نے بھوپال میں ادبی سرگرمی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے"

(کوثر چاندپوری)

"لائبریریوں کا قیام قوم وملت کی فلاح کے لیے اشد ضروری ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میں "اقبال لائبریری" آیا۔ یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ لائبریری کے منتظمین اور اراکین بڑی خوش اسلوبی سے اس ادارہ کو چلا رہے ہیں۔ میری دلی مبارکباد

قبول کیجیے"

(عبدالحمید انصاری ۔ مالک روزنامہ "انقلاب" بمبئی)

"مجھے یقین ہے کہ کوزہ سمندر میں بدل جائے گا کیونکہ "اقبال لائبریری" میرے لیے ایک نہایت حیرت انگیز اور مسرت افزا چیز ہے۔ اس لائبریری کے منتظمین میں خلوص کار کا وہ جذبہ نظر آتا ہے جس نے حیات جاوداں کی شمعیں روشن کی ہیں۔"

(افسر سیمابی)

"اقبال لائبریری" کے سلیقہ شعار کارکنوں کا آئینہ "اقبال لائبریری" ہے جس میں اُن کی عرق ریزی اور علم و فن سے محبت کا عکس جھلکتا ہے۔"

(مظفر شاہجہاں پوری)

"اقبال لائبریری" بھوپال کی قابل فخر اور عظیم لائبریری ہے جس کے ذریعہ تشنگانِ ادب برابر سیراب ہوتے رہے ہیں اور آج بھی بفضلہٖ یہ سلسلہ جاری ہے۔ خدا کرے ہمیشہ ہمیشہ یہ لائبریری اسی طرح علمی اور ادبی خدمت کرتی رہے۔"

(شعری بھوپالی)

"اقبال لائبریری" کے زیر اہتمام جیسا کہ قبل ازیں عرض کر چکا ہوں سالہا سال تک "یوم اقبال" وسیع پیمانہ پر منایا جاتا رہا جس کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد الیاس برنی وغیرہ، ایسے اکابر پیغامات ارسال کیا کرتے تھے جو "یوم اقبال" کے موقعوں پر سنائے جاتے تھے۔ جن بلند پایہ اور مقتدر شخصیتوں نے "یوم اقبال" کے سلسلے میں اقبال کی سیرت و شخصیت، ان کے افکار و نظریات اور اُن کی شاعرانہ عظمت کو تحریر و تقریر کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا اُن میں علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر سید احتشام حسین، مولوی محمد ابراہیم، محمد احمد سبزواری، حکیم سید ضیاء الحسن، ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، سردار جعفری، کوثر چاند پوری، کامتا پرشاد، لالہ ملک راج، سورج کلا سرور، حامد حسین، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی، ایم۔ عرفان، مولانا وجد الحسینی، آفاق احمد، نہرہ جمال، تربینی سرن شاد، ابراہیم یوسف، عبدالحلیم انصاری، حبیب فخری، گوہر جلالی، مقصود عمرانی، آصف شاہمیری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۲ جون ۱۹۵۸ء کو "یوم اقبال" کے موقع پر منتظمین نے جو پوسٹر شایع کیا تھا اس کے مطالعہ سے بھوپالیوں کی اقبال سے عقیدت و محبت کا ناقابلِ تردید ثبوت ملتا ہے۔ اس پوسٹر سے جہاں ایک طرف اقبال کے گہرے اور مثبت اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ تقسیم ہند کے باوجود اہل بھوپال کے دلوں میں اقبال سے والہانہ محبت کی شمعیں اُسی تابانی کے ساتھ روشن رہیں۔ وہ اپنے محبوب شاعر سے کل کی طرح آج بھی اپنا رشتہ قایم رکھے ہوئے ہیں۔ پوسٹر کا متن حسب ذیل ہے:۔

"زندہ قومیں اپنے نامور اسلاف کی یاد تازہ کر کے موجودہ نسلوں کو مردہ پرستی کا نہیں زندگی کا درس دیتی ہیں۔
علامہ اقبال گو اس عالم آب و گِل میں موجود نہیں مگر ان کی شاعری اور اُن کا پیغام

آج بھی زندہ اور پائندہ ہے اور یہ اُن کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت ہی ہے کہ ہر سال ہند اور پاکستان میں جابجا اس عظیم انسان کو مختلف صورتوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا تھا؟ بچھڑی ہوئی انسانیت کے لیے "قُم" کی جاں بخش آواز۔! پست ہمتی اور بے عملی کے لیے حوصلہ افزا للکار۔ تنگ نظری اور تعصب کو وسیع المشربی اور فراخ حوصلگی کا درس۔ خود فراموشی اور خود فریبی کو خودی اور خود آگاہی کی تعلیم۔ انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کردینے کی تلقین۔ غرضکہ ہماری ہیئتِ اجتماعی کو فرد یا جمعیت کی حیثیت سے جتنے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان سب کا حل اقبال کے کلام اور پیغام میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی پیغام سے ایک نئی زندگی اور اسی کلام سے ایک نئی تازگی حاصل کرنے کے لیے ہم "یوم اقبال" منا رہے ہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس "یوم اقبال" میں مُردہ پرستی کے رسوم ادا نہیں کیے جائیں گے بلکہ مُردوں کو زندہ رہنے کا چلن سکھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ دن اُس شخصیت کی یاد میں منایا جارہا ہے جس نے مُردہ قوموں کی رگوں میں زندگی کا گرم خون دوڑایا ہے[۱]"

اقبال کی بھوپال سے وابستگی اور بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات کا ایک اور دستاویزی ثبوت ہمیں اُس کتاب سے ملتا ہے جو "تصورات اقبال" کے نام سے اگست ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد دکن سے نفیس اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مصنف بھوپال ہی کا ایک جواں سال اور قابلِ فخر ادیب و نقاد۔ شاغل فخری تھا جس نے اقبال کے سانحۂ ارتحال کے فوراً بعد اسے لکھنا شروع کیا اور دو ماہ کی شبانہ روز محنت شاقہ کے بعد مسودہ مکمل کرلیا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اقبال کا یہ پرستار اپنے مسودہ کو کتابی صورت میں نہ دیکھ سکا۔ بلکہ یہ کتاب اُس کی جواں مرگی کے بعد بھوپال ہی کے ایک اور جواں حوصلہ ادیب و شاعر عمران انصاری کی سعی و کوشش سے طبع ہوسکی۔ عمران انصاری کی شاغل فخری سے قُربت و قرابت تھی۔ چنانچہ جب یہ مسودہ اُن کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اسے اشاعت کے قابل بنایا اور نفیس اکیڈمی کے صاحب ذوق مالک محمد اقبال سلیم گاہندری نے اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ یہ کتاب اب تقریباً نایاب ہے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد مجھے یہ کتاب دستیاب ہوسکی، اور جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو اُس کے ورق ورق سے مجھے شاغل فخری کی اقبال شناسی، اس کی علمیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیت کار کا ثبوت ملا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اقبال کے فکر و فلسفہ کا بڑی حد تک احاطہ کرتی ہے اور جسے ہم بلاخوفِ تردید بھوپال کی جانب سے اقبال کے حضور پہلا قابلِ فخر نذرانۂ عقیدت کہہ سکتے ہیں۔

"شاغل فخری ہندوستان کے مشہور صحافی، مقالہ نگار اور افسانہ نگار تھے۔ برسوں "مدینہ" بجنور میں کام کیا ہے۔ بچوں کے رسالہ "غنچہ" بجنور کے ایڈیٹر بھی رہے۔ علمی ذوق کے مالک تھے۔ سب سے بڑی یادگار "تصورات اقبال" ہے۔ جوانی میں انتقال کرگئے[۲]"

---

۱ علامہ اقبال بھوپال میں۔ صفحہ ۶۶۔۶۷ ۲ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ صفحہ ۵۴

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کے اس مختصر سے تعارف سے شاغل فخری کی عام زندگی، اُس کی غربت و تنگ دستی، اُس کے ماحول کی گھٹن، اُس کے والد کی مخبوط الحواسی، اُس کے ذوقِ علم و کتب بینی، اُس کی بے پناہ ذہانت اور صلاحیت کا رکا قطعی اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ "تصورات اقبال" میں عمران انصاری نے "دو دو باتیں" (صفحات ۱ تا ۱۴) میں شاغل فخری اور اُس کی زندگی کے بارے میں اپنے طور پر اور شاغل فخری کی ڈائری کے اقتباسات پیش کر کے اُس کی شخصیت، اُس کی خودداری، اُس کی حوصلہ مندی، اُس کے ذوقِ علم اور اُس کے خانگی الم انگیز حالات کی جو تصویریں پیش کی ہیں اُنھیں پڑھ کر انسان بے اختیار آب دیدہ ہو جاتا ہے۔ فخری کی ڈائری کے اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے انتہائی صبر آزما حالات میں زندگی بسر کی — ۵۰ روپے ماہانہ پر مزدوری کر کے اپنے کنبہ کا خرچ چلایا۔ والد کی دیوانگی، دو جوان بہنوں کی موجودگی گھر کی خستہ حالی کے باوجود اُس نے منشی فاضل کا امتحان دیا اور چند در چند پریشانیوں، محرومیوں اور ناکامیوں سے کبھی دل برداشتہ نہ ہوا بلکہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا اور اُس کی یہی حوصلہ مندی تھی کہ بھوپال کے مایۂ ناز فرزند ابوسعید بزمی ایڈیٹر "مدینہ" بجنور کی جب اُس پر نظر پڑی تو انھوں نے بجنور بلا کر اُسے رسالہ "غنچہ" کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ "مدینہ" ایسے بڑے اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا اور اُس کی اعلیٰ صلاحیتیں دنیا کے سامنے آگئیں۔ وہ کتنا بڑا اقبال شناس تھا اس کے بارے میں عمران انصاری کی زبانی سنیے :-

> "فخری تہذیب جدید کی بہترین پیداوار اور تہذیب جدید کا بہترین نقاد تھا — وہ تہذیب اسلامی کا زبردست حامی اور اسلام و قرآن کا ایسا والہ و شیدا تھا کہ یہی باعث ہے جو اس کی نگاہ صرف اقبال پر آ کر ٹھہر جاتی تھی اور اس کے کلام کو سُن سُن کر جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ جس طرح کہ اُس کی کتابیں رٹی اور ازبر کی جاتی ہیں اس طرح اُس نے اقبال کے ایک ایک مصرعہ کو سمجھا اور بوجھا تھا۔ وہ جس طرح حافظِ قرآن تھا اسی طرح حافظ اقبال بھی [1]"

وہ لگاتار کام کرنے کا بچپن سے عادی تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی صحت پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اُس کے پھیپھڑے متاثر ہیں۔ اس تشخیص کے باوجود فخری نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو استعمال کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ زیادہ دنوں نہ جی سکا۔ اور عین عالمِ جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بلا شبہ وہ اقبال کے کلام کا حافظ تھا۔ "تصورات اقبال" میں اُس نے اقبال کی فکر کے تقریباً ہر گوشہ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ بھوپال کی محدود فضا میں رہ کر اُس نے اپنے علم و مطالعہ اور قوتِ مشاہدہ میں اتنی گیرائی اور گہرائی کیونکر پیدا کر لی — !

محمد اقبال سلیم گاہندری "حرف آغاز" میں لکھتے ہیں :-

> "تصورات اقبال" مرحوم شاغل فخری کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ شاغل ایک مدت تک مشہور اخبار "مدینہ" بجنور کی ادارت کا کام کرتے رہے اور ملک کے بہترین لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ افسوس کہ اُن کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اُن کے انتقال سے ہم نے ایک ایسے عالم و ادیب کو کھو یا جس کی یاد بہت دنوں

---

[1] تصورات اقبال۔ صفحہ ۲

تک باقی رہے گی۔

یہ مسودات ہمیں مرحوم شاغل کے قریب ترین عزیز اور اپنے کرم فرما جناب حافظ عمران انصاری کی عنایتوں سے ملے۔ عمران صاحب نے ان مسودات کو بڑی محنت سے مرتب فرمایا اور طباعت و اشاعت کے قابل بنایا ہے۔ ہم اُن کی اس محنت و شوق کے لیے صمیم قلب سے شکر گزار ہیں۔ اگر اُن میں یہ ذوق نہ ہوتا اور وہ یہ سارا کام اپنے ذمہ نہ لیتے تو شاید یہ کتاب منصۂ وجود پر نہ آسکتی[۱]۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"تصورات اقبال" میں شاغل نے اپنے مطالعۂ اقبال کا ماحصل مختلف ابواب میں تقسیم و ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اس میں اقبال کے تصورات و افکار کی دلنشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے اور اقبال کے کلام سے ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف مسائل انفرادی و اجتماعی پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کیا خیالات تھے اور وہ خیالات کس سرچشمۂ ہدایت سے سیرابی کا نتیجہ تھے۔

شاغل مرحوم کی تحریر صاف و واضح اور عالمانہ انداز کی مرتب و مربوط تحریر ہوتی ہے جس میں ایک قسم کا شکوہ اور وقار بھی پایا جاتا ہے۔ مسائل کی ترتیب عموماً منطقی انداز میں کرتے ہیں اور نتائج کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں[۲]۔"

آیئے اب یہ بھی دیکھیے کہ خود اس جواں مرگ ادیب نے اقبال کی موت کا کیا اثر لیا اور اُس کی نظر میں اقبال کا کیا مقام تھا۔ یہ "تصورات اقبال" کا پیش لفظ ہے جو شاغل نے اپنی زندگی میں ہی لکھا تھا۔ اُس کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی موت نے اُسے کس طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اور وہ بے اختیار قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے بیٹھ گیا اور صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں یہ منفرد و یادگار تصنیف معرضِ وجود میں آگئی:-

"بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

گو اقبال کا سانحۂ ارتحال تمام دنیا کے لیے بالعموم اور عالمِ اسلامی کے لیے بالخصوص ایک زبردست حادثہ ہے جو صدیوں نہیں بھلایا جا سکتا، لیکن اس کی "خوشنودیٔ روح" کے لیے اب سب سے اہم فاتحہ خوانی یہی ہے کہ اس کے پیغام کو اوراقِ کتب سے نکال کر دلوں کے صحائف میں جگہ دی جائے۔ اس کو بیش از بیش سمجھا جائے اور دنیا کو بار بار سمجھایا جائے کہ ترجمانِ حقیقت اپنی زندگی کی آخری سانس تک کس زندہ و طاقت ور حقیقت کو بے نقاب کرتا رہا ہے تاکہ جس مقصد کے لیے اُس نے جگر کاوی کی تھی، وہ حاصل ہو اور جو راستہ اُس نے تیار کیا تھا اُس پر قدم پڑنے لگیں۔

---

[۱] تصوراتِ اقبال۔ صفحہ ۵

[۲] تصوراتِ اقبال۔ صفحہ ۶

اقبال کو سمجھنے سمجھانے کے لیے فکر عمیق اور فرصت طویل کی ضرورت ہے کیونکہ فلسفۂ قدیم و جدید پر پورا پورا عبور رکھنے کے ساتھ خود بھی وہ ایک زبردست مفکر ہے اور برسوں غور و فکر کے بعد اُس نے حیات انسانی کے لیے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ تمام تر کلام اللہ کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کے فلسفیانہ نکات جو وجدان و شعریت کی زبان میں ادا ہوئے، وہ سب قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشریح ہیں۔ اس لیے اگر اقبال کو صرف فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ معما بن جاتا ہے۔ اس کے فلسفہ کی پیچیدگیاں سلجھانے کے لیے قرآنی بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ حیاتِ انسانی کو اس بلند ترین نصب العین سے واقف کرنا چاہتا ہے جو قرآن نے متعین کیا ہے اور ہر نئے اسلوب میں وہی کچھ کہتا ہے جو قرآن نے کہا ہے۔

اقبال کے مہماتِ سخن سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلے اس کی روشن فکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ "شعر و حکمت" کے باب میں اس کے اندازِ تفکر پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس مقام پر بھی چند الفاظ بطور تعارف عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

اقبال کے تخیلات کا مرکزی نقطہ "زندگی" ہے اور اس کا تحفظ و ارتقا اس کے تصورات کا نصب العین ہے۔ وہ موجودات کے حقایق سے آنکھیں نہیں بند کر لیتا بلکہ اُن کو بغور دیکھتا اور زندگی کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا فلسفہ، عمل کا فلسفہ ہے اور اس کا یہ علم یا فلسفہ ادب خوردۂ دل ہے اور دل کو وہ عشق و وجدان کے زیر فرمان رکھتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم ہمیشہ عمل کا دست پرور رہا ہے۔ حیات کی پیچیدگیاں محض عقل سے نہیں سلجھائی جا سکتیں عقل کی جولانیوں کے لیے ایک خاص حد مقرر ہے جس سے آگے بڑھنے کے لیے اس کو ایک دوسری زبردست و برتر قوت کی رہنمائی میں چلنا پڑتا ہے جس کو اقبال نے عشق و وجدان سے تعبیر کیا ہے۔ عقل کی نارسائی اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے جذبۂ شعریت کا ہی وہ آج تک مکمل تجزیہ نہ کر سکی۔ کبھی تو اس کی ہمہ گیری اور زبردست اثراندازی دیکھ کر اس کو مفید بتاتی ہے اور پھر جب اس کے حدود کا احاطہ نہیں کر سکتی تو لغو و لایعنی کہہ کر دامن چھڑا لیتی ہے۔ یہی بے چارگی اس کو روح کے معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اس طرح مذہب کا تعلق بھی عقل سے زیادہ وجدان سے ہے۔ اگر اس راستہ میں صرف عقل کی مشعل جلائی جائے تو تاریکی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔ مجرد عقل، شک و وسوسہ کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے اور عشق و وجدان، یقین و استقامت کی ٹھوس چٹان پر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیفیاتِ قلب کو سمجھنے کے لیے دل ہی کی روشنی میں آنا پڑتا ہے اور ان کے اظہار کے لیے دل ہی کی زبان درکار ہوتی ہے۔ اس لیے عقل اُسی وقت کامل ہوتی ہے اور نظارہ کی پریشانی اُسی وقت دور ہوتی ہے کہ نظروں کی ہمراز ہو۔ یہی تفکر اقبال کا

بنیادی نقطہ ہے۔
اقبال پر لکھنے کا خیال ایک عرصہ سے دل میں تھا جو امروز و فردا پر ٹل رہا تھا کہ اُس کے سانحۂ ارتحال کی خبر میرے اعصاب وحسیات پر ایک برقی تازیانہ بن کر لگی اور ایک ناقابل ضبط و شدید ترین اندرونی تقاضہ سے بیتاب ہو کر میں اس طرف متوجہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد ان صفحات کو پورا کیا[1]۔"

اس کے فوراً بعد نیا باب "اشک خونیں" ہے۔ ملاحظہ ہو:

"حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں (پیام مشرق)

۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کیسی المناک صبح تھی کہ ایک طرف آسمان پر دنیا کا سورج بلند ہو رہا تھا اور دوسری طرف زمین کے اندر مشرق کی عظمت وسعادت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ دنیا کے لیے یہ بہت ہی جانکاہ حادثہ تھا۔ وہ چیخ اُٹھی اور اُس کے صبر وضبط کا کلیجہ پھٹ گیا۔ حسرت کی آنکھ یہ دیکھ کر خوں چکاں ہوگئی کہ عشق کا وہ شعلہ جو صدیوں کی افسردگی کے بعد اقبال کی آہ سحرگاہی و سوز نفس سے بھڑک اُٹھا تھا ــــ پھر سیاہ پوش ہوگیا۔ جبریل کو پرفشانی سکھانے والا طائر لاہوتی عالم آب و گِل سے منہ موڑ کر افلاک کی وسعتوں میں گم ہوگیا اور وہ نئے نوازِ حیات دیکھتے ہی دیکھتے فردوسی حوروں کا وجدانی نغمہ بن گیا۔
وہ لب ہائے اُلوہیت کا ایک لطیف تبسم تھا جس کا کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوبا ہوا نُطق شیریں اس چمن کی آبیاری کر رہا تھا۔ وہ حیاتِ انسانی کا ایک پیغامبر تھا جس کے سینہ کا مدوجزر مشرقی روحانیت کے لیے درس ابدیت اور مغربی مادیت کے لیے برق خاطف تھا۔
وہ اسلامیان عالم کا حسان ثانی تھا جو انسانی غیرت وخودی کے لیے غفلت شکن تازیانہ بنا۔ اب کون ہے جو ہم کو افلاک کی سیر کرائے؟ــــ اب کس کے منہ سے ہم ستاروں کا پیغام اور نوریوں کے گیت سُنیں؟ــــ آہ! اب کس کی زبان میں وہ آتش بیانی ہے جو عرش نشیں کے حضور میں ہم خاکیوں کی طرف سے سپاس نامہ پیش کر کے جواب حاصل کر سکے؟؟ــــ
حُسن ہمیشہ اُس کے لیے تڑپے گا
اور
عشق ہمیشہ سوگوار رہے گا ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے (پیام مشرق)

---

[1] تصورات اقبال۔ صفحہ ۹ تا ۱۱

ماتم اس کا نہیں کہ اقبال کی رحلت نے شاعری کا دروازہ بند کر دیا۔ بہت سے نغز گو اور شیوہ بیان شاعر موجود ہیں اور بہت سے میر و مومن اور غالب و حالی مستقبل کے گہوارے میں پرورش پا رہے ہیں۔ دل کی خوں چکانی اس لیے ہے کہ جو صدائے ربانی آج خاموش ہوئی ہے وہ مدتوں نہیں بلند ہوگی ۔ کہ اس وقت زمانے کا رجحان دوسرا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (بانگِ درا)

اقبال — ہم سے نہیں چھنا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہی اپنے آپ سے چھن گئے۔ وہ ہم سے ہمارا تعارف کرا رہا تھا، تا کہ ہم اپنی طاقتوں سے واقف ہو کر ارض و سما پر چھا جائیں اور کائنات کی پہنائیاں ہماری جولانیوں کے لیے تنگ ہوں۔ دیکھیے کن پُر سوز الفاظ میں ہمارے لیے خدا سے عزم و استقامت کی دولت طلب کرتا ہے ؎

وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لا تذر" میں — دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے — عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے

حسن و عشق کی داستانیں تو ابھی بہت کچھ بیان ہوں گی لیکن یہ آتشیں نعرے اب کون بلند کر سکے گا ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

(بالِ جبریل)

در دشتِ جنونِ من، جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ

(زبورِ عجم)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے[1]"

(بالِ جبریل)

اس باب کے بعد دیگر ابواب جس ترتیب سے لکھے گئے ہیں اور جن جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اُن کی تفصیل یہ ہے :۔

اسلام و مومن ——— صفحہ ۱۵ تا ۲۸
روحانیت و مادّیت ——— " ۲۹ تا ۳۳
دین و سیاست ——— " ۳۴ تا ۳۹

---

[1] تصوراتِ اقبال — صفحہ ۱۲ تا ۱۴

ملوکیت واشتراکیت ـــــــــ ۴۰ تا ۷۷
قومیت و بین الاقوامیت ـــــــــ ۷۸ تا ۱۱۴
شعر و حکمت ـــــــــ ۱۱۵ تا ۱۶۳
موت و حیات ـــــــــ ۱۶۴ تا ۱۸۷
خودی ـــــــــ ۱۸۸ تا ۲۱۴
بے خودی ـــــــــ ۲۱۵ تا ۲۵۰
خلاصۂ کلام ـــــــــ ۲۵۱

اور آخر میں "گل ہائے عقیدت" ہیں جو صفحہ ۲۵۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۵۴ پر ان اشعار کے ساتھ ختم ہوتے ہیں۔ ؎

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بانگِ درا)

مختلف ابواب میں شاغل نے اپنے فکر و قلم کے جوہر خوب خوب دکھائے ہیں اور شاعرِ مشرق کے اشعار سے ہی نہیں بلکہ قرآن مجید اور احادیث کے جابجا حوالے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ:

"اقبال نہ محض شاعر تھا۔ نہ محض فلسفی۔ دراصل وہ ایک حقیقت کبریٰ کا پیغام بر تھا اور حسن کا اداشناس عاشق۔ اس کی شیریں سخنی و آتش بیانی، اس کی فکر و نظر کی مستی ہے جس سے اُس کا پیغام دماغوں سے گزرتا ہوا۔ دلوں کی گہرائی میں اُتر جاتا ہے۔ محض شاعری یا محض فلسفہ خود اس نے بھی کبھی اپنا سرمایۂ افتخار نہیں جانا۔ اس کا مطمحِ نظر شعر گوئی و فلسفہ سنجی نہیں۔ بلکہ "تپش اندازی" تھا۔"

بھوپال کے ہونہار اور صاحب بصیرت نوجوان ادیب شاغل فخری مرحوم نے "تصوراتِ اقبال" لکھ کر۔ صرف اقبالیات کے مطالعہ میں ہی اضافہ نہیں کیا۔ بھوپال کی ادبی تاریخ میں اولیت کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس کتاب کی توضیح و تشریح کے دوران ایک جگہ شاغل مرحوم نے اقبال کے تصور پاکستان کو بظاہر ناممکن العمل قرار دیا تھا۔ کاش وہ زندہ ہوتا تو اپنے نظریہ کی اصلاح کر لیتا اور پاکستان ایسی ـــــــ اسلامی مملکت کو اپنی آنکھوں سے پھولتا پھلتا دیکھ کر یقیناً خوش ہوتا۔ کیونکہ وہ نہایت روشن خیال اور ہوش مند ادیب تھا۔ اور خود اصلاحی کا قدرت نے اُسے خاص جوہر عطا کیا تھا۔ ویسے بھوپال کا یہ تنہا نوجوان ہے جو صحیح معنوں میں اقبال کا سچا عاشق تھا۔ اور مرتے مرتے بھی اقبال کے سلسلے میں اُس نے جو کلمات ادا کیے وہ اُس کے سچے عشق اور جذبۂ صادق پر دلالت کرتے ہیں۔ عمران انصاری لکھتے ہیں:۔

"میرے ہی مواجہ میں اقبال پر ایک سیر حاصل گفتگو اُس نے کی اور اقبال کی صحیح صحیح منزلت کے بارے میں جس اعتماد و یقین کے ساتھ وہ اپنے عقاید کا اظہار کر رہا تھا اُس وقت میری آنکھوں میں وہ تصویر بسی ہوئی ہے کہ کھانسی کو پوری طرح روک دونوں

"گھٹنوں کو دونوں بازوؤں میں گھٹنے کے بعد وہ تن کر بیٹھ گیا تھا اور سیاہ حلقوں میں بے نور ہو جانے والی آنکھوں میں اقبال کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ اللہ اکبر۔ رہے نام اللہ کا[1]"

شاغل مخزی کے علاوہ بھوپال کی جن دیگر ممتاز شخصیتوں نے اقبال کو موضوعِ بحث بنایا یا اُن کے فکر و فن پر کام کیا۔ اُن میں رضیہ فرحت بانو، محمد امین زبیری، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور عبدالقوی دسنوی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا آیندہ صفحات میں احاطہ کیا گیا ہے۔ صرف رضیہ فرحت بانو کی مرتبہ کتاب "خطبات اقبال" مجھے دستیاب نہ ہو سکی لیکن یہ کتاب "اقبال لائبریری" بھوپال میں موجود ہے۔ رضیہ فرحت بانو۔ بھوپال کی ممتاز ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں۔ "تصورات اقبال" کی طرح ایک اور اہم کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ہے جسے محمد احمد خاں ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ نے تالیف فرمایا ہے۔ یہ کتاب کاروان ادب۔ کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۲ء میں شایع ہوئی تھی۔

بھوپال کے بلند پایہ اور شہرت یافتہ ادیب، انشا پرداز، محقق اور مورخ۔ محمد امین زبیری مارہروی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے سے نواب حمیداللہ خاں کے دورِ حکومت تک آپ نے بھوپال میں رہ کر جو گراں مایہ علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے اُن کی ایک طویل فہرست ہے ـــــ ماہنامہ "ظل السلطان" بھوپال کی ادارت کے زمانے میں اقبال سے آپ کی خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ "مہتمم تاریخ" کی حیثیت سے آپ کا نام بھوپال کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ کراچی آ گئے اور یہیں انتقال فرمایا۔ میرے عمِ محترم پروفیسر سید نواب علی سے محمد امین زبیری اکثر ملاقات کے لیے تشریف لاتے تھے۔ یہ ۱۹۵۵ء۔۵۶ء کا ذکر ہے۔ آپ نے "افکار" میں اشاعت کے لیے مجھے اپنا ایک معرکہ آرا مضمون "تصور پاکستان" بھی عطا کیا تھا جو خود میری بے سروسامانی کے سبب مسودات میں کہیں گم ہو گیا۔ جب ۱۹۵۹ء میں میں نے اپنی اس کتاب کا کام شروع کیا تو مجھے یہ علم ہوا کہ محمد امین زبیری نے اقبال پر ایک کتاب بعنوان "خدوخالِ اقبال" تحریر کی ہے جو شایع نہیں ہو سکی۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ محمد امین زبیری نے "خدوخال اقبال" کا مسودہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو دیکھنے کے لیے دیا تھا اور یہ خواہش کی تھی کہ اسے انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیرِ اہتمام شایع کر دیا جائے۔ کسی وجہ سے انجمن اس کتاب کو شایع نہ کر سکی۔ عجب اتفاق ہے کہ میں اپنی اس کتاب کے آخری ابواب مکمل کر رہا تھا کہ مجھے سید انیس شاہ جیلانی کی مرتبہ کتاب "نوازش نامے" تبصرے کے لیے موصول ہوئی اور یہ دیکھ کر میری

---

[1] تصورات اقبال۔ صفحہ ۱۴۱

[2] بعد کی تحقیق سے "اقبال کا سیاسی کارنامہ" محمد احمد خاں سابق چیف جسٹس بھوپال کی ثابت نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی۔

حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ جس مسودہ کی تلاش میں مَیں عرصہ تک سرگرداں رہا اس کی تفصیلات خود محمد امین زبیری کے اُن خطوط میں مجھے مل گئیں جو انھوں نے سید انیس شاہ جیلانی کو ۱۹۵۶ء میں تحریر کیے تھے۔ انیس شاہ جیلانی نے ان خطوط سے قبل جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے۔ اُس کے مطالعے سے "خدوخال اقبال" کے بارے میں کئی ایسی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے اردو دنیا اور اقبال شناس آج تک لاعلم تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"مرحوم (محمد امین زبیری) سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس مجموعہ میں شریک تقریباً سبھی خطوں میں ذکر خیر اُن کی تصنیف "خدوخال اقبال" کا ہے۔ میں یہ مسودہ اُن سے حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہا کہ میری مالی حالت چنداں قابلِ رشک نہ تھی۔ والد محترم کو میرا "پبلشر" بن کر اُن کا روپیہ ضائع کرنا گوارا نہ ہوا۔ حالانکہ یہ کتاب کاروباری لحاظ سے بھی خاصی کامیاب رہتی جیسا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے بھی رحیم یار خاں (بہاولپور ڈویژن) میں والد صاحب کے پوچھنے پر بتایا تھا اور یہی مشورہ جناب سید رئیس احمد جعفری مدظلہٗ (مرحوم) نے دیا تھا کہ اشاعت کا اہتمام کر ڈالنا چاہیے۔ نفع نہ سہی لاگت تو نکل ہی آئے گی۔ پچھلے دنوں مرحوم کے ایک قریبی عزیز سے جن کے پاس وہ مسودہ محفوظ ہے، حصول مسودہ کی تحریک کی گئی اور میں گھر پھونک تماشہ دیکھنے پر آمادہ ہوا بھی تو وہ کا فرمسلمان ہوگیا اور یہ لکھ کر پیچھا چھڑا لیا کہ فی الحال وہ اس تصنیف کو منظرِ عام پر لانے کے حق میں نہیں ہیں۔ زبیری مرحوم کی روح یقیناً اس انکار پر تڑپ اُٹھی ہوگی۔ یہی وہ زبیری ہیں جن کے طفیل اردو ادب میں مکاتیب شبلی بنام عطیہ کا گراں بہا اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ شبلی کے "انسان" ہونے کا ثبوت بھی ملا۔

خدا کرے "خدوخال اقبال" کو منظرِ عام پر لانے کی سعادت مجھے حاصل ہو لیکن یہ میری ہی آرزو تو ہے اور اس کا شرمندۂ تعبیر ہونا معلوم [1]۔"

اس وضاحت کے بعد محمد امین زبیری مرحوم کے وہ خطوط شامل ہیں جن کے مطالعے سے مجوزہ کتاب کے بارے میں نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ جستہ جستہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

(۱)

" اک ۔ اک اسکول کلفٹن ۔ (کراچی)

۷/ دسمبر ــــ

مکرم محترم ۔ تسلیم

آپ کا محبت نامہ کل موصول ہوا۔ خطوط شبلی سے اغلباً کتاب شبلی کی رنگین زندگی مراد ہے۔

آپ ذکر شبلی ملاحظہ فرمایئے جو حیات شبلی پر تنقید ہے۔ اس سے اصل حالت معلوم

---

[1] نوازش نامے۔ صفحہ ۵۷ ۔ ۵۸

ہوتی ہے کہ کیسی تدلیس و تلبیس ہے۔
یہی حالت علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کی ہے۔ میں نے ان پر تنقید لکھی ہے ــــ خدو خال اقبال تاریخی نام ہے۔ لیکن اپنی ضعیف العمری اور علالت کی وجہ سے نظرِ ثانی نہیں کر سکا۔
میری عمر ۸۶ سال میں ایک مہینہ کم ہے۔ کوئی متصور یہ نہیں اور تصویر کا کیا ہو گا۔ اب تو سکون کو دل چاہتا ہے۔
'خدو خال اقبال' بڑی معرکہ آرا کتاب ہو گی۔ پاکستان یا تقسیم ہند کا تو دور کا واسطہ بھی نہیں ــ یہ صرف بزم اقبال وغیرہ کا پروپیگنڈا ہے۔
معاف فرمائیے میرے متعلق آپ نے حسنِ ظن سے کام لیا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

زیادہ شوقِ ملاقات

خاکسار

محمد امین زبیری ۔ ۱۹۵۷ء

(۲)

ــــــ علامہ اقبال پر میری تنقید شاعرانہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کی سیرت پر جو کتابیں شایع ہوئی ہیں اُن پر اُنہی خطوط سے تنقید ہے۔
..... اگر آپ تیار ہوں تو میں مسودہ دے دوں گا۔ اس کتاب کے متعلق بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے۔
میں بیمار، ۸۶ سال کی عمر میرے لیے سفر ممکن نہیں آپ خود تکلیف فرمائیں۔ اس کا تاریخی نام "خدو خال اقبال" ہے۔ عطیہ بیگم۔ میکلوڈ روڈ۔ ایوان رفعت پتہ ہے۔ اپنی خاص عنایت فرمائیں۔

خادم ــ محمد امین زبیری

12/13 اک اک اسکول۔ کراچی۔ مہرڈاک خانہ (۱۳ر دسمبر ۱۹۵۷ء)

(۳)

۲۵ ر دسمبر ۱۹۵۷ء

ــــــ کتاب کا نام میں نے "خدو خال اقبال" (۱۳۷۵ھ) تجویز کیا ہے۔ مسودہ دیکھے بغیر آپ قیمت کا اندازہ صحیح نہیں کر سکتے .... زیادہ انسب ہو گا کہ آپ ہی لکھیں کہ کیا ادا کر سکتے ہیں۔ کتاب مطبوعہ کے ۲۰۰ صفحات ہو جائیں گے۔ میں نے تمام کتاب میں حوالوں سے ہی کام لیا ہے ــ .... ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی مسودہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مخلص

محمد امین زبیری

(۴)

۳ر جنوری ۱۹۵۶ء

——— یہ کتاب بڑے معرکہ کی ہے۔ آج کل اقبال کو انبیائے کرام کی صف میں اُن کے سیرت نگاروں نے شامل کر دیا ہے۔ . . . . . جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے۔ . . . . . میری کتاب دراصل اُن کی سوانح عمری پر کی تنقید ہے۔ واقعات اور اُنہی کے خطوط سے . . . . مجملاً چند عنوان پیش ہیں:۔

تمہید۔ شاعری کی تعریف۔ سیرت نگاروں پر تنقید۔ نقوش سیرت۔ ابتدائی حالات متاہل زندگی۔ اقتباس خطوط بنام عطیہ بیگم۔ غیر ملکی لباس سے نفرت۔ شان فقر وغیرہ ایک نیشنل فنڈ۔ بلند ارادے۔ عملی زندگی۔ خطاب۔ جنگ عظیم کے متعلق نظمیں۔ علی گڑھ تحریک۔ مدحت طرازی۔ خالص تعلقات۔ اقبال اور وزیر اعظم سرکشن پرشاد۔ نظام سے ملاقات۔ شاہانِ افغانستان سے خاص تعلق۔ سر راس مسعود سے درخواستیں اور وظیفۂ بھوپال۔ سیاسیات۔ عام سیاسی مصروفیات۔ تصور پاکستان کا تاریکی منظر۔ چودھری رحمت علی کے ایک رفیق کا بیان۔ چند تعجبات۔ انتقال۔

یہ فہرست بہت مجمل ہے۔ تاہم نصف اندازہ ہوتا ہے۔

مخلص۔ محمد امین زبیری

(۵)

۸ر جنوری ۱۹۵۶ء

——— میرا شغل تصنیف و تالیف پیشہ ورانہ نہیں۔ میں ۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۰ء فردوس آشیاں بیگم صاحبہ بھوپال کا لٹریری اسسٹنٹ اور ایک بڑے دفتر کا انچارج تھا جس کا تعلق مصنفین وغیرہ سے بھی رہتا تھا۔ دفتر میں ہمیشہ تین چار ادیب و مصنف میرے ماتحت تھے۔ خدا کا شکر اور بھوپال کا احسان ہے کہ مجھے میرے گزارے کے قابل پنشن ملتی ہے البتہ مہاجرت نے گزارا گراں تر بنا دیا ہے۔ مہاجرت سے پہلے میری جس قدر کتابیں شائع ہوئیں وہ میرے شوق کا نتیجہ تھیں اور صرف یہ خیال رہتا تھا کہ گرہ سے خرچ نہ ہو اور نفع اتنا ملے کہ اپنے دوستوں کو اور لائبریریوں کو ہدیہ دے سکوں ———!

. . . . . میں نے آپ کے خط کے ایک فقرہ پر کہ "کم از کم دنیا کو تصویر کا دوسرا رُخ تو نظر آجائے گا"۔ بے ساختہ خیال کیا کہ:۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

---

۱ سہو کتابت ہے۔ پس منظر ہونا چاہیے۔

خدا کرے ہمارے نوجوان ایسے ہی خیال کے ہو جائیں تو یہ ملمع کاریاں نہ ہو سکیں۔
اب معاملہ معاملہ کی طرح کیجیے!

مخلص محمد امین زبیری لے"

لیکن یہ معاملہ کسی وجہ سے طے نہ ہو سکا اور جیسا کہ سید انیس شاہ جیلانی نے وضاحتی نوٹ میں بھی لکھا ہے۔ وفات کے بعد انھوں نے کتاب کے مسودہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی سعی وجہد کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور اس طرح یہ مسودہ آج تک شائع نہ ہو سکا۔

"اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا آٹھواں باب۔ دورِ پنجم کی تخلیقات پر مشتمل ہے جس میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۹ء تک کے ادیبوں، شاعروں، انشا پردازوں اور اُن مشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی عنوان بھوپال سے وابستہ رہے — یہ نواب حمید اللہ خاں۔ آخری فرماں روائے بھوپال کا زمانہ ہے جن کے دورِ حکومت میں ریاست بھوپال نے صنعتی ترقی اور آئینی اصلاحات کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے میدانوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں "مشاہیر علم و ادب کا تعلق بھوپال سے" کی ذیلی سرخی کے تحت سب سے پہلے راس مسعود کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد صفحہ ۶۲ ۴ تا ۶۸ ۴۔ ڈاکٹر اقبال کے عنوان سے ابتداً ۱۱ سطری نوٹ لکھا ہے جس میں اُن کے بھوپال آنے اور "ریاض منزل" اور "شیش محل" میں قیام کا حال درج ہے۔ پھر انھوں نے راس مسعود کے نام اقبال کے اُن چند خطوط[2] کے اقتباسات دیے ہیں جن کے مطالعے سے نواب صاحب بھوپال اور اقبال کے خصوصی روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تمام خطوط گزشتہ صفحات میں زیر بحث آچکے ہیں۔ اس لیے اُن کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ اقبال نامہ سے ہی ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے وہ قطعہ بھی نقل کیا ہے جو مولانا حالی کی صد سالہ برسی پر اعلیٰ حضرت کی موجودگی میں اقبال نے پڑھا تھا۔ اس کے بعد نذیر نیازی کے مضمون "اقبال کی آخری علالت" کا ایک حوالہ دیا ہے جس میں جا بجا بھوپال کے قیام کا تذکرہ ہے۔ آگے چل کر "ضرب کلیم" کی اُن نظموں کی نشان دہی کی ہے جو دورانِ قیام بھوپال اقبال نے کہی تھیں۔ علاوہ ازیں مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے بارے میں اُس خواب کا ذکر بھی کیا ہے جو انھوں نے "شیش محل" بھوپال میں دیکھا تھا اور اُس کے فوراً بعد مثنوی کے اشعار کا نزول شروع ہو گیا تھا۔ سب سے آخر میں اُنھوں نے اقبال کے بھوپال سے تعلقِ خاص کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد کی نسل نے اقبال کے فکر و فن سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> "بھوپال کی سرزمین کو (یہ) فخر حاصل ہے کہ علامہ اقبال نے چند ماہ یہاں گزارے اور یہاں کے فرماں روا کی محبت اور عظمت اُن کے دل میں مستقل طریقہ پر جاگزیں رہی۔ مقامی شعراء کے ۱۹۳۵ء کے بعد کے کلام کو اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو علامہ اقبال کے نقوش و افکار، بہت نمایاں ملیں گے۔ اس چیز نے علامہ اور بھوپال کے رشتہ کو

لے نوازش نامے۔ صفحہ ۵۸ تا ۶۷

[2] یہ خطوط مسٹر ممنون حسن خاں صاحب۔ بی۔ اے کے پاس تھے جن سے شیخ عطاء اللہ نے حاصل کر کے "اقبال نامہ" مجموعۂ مکاتیب اقبال کے نام سے کتابی صورت میں شایع کر دیے ہیں۔ (ڈاکٹر سلیم حامد رضوی)

اور زیادہ مضبوط کر دیا[1]۔"

عبد القوی دسنوی ۔ سیفیہ کالج بھوپال میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ آپ نے بھوپال میں رہ کر اردو کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ "لوائے سیفیہ" کالج کا امتیازی جریدہ ہے جس نے آپ کی زیر نگرانی اردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمت کی ہے ۔ آپ کو بچپن سے ہی اقبال سے عقیدت و محبت تھی ۔ جب ۱۹۶۱ء میں آپ بھوپال بحیثیت لکچرر پہنچے تو آپ اقبال کا بخوبی مطالعہ کر چکے تھے چنانچہ آپ نے ایک مضمون "علامہ اقبال بھوپال میں" تحریر کیا جو پہلے "لوائے سیفیہ" میں شایع ہوا ۔ بعد میں آپ نے اسی مضمون کو کتابچہ کی صورت میں بھی ۱۹۶۷ء میں شایع کر دیا ۔ یہ کتابچہ ۱۸×۲۳/۸ سائز کے ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ آغاز میں آپ نے اُن مشکلات کا ذکر کیا ہے جو اقبال پر کام کرنے کے سلسلے میں پیش آئیں ۔ فرماتے ہیں :۔

"جب میں تعلیم سے فراغت پا کر فروری ۱۹۶۱ء میں بھوپال آیا تو اُس وقت تک اقبال کو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کر چکا تھا اور اُن کی عظمت کا معترف اور شاعری کا دل دادہ ہو چکا تھا ۔ اُن کے افکار و خیالات اور تصورات دل کے مختلف گوشوں پر اپنا سکہ جما چکے تھے ۔ یہاں اقبال کے عاشق اور اُن کے دیوانے اُن کی آمد کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے نظر آئے ۔ میں نے ایسے لوگوں کی آنکھوں میں اس تذکرے کے ساتھ خوشی کی چمک، چہروں پر مسرت کی دمک اور دلوں میں فخر کے جذبات محسوس کیے ۔ لیکن مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ یہاں کب آئے، کیوں آئے اور نواب صاحب بھوپال سے اُن کے کس قسم کے تعلقات تھے ؟ اور سر راس مسعود نے دوستی کا حق کس طرح ادا کیا ؟ اس قسم کے خیالات ہمیشہ دل میں چٹکیاں لیتے رہے ۔ یہاں کے لوگوں سے دوبارہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن جلد ہی مایوس ہونا پڑا ۔ اس لیے کہ اس دور کے اُن لوگوں میں سے جو علامہ سے قریب رہے تھے بہت کم موجود ہیں ۔ باقی یا تو بھوپال چھوڑ چکے ہیں یا ملکِ عدم کی راہ لے چکے ہیں ۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور با وجود نا مساعد حالات کے کوشش جاری رکھی ۔ علامہ اقبال سے ملنے والوں میں خاص طور سے ممنون حسن خاں[2] کا نام لیا گیا ۔ موصوف اس زمانے میں سر راس مسعود کے سکریٹری تھے اور علامہ اقبال کی دیکھ ریکھ کا کام انجام دے رہے تھے ۔ خان صاحب علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اُس دور کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں ۔ اُن سے علامہ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی اور اُنھوں نے بہت حد تک میری رہنمائی، ہمت افزائی اور بڑی مدد کی[3] ۔ ان کے علاوہ عبد الحلیم انصاری صاحب،

---

[1] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ ۔ صفحہ ۴۶۸

[2] آپ بفضلہ حیات ہیں ۔ قیام بھوپال ہی میں ہے ۔ سنا گیا ہے کہ اقبال پر آپ نے بہت کچھ لکھ رکھا ہے جواب تک شایع نہیں ہو سکا ۔

[3] آپ کے انکشافات کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی

اقبال حسین خاں صاحب، حکیم قمر الحسن صاحب، زبیر احمد صدیقی صاحب، یوسف قیصر صاحب اور اختر سعید خاں صاحب سے اس سلسلے میں کافی تعاون ملا۔ دراصل ان صاحبان کی دلچسپیوں نے ہی اس کام کو اس منزل تک پہنچانے میں میری ہمت افزائی کی[1]۔"

یہ کتابچہ عبدالقوی دسنوی نے بطور خاص مجھے بھی ارسال کیا اور مجھے یہ لکھا کہ یہاں علامہ اقبال پر اس سے زیادہ مواد نہیں ملا۔ اب آپ اس کام کو تکمیل تک پہنچائیں۔ کیونکہ انھیں یہ علم تھا کہ "اقبال اور بھوپال" کے موضوع پر میں عرصۂ دراز سے کام کر رہا ہوں۔ اور اس سلسلے میں بھوپال کے متعلقہ حضرات کو خطوط لکھتا رہا ہوں۔ اس کتابچے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دسنوی صاحب نے اسے بہت عجلت میں تحریر کیا ہے اور پہلی ہی نظر میں جو مواد مل گیا اُسے اپنے مضمون میں سمیٹ لیا۔ حالانکہ یہ موضوع ایسا نہ تھا کہ عجلت اور رواروی کا شکار ہو جاتا۔ خود بھوپال کی لائبریریوں میں ندیم ہفت روزہ اور دوسرے اخبارات و رسائل کی فائلیں مل سکتی تھیں جن میں اقبال پر شائع ہونے والا مواد بآسانی یکجا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ ادبی سرمایہ اب تک تاریکی میں ہے۔ شاید آنے والے دور میں کوئی محقق یا خود عبدالقوی دسنوی اُسے ڈھونڈ نکالیں اور نشر و اشاعت کی جو سہولتیں انھیں میسر ہیں اُس کے تحت اسے کتابی صورت میں شائع کر دیں۔ اس منتشر مواد کو یکجا کیے بغیر اقبال کے اُن گہرے اثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو بھوپال کی نئی اور پرانی نسل نے قبول کیے اور جس کے نتیجے میں اقبال شناسی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کتابچے کے صفحہ ۵، ۷ پر انھوں نے اقبال سے ملاقات کرنے والوں کے جو نام شائع کیے ہیں اُن میں دو نام محلِ نظر ہیں۔ مفتی انوار الحق کا اقبال کی بھوپال میں آمد سے بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا اور آصف شاہمیری اُس وقت بہت کم سن تھے، جب اقبال قیام کے لیے بھوپال آئے ہیں۔ اسی طرح دیگر واقعات میں کسی تسلسل یا نظم و ضبط کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ان معمولی کوتاہیوں کے باوجود عبدالقوی دسنوی کی سعی و جہد لائقِ تحسین ہے۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ اقبال کے زمانۂ قیام کی کتنی ہی نمایاں شخصیتیں یا تو پاکستان منتقل ہو گئیں جن میں سے چند ایک سے راقم الحروف رابطہ پیدا کر سکا اور کتنی ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ممنون حسن خاں کی ذات گرامی۔ آج بھی اقبال کے سلسلے میں سب سے مستند اور معتبر ہے۔ کاش وہ اپنے اُس اردو اور انگریزی مواد کو جلد منصۂ شہود پر لا سکیں جو اقبال سے اُن کی عقیدت و وابستگی کے نتیجے میں معرضِ تحریر میں آچکا ہے اور اشاعت کا منتظر ہے۔ اگر اُن کی یہ کتابیں شایع ہو جائیں تو یقیناً اقبال اور بھوپال کے قریبی اور گہرے روابط کے کچھ اور نئے گوشے دنیا کے سامنے آ جائیں گے۔ کاش جلد ایسا ہو سکے!

اقبال کی بھوپال میں آمد و قیام سے ــــ بھوپال کے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور اہلِ علم نے جو مثبت، دیرپا اور گہرے اثرات قبول کیے۔ اُن کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے[2]۔ ۱۹۳۵ء اور اُس کے بعد کا زمانہ برصغیر میں سیاسی تحریکات کے عروج کا زمانہ ہے جب اقبال کے پیغام بیداری، حب الوطنی کے ترانوں اور آزادی کے نغموں نے غلامی اور محکومی کے خلاف جد و جہد میں ہندوستان کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کو سیاسی رہنماؤں اور مجاہدینِ آزادی کی صفوں میں دوش بدوش لا کھڑا کیا تھا اور انھوں نے اپنے فرض کو محسوس کرتے ہوئے۔ اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں کو جہدِ آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس طرح بھوپال کے فن کار بھی جہدِ آزادی میں برابر کے شریک تھے۔

---

[1] علامہ اقبال بھوپال میں۔ صفحہ ۳-۴

[2] ملاحظہ ہو دیباچہ طبع سوم

بھوپال جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ ہمیشہ سے شعر و سخن اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ بھوپال کے بیشتر والیانِ ریاست، اکابر اور اعلیٰ حکام نہ صرف بلند پایہ شاعر اور صاحبِ دیوان گزرے ہیں، بلکہ ان کی علم دوستی، ادب نوازی، شاعروں اور ادیبوں کی قدرشناسی، سرپرستی اور عزت افزائی بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھوپال کے ریاستی ماحول میں شعر و سخن کی محفلیں ہمیشہ برپا ہوتی تھیں۔ اپنے مزاج اور روایات کے اعتبار سے بھوپال کے شعراء عموماً غزل کی طرف ہمیشہ مائل رہے اور اسی مناسبت سے بھوپال کو "شہرِ غزل" کہا جاتا تھا۔ بھوپال کے مذاق شعری کا اندازہ ایک دلچسپ واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اخوانِ ریاست سے تعلق رکھنے والے ایک تحصیل دار میاں اسد اللہ خاں جب اپنی تحصیل سے دیہاتوں کے دورے پر جاتے تھے تو دن میں فرائض منصبی انجام دینے کے بعد رات کو اُن کے کیمپ میں محفل شعر و سخن گرم ہو جاتی تھی جس میں قصبہ کے شعراء کے علاوہ پٹواری، قانون گو وغیرہ بھی شاعر یا سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے تاکہ میاں اسد اللہ خاں کی نگاہِ التفات اور حسنِ ذوق سے فیض یاب ہو سکیں۔

بھوپال کا تنہا یہ ادبی کارنامہ ہی اُس کی عظمت کا ہمیشہ امین رہے گا کہ غالب کے دو ابتدائی دیوان بھوپال ہی سے دستیاب ہوئے۔ پہلا دیوان۔ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا جس کی بابت مشہور ہے کہ مرزا غالب نے اُن کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ یہ دیوان مولوی انوار الحق کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے معرکہ آرا مقدمہ کے ساتھ نواب حمید اللہ خاں کے دورِ حکومت میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا نسخہ جو نسخۂ حمیدیہ سے زیادہ اہم ہے اور غالب کا قلمی اولین دیوان ہے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے دوران۔ بھوپال ہی میں ایک کتب فروش سے امروہہ کے ایک شخص نے خرید لیا جسے عرشی زادہ اکبر علی خاں نے فوٹو آفسٹ پر شایع کیا ہے۔ اور اس کا نام۔ "نسخۂ عرشی زادہ" رکھا ہے۔

سیاسی تحریکات کے اثرات سے ریاستوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ چنانچہ برصغیر کی عام سیاسی بیداری کے نتیجہ میں بھوپال میں بھی "اسٹیٹ پیپلز کانفرنس" معرضِ وجود میں آگئی اور اُس نے ذمہ دار حکومت کا نعرہ بلند کر دیا اور اب بھوپال کی فضاؤں میں بھی "دنیا کے غریبوں کو جگا دینے" اور "کاخ اُمرا کے در و دیوار ہلا دینے" والے نعرے کبھی مدھم اور کبھی تیز آوازمیں گونجنے لگے۔ بیداری کی اس عام لہر سے بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کا علیحدہ رہنا ناممکن تھا۔ خاص کر ایسے حالات میں جب کہ وہ اپنے ادبی رہنما اور سیاسی پیشوا۔ اقبال کو خود اپنے ہی شہر میں موجود پاتے تھے اور اُن کی فکر و بصیرت سے درس تپش حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ اقبال بھوپال کی ادبی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے۔ غالباً ایک بار کسی اسکول کی سالانہ تقریب میں ضرور شریک ہوئے تھے اور حاضرین کے بے حد اصرار پر ایک غزل ؎

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

سنائی تھی۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ بھوپال کے ادیب، شاعر اور اہلِ ذوق اُن کے قیام بھوپال کے دوران ہمیشہ آستانۂ اقبال پر حاضری دیتے تھے اور اُن کے افکار عالیہ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔ شمبھو دیال سُخن بھوپال کے کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بے حد ذہین، طباع اور خوش گو شاعر تھے۔ شعرائے بھوپال میں اُن کا مرتبہ کافی بلند تھا۔ ہمیشہ اساتذہ کی صف میں بٹھائے جاتے تھے۔ غزل کے شاعر تھے۔ لیکن قدرت نے انھیں ہجوگوئی میں یگانہ بنا دیا تھا۔ اُن کو "بھوپال کا سودا" کہا جاتا تھا اور اُن کی ہجویات بھوپال میں زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ اسکول کی تقریب میں اقبال کی غزل سخن نے بھی سُنی اور موقع نکال کر خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت

ادب سے اقبال سے دریافت کیا کہ لفظ "پرہیز" مذکر ہے یا مؤنث۔ اقبال نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ نہایت شفقت سے فرمایا کہ ویسے تو "پرہیز" مذکر ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اقبال کو اتنا حق تو ہے کہ وہ اُسے مؤنث بھی استعمال کر سکے۔ یہ واقعہ مجھے اظہر سعید خاں نے سُنایا جن سے خود ایک بار شمبھو دیال سخن نے اقبال سے ملاقاتوں کے ذیل میں بیان کیا تھا۔

بھوپال واقعی "شہرِ غزل" تھا۔ جسے دیکھو غزل کے بانکپن کا دل دادہ تھا۔ لیکن یہ بانکپن زیادہ عرصہ اپنا جلوہ نہ دکھا سکا کیونکہ بھوپال کو اقبال ایسے عظیم شاعر، مفکر، نکتہ رس اور نکتہ شناس کا قرب اور اُس کے کلام سے بھرپور استفادہ کی ہر ممکن سہولت میسر آگئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے بعد بھوپال کے بیشتر شعراء غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف بھی مائل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو پورے برصغیر میں نئے ادب، نئے افکار و خیالات اور نئے تصورات سے ادب اور زندگی کے رشتے نہ صرف مستحکم، معتبر اور حقیقت پسندانہ انداز میں دنیا کے سامنے آنے لگے بلکہ ادب و شعر کی نئی تفہیم کا بھی آغاز ہو گیا اور اس طرح شاعرِ مشرق کے کلام سے ترقی پسند ادیبوں نے بھی بیش از بیش استفادہ کیا اور زندگی اور ادب کے نئے خواب اور نئی تعبیریں موضوعِ بحث بننے لگیں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ ختم ہوئی۔ اس تمام عرصے میں بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسل پروان چڑھ چکی تھی اُسے ماضی کی اقدار سے زیادہ اپنے گرد و پیش کی فضا، ماحول، معاشرہ کے تضاد اور حالات کی نامساعدت نے بڑی حد تک باغی بنا دیا تھا۔ لیکن محض بغاوت ہی تو مسائل کا حل نہیں بن سکتی۔ اس لیے جو نئے شاعر پیدا ہوئے۔ انھوں نے موضوعاتی شاعری کے لیے خود کو تنگنائے غزل سے باہر نکالا۔ اور مروجہ موضوعات اور رومانی نظموں سے قطع نظر کر کے خالص سیاسی رنگ کی نظمیں بھی لکھنی شروع کر دیں جو کبھی اصلی اور کبھی سیاسی بندشوں کے سبب فرضی ناموں سے چھپتی رہیں۔ لیکن بات ے

دل ضبط، زباں ضبط، اثر ضبط، فغاں ضبط
سرکار کا منشاء ہے کہ ہو سارا جہاں ضبط

سے آگے نہ بڑھ سکی۔

یہ صحیح ہے کہ بھوپال میں کوئی ایسا نظم گو شاعر پیدا نہیں ہوا جس نے کلیتاً اقبال کے لب و لہجہ یا رنگ و آہنگ میں نظمیں کہی ہوں۔ لیکن ایسا ہندوستان کے دوسرے مقامات پر کہاں ہوا۔؟

نواب حمید اللہ خاں کے دور میں بھوپال کے جن شعرا کی بیرونِ بھوپال بھی شہرت و عظمت تھی، اُن کی ایک طویل فہرست ہے۔ پھر بھی سہا مجددی۔ ملا رموزی۔ ذکی وارثی۔ شریف محمد خاں فکری۔ سید محمد یوسف قیصر — ارشد تھانوی۔ محوی صدیقی۔ سید محمود اعظم فہمی۔ رمزی ترمذی۔ محمد اسمٰعیل ہاتف۔ عبد الجلیل، مائل نقوی۔ حامد سعید خاں، منیر بھوپالی۔ تربینی سرن شاد۔ بہاری چرن صادق۔ باسط بھوپالی۔ شعری بھوپالی، اور ان کے بعد کی نئی نسل میں کیف بھوپالی۔ احسن علی خاں۔ اختر سعید خاں۔ اظہر سعید خاں۔ وجدی الحسینی۔ فضل علی سرور۔ اسد بھوپالی — عشی بھوپالی۔ عنبر چغتائی، مرزا متین سروش۔ عمران انصاری۔ گوہر جلالی۔ احمد علی جاوید۔ حبیب فخری۔ مخمور بھوپالی۔ شمبھو دیال سخن۔ مقصود عمرانی، مقصود عرفان۔ افسوں بھوپالی۔ گوپی کرشن شوق۔ سورج کلا سہائے سرور۔ مہ جبین خمار۔ سعیدہ بانو۔ محمد علی تاج۔ عشرت قادری۔ وفا صدیقی۔ جہاں قدر چغتائی، شہاب اشرف۔ شفا گوالیاری۔ رفعت الحسینی اور محسن بھوپالی کا ذکر ضروری ہے۔

اسی طرح نثر نگاروں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جنھوں نے بھوپال کے علم و ادب کے خزینوں میں بیش بہا اضافے کیے۔ کچھ شخصیتیں وہ ہیں جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اقبال کے پیغام کو دنیا کے سامنے نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے جدید دور کے نئے تقاضوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنا کر نیک نامی اور شہرت حاصل کی۔ چند ایک ایسے بھی ہیں جنھوں نے براہِ راست اقبال کے فکر و فن پر کام کیا۔ ذیل میں ایک مختصر سی فہرست پیش کر رہا ہوں جس سے صرف یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان میں سے کتنے صاحب مرتبہ ہیں اور کتنے عالی مرتبہ:-

مولوی عبدالرزاق۔ محمد امین زبیری۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ مولانا محمد اسلم جے راج پوری۔ مفتی انوارالحق۔ شاہ اسدالرحمٰن قدسی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ علامہ سلیمان ندوی۔ نیاز فتحپوری۔ محمود اعظم فہمی۔ علامہ میاں خالد۔ حامد رضوی۔ سہا مجددی۔ قاضی ولی محمد۔ سید محمد یوسف قیصر۔ ملا رموزی۔ محوی لکھنوی۔ ارشد تھانوی۔ محمد احمد سبزواری۔ ابوسعید بزمی۔ خاتون ارشد۔ شاغل فخری۔ محمود الحسن صدیقی۔ کوثر چاند پوری۔ قدوس صہبائی۔ قمرالحسن وجدی الحسینی۔ عبدالحلیم آرٹسٹ۔ رشدی۔ سلمان الارشد۔ اختر سعید خان۔ ابراہیم یوسف۔ رقیب خلیلی عرب۔ اشتیاق عارف۔ قمر جمالی۔ انجم سلمانی۔ ایم۔ عرفان۔ جوہر قریشی۔ کوکب جمیل۔ سید حسن محمود الحسینی۔ لطف اللہ خاں نظمی۔ اختر جمال۔ زہرہ جمال۔ احمد مکی۔ خلیل بدر۔ شاہ میر راہی۔ پروین رشدی۔ رضیہ فرحت بانو۔ شفیقہ فرحت۔ محمد وکیع صدیقی اور آخری دور میں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی۔ ڈاکٹر گیان چند۔ ڈاکٹر حامد حسین۔ عبدالقوی دسنوی۔ شمیم احمد۔ آفاق احمد۔ عبدالاحد خاں تخلص۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ڈاکٹر حنیف فوق اور ڈاکٹر محمد یوسف وغیرہ۔

بھوپال میں نظم نگاری پر خصوصیت کے ساتھ جن شعراء[1] نے اپنی توجہ مبذول کی اور نظم کی روایت کو آگے بڑھایا اُن میں محمود اعظم فہمی۔ ملا رموزی۔ ارشد تھانوی۔ محوی صدیقی۔ باسط بھوپالی۔ کیف بھوپالی۔ احسن علی خاں۔ اختر سعید خاں۔ اظہر سعید خاں۔ وجدی الحسینی۔ عمران انصاری اور ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد محسن بھوپالی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۰ء میں بھوپال میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آ گیا اور چند ہی سالوں میں اس انجمن کے باشعور ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے نثر و نظم دونوں میں موضوع و ہیئت کے نئے اسالیب کو اپنایا اور اس طرح بھوپال میں بھی نئے ادب کی طرح ڈال دی۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ساری دنیا کی طرح بھوپال کے اہلِ قلم نے بھی سُکھ کا سانس لیا اور نشر و اشاعت کی نئی راہیں نکالیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں رشدی اور راقم الحروف نے بڑی جدوجہد کے بعد ماہنامہ "افکار" کا ڈکلریشن حکیم قمرالحسن ایڈیٹر "ندیم" کی وساطت سے حاصل کیا اور یہ سوچا کہ جب تک بھوپال سے کوئی معیاری ادبی ماہنامہ جاری نہ ہو گا اُس وقت تک نہ بھوپال کے علم و ادب کی تشہیر ممکن ہو گی نہ ادیبوں اور شاعروں کا بجا طور پر تعارف ہو سکے گا۔ عجب اتفاق ہے کہ رشدی اور میں نے "افکار" کے اجراء کے لیے اقبال کی مشہور نظم "تخلیق"۔ مطبوعہ ضرب کلیم کے پہلے شعر سے

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کو منتخب کیا۔ اور جب ایک صحبت میں ملا رموزی سے جو رشدی کے اور میرے مشترک دوست تھے۔ اس شعر کا حوالہ دے کر "افکار" کے اجراء کا مشورہ لیا تو ملا رموزی نے جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے لیے ہندوستان گیر شہرت رکھتے تھے، ماہر نجوم بھی تھے اور جوہری بھی اور جن کی گلابی اردو اور طنزیہ مزاحیہ نظموں نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دی تھی، کچھ دیر سوچتے رہے۔

---

[1] شعراء کے اس گروہ میں راقم الحروف بھی شامل تھا لیکن اس فہرست میں دانستہ اپنا نام شامل نہیں کیا ہے۔

پھر ہنس کر فرمایا کہ اس نام کی تاثیر یہ ہوگی کہ تم دونوں ساری عمر "مجموعۂ افکار" بنے رہو گے یا "ہجومِ افکار" میں گھرے رہو گے اس لیے اگر فکروں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو "ماہ وانجم" "گلستاں" یا "باغ وبہار" قسم کا نام رکھو۔ ویسے میرا نجوم یہ بتاتا ہے کہ لفظ "افکار" کو یقیناً دوام حاصل ہے اور پھر تم نے تو اس نام کو شاعرِ مشرق کے شعر سے اخذ کیا ہے۔ لہٰذا بسم اللہ!

ملا رموزی۔ آج اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ "افکار" مارچ ۱۹۴۶ء سے معرضِ وجود میں آیا اور اُسے جاری ہوئے اب ۲۸ سال ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ "افکار" ۱۹۵۰ء میں میرے ساتھ بھوپال سے کراچی آ گیا اور اپریل ۱۹۵۱ء سے اُس نے دوسرے دور کا پاکستان سے آغاز کیا۔ میرے آنے کے بعد ۱۹۵۱ء سے روزنامہ "افکار"۔ رشدی نے بھوپال سے جاری کیا جو تاحال جاری ہے۔ واقعی شعر وحکمت کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ رشدی یا میں اقبال کے اس شعر ۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کی صداقت کے امین بن کر انتہائی صبر آزما اور نامساعد حالات میں اسے زندہ رکھ سکیں گے۔ لیکن اقبال کے فیضان سے یہ چراغ آج تک روشن ہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک افکار بھوپال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شایع ہوتا رہا اور اس کی لوح پر ہم جہانِ تازہ والا شعر ہمیشہ درج کرتے رہے۔ کتنے ہی پرانے اور نئے لکھنے والے۔ اس کے ذریعہ متعارف ہوئے۔ اور ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد جب صفیہ اختر۔ اور جاں نثار اختر۔ حمیدیہ کالج بھوپال میں لکچرر ہو کر آ گئے تو بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں بھی جان پڑ گئی۔ ۱۹۴۹ء میں بھوپال کی ادبی تاریخ میں پہلی بار کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس کا افتتاح علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا۔ اس کانفرنس کی قابلِ ذکر شخصیتوں میں پنڈت سندر لال۔ کرشن چندر۔ جوش ملیح آبادی۔ عصمت چغتائی، شاہد لطیف، مہندر ناتھ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مدتوں اس کانفرنس کا بھوپال میں چرچا رہا۔ افکار نے اس کانفرنس کا یادگار نمبر شایع کیا اور اس طرح بھوپال نے دنیائے ادب میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ "افکار" جب تک بھوپال سے نکلتا رہا اقبال کی فکر کا ترجمان رہا۔ اور "جہانِ تازہ" کی "افکارِ تازہ" سے تعمیر کرتا رہا۔ اور اسی مسلک پر وہ آج بھی گامزن ہے۔

قرآن مجید کے حواشی

۱۹۳۱ء سے اقبال کے بھوپال آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جاچکا ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب راس مسعود بھوپال تشریف لے آئے تو کچھ اور وسعت پذیر ہوگیا۔ ۱۹۳۳ء سے ہی اُن کی صحت کا عالم دگرگوں ہوچلا تھا۔ چنانچہ نواب صاحب بھوپال کی خواہش اور راس مسعود کی ترغیب پر وہ ۱۹۳۵ء میں بھوپال آکر علاج کرانے پر آمادہ ہوگئے۔ اسی دوران راس مسعود سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ نواب صاحب کو بھی راس مسعود نے اُن کے خانگی اور مالی حالات سے مطلع کیا اور نواب صاحب نے بلاکسی تذبذب کے فوری طور پر اُن کا وظیفہ مقرر کردیا۔ نواب صاحب نے اُن سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ قرآن مجید کے ایسے مستند حواشی تحریر کردیں جو تمام مسلمانانِ عالم کے لیے رہبری و ہدایت کا سبب بن سکیں۔ اقبال نے بخوشی اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ چنانچہ مکتوباتِ اقبال کے آخری باب "خاتمۂ سخن" میں نذیر نیازی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ پیش خدمت ہے۔

قرآن شریف کے نوٹ

"۱۹۳۵ء میں جب اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے حضرت علامہ کی لائف پنشن مقرر کردی اور حضرت علامہ نے راقم الحروف کو اس کی اطلاع کی تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

"اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کروں گا۔"

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن مجید کے ان تفصیلی حواشی کی تکمیل جب ہی ممکن تھی جب حضرت علامہ کو صحت ہوجاتی۔ مگر اس کے باوجود لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ حواشی کیا پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے یا ان کا کچھ حصہ بعد میں لکھا گیا اور اگر نہیں تو یہ حاشیے لکھے جاتے تو ان کی نوعیت کیا ہوتی۔۔؟ کیا حضرت علامہ اپنے ذہن میں مطالب قرآنی کا کوئی خاص نقشہ قایم کرچکے تھے؟ ان کے خیالات اس سلسلے میں کیا تھے؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور قوم کا ذوقِ تجسس

بجا طور پر اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کا کوئی ٹھیک ٹھیک جواب مل سکے۔ بالخصوص اس لیے کہ ناقدین کی رائے کچھ بھی ہو حضرت علامہ کا اپنا ارشاد تو یہی تھا کہ ان کے افکار کا سرچشمہ قرآن پاک اور اُسوۂ حضور رسالت مآب صلعم کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اسی ذاتِ گرامی سے جس پر قرآن مجید نازل ہوا والہانہ عشق و محبت کا تعلق تھا جس کی بدولت۔ کتاب اللہ کی حکمت ان پر عیاں ہوئی۔ "پس چہ باید کرد" کے یہ اشعار کس کی نظر سے نہیں گذرے۔

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃ صبح تو بانگِ اذاں
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
قطرہ و دریا و طوفانم توئی
گردِ تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

قرآن پاک سے حضرت علامہ کو جو عشق تھا اور اس کا مطالعہ انھوں نے جس محنت اور کاوش سے کیا تھا وہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے لوگ ناواقف ہوں۔ ان کی طالب علمی اور ابتدائی زمانے کے دوست بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بڑے سحر خیز تھے۔ فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرتے اور پھر قرآن مجید کی تلاوت بڑے ذوق و شوق سے فرماتے۔ اپنی آخری علالت میں جب ان کی آواز بیٹھ گئی اور کچھ گلے کی تکلیف، کچھ حبس دم کے باعث تلاوت قرآن کا سلسلہ چھوٹ گیا تو انھوں نے کس حسرت سے کہا:۔

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

علی بخش ان کے مدت العمر کے ملازم کا بھی، جو ہمیشہ ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا، یہی بیان ہے کہ فجر کی نماز کے لیے وضو اور جائے نماز کا اہتمام سونے سے پہلے ہی کرنا ہوتا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تعلیمات قرآنی کے بارے میں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جس کی اپنے اشعار اور خطبات میں انھوں نے وضاحت بھی کی۔ لیکن جہاں تک ان تفسیری حاشیوں کا تعلق ہے وہ کبھی سپرد قلم نہیں ہوئے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی علالت۔ البتہ اس سلسلے میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اب اقبال اکیڈیمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں تو فقہ اسلامی کی بحث میں بعض قرآنی مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر صرف چند ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔ لیکن ان دونوں تحریروں کی حیثیت حواشی کی نہیں۔ حضرت علامہ نے ان تحریروں میں کوئی جملہ بھی رقم نہیں فرمایا۔ صرف چند الفاظ

مستفسرانہ انداز میں لکھے ہیں جس سے کچھ مترشح ہوتا ہے تو یہی کہ انھوں نے اپنی یادداشت کے لیے چند ایک باتیں بطور اشارات لکھ لیں تھیں[1]۔ رہا یہ امر کہ وہ ان باتوں کی تشریح اور تفصیل کس انداز میں اور کس نہج پر کرتے اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ الّا یہ کہ ان کی روزمرہ گفتگو یا ان ارشادات سے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اس سلسلے میں فرمائے سامعین کو ان کے خیالات کا شاید ایک حد تک اندازہ ہو سکے۔ یہ اس لیے کہ قرآن اور رسالت، یہ دو موضوع ایسے ہیں کہ کوئی بھی مسئلہ یا کوئی بھی بحث ہو اس کا خاتمہ اسی پر ہوتا تھا کہ قرآن پاک کا ارشاد اس سلسلے میں کیا ہے یا یہ کہ حضور رسالت مآب صلعم نے اس بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ بسا اوقات وہ یہ بھی فرماتے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کس نہج پر کرنا چاہیے اور پھر باتوں باتوں میں تعلیمات قرآنی کی طرف بڑے لطیف اشارات کر جاتے۔ مختصراً یہ کہ ان کے ذہن میں تعلیمات قرآنی کو ایک باقاعدہ شکل میں پیش کرنے کا تصور تو ضرور تھا لیکن بہ سبب علالت وہ اپنا یہ ارادہ پورا نہ کر سکے جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ چنانچہ راقم الحروف نے اکثر محسوس کیا کہ ان کے پیشِ نظر شاید یہی ایک مسئلہ ہے جس پر وہ انتہائی تجسس اور تحقیق سے قلم اٹھانا چاہتے ہیں۔ رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں میں اپنے مضمون "اقبال کی آخری علالت" میں اس امر کی طرف اشارا کر چکا ہوں کہ ان کا ذہن کس طرح ہر وقت اسی فکر میں الجھا رہتا تھا[2]"۔

نذیر نیازی کی اس توضیح و تشریح کے بعد محمد امین زبیری مرحوم کا ایک مضمون بعنوان "بھوپال کا علمی جائزہ" میری نظر سے گزرا جسے سید محمد یوسف قیصر نے مجھے بطور خاص بھوپال سے بھجوایا تھا۔ اس مضمون میں والیانِ ریاست کے علمی، ادبی، مذہبی، اخلاقی، تاریخی کارناموں کا مختصر تذکرہ بھی ہے اور ہندوستان کی جتنی مایۂ ناز شخصیتیں بھوپال سے وابستہ رہیں اور انھوں نے بھوپال میں رہ کر یا بھوپال کی امداد سے علمی، ادبی اور تاریخی خدمات انجام دیں۔ ان کا جستہ جستہ احوال بھی درج ہے۔ یہ مضمون رسالہ 'اردو' کے صفحہ ۱۱۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۸ پر ختم ہوتا ہے اور بلاشبہ بھوپال کے علمی کارناموں کا جو کئی ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اتنے مختصر اور جامع انداز میں محمد امین زبیری ایسے بلند پایہ ادیب و محقق ہی احاطہ کر سکتے تھے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے دوران صفحہ ۱۳۰ پر دورِ حمیدی کے مختلف علمی و ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی یہ عبارت جب میری نظر سے گزری:

"ہز ہائی نس نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک مستقل تصنیف کی درخواست پر افکارِ حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے پانچ سَو روپیہ ماہانہ کی امداد مقرر کی مگر علامہ نے تین سال میں اس کام کا اقدام بھی نہ کیا

---

[1] سہو کتابت ہے۔ "لکھ لی تھیں" ہونا چاہیے۔

[2] مکتوبات اقبال۔ صفحہ ۳۴۲۔۳۴۵

اور نہ کوئی یادداشت ہی چھوڑی[1]۔"

تو مجھے واقعی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ اس عبارت سے جو ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی ہے۔ نذیر نیازی کا وضاحتی بیان جو کتابی صورت میں ۱۹۵۷ء میں سامنے آگیا تھا خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بیان کردہ واقعات بھی صحت پر مبنی نہیں، کیونکہ پانچ سو روپے بطور وظیفہ مقرر ہوا تھا نہ کہ بطور امداد یہ رقم ماہانہ مقرر کی گئی تھی جس کا ثبوت گزشتہ صفحات میں بھی مل سکتا ہے اور "ذکر اقبال" سے بھی۔ عبدالمجید سالک فرماتے ہیں:۔

> "اس درویش خدامست نے کبھی دولت وجاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں روزمرہ کی معیشت تنگ دشوار ہو گئی۔ اس موقع پر نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال نے اپنے تعلق خاطر اور قدردانیٔ خدمت اسلامی کے باعث جیب خاص سے حضرت علامہ کا پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ (تا) حین حیات مقرر کر دیا۔
>
> مئی ۱۹۳۵ء میں ہی بیگم کا انتقال ہوا اور اسی مہینے میں بھوپال کا وظیفہ شروع ہوا[2]۔"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ والیٔ بھوپال نے "اپنے تعلق خاطر" اور "قدردانیٔ خدمت اسلامی" کے پیش نظر وظیفہ مقرر کیا تھا۔ امداد مقرر نہیں کی تھی۔ نیز خود اقبال اور راس مسعود کے خطوط کے علاوہ شہزادی عابدہ سلطان کے ارشادات اور علی حیدر عباسی کے بیان سے بھی پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ کی تصدیق ہوتی ہے نیز یہ وظیفہ غیر مشروط تھا اس لیے محمد امین زبیری مرحوم کا یہ لکھنا کہ یہ رقم "ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک مستقل تصنیف کی درخواست پر افکار حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کے لیے" دی گئی درست نہیں۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ تفسیری نوٹ لکھنے کی خواہش یا درخواست اقبال نے کی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب بھوپال نے اقبال سے اس خدمت کو انجام دینے کی درخواست کی تھی جس کا ثبوت ہمیں کئی مستند بیانات سے مل جاتا ہے جو گزشتہ صفحات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان کا ایک اور اعتراض کہ "علامہ نے تین سال میں اس کام کا اقدام بھی نہ کیا اور نہ کوئی یادداشت ہی چھوڑی" بھی محل نظر ہے کہ نذیر نیازی نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے:۔

> اس سلسلے میں ان کی دو ایک تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں اور وہ شاید اقبال اکیڈیمی کے پاس محفوظ ہیں۔ ایک تحریر میں تو فقہ اسلامی کی بحث میں بعض قرآنی مصطلحات مذکور ہیں۔ دوسری تحریر صرف چند ایک قرآنی مصطلحات پر مشتمل ہے۔"

ظاہر ہے یہ حواشی تو نہیں ہیں لیکن ان کے اس بیان سے اس امر کی تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ انھوں نے اس کام کو سب کاموں پر مقدم سمجھ کر ابتدا کر دی تھی۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور یہ عظیم کام تشنۂ تکمیل رہا۔

محمد امین زبیری کے اس اعتراض برائے اعتراض کا اندازہ محمد نعیم ندوی کے اس مضمون کے اقتباس سے بخوبی

---

[1] رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۶ء
[2] ذکر اقبال۔ صفحہ ۱۹۶

لگایا جاسکتا ہے جو "فاران" کراچی میں بعنوان "علامہ شبلی، دارالمصنفین اور بھوپال" شایع ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"علامہ شبلی نے جو اپنے گوناگوں علمی کمالات اور کارناموں کی بدولت تاریخ علم و ادب میں زندۂ جاوید ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک دادِ تحقیق دینے کے بعد عمر کے آخری حصہ میں سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دربار میں اپنے "اخلاص و عقیدت کا نذرانہ" پیش کرنے کا ارادہ کیا لیکن راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ کی نایابی تھی۔ چنانچہ علامہ شبلی نے جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں قوم کے نام یہ اپیل شایع کی کہ جو اس سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہو وہ دست تعاون دراز کرے۔ منشی محمد امین زبیری جو ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے لٹریری سکریٹری تھے یہ اپیل دیکھ کر سرکار سے کونین کی اس لٹتی ہوئی دولت سے اپنے دامن کو بھر لینے کی درخواست کی اور اس علم نواز خاتون نے بسر و چشم اس کو قبول کر کے مصنف علام کو دوسرے آستانوں سے مستغنی اور تمام افکار سے بے نیاز کر دیا۔

منشی امین زبیری مرحوم کا ذکر نوک قلم پر آگیا ہے تو چند سطور اُن کے متعلق بھی گوارا کر لی جائیں۔ زبیری مرحوم کو علامہ شبلی سے غایت درجہ عقیدت تھی۔ چونکہ وہ ریاست کے شعبۂ تاریخ کے مہتمم بھی تھے۔ اس لیے وہ ریاست کی تصانیف و تالیفات کے سلسلے میں علامہ مرحوم سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔ سیرت کی امداد کرانے میں موصوف کی خدمت کو بڑا دخل تھا۔ علامہ شبلی کے مطبوعہ مکاتیب میں زبیری کے نام ۱۳ خطوط پائے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے بھی دونوں کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے لیکن اپنے ممدوح (علامہ شبلی) کی رحلت کے بعد ایک عرصہ کے بعد جب مولانا سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق تصنیف "حیاتِ شبلی" منصۂ شہود پر آئی اور اُس نے علمی دنیا میں دھوم مچادی تو انہی زبیری مرحوم نے یک دم "قلب ماہیت" اختیار کر لی اور نہ صرف سید صاحب علیہ الرحمۃ سے انتہائی بدظن ہو گئے بلکہ علامہ شبلی کی ثقاہت کو مجروح کرنے کی فکر اُن پر مسلط ہو گئی۔ بظاہر تو انھوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "حیاتِ شبلی" کے مصنف نے سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کیا ہے اور شبلی کی زندگی کا صرف ایک رُخ دکھایا ہے۔ تصویر کے دوسرے رُخ سے جسے زبیری "رنگین زندگی" کا نام دیتے ہیں چشم پوشی کی ہے۔

مگر اہلِ نظر خوب جانتے ہیں کہ شبلی کی "رنگین زندگی" سے اغماض کا الزام سید صاحب پر صرف برائے الزام ہی ہے ورنہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ زبیری مرحوم کے بار بار اصرار کرنے پر بھی سید صاحب نے "حیاتِ شبلی" کا مسودہ اُن کو دیکھنے نہ بھیجا۔ بس اس پر چراغ پا ہو کر زبیری صاحب نے اپنی بقیہ عمر شبلی و سلیمان علیہما الرحمۃ کی مخالفت اور اُن پر طنز و تعریض کرنے میں گزاری ہے۔"[1]

---

[1] ماہنامہ "فاران" کراچی اکتوبر ۱۹۶۸ء صفحہ ۲۵ تا ۲۹

نفس موضوع سے ہٹ کر اس طویل جملۂ معترضہ کو پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شبلی کی طرح زبیری مرحوم کو اقبال سے بھی کچھ اسی نوعیت کا للہی بُغض تھا جس کے نتیجہ میں آخری عمر میں انھوں نے "خدوخال اقبال" لکھ ڈالی، جس کا خاص مقصد اقبال کی سیرت کے "دوسرے رُخ" کو اُجاگر کرنا تھا۔ لیکن اُن کی یہ آرزو اُن کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی اور "خدوخال اقبال" کا مسودہ ہی لاپتہ ہوگیا جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں۔

اب آیئے اس حقیقت کا مزید جائزہ لیں کہ قرآن مجید کے حواشی کے سلسلے میں اُن کے کیا کیا عزائم تھے۔ وہ اس سعی وجہد میں کس حد تک کامیاب ہوئے اور اس ضمن میں انھوں نے کیا کچھ سرمایہ چھوڑا۔ سب سے پہلے عبدالمجید سالک کی مشہور کتاب "ذکر اقبال" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

تصنیفی منصوبے

"علامہ اقبال کے ہم صحبت نیازمندوں کو معلوم ہے کہ حضرت ممدوح کے ذہن میں بعض نہایت مفید تصنیفات کے خاکے اور بعض تنظیمی و اصلاحی اداروں کے منصوبے موجود تھے جن کو وہ اپنی زندگی میں معرض شہود میں نہ لاسکے لیکن ان کی تڑپ علامہ کے قلب میں مرتے دم تک رہی۔ مثلاً وہ جوانی کے زمانے میں محسوس کرچکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرح اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا

(Construction of Islamic Jurisprudence).

انھوں نے بارہا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے۔ جس کا نام ہوگا

Islam as I understand.

(یعنی اسلام میرے نقطۂ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنس داں اور فلسفی کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانۂ حال کے علمی حلقے سمجھتے ہیں۔

اواخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعۂ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہوجائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قایم کر رکھے ہیں وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی

Aids to the study of Quran.

بتایا کرتے تھے[1]"

---

[1] ذکر اقبال - صفحہ ۲۱۱-۲۱۲

مقدمۃ القرآن

قرآنِ مجید کے حواشی کے بارے میں — ممنون حسن خاں کے انکشافات آپ نے دیباچہ طبع ثانی میں ملاحظہ کیے ہوں گے۔ خوش نصیبی سے نظرِ ثانی کے دوران اقبال کا ایک ایسا خط بھی مل گیا جس سے پہلی بار یہ علم ہوا کہ انھوں نے قرآنِ مجید کے حواشی سے متعلق کتاب کا نام "مقدمۃ القرآن" رکھا تھا۔ اقبال نے یہ خط دوسرے قیامِ بھوپال کے دوران "شیش محل" سے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کو انگلستان ارسال کیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں اقبال کے وظیفہ سے متعلق ۱۹۳۵ء[1] کے دوران اقبال اور راس مسعود کے درمیان جو خطوط کا تبادلہ ہوا ہے وہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ انھیں خطوط میں انھوں نے ایک تجویز نواب صاحب بھوپال کی خدمت میں ذریعہ راس مسعود پیش کی تھی جس کا واضح ثبوت ذیل کا خط مہیا کرتا ہے۔ اس خط میں وہ ڈاکٹر تاثیر کو لکھتے ہیں:

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لیے مجھے انھوں نے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہوگیا ہوگا۔"

"مقدمۃ القرآن" اور "لٹریری پنشن" کی اصطلاحات کا شاید ہی اس سے پہلے کسی کو علم ہو۔ اور اس امر کا بھی کہ لٹریری پنشن کی خبر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ دوسرے قیام کے دوران جاوید بھی ان کے ہمراہ تھے جیسا کہ خط کے مندرجات سے ظاہر ہے:

"بھوپال۔ شیش محل
۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۳ء[1]

ڈیر تاثیر صاحب — السلام علیکم

جاوید کے لیے الف لیلہ کا نسخہ جو آپ نے بھیجا ہے مجھے آج یہاں بھوپال میں موصول ہوا۔ جاوید بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہے اور آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہے۔

میں یہاں بھوپال میں بغرض علاج برقی مقیم ہوں اور اگست کے آخر تک علاج جاری رہے گا۔ بہ نسبت سابق حالت بہتر ہے اور ڈاکٹر صاحبان یقینی امید دلاتے ہیں کہ آواز عود کر آئے گی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے یہ معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے

---

[1] سہو کتابت ہے۔ ۳۵ء ہونا چاہیے۔

لیے مجھے انھوں نے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہولے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کروں گا۔ اسی سال کے دوران میں امید ہے صورِ اسرافیل بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر کچھ مدت کے لیے مقدمۃ القرآن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دوں گا۔ باقی اب زندگی میں کوئی دلچسپی مجھ کو نہیں رہی۔ صرف جاوید و منیرہ کی خاطر زندہ ہوں۔ انگلستان آنا بھی اب ممکن نہیں رہا۔ اگر میں کچھ مدت کے لیے اُدھر چلا جاؤں تو ان بچوں کی نگرانی کون کرے گا۔ اس کے علاوہ میرے لیے ان کی جدائی بھی مشکل ہے۔ ان کی ماں کی آخری وصیت بھی یہ تھی کہ جب تک یہ دونوں بچے بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنے سے جدا نہ کرنا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ لاہور سے فساد کی خبریں آ رہی ہیں۔ ملٹری نے فائر کر دیے تھے۔ آج کی خبر ہے کہ دس مسلمان مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ ملٹری اور پولیس کے آدمی بھی زخمی ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ مسجد شہید گنج کے انہدام کے سلسلے میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ انگریزی تدبر کے اب آخری دن ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

علی بخش سلام کہتا ہے۔ جاوید آداب لکھواتا ہے۔

محمد اقبال

حاشیہ پر:

میاں صاحب کے باغ کے آم لاہور سے کھا کر روانہ بھوپال ہوا تھا اگرچہ ان آموں کا موسم کچھ میرے بعد شروع ہوگا۔

آپ نے ارادہ کیا تھا کہ جاوید نامہ پر لکچر دیں گے۔ وہ لکچر لکھا گیا یا ابھی تک معرض التوا میں ہے۔ لکھا جائے تو ایک کاپی ضرور ارسال کیجیے۔

محمد اقبال[1]"

---

[1] انوار اقبال۔ صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷

6030

اسی سلسلے میں میاں محمد شفیع ایم۔ایل۔اے (م۔ش) کا ایک مضمون ہماری بہت سی الجھنوں کو دور کر دیتا ہے جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ اُس کتاب کا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جسے وہ نواب صاحب بھوپال کی تجویز پر لکھ رہے تھے ۔۔۔ میاں صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو:۔

شاعرِ مشرق کی آخری خواہش

"۱۹۳۳ء میں مجھے علامہ اقبال مرحوم کے نویسندہ کی حیثیت سے کام کرنے کا شرف حاصل ہوا تو علامہ مرحوم نے چند کاغذات میرے حوالے کیے جن پر ان کے ہاتھ سے ایک کتاب کا خاکہ لکھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی زبان میں اسلام کے مطالعے کے لیے ایک دیباچہ قلم بند کرانا چاہتے تھے۔ جس میں اسلام کے فلسفۂ قانون پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی جاتی۔ چونکہ ان کی بینائی روز بروز کم ہوتی جارہی تھی اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ وہ یہ کتاب مجھے تحریر کرواتے جاتے۔ اگر یہ مکمل ہوجاتی تو انگریزی زبان میں تو اسلامی نظام حکومت و معاشرت اور فلسفۂ اسلامی قانون کے متعلق یہ ایک مستند ترین اور دور آفریں تصنیف ہوتی۔ اس کتاب کی تجویز درحقیقت انھیں نواب بھوپال نے پیش کی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے علامہ مرحوم کی بڑھتی ہوئی علالت نے انھیں اپنے ارادے پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اور بالآخر ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو موت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

علامہ اقبال کی اس تحریر کو میں نے اب تک ایک قومی امانت کے طور پر سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے قائد اعظم مرحوم سے بھی اس کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے مارچ ۱۹۴۳ء میں ایک گرامی نامے کے ذریعہ مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں علامہ کی اس کتاب کا خاکہ ان کی خدمت میں ارسال کردوں تاکہ وہ اس کا مطالعہ کرکے اسے کسی ایسی شخصیت کے سپرد کردیں جو اس امانت کو سنبھالنے اور علامہ مرحوم کے تحریر کردہ خاکہ کے مطابق کتاب کو مکمل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ قائد اعظم مرحوم کا خیال تھا کہ چونکہ کتاب کا موضوعِ بحث فلسفۂ قانون ہے اس لیے ایک قانون دان ہی اس کام کو بہتر طریقہ سے سرانجام دے سکتا ہے۔ چونکہ یہ نوٹ پنسل سے لکھے ہوئے تھے اس لیے مدھم پڑتے جارہے تھے چنانچہ ۱۹۴۵ء میں سنٹرل جیل ملتان میں اسیری کے دوران میں نے بڑی احتیاط سے انھیں نقل کرلیا اور اب میں اس خاکہ کی نقل بجنسہٖ قوم کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ اس امید میں کہ اہلِ اصحاب علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق اس خاکہ کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسی مستند کتاب تصنیف کرسکیں جس میں اسلام کو ایک پائندہ حقیقت اور ہمارے معاشرہ میں ایک زندہ و فعال عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے۔

۱۔ اسلام کا مطالعہ ضروری کیوں ہے؟

(۱) اس میں قوت و فعالیت ہے۔ اس نے مختلف ادوار میں فروعات اور زوائد سے نجات حاصل کرنے کی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اسلام میں نئی تحریکیں

ہیں ان پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ یہ فکری انتشار اور اندرونی خلفشار کا اظہار کرتی ہیں۔

(۲) اسلام۔ دنیائے جدید اور مملکت برطانیہ۔

ب ـــــ اسلام اور شہنشاہیت۔

اسلام پر عرب شہنشاہیت کا اثر۔ انھوں نے روما اور ایران کی شہنشاہیتوں کو ختم کر کے ایک نئی شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی۔

شہنشاہیت کے اسباب و علل۔

(۱) مذہبی جوش اور انسانیت کی اصلاح و ہدایت کی لگن۔

(۲) بھوک (افلاس)

بہرحال اسباب چاہے کچھ ہی ہوں اس کے نتائج مفید ثابت نہیں ہوئے شہنشاہیت نے ان رہبانیت پسند مذاہب کو بھی اسلام کے دامن میں پناہ دیدی۔ جنھیں اسپنگلر نے مؤیدوں کے مذہب (Magian) کا نام دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے سابقہ مذاہب کے فلسفیانہ مناقشات اور مباحثات یعنی روح، نفس، قرآن، حدیث یا قدیم اور اسی قسم کے دوسرے متنازعہ فیہ مسائل کو اپنے اندر جذب کر لیا اور حقیقی اسلام کو اُبھرنے کا بہت کم موقع ملا۔

ج ـــــ اسلام کو سمجھنے کے لیے دور جدید کے طالب علم کی مشکلات۔ اسے اسلام کے متعلق لاتعداد اور ان گنت لٹریچر کی چھان بین کرنی چاہیے۔ اور قرآن حکیم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے اسلام کا مطالعہ اسی طریق پر کیا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

د ـــــ اسلام کیا ہے؟

کیا یہ ایک مذہب ہے دوسرے مذاہب کی طرح؟

مذہب کے معنی کیا ہیں؟ قرآن میں اس کے لیے دین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قانون کی اطاعت (دیکھیے قرآن ۵ : ۱۸)

پُرانے ایشیائی مذاہب کی خصوصیات۔

(۱) ابتدائی مذاہب میں وحی کا تصور۔ ایک پُراسرار فعل۔ اسلام نے اس کی خالص علمی اور سائنٹفک توضیح پیش کی۔ قرآن۔ ابن خلدون۔ تصوف۔

(۲) نجات۔

(۳) دنیا سے قطعی بے تعلقی (لا رھبانیہ) خانہ، حجرے، تہ خانے۔ اسلام اور عیسائیت کا موازنہ (واللہ یخرجکم من الظلمات الی النور) حضرت عیسیٰ ـــ وحی

(۴) غیب کا خوف (لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)

(۵) اسپنگلر کی کتاب (Some secret teachings) جلد دوم —
صفحہ ۲۳۵ مارٹیمین کی جلد اول بھی پڑھیے۔
(۶) زمان اور عالم کی بے حقیقتی (Unreality) پر ایمان۔
(ربنا خلقت ھذا باطلا — ھل اتیٰ علی الانسان .....)
(۷) تقدیر۔
(۸) دینی حکومت۔ ر (Theocracy)
اسلام کے ظہور کے وقت دنیا میں جتنے مذاہب موجود تھے۔ اسلام ان کے خلاف ایک احتجاج تھا۔
کائنات ایک حقیقت ہے — وقت حقیقت ہے — اب نبیوں کا ظہور نہیں ہوگا۔
(نبی موعود)
(ج) قید (Limitation) سے فرار نہیں۔
بیچ بچاؤ نہیں ہوگا۔ قسمت یا تقدیر (Fatalism) کوئی چیز نہیں۔
کیا اسلام ایک دینی حکومت ہے؟
کلیسا اور ریاست کا رشتہ!
ریاست کیا ہے۔ ایک معاہدہ ہے ازدواجی رشتہ کی طرح۔
ر — لیکن اسلام مذہب سے بہت کچھ زاید ہے۔ امن و اطمینان، اندرونی اور بیرونی۔
(قرآن — ۵ : ۱۸)
(۱) اسلام انسان کی نسلی تفریق کو ختم کرتا ہے (بیرونی امن)
(۲) یہ اقتصادی مساوات پیدا کرتا ہے (اندرونی امن)
(۳) یہ باب یہاں ختم ہوتا ہے۔ دو آخری مشاہدات۔
۱۔ کیا اسلام ایک خطرہ ہے؟
۲۔ اسلام عیسائیت کا دشمن یا رقیب نہیں۔
دنیا کو تہذیب کا سبق دینے میں وہ عیسائیت کے ساتھ اشتراک عمل قبول کرتا ہے۔

باب دوئم — اسلام کا قانون

دیکھیے ڈکنس کی تصنیف (After two hundred years) موبدوں کے مذہب میں وحی ایک پُر اسرار عمل ہے۔ اسلامی تصوف میں اس پُر اسرار عمل کی علمی اور سائنٹفک تشریح کی گئی ہے۔
کیا یہ اخلاقیات کا نام ہے جس میں جذبات کی اثر پذیری ہے؟
ا — مذہب — کیا یہ خدائے واحد یا دیوتاؤں میں ایمان کا نام ہے۔ جن کی کسی نہ کسی صورت میں پرستش کی جاتی ہے — رہبانیت کو مذہب کا نام دیا گیا ہے۔

(۱) کیا یہ دنیا سے قطع تعلق کا نام ہے۔ (لا رھبانیہ فی الاسلام)
(۲) کیا یہ غیب کا خوف ہے؟ (لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)
(۳) کیا یہ فوق الحس (Super sensible) سے رابطہ کا نام ہے؟
اس کا جواب کسی حد تک اثبات میں ہے، لیکن ایسی فوق الحس جس کی علمی تشریح و توضیح کی جا سکے۔
ابن خلدون اتمام (Finality) کا تصور۔
(۴) کیا یہ کوئی خفیہ تعلیمات ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل کی جاتی ہے، (راز؟)
اسپنگلر کی کتاب (All early Magian Religions)
جلد دوم صفحہ ۲۴۶ اسلام ۲ (قد تبین الرشد من الغی)
(۵) مذہب — لفظ مذہب کا ماخذ — قرآن میں مذہب کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ قرآن میں دین، منہاج اور ملت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں — ملت اور دین کے الفاظ کے معنی۔
(۶) دیکھیے — میٹی نین (Matinean) جلد اول
ب — اسلام مذاہب کے پرانے مفہوموں سے احتجاج یا بغاوت ہے۔
(۱) نبوت کا خاتمہ (Abolition) اسلام اور زمان (ھل اطیع)
(۲) اسلام میں نجات کا تصور — کیا یہ ایک نجات دہندہ مذہب ہے؟ — قرآن میں نجات کا لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ نجات کے کیا معنی ہیں۔؟
(۳) یہ کوئی خفیہ تعلیمات نہیں!
(۴) خدا (غیب) میں ایمان — انسانیت کی نسلی تفریق کا خاتمہ اور اقتصادی مساوات۔ (قل العفو)
ج — کلیسا اور ریاست۔
کیا اسلام میں جماعت ایک قانونی فرد ہے؟
(Juristic person)
ریاست اور کلیسا کا باہمی رشتہ۔ ریاست کیا ہے — نکاح کی طرح ایک معاہدہ
امین شیخ الاسلام ہے — وغیرہ۔
موروثی بادشاہت — اسلام میں ملاگری (Priesthood) کی تاریخ۔
واقعہ کربلا، اس کے نتائج۔
د — اسلام اور عورت۔
ر — اسلام اور سرمایہ داری۔
۲ — موبدوں کے مذہب (Magian) میں وحی ایک پُراسرار عمل ہے۔

جس میں کوئی 'روح بولنے والے کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسلام میں وحی (آیات قرآنی کے حوالہ سے) زندگی کی ایک عالمگیر خصوصیت ہے۔ جس میں انسان خدا سے رشتہ قایم کر لیتا ہے۔ زندگی کے سرچشمے ۔ یہ اپنے آپ کو تین طریقوں سے ظاہر کرتی ہے۔ علم کے منبع کی حیثیت سے یہ ختم کر دی جاتی ہے۔ اسلام میں فکر، عمل کے بغیر نامکمل ہے۔ فکر اسلامی ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتا ہے جس میں نسل، فرقہ اور مذہب کے دقیانوسی تصورات معدوم اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ یہ روشنی ہے (اللہ نور السموات والارض)
واللہ یخرجکم من الظلمات الی النور۔

۳۔ نجات۔

نجات کیا ہے۔ نجات کس چیز سے ۔ انفرادیت کی حد بندیوں سے نہیں ۔ (وجنکم فھدا) شعور و احساس کی کشاکش سے نہیں۔ یہ کائنات میں خودی کی آزادی کا نام ہے۔ خدا کا تصور (رفیق، علی رفیق الاعلیٰ)

ا۔ نیند نجات دلاتی ہے۔ (لا تاخذہ سنۃ ولا نوم)

ب۔ شراب نجات دلاتی ہے اور شعور کی قوت اور بل کو توڑتی ہے۔

ج۔ رقص بھی نجات دلاتا ہے۔ (اھو وبا لعفو وکراما)

زمان اور مکاں سے نجات (فرار) کے یہ تمام ذرایع اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ اس کی تعلیم ہے کہ آپ فکر کے ذریعہ حقیقت کا ادراک اور معرفت حاصل کر کے اور مکان پر قبضہ حاصل کریں۔ (علیٰ سلطان)۔ تفکروا فی خلق السموات)

جب ہم اشیا کو محض اتفاقی علایق اور رشتوں کے رنگ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ تو حقیقت حاضرہ (Visible Activity) کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ خوف منتروں اور تعویذ گنڈوں سے نہیں، بلکہ رموز فطرت کو پہچان لینے سے دور ہوتا ہے۔

د۔ دنیا کا مطالعہ ایک تحریک کی حیثیت سے۔

تاریخ ۔ تصوف۔

۴۔ ایمان۔ سلامتی۔

اسلام میں اصلاحی تحریکیں

ابن تیمیہ

عبدالوہاب بابی ۔ پیشین گوئیاں	}	کم، بیش
احمدیہ ۔ سید احمد		مویدوں کی
عقلیت		تحریکیں

نئی تحریک
نبی موعود کی بعثت
احادیث (بخاری) ـــے "

نذیر نیازی، مولینا عبدالمجید سالک اور میاں محمد شفیع کی شخصیتیں ایسی نہیں جن کی اصابت رائے پر مزید اظہار خیال کی ضرورت پیش آئے۔ جو کچھ نذیر نیازی نے توضیح و تشریح کی ہے، جو کچھ مولینا سالک نے بیان کیا ہے اور جو خاکہ قرآن مجید کے حواشی کا میاں محمد شفیع نے شائع کر دیا ہے اُس کے مطالعہ سے اقبال کی آخری خواہش کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اور جیسا کہ میاں شفیع نے بھی لکھا ہے۔ قائد اعظم کی بھی یہی آرزو تھی کہ اس خاکہ کو کسی ایسی شخصیت کے سپرد کر دیں جو اس امانت کو سنبھالنے اور علامہ مرحوم کے تحریر کردہ خاکہ کے مطابق کتاب کو مکمل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہ خواہش اور یہ آرزو۔ آج تک تشنۂ تعبیر ہے۔ کاش مملکت اسلامیہ کا کوئی دردمند، باصلاحیت اور جواں حوصلہ فرد اقبال کی اس دیرینہ اور آخری خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے اور قرآن حکیم، فلسفۂ اسلام اور دین متین پر ایک ایسی کتاب معرض وجود میں آجائے جو آج اور ہمیشہ مملکت پاکستان کے لیے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے رُشد و ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

وما توفیقی الّا باللہ!

---

[1] روزنامہ "آفاق"۔ لاہور۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۵

کچھ کتاب کے بارے میں...

(۱۴)

۲۵ رمئی ۷۲ء۱۹ء کو شہزادی عابدہ سلطان — سابق ولی عہد ریاست بھوپال کی صدارت میں زیرِ اہتمام نیشنل بک سنٹر بہ اشتراک اقبال اکادمی پاکستان، پاکستان نیشنل سنٹر، آرٹس کونسل آف پاکستان اور ادارہ" یادگار غالب کراچی —" اقبال اور بھوپال" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جو مضامین نظم ونثر پڑھے گئے وہ ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے مقتدر اخبارات اور رسائل میں جو مضامین اور تبصرے شائع ہوتے انھیں بھی اس باب میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اقبال شناس ملک کی معتبر و مستند شخصیتوں کی آرا اور خیالات سے استفادہ کرسکیں اور " اقبال اور بھوپال" کے مطالعہ میں ان سے مدد مل سکے۔

یہاں یہ اظہار بھی بے جا نہ ہوگا کہ " اقبال اور بھوپال" اقبال اکادمی پاکستان کی پہلی تحقیقی کتاب ہے جس نے ۱۹۷۳ء کی تحقیقی کتابوں میں داؤد ادبی انعام حاصل کیا اور مصنف کو ۵ ہزار روپے عطا کیے گئے۔

ریاضِ فردوس میں

(نواب حمید اللہ خاں اور علامہ شیخ محمد اقبال کا منظوم مکالمہ)

نواب حمید اللہ خاں

(۱)

نگاہوں کو تمھاری جستجو تھی — کہ اک تحریرِ دلکش روبرو تھی
کتاب "اقبال اور بھوپال" ہے یہ — دلیلِ عظمتِ اقبال ہے یہ
جسے لکھا ہے تم نے دارالاقبال — وہ اس سیپارۂ دل میں ہے بھوپال
سقوطِ شرقیِ بنگلہ پر ہوں برہم — مسلماں کے تدبر کا ہے ماتم
عجم میں کوئی غیرت مند بھی ہے — روایت کا کوئی پابند بھی ہے
کوئی بوذرؓ کوئی سلمانؓ بھی ہے — دلوں میں آیۂ قرآن بھی ہے
بتاؤ کچھ تو پاکستان کا حال — ابھی اٹھ کر گئے ہیں شیرِ بنگال
نئی شیرازہ بندی بھی ہوئی ہے — کہ ملّت اب بھی نخچیرِ دوئی ہے

محبت کا کسی نے باب لکھا
حقیقی صبحِ نو کا خواب لکھا

علامہ شیخ محمد اقبال

(۲)

منم آزردہ ام از حالِ دنیا — کہ انساں کرد استحصالِ دنیا
شنیدیم آں تگاپوئے دمادم — ولے بینی کہ من گیرم نہ سازم
وہ ساری صحبتیں ہیں حافظے میں — جو ہیں اک لکھنویؔ[1] کے تذکرے میں
درندہ آج پھر انساں ہوا ہے — مسلماں کا لہو ارزاں ہوا ہے
زمینِ دشمناں خنجر بکف ہے — عرب لیکن ابھی ساغر بکف ہے
عجم کی اعلیٰحضرت کو ہے تشویش — علی اخوان و حسرت کو ہے تشویش
عجم جولاں گہِ مردانِ حُر ہے — جراحت پیشگی سامانِ حُر ہے
کہیں صیقل گرِ تیغِ دو دمِ عشق — کہیں صورت گرِ نقشِ ارمِ عشق

---

[1] مراد صہبا لکھنوی

روایت گرچہ ہے پامال پھر بھی — دلوں میں موجزن ہے دردمندی
زمینِ پاک ہے آسودۂ شوق — مری فردوس ہے معمورۂ شوق
وہاں باقی ابھی خیبر شکن ہیں — ہزاروں دل محمد کا وطن ہیں
وفا کے حرف جب لکھے گئے ہیں
جگر کے خون سے روشن ہوئے ہیں

(تقریب رونمائی میں پڑھی گئی) [۱]
—— قمر ہاشمی

ارمغانِ اقبال

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می دانم — مزاجِ ناقہ سے مانندِ عرفی میں بھی واقف ہوں
چوں محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم — جو محمل ہو گراں، میں تیز کرتا ہوں حدی خوانی
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — حمید اللہ خاں تجھ سے فروغ ملک و ملت ہے
ز الطافِ تو موج لالہ خیزد از خیابانم — ترے الطاف سے گلشن میں فصلِ گل کی ارزانی
طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را — بجا ہے اہلِ معنی کو طوافِ مرقدِ حالی
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم — کہ ہے اس کی نواؤں سے دلوں میں حشرسامانی
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم — چلیں اس کی لحد پر فقر و شاہی ہم قدم ہو کر
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم — میں برگِ گل لٹاؤں، آپ کیجیے گوہر افشانی

—— اقبال
—— ترجمہ: سحر انصاری

تقریب رونمائی میں پڑھی گئی [۲]

انتسابِ ضربِ کلیم

اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال کی خدمت میں

زمانہ با اُمَمِ ایشیا چہ کرد و کند — درازدستیٔ تیرہ شبی کو کیا کہیے
کسے نہ بود کہ ایں داستاں فرو خواند — یہ لطفِ خاص ہے اقوام ایشیا کیلئے
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیرِ من است — وہ نورِ دیدۂ بھوپال ہمدمِ اقبالؒ
دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند — قبول صورتِ شاہین ہر فضا کیلئے

---

[۱] ماہنامہ افکار - کراچی - جون ۱۹۷۳ء - صفحہ ۲۶ - ۲۷
[۲] ایضاً، صفحہ ۲۵

بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من اسی کے نام سے منسوب تحفۂ درویش
"کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند" وہی ہے آبِ بقا چشمۂ وفا کے لیے
——— اقبال. ——— آزاد ترجمہ، انور حارث

(تقریب رونمائی میں پڑھی گئی)۔

خطبۂ صدارت

محترم مصنف و عزیز بانو و معزز حضرات!

آپ نے "اقبال اور بھوپال" کی افتتاحی یا تعارفی تقریب میں مجھے صدارت کی دعوت دے کر جس امتیاز کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اس کا ذاتی طور پر ممنون ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور میرے لیے یہ ایک بڑا خوش گوار فرض ہوتا کہ میں چند رسمی و اخلاقی خوش نما جملوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کر کے اس فرض سے سبک دوشی حاصل کر لیتی ———

لیکن بات اتنی ہی نہیں ———

بات تو یہ ہے کہ صہبا صاحب کی اس بارہ سال کی محنت، اس کاوش، اس تحقیق اور اس قابلِ قدر تصنیف نے جہاں علامہ اقبال کی زندگی کے یادل کے اس گوشے پر پہلی بار روشنی ڈالی ہے جس سے عام طور پر لوگ کم واقف تھے۔ وہاں بھوپال کی روایات۔ تاریخی کردار۔ مذہبی۔ علمی۔ ادبی و قومی خدمات کی بھی نشان دہی پاکستان میں پہلی بار صہبا صاحب کی ہی طرف سے کی گئی ہے۔

اس لیے میری آج کی مسرتوں میں، میرے فخر میں، میرے امتیاز میں اور میری سپاس گزاری میں، میں تنہا نہیں، بلکہ اپنے تمام اہلِ بھوپال کو شریک محسوس کرتی ہوں اور اُن سب کی طرف سے بھی ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتی ہوں ———

عزیز و قابلِ فخر مصنف! ———

آج ہماری تہنیت میں ایک بہت بڑی مسرت یہ بھی ہے کہ تاریخ بھوپال کے شان دار اوراق میں ایک اور جگمگاتے باب کا اضافہ ایک فرزندِ بھوپال ہی کے قلم سے ہوا ———

ساتھ ہی ساتھ ہمیں اقبال اکادمی اور ان تمام بزرگ حضرات کا بھی ممنون ہونا چاہیے۔ جنھوں نے اس تصنیف کی ترتیب و تدوین و اشاعت میں اتنا پُرخلوص تعاون کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

"اقبال اور بھوپال" کے متعلق سب سے پہلے تو میں اس بات کا اعتراف کروں گی کہ مجھے قطعی اُمید نہ تھی کہ کوئی شخص اس تحقیق و جستجو میں کامیاب ہو سکے گا۔ کیوں کہ ان واقعات کو گزرے زمانہ ہو گیا۔ قیامِ پاکستان کے دوران جو لاکھوں افراد اِدھر سے اُدھر ہوئے۔ ان میں جان و مال کا نقصان تو ہوا ہی ہوا ——— بہت سے رابطے ٹوٹ گئے۔ قیمتی دستاویزیں، خطوط، کتابیں اس طرح ضائع ہو گئیں کہ پھر اُن کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ خود میری کتابیں اور بیشتر کاغذات کا بھی یہی حشر ہوا۔

اس لیے مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ "اقبال اور بھوپال" کے متعلق صہبا صاحب مجھ سے بھی کچھ معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو مجھے افسوس و مایوسی ہوئی کہ میرے پاس سوائے اُن دو نسخوں کے جو علامہ اقبال نے مجھے بھوپال میں بطور تحفہ دیے تھے کوئی دوسرا تحریری اور ٹھوس مواد نہ تھا جس کو زندگی کے مستند واقعات کی تائید کے طور پر پیش کیا جا سکے ———

مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس تصنیف میں صہبا صاحب نے تحقیق کی دیانت کا پورا پورا حق کیوں کر ادا کیا ہے۔ کہاں کہاں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ واقعات، خطوط وغیرہ اکٹھے کیے ہیں اور کتنے دلچسپ اور اچھے انداز میں ان کو پیش کیا ہے۔

یہ کتاب جہاں ماضی پر روشنی ڈالتی ہے وہاں مستقبل کے لیے دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں بھوپال کے اُس دَور کے نقشے سامنے آ گئے جن میں علامہ اقبال، سر راس مسعود، شعیب قریشی، مولانا محمد علی، شوکت علی، مسز نائیڈو، بی اماں، پنڈت نہرو، گاندھی جی، قائداعظم اور بہت سے اکابر کی مسلسل آمد و رفت رہتی تھی۔

میں نے سوچا ———

"اقبال اور بھوپال"، قائداعظم و مسلم لیگ، علی گڑھ یونیورسٹی اور نواب حمید اللہ خاں، یہ سب ایک ہی سلسلے کی وہ کڑیاں تھیں جن کا مجموعی نام پاکستان تھا ———

پھر میں نے سوچا :— کہ ان جیسی تاریخ ساز شخصیتوں کا یا اداروں کا ماضی سے تو بے شک رشتہ ہے کہ تاریخ بنا گئے۔ ایک ملک بنا گئے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی و نظریاتی سلطنت بنا گئے۔ مگر حال و مستقبل سے ان کا کتنا تعلق باقی رہ گیا ہے ؟ ؟ ؟ ———

اس پر آپ بھی غور فرمائیں ———

علامہ اقبال آج ہمارے ہاں ایک تاریخ ساز مفکر، عظیم شاعر، فلسفی اور دانش وروں کے دیوتا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے پجاریوں کے لیے اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا :

نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں، نہ وہ عشق کی رہیں گرمیاں
نہ وہ غزنوی کی تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز کی

یومِ اقبال تو منایا جاتا ہے۔ قائداعظم کی شان دار سال گرہ بھی ہوتی ہے۔ یومِ پاکستان پر چراغاں ہوتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ توپوں کی سلامیاں لی جاتی ہیں۔ پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ پھر ——— کیوں پاکستانیوں کا دل ہے کہ بجھا بجھا جاتا ہے۔ نگاہیں جھکی جھکی جاتی ہیں ———

نہ وہ اسلام کا سنگھار ہے جو بھوپال کے پتے پتے، بوٹے بوٹے سے نکھر کر اس کے حُسن کو دوبالا کرتا تھا۔ نہ وہ علی گڑھ کی بہار ہے۔ جہاں کے نوجوان متوالے ایک قوم۔ ایک ملت کے نشے میں اٹھلاتے تھے۔ نہ وہ مسلم لیگ ہے۔ جس کا ادنیٰ کارکن بھی نظریۂ پاکستان کو جزوِ ایمان تصور کرتا تھا۔

یہ وہی سرزمین ہے جس کو قائداعظم بانیٔ پاکستان کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ یہ وہی ملک ہے جس نے شاعرِ مشرق کو جنم دیا ہے۔ اور یہ وہی قوم ہے جس نے تعمیرِ پاکستان کو عبادت سمجھا تھا ———

بیس، بائیس سال کے قلیل عرصہ میں عبادت گناہ میں تبدیل ہو گئی۔ اتحاد مختلف قومیتوں کو جنم دے رہا ہے۔ علاقائی تعصبات نے اخوت و محبت کی جگہ لے لی ہے۔ مسلمان نے مسلمان کے خلاف، پاکستان نے پاکستان کے

خلاف وہ ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے کہ تقسیم ہند کے فسادات بھی شرما گئے۔

میں نے سوچا ——

ایسی فضا میں کتنے لوگوں کو اس سے دلچسپی رہ گئی ہوگی کہ علامہ اقبال کا بھوپال اور فرماں روائے بھوپال سے کیا تعلق تھا۔ کیا رشتہ تھا۔ کیا پس منظر تھا؟ ——

بہر حال۔ واقعات و حالات تو اپنی جگہ موجود ہیں۔ علامہ اقبال اور میرے والد مرحوم میں جو قدریں مشترک تھیں۔ ان کی بنیاد علی گڑھ یونیورسٹی تھی۔ عالم اسلام کی ترقی، فلاح و بہبود تھی۔ جو کسی خاص علاقہ سے مخصوص نہ تھی۔
اکثر میرے والد یہ مصرعہ گنگنایا کرتے تھے:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور یہی دُھن ہمارے تمام سابقہ اکابر کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ اگر علامہ اقبال کا تصور، ان کا پیغام ان کی فکر، ان کی دُعائیں یا ان کا شکوہ۔ تمام عالم اسلام کے لیے یکساں تھا، تو قائداعظم بھی صوبہ سندھ تک محدود نہ تھے۔ اور نواب حمید اللہ خاں بھوپال ہی نہیں، بلکہ بھوپال کی اس تاریخ کے محافظ و علم بردار تھے۔ جس نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے بھوپال و بیرونِ بھوپال۔ برصغیر و بیرونِ برصغیر مسلسل دو سو پچاس (۲۵۰) سال خدمات انجام دیں۔
اور یہی وہ عظیم رشتے تھے جو ہمارے بزرگوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے تھے۔ منزل سب کی ایک تھی۔ فرائض جدا جدا تھے۔ اُس دَور کے ہر فرد نے، ہر طبقے نے بڑی دیانت داری اور بڑے خلوص کے ساتھ اپنا اپنا فرض ادا کیا۔ بڑی عظیم الشان قربانیاں دے کر پاکستان بنایا اور اس طرح ہم کو اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک فقیدُ المثالی موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ——

مختلف زبانیں تو اس وقت بھی تھیں۔ صوبے تو اس وقت بھی تھے۔ مگر کسی نے بھی اُن کو مسلمانوں کے اتحاد و ارتقا کے لیے رکاوٹ نہ سمجھا تھا۔ ایک ہی نعرہ تھا کہ: ——

"مسلمان ایک قوم ہے اور برصغیر میں ان کی نمایندگی کا حقِ واحد مسلم لیگ ہی کو ہے۔"

اسی نکتہ کو نواب حمید اللہ خاں صاحب نے جب گاندھی جی سے تحریری طور پر تسلیم کرالیا —— تو ایک طرف تو گاندھی جی نے فرمایا: ——

I HAVE MADE A HIMALIAN BLUNDER

دوسری طرف قیامِ پاکستان کا جمہوری جواز پیدا ہوگیا اور قیام پاکستان کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ اُس وقت ہمارے تمام بزرگوں کو یقین تھا کہ جب برصغیر کے مسلمان متحد ہوکر سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے قیام میں کامیاب ہوجائیں گے تو دنیا کے دوسرے مسلمان خود بخود اس طرف متوجہ ہوں گے۔ آپس کے اتحاد کی خود بخود ترغیب ہوگی اور اس برادرانہ تعلق سے تمام دنیا کے مسلمان۔ ایک دوسرے کے شریکِ کار و ممد و معاون بن جائیں گے۔

انھیں بنیادوں پر گفتگو ہوتی تھی جس کو بارہا میں نے خود بھی سُنا ہے۔ قائدِ اعظم۔ سر آغا خان، علامہ اقبال، میرے والد مرحوم، سر راس مسعود، چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، ڈاکٹر انصاری وغیرہ وغیرہ —— سب متفق تھے۔ سب کے دل میں یہی آرزوئیں تھیں۔ یہی ولولے تھے۔ مگر کتنے قلیل عرصہ میں بجائے اتحاد و اخوت کے المیہ مشرقی پاکستان رونما ہوا؟ اس سے صرف ہم ہی مجروح نہ ہوتے۔ تمام عالمِ اسلام کو زبردست دھچکا لگا ——!

بہر حال یہ تقریب ایک مصنف کی بارہ سالہ جدوجہد کی کامیابی پہ مسرت اور خوشی کے اظہار کے لیے منعقد کی گئی

ہے۔ اس میں میرا یہ ماتم بے موقع بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن جب یہ کتاب تاریخی بھی ہے مستند بھی ہے۔ اقبال اور بھوپال کے متعلق بھی ہے۔ تو تاریخ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اگر ماضی کے واقعات و مستقبل کے امکانات سے صرفِ نظر کیا جائے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبال اگر مفکر تھے تو اہلِ بھوپال اہلِ عمل تھے۔ اور کتنے عزم و پختگی کے ساتھ مسلمانوں کی عام فلاح و بہبود کے لیے بالخصوص تعمیرِ پاکستان کے لیے بھوپال نے اپنے، اپنے خاندان کے، اپنے ورثا کے مفادات کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے تعمیرِ پاکستان میں کتنا بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ——— !

آج کی محفل میں مفکر بھی ہیں، مصنف بھی، شاعر بھی، اہلِ قلم بھی۔ اقبال کے جانشین بھی ہیں، بھوپال کے وارث بھی۔ آپ کی اس جانشینی کا حق اسی وقت ادا ہوگا کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کو آپ اُسی طرح جاری رکھیں جس طرح آپ کے ہمارے بزرگوں نے طاقتِ برطانیہ اور غیر مسلم اکثریت کے باوجود جاری رکھا اور کامیاب بنایا تھا ——— وہ دَور ——— دَورِ غلامی کہلاتا تھا۔ آج آپ آزاد بھی ہیں، خود مختار بھی، اس وقت آپ کو متعدد اختلافات سے سابقہ تھا ——— آج آپ کو صرف اپنے مسلمان بھائیوں کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ محبت اور پیار سے متحد کرنا ہے۔ دلائل کے ذریعہ یقین دلانا ہے کہ ہماری سب کی بقا اور ترقی کا راز۔ اتحاد و محبت میں ہے۔ تفرقہ و تعصب میں نہیں ہے۔ یہ تصور غلط ہے کہ سیاسی لیڈری یا منسٹری کے بغیر کوئی خدمت نہیں انجام پا سکتی، یا تعصب کا جواب تعصب سے دینا چاہیے۔ یا طاقت کا مظاہرہ کر کے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہیے۔ یہ طریقہ غیر مہذب اور غیر جمہوری ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔

اس لیے میرے بزرگو، میرے بھائیو، میری بہنو! ہمارا ایک ہی موقف ہے ایک ہی نعرہ ہے ———

مسلمان ایک ہی قوم ہیں اور جہاں جہاں مسلمان ہیں، وہاں وہاں پاکستان ہے۔ مسلمان جغرافیائی حدود، نسلی امتیاز، لسانی فرق وغیرہ کا کب پابند رہا ہے:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا   پاکستان پائندہ باد

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)[۱] ——— شہزادی عابدہ سلطان

نئے عنوان کی کتاب

جنابِ صدر - برادرم صہبا، خواتین و حضرات ———

میں صہبا صاحب کو جسمانی طور پر ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں پاتا۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ وہ اتنے بھاری بھرکم کام کر ڈالتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ بھاری بھرکم کام کی تازہ ترین مثال "اقبال اور بھوپال" ہے۔ میں نے کتاب پڑھی ہے اور پوری پڑھی ہے۔ اقبال پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ شاید اتنی ہندوستان میں رہنے والے کسی اردو یا فارسی کے شاعر پر غالب کے سوا نہیں لکھی گئی ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" ایک نئے عنوان کی کتاب ہے اور مجھے اس کتاب میں باوجود اس کے کہ اس کو محدود تحقیق یا جزوی تحقیق کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے ایسے مواد ملے ہیں اور بہت سی ایسی محققانہ باتیں

۱۔ ماہنامہ افکار، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۳۰ تا ۳۲

ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت کے بہت سے نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ ان کے ساتھ اور بہت سی اہم شخصیتوں کے بارے میں ہم کو معلومات ہوتی ہیں۔ مثلاً سر راس مسعود، نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال ــــ ان لوگوں کی شخصیت پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ اگر یہ کتاب نہ لکھی گئی ہوتی، تو شاید ہم ان لوگوں سے بالکل ناواقف رہتے۔ صہبا صاحب نے بڑی محنت اور کاوش اور تحقیق اور دیانت داری اور اسی کے ساتھ ساتھ بغیر کسی قسم کے تصرف کے مواد اکٹھا کیا ہے۔ اقبال کے جتنے خطوط انھوں نے اکٹھا کیے ہیں، ان کی داد مجھ سے پیشتر مقررین اور مقالہ پڑھنے والوں نے دی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ جو خطوط مطبوعہ یا غیر مطبوعہ اب تک لوگوں کی نظر سے گزرے ہیں اُن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سے، ان کی شخصیت اور شاعری سے ہم پہلے بھی واقف تھے۔ لیکن ان خطوط سے ان کی شخصیت، ان کے قلندرانہ مزاج، ان کی تخلیقِ شعری اور ان کی بہت سی اور انسانی اور شعری حیثیتوں پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے۔

اقبال کو اپنے کام کے ساتھ جو کام وہ اپنے ذمے لے لیتے تھے یا اس کے لیے حامی بھر لیتے تھے۔ سچی لگن ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال جس کی طرف بعض مقررین نے اشارا کیا ہے۔ جشنِ حالی ہے جو ۱۹۳۵ء میں پانی پت کے مقام پر ہوا تھا۔ کس بے چینی کے ساتھ راس مسعود کو بار بار خط لکھتے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس لیے کہ وہ نواب بھوپال کو راضی رکھیں۔ اور ان کو اس بات پر آمادہ کیے رہیں کہ وہ آکر صدارت کریں جشنِ حالی کی۔ میں جشنِ حالی کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میں خود وہاں موجود تھا۔ ایک منصبی حیثیت سے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پبلسٹی آفیسر تھا اور مجھے وہاں بھیجا گیا تھا ــــ !

اقبال، راس مسعود اور نواب بھوپال سے پہلی دفعہ ملنے کا موقع مجھے وہیں ملا۔ وہ میری ڈاکٹر اقبال سے پہلی ملاقات تھی اور آخری ملاقات بھی ــــ اور مجھے یاد ہے صہبا صاحب کی کتاب نے وہ یاد تازہ کر دی کہ وہ کس قدر بیمار تھے۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ یہی نہیں مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا تھا کہ بات بات پر ان پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ چنانچہ اگر کوئی سوال کرتا تھا تو زحمت بھی ہوتی تھی۔ میں نے بھی ان سے دو تین سوالات کیے تھے۔ پھر احساس یہ ہوا کہ ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے یا آواز چونکہ بیٹھی ہوئی ہے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ پھر میں نے سوال نہیں کیا۔ اور انھوں نے ایک دن ہی قیام کیا۔ پھر اسی وقت وہ دلی چلے گئے اور دلی سے لاہور ــــ ان تمام باتوں کی تفصیلی معلومات صہبا صاحب نے جس طرح سے اپنی کتاب میں فراہم کی ہیں ــــ وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں اور ان سے آیندہ لکھنے والے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ تو اس کتاب کی اہمیت ہوئی۔ ہم کو یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوتی ہے کہ صہبا صاحب نے بہت مدہم، بہت ہموار اور بہت ستھرے، شستہ طریقہ پر تحقیق کے بعد جو کچھ مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس کو سلیقہ سے پیش کیا۔ ان کی عبارت میں شگفتگی ہے اور دل کشی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ صہبا صاحب ایک محقق بھی ہو سکتے ہیں اور تحقیق کو شگفتہ انداز، دلچسپ انداز ــــ اس انداز میں کہ شروع سے آخر تک کتاب میں دلچسپی قایم رہے، اس انداز میں پیش کر سکتے ہیں ــــ مجھے یہ احساس اس وقت ہوا جب کہ میں نے "اقبال اور بھوپال" ان کی یہ تازہ تصنیف اٹھائی تو آپ یقین مانیے کہ اس کتاب کو ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا تھا اور میں نے وہ کتاب دو دن میں پڑھی۔ انھوں نے اس کتاب میں تحقیق کی بھی داد دی ہے اور شخصیت نگاری کے بھی آداب برتے ہیں۔ اور بعض شخصیتوں کے جیسا کہ میں نے کہا بہت سے ایسے گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جو اگر یہ کتاب نہ چھپتی تو شاید ہمیشہ کے لیے پوشیدہ رہتے۔ مجھے شاید اس سے زیادہ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے پیشتر لوگوں نے مقالے پڑھے ہیں۔ تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ لوگ اس کو خریدیں گے اس لیے کہ زبانی

قدر تو بہت عام ہے۔ کتاب کی اصل قدر تو یہی ہے کہ اس کی اشاعت ہو۔ اس کی بکری ہو۔ میرا خیال ہے اور مجھے امید ہے کہ صہبا صاحب کی کتاب کی مانگ ہوگی اور خاص کر کے اقبال انتھوزیاسٹ IQBAL ENTHUSIAST جو اقبال کے گرویدہ لوگ ہیں ان کی شاعری، ان کی شخصیت کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں، ان میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

——— پروفیسر مجنوں گورکھپوری

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)[1]

اقبالیات میں ایک نیا موضوع

اقبال سے تو شاید ہم سب کو برابر کی نسبت رہی ہے لیکن سرزمینِ بھوپال سے تعلق اور رفیق دیرینہ صہبا لکھنوی سے تعلق خاطر کے جرم میں ماخوذ ہو کر میں آج آپ کے سامنے پیش ہوا ہوں۔ میرے لیے یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ خوش بختی سے، اقبال اور بھوپال کے جس مسودے کو مجھے دیکھنے کا موقع ملا تھا، وہ آج نظر افروز کتاب کی صورت میں اربابِ نظر کے سامنے ہے۔ اس کی ترتیب و تکمیل میں جو مدارج طے ہوئے ہیں اور صہبا لکھنوی کو جن دقتوں سے دست و گریباں ہونا پڑا ہے، اس کا بھی مجھے تھوڑا بہت علم ہوتا رہا ہے ——— بہرحال اس راہِ جستجو میں صہبا لکھنوی پر جو گزری ہو، یہ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ "اقبال اور بھوپال" مطالعۂ اقبال اور اقبالیات کے سلسلے میں ایک لائقِ ستایش کاوشِ تحقیق ہے۔

شاید آج تحقیق سے زیادہ کوئی شعبۂ علم تختۂ مشق نہیں رہا ہے۔ خصوصاً تحقیقِ ادبیات کو ادب کے منشیوں نے نقل، خلاصہ نگاری اور بسیار نویسی کا مترادف اور بہانہ بنا لیا ہے ——— محقق ہونے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ چند کتابوں کو سامنے رکھیے اور ان کے متن کی تفصیلات بتاتے چلے جائیے۔ نہ کسی مبسوط نظر کی ضرورت ہے، نہ سماجی پس منظر سے کوئی واسطہ ہے اور نہ انسانی رابطوں سے کوئی غرض ہے۔ اس طرح کی تحقیق نہ ادبی تصورات کے تجزیے کے بکھیڑے میں پڑتی ہے اور نہ ان تصورات کو مجموعی انسانی علوم سے منسلک کرنے کا جھمیلا پالتی ہے۔ تھوڑی سی محنت سے رنگ چوکھا آتا ہے۔ اس تحقیق میں خیال کو جگانے اور زندگی کو روشن کرنے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تو نہ سہی۔ خواہ یہ دادِ تحقیق الماریوں کی زینت ہی کیوں نہ بنی رہے، صاحبِ تحقیق کا شمار تو ادب کے جغادریوں میں ہو جاتا ہے۔ "اقبال اور بھوپال" کے مطالعہ سے مجھے سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی منشیانہ روایت سے الگ ہے۔ صہبا لکھنوی نے اپنے مواد کی جستجو میں کم و بیش گیارہ برس صرف کیے ہیں۔ واقعات کی صداقت کو پرکھنے کے لیے دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور مختلف ماخذات و ذرائع سے اپنی کتاب کے لیے مستند واقعات فراہم کیے ہیں۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ اقبال اور بھوپال کے مطالعہ سے صرف چند خشک اور بے جان کتابوں کا علم نہیں ہوتا، بلکہ ایک دور کی تہذیب، اس کا ذہنی و فکری پس منظر اور اس تہذیب کے پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگا رنگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے سے اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی و فکری رجحانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس طرح صہبا لکھنوی کی تحقیق بوسیدہ ہڈیوں کو منظرِ عام پر نہیں لاتی، ذہن کی زندہ و فعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔

---

[1] ماہنامہ افکار۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۴، ۳۵

علم و ادب کا ذوق ایک زمانے سے خطۂ بھوپال کے باشندوں کا حصۂ خاص رہا ہے اور جاگیردارانہ سماج کے باوصف علم و ادب کی قدردانی کی روایت کو اس خطے نے خوب پروان چڑھایا ہے۔ شبلی اور اقبال جیسے دیو پیکر مشاہیر ادب کے علمی و تحقیقی کاموں میں اعانت کا فخر بھوپال کو حاصل ہوا ہے۔ صہبا لکھنوی نے جہاں ایک جانب بھوپال کی علمی فضا اور ادبی کارناموں کے پس منظر کو تاریخی حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے، وہاں دار الاقبال بھوپال سے شاعر، عالم اور فلسفی کے روابط کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں "اقبال اور بھوپال" کے دو بظاہر الگ الگ موضوعات میں اس علمی اور فکری وحدت کو دریافت کرنے کی کوشش جھلکتی ہے جو اقبال کو بھوپال کے قریب لائی اور جس نے بھوپال کے باشندوں کے لیے اقبال کو روشنی کا مینار بنا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ صہبا لکھنوی کی اس کتاب سے چند نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان سے خاص طور پر اس برصغیر کے مسلمانوں کے اس فکری پس منظر کی تلاش و جستجو کو تحریک ملتی ہے جس نے درۂ خیبر سے لے کر شیکناف اور راس کماری تک نئی بیداری کی ہر دوڑانے کے ساتھ بعض تہذیبی نقش قایم کیے تھے اور خطۂ بھوپال نے بھی اس نقش آرائی میں اہم حصہ لیا تھا۔ اس سلسلۂ فکر کا ایک مظہر تحریکِ پاکستان اور مملکتِ پاکستان بھی ہے۔ امید ہے کہ "اقبال اور بھوپال" میں جن امور کی جانب چند اشارے ملتے ہیں، ان کی بنیادوں پر تحقیق کی نئی عمارتیں استوار کی جائیں گی۔ اس بازخوانی میں سینے کے داغوں کو تازہ رکھنے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے لیے راہوں کے تعین میں مدد ملے گی۔ کوئی ثقافت و سیاست ماضی سے بالکل بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اس کے برخلاف ماضی کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ شعور کی سطح کو بلند کرتا اور لائحہ عمل کے انتخاب میں معاون ہوتا ہے۔ اقبال فکر و عمل کے شاعر ہیں۔ اسی لیے اقبال کے ذکر و فکر و جذب کے تذکرے اور بھوپال میں ان کے کلام سے حاصل کردہ سرور و سوز و مستی کی روایت میں آج کے لیے بھی بہت کچھ سامانِ بصیرت موجود ہے۔

"اقبال اور بھوپال" میں اقبال کی بعض نظموں اور بعض اشعار کی عقبی زمین اور محرکات اس طرح سامنے آئے ہیں کہ ان نظموں اور ان اشعار کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی شخصیت کے بعض نجی اور نازک گوشے ان کی قدرِ انسانیت پر روشنی ڈالتے اور ان کی زندگی میں خلوص و دل نوازی کے نقوش ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اقبال کے چند خطوط بھی جو اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں جہاں اقبال کے بھوپال اور بھوپال کی ممتاز شخصیتوں سے خصوصی روابط کی نشان دہی کرتے وہاں ان کی سیرت کے بعض دلکش رنگوں کے ترجمان ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعض جگہ تصوراتِ فن کے بارے میں خود اقبال کے اقوال بحوالہ راوی درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کوئی تصور بھی نیا نہیں ہے اور نہ پہلی بار پیش ہوا ہے لیکن ان سے اقبال کی قدآور شخصیت کے سمجھنے میں ضرور مدد ملتی ہے۔ مثلاً اقبال کا یہ تصورِ فن کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا، خود ان کے فن کی بلندی کا شارح ہے۔ اقبال کے راس مسعود اور دیگر احباب سے بے تکلفانہ تعلقات میں بھی جس مشرقی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی جھلک ملتی ہے وہ ایک دورِ تہذیب کی گواہی دیتی ہے۔ ان تعلقات سے جہاں اقبال کی شائستگی اور ضبط و نظم کا پتہ چلتا ہے وہاں ایک دور کی اقدارِ شائستگی کا حال بھی کھلتا ہے۔ صہبا لکھنوی نے اپنے موضوع کا دل نشیں انداز سے جائزہ لیا ہے اور اقبال کی احسان شناسی، دوست نوازی، صاف دلی اور اعلیٰ ظرفی کے نقوش کچھ اس طرح پیش کیے ہیں کہ خود اقبال کے لفظوں میں خیاباں سے موجِ لالہ کے اٹھنے کا گمان ہوتا ہے۔ اپنی تلاش و جستجو میں صہبا لکھنوی نے بعض نئے گوشے دریافت کیے ہیں اور انھیں پہلی بار اس کتاب کے ذریعہ

متعارف کرایا ہے۔ اس طرح تحقیق، تاریخ اور سیرت نگاری میں جو تخلیقی ہم آہنگی قایم ہوئی ہے، وہ اس کتاب کا بہت بڑا وصف ہے۔ اس سے ایک عمر کے ادبی انہماک کا پتہ چلتا ہے۔

اقبال کی مجوزہ کتاب کے خاکے میں جو صہبا لکھنوی نے میاں محمد شفیع کے حوالے سے پیش کیا ہے، اقتصادی مساوات کو بھی معاشرے کی ضرورت سمجھا گیا ہے۔ اقبال کی فکر سے آگاہی رکھنے والوں کے لیے یہ کوئی نیا نکتہ نہیں۔ لیکن اقبال کی شاعری کو اپنی رجعت پسندی کا شکار بنانے والوں کے لیے ضرور ایک تازیانہ ہے۔ بحیثیت مجموعی "اقبال اور بھوپال" کے مطالعہ سے زندگی کی عظمت و سعادت کا نقش ذہن پر مرتسم ہوتا ہے۔ صہبا لکھنوی کے ساتھ ساتھ اقبال اکیڈمی اور نیشنل بک سینٹر بھی سزاوار ستائش ہیں کہ اقبال کے سلسلے میں ایک اچھی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے ؎

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

——— ڈاکٹر حنیف فوق

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا) [۱]

اقبال اور بھوپال

صہبا لکھنوی سے میرے برس ہا برس کے تعلقات ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں صہبا جن ادوار سے گزرے ہیں ان سے میں بخوبی واقف ہوں۔ ایک عرصہ گزرا جب صہبا نے کہا تھا کہ بھوپال کی ریاست سے اقبال کے گہرے روابط تھے اور ایک کتاب "اقبال اور بھوپال" لکھی جا سکتی ہے۔ ایک دو سال کے بعد انھوں نے کہا میں نے کتاب پر کام شروع کر دیا ہے۔ مواد کی فراہمی مشکل بھی۔ لیکن ناممکن نہیں ہے۔ اس زمانے میں عبدالقوی دسنوی کی کتاب کا تذکرہ ہوا۔ صہبا لکھنوی کی رائے میں یہ کتاب اقبال اور بھوپال کے روابط پر تشنہ تھی۔ اہلِ بھوپال اور اقبال سے قریبی تعلق رکھنے والوں کی جانب سے صہبا لکھنوی کے خطوط کے جوابات آنے شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ صہبا کا کام آگے بڑھا۔ لیکن میں نے صہبا لکھنوی کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے ——— میں سوچتا تھا کہ "اقبال اور بھوپال کے عنوان سے تفصیلی کتاب بھی لکھی جائے تو مطالعہ اقبال میں اس کی کیا اہمیت ہوگی۔ اس کے علاوہ صہبا لکھنوی کے بارے میں بھی مجھے کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔ میں انھیں ایک دیانت دار اور محنتی ادبی صحافی سمجھتا تھا۔ لیکن ان سے کسی اہم تحقیقی کام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ میں صہبا لکھنوی کے اتنے قریب رہ کر بھی ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا اور مجھے اپنے استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک بات یاد آئی جو وہ اپنے طالب علموں سے گاہے بہ گاہے کہا کرتے تھے کہ آدمی ٹھک ٹھک کرتا ہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہتا ہے۔ صہبا لکھنوی کی کتاب مکمل ہوئی تو یہ جملہ ذہن کے کسی چھپے ہوئے گوشے سے نکل کر روشنی میں آگیا اور پتہ چلا کہ ہم انسان کی محنت اور ذہانت کے بارے میں جو اندازے قایم کرتے ہیں۔

---

[۱] ماہنامہ افکار۔ کراچی، جولائی ۱۹۳۷ء۔ صفحہ ۱۲ تا ۱۴

وہ اکثر صحیح نہیں ہوتے۔ کیوں کہ کام کرنے والے اپنی لگن میں محو، دن رات اپنی گوشوں میں لگے رہتے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں کچھ بھی سوچتے رہیں لیکن وقت کی میزان پر وہی پورے اُترتے ہیں اور اپنی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر لیتے ہیں۔ صہبا لکھنوی میں بھی کام کرنے کی بے پناہ دھن تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی صحت کی خرابی اور گھریلو اور کاروباری مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب کو مکمل کر کے ہی دم لیا۔

صہبا لکھنوی کی کتاب "اقبال اور بھوپال" کیسی کتاب ہے۔ اس میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ عرض کر دوں کہ عنوان سے آپ لوگ بھی میری ہی طرح اس فریب میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ ہو گی کوئی کتاب جس میں ریاست بھوپال اور نواب بھوپال سے اقبال کے چند رشتوں کو بیان کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ایک بار کتاب پڑھ لیجیے پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کتاب برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور ایک ایسی مستند ادبی اور تاریخی دستاویز ہے جسے نہ ادب کا آدمی فراموش کر سکتا ہے اور نہ تاریخ کا ——

میں تحقیق کے فن سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں رکھتا، لیکن مجھے حیرت ہے کہ صہبا لکھنوی نے مواد کی فراہمی اور ترتیب اور حقایق کی چھان پھٹک کا ایسا سلیقہ کہاں سے برتا ہے۔ لے دے کر ذہن اس خیال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ وہ پروفیسر نواب علی کے بھتیجے اور داماد ہیں۔ نواب علی صاحب کی دقت نظر اور تحقیقی لگن سے کون واقف نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ گھر کی یہی روایت صہبا کے خون میں رچ گئی ہوگی اور اس نے صہبا لکھنوی کو اُکسایا بھی ہوگا کہ تحقیق کا کوئی کارنامہ کر کے دکھاؤ ——

صہبا لکھنوی نے اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ "اقبال اور بھوپال کے تعلق سے جو کچھ میسر آسکتا تھا۔ حاصل کیا اور اسے ایک لڑی میں پرو دیا۔ نتیجہ کے طور پر ان کی کتاب تاریخ کے ایک پورے دور کو احاطہ کر لیتی ہے۔ اس میں بھوپال کی معاشرت کی دل کشی اور خوبصورتی ہے۔ نواب حمید اللہ خاں کی ذہانت، تدبر اور علم دوستی کا بھرپور عکس ہے۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور شخصیت کی تابناکی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں یہ کتاب بھوپال سے نکل کر پورے برصغیر کے حالات پر محیط ہے۔ یہ برصغیر کے ادب و ثقافت، معاشرت و تہذیب اور سیاست و تدبر کا آئینہ بن گئی ہے۔ اس میں شخصیتوں کے ایسے خاکے ہیں جو ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ قدسی صاحب، اقبال اور ممنون کی شخصیتوں کو صہبا لکھنوی کے قلم نے لازوال بنا دیا ہے۔ راس مسعود اور لیڈی مسعود سے اقبال کے روابط پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی دوستی اس کتاب کا ایک مکمل باب ہے جس کا ایک سرا راس مسعود کی علم دوستی ہے اور دوسرا سرا شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شاعرانہ اور ملی بصیرت ہے۔

اور بہت سی باتیں اس کتاب کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں نے یہاں صرف تعارفی باتیں لکھی ہیں۔ باقی آپ کو خود پڑھنی ہوں گی۔ مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے کہ صہبا لکھنوی نے یہ کتاب لکھ کر اپنے گھر کی روایت ہی کو نہیں اردو تحقیق کو ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ لیکن ان کا اسلوب پروفیسر نواب علی کے بجائے شبلی کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں شگفتگی اور رعنائی ہے۔ وہ تحقیق کی باتیں خشک پیرائے میں لکھنے کے بجائے اپنی بات کو بڑے دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اسلوب کا تجزیہ بڑا مشکل کام ہے لیکن مجھے اس کے ایک سبب کا بالکل صحیح اندازہ ہوا ہے۔ انھیں اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے کام سے اتنا گہرا شغف رہا ہے کہ زبان اپنی تمام تر دل کشی اور خوبصورتی کے ساتھ ان کے نوکِ قلم سے برابر ٹپکتی رہی ہے۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ یہ کتاب اہل بھوپال کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ کیوں کہ کسی جگہ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسی کتاب لکھی جاتی ہے۔ مطالعۂ اقبال میں اس کتاب کو بہت خاص جگہ دینی پڑے گی۔ کیوں کہ اس میں واقعات کی ترتیب سے بڑے اہم نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود صہبا لکھنوی تاریخی واقعات کی ترتیب

میں اور اپنے اسلوب میں اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ انھیں بھی اس کتاب میں دوام حاصل ہے۔ اسی لیے آج جب اس کتاب کا جشن منایا جا رہا ہے تو میرے نزدیک یہ "جشنِ اقبال" بھی ہے، "جشن بھوپال" بھی ہے اور "جشن صہبا" بھی ہے۔ — اور یہ بات نہ میرے بتانے کی ہے اور نہ آپ کے کہنے کی، بلکہ خود کتاب کہتی ہے کہ یہ ایک یادگار جشن ہے — !

——— پروفیسر انجم اعظمی

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)[۱]

صہبا، اقبال اور بھوپال

ہمارے ہاں تحقیق کی لگن ذرا کم ہی ہے اور اردو میں تو اس چراغ کی لَو اور بھی مدھم ہے۔ تاہم اس سے یہ قیاس کرنا درست نہیں ہوگا کہ اُردو میں معیاری تحقیق کی بلند پایہ کتابیں ہی موجود نہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں مگر ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں تحقیق کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا جس کی وہ مستحق ہے۔ چنانچہ جب "اقبال اور بھوپال" کی اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا تو ایک بزرگ فرمانے لگے کہ اقبال دو تین مرتبہ بھوپال گئے اور وہاں چند مہینے قیام کیا۔ پھر بھلا زندگی کے اس مختصر واقعے پر کتاب لکھنے سے کیا فائدہ۔ دراصل یہ ان کی ذاتی رائے نہیں تھی، بلکہ اس کو ہمارے معاشرے کے ذہنی افکار کا پَرتو سمجھنا چاہیے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شیکسپیئر جو اکبر اور جہاں گیر کا ہم عصر تھا اور جس کے انتقال کو ساڑھے تین سو سال سے زائد ہو چکے ہیں، اس پر بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہر سال ایک دو نئی کتابیں اس پر شائع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کی وفات کو ابھی پورے چالیس سال بھی نہیں ہوئے مگر اب ہم اس پر مزید لکھنے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں غالب کے بعد اگر کسی پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے تو وہ اقبال ہے۔ مگر ابھی اقبال کی زندگی کے ایسے بہت سے گوشے ہیں جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں اور ان کو منظرِ عام پر لانے کی شدید ضرورت ہے، "اقبال اور بھوپال" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بھوپال ایک ممتاز ریاست تھی، قدیم جاگیردارانہ نظام کی ایک شاخ، مگر اس زمانے میں برصغیر میں یہی نظام رائج تھا، اس نظام میں برائیاں بھی تھیں اور اچھائیاں بھی، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ سربراہ خود کچھ خوبیوں کا حامل ہو۔ برصغیر میں اس نظام نے علم و ادب اور فن کی بڑی خدمت کی ہے اور برصغیر ہی پر کیا منحصر، عالمی علم و ادب میں اس ادارے نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگریزی زبان کے قابلِ فخر شاعر مثلاً چاسر، سودے، ورڈس ورتھ، ٹینی سن، ملک الشعراء ہے ہیں، جو اس رتبے پر نہ پہنچ سکے، ان کو بھی کسی نواب یا رئیس کی سرپرستی حاصل رہی۔ شیکسپیئر کا مربی، وریوتھسلی (WIRO THESLEY) ارل آف ساؤتھ ہمپٹن تھا۔ یہی صورت ایرانی شعرا کی ہے۔ برصغیر میں بھی یہ روایت برقرار رہی اور جب سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھرا تو یہ روایت بھی منتشر ہو گئی، مگر اردو، اس کے ادب، شہ پاروں اور اس کے فن کاروں کی کہانی ان منتشر کرداروں کے ذکر کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے؟ "جب تک اردو زندہ ہے حیدرآباد دکن کی اس خدمت کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں یہیں سب سے پہلے اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا اور علم جواب تک نامانوس

---

[۱] ماہنامہ افکار، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۴۰، ۴۱

زبانوں میں قید تھا، سرزمین جامعہ عثمانیہ، پر آزاد ہوا، عام ہوا۔[۱]

ریاست بھوپال کی تاریخ کا دور تقریباً ڈھائی سو سال پر مشتمل ہے اور اس کی علمی و ادبی تاریخ بھی اسی دور پر محیط ہے۔ اس نے ہمیشہ علم و ادب کی سرپرستی کی، علما و فضلا کی قدر کی، علمی کاموں کی ہمت افزائی کی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں بھوپال کا ایک وفد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیوان ریاست کی جانب سے نذرانہ اور تحائف پیش کرکے شاہ صاحب کو بھوپال آنے کی دعوت دی، بارہ ہزار سالانہ جاگیر کی پیش کش بھی کی۔ شاہ صاحب نے ضعیف العمری کی بنا پر معذوری کا اظہار کیا۔[۲] ایک اور رئیس نے مومنؔ کو بھی بھوپال بلانا چاہا۔[۳] ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز المیے کے بعد رئیسِ وقت (نواب سکندر جہاں بیگم) نے غالبؔ کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور کل مصارف کی ذمہ داری لی، مگر وہ بھی دلی کی گلیاں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، اس کے باوجود بیگم اپنے ماموں میاں فوجدار محمد خان کے ذریعہ غالب کی خدمت کرتی رہیں اور اسی آمد و رفت کا نتیجہ تھا کہ غالب نے اپنے اصل دیوان کا نسخہ اپنے قلم سے تصحیح کرکے نذر کیا اور یہی نسخہ اوائل بیسویں صدی میں، عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شایع ہوا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس کے پچاس سال بعد غالب کی صد سالہ برسی یعنی ۱۹۶۹ء میں جو دوسرا اہم "نسخۂ عرشی زادہ" شایع ہوا وہ بھی بھوپال کے ایک کتب فروش سے حاصل ہو کر امروہے پہنچا، یہ نسخہ بھوپال کیسے پہنچا، اس کی تحقیق پرستارانِ غالب کے ذمہ ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں اردو اور عربی میں مختلف علوم و فنون پر اس کثرت سے بلند پایہ کتابیں بھوپال سے شایع ہوئیں کہ بھوپال کو "بغداد الہند" کہا جانے لگا۔ نواب سلطان جہاں بیگم خود مصنفہ تھیں، اہلِ علم کی مدد اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ سیرۃ النبی کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی اعانت تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، تاریخ البرامکہ اور دوسری اہم تصانیف کی اشاعت ان ہی کی مرہونِ منت ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، مدرسہ دیوبند، مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ اور دیگر اداروں یا افراد کو مستقل مدد ملا کرتی تھی۔ علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کی یا ان کی اولاد کی سالگرہوں پر سیم و زر کے نذرانوں کی بجائے علمی اور ادبی تحائف پیش کرتے تھے۔ ہمارے مہمانِ خصوصی کی ابتدائی تربیت ان ہی بزرگ کی گود میں ہوئی اور ان کی اکثر سالگرہوں پر مطبوعہ کتابیں پیش کی گئیں۔

نواب محمد حمید اللہ خان نے علمی ماحول میں آنکھ کھولی، علم و ادب سے محبت اور وابستگی ان کو ورثے میں ملی۔ انھوں نے برصغیر کی سیاسی، سماجی اور علمی دنیا میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آزادی سے قبل اور بعد دونوں ادوار میں سیاسی حالات اور مصالح نے ان کی بھرپور شخصیت کے خدوخال کو اجاگر نہ ہونے دیا اور ان کی بیشتر خدمات صرف منتشر زبانی روایات تک محدود رہ گئیں۔ "اقبال اور بھوپال" کی اشاعت سے قبل یہ واقعہ کس کو معلوم تھا کہ علامہ اقبال کے سفر اسپین کے محرک اور معاون کون تھے؟ جب لندن میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں علامہ، نواب صاحب سے ملنے گئے تو باتوں باتوں میں انھوں نے کہا کہ "اقبال اسپین کیوں نہیں جاتے ہو" تو علامہ نے برجستہ جواب دیا کہ اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہو آیا ہوتا۔" دوسرے دن علامہ کو نواب بھوپال کی جانب سے چھ ہزار کا ایک چیک مل گیا اور سفرِ اسپین کا انتظام ہو گیا۔[۴] اس واقعہ سے قطع نظر علامہ کے اس سادہ سے جملے میں بڑا وسیع مفہوم پوشیدہ تھا۔

---

۱ مرزا ظفر الحسن، ذکر یار چلے، پاک پبلشرز لمیٹڈ، کراچی۔ اپریل ۱۹۷۵ء، صفحہ ۵۴

۲ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ادارہ ادب و تنقید، بھوپال، صفحہ ۶۸

۳ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ایضاً، صفحہ ۷۰

۴ ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی (صہبا)

ب تک صرف نواب بھوپال کی سیاسی سوجھ بوجھ، فراست، دانائی کے تو ضرور قائل تھے مگر پھر بھی وہ ان کو محض ایک ں دماغ والیِ ریاست ہی سمجھتے تھے، مگر بعد میں جب ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کے دوسرے خیالات لوم ہوئے تو محسوس ہوا کہ ان کے دل میں بھی اسلام اور مسلم قوم کی سربلندی کے لیے وہی تڑپ اور لگن ہے جو علامہ اپنے دل و دماغ میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھوانے کی خواہش اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جب ان کو والیِ ریاست میں قلندرانہ صفات، درویشانہ خصوصیات اور مجاہدانہ جذبات نظر آئے تو وہ ان کو بے ساختہ "صاحب ری" سے مخاطب کرنے پر مجبور ہوگئے، یہ محض شاعری نہیں تھی، بلکہ اس یکتائے روزگار کے دلی جذبات کی گہرائیوں نکلی ہوئی آواز تھی جو خود اپنے متعلق یہ کہتا ہے:

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نیاید

یہی دانائے راز نواب کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ:

"بگیر! ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من"

یہی وہ ستائش اور عقیدت تھی جس نے اقبال کے ممدوح کو بھی زندۂ جاوید کر دیا۔ پاکستان میں اس کا احساس مشکل ہے۔ اس کا اندازہ اس ایک چھوٹے سے واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ریاست ۱۹۴۹ء میں وفاقِ ہند میں ضم ہو کر سز کا صوبہ بنی اور پھر یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو مدھیہ پردیش کے صوبے میں مدغم ہو گئی۔ اس کے بھی چار سال بعد یعنی ۱۹۶۰ء اردو کے ایک بیرونی شاعر جگن ناتھ آزاد ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کے لیے بھوپال آئے، انھوں نے وہاں چند روز کے بعد ایک طویل نظم کہی، اس کے دو شعر پیشِ خدمت ہیں:

اے مرے اقبال کے ممدوح کی دنیائے حسن — آج بھی لبریزِ مستی ہے تری صہبائے حسن
حال پر ماضی ترا اب بھی تجلی بار ہے — آج بھی تیری زمیں پر بارشِ انوار ہے[1]

علامہ نے مولانا حالی کی صد سالہ برسی پر جو نظم پڑھی تھی اس کے اس شعر میں علامہ نے اپنے اور نواب بھوپال کے ن اور دونوں کے مقامات کو بڑی خوبصورتی سے یوں ادا کیا تھا:

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگِ گل افشانم

"اقبال اور بھوپال" طویل کہانی کا ایک مربوط سلسلہ ہے جس کی کڑیاں تاریخی شواہد کے ساتھ ایک دوسرے سے لک ہیں۔ میری نظر میں اس کتاب کی مندرجہ ذیل خصوصیات خاص طور پر مستحقِ توجہ ہیں:

۱۔ یہ کتاب تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس میں سے بیشتر چیزیں اب تک عوام نظروں سے پوشیدہ تھیں۔ اگر صہبا اس کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کرتے تو کچھ عرصے بعد یہ سارا مواد تلف ہو جاتا۔ ب کی اشاعت تک اقبال کے بعض نیاز مند اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور بعض چراغِ سحری ہیں، جن میں محترم ں صاحب قبلہ[2] اور محترمہ خاتون ارشد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] روزنامہ "ندیم" بھوپال ۷ر جولائی ۱۹۶۰ء

[2] افسوس کہ اسد الرحمٰن قدسی کا ۱۹۷۹ء میں اور خاتون ارشد کا ۱۹۸۲ء میں انتقال ہو گیا۔

۲۔ کتاب میں متعدد انکشافات ہیں، مثلاً جواب شکوہ کا محرک کون تھا؟[۵] علامہ نے شکوے کے ایک بند میں کیسے ترمیم کی، کس طرح ایک کم نام شاعر کو اصلاح دی، مذکر اور مؤنث کے اعتراض کا جواب کس عالمانہ انداز میں دیا۔

۳۔ مختلف نظمیں اور اشعار جو بھوپال میں کہے ان کا پس منظر کیا تھا۔ مثلاً جب بھوپال میں شیش محل میں قیام تھا تو آپ نے پہلی نظم صبح کہی جس کا آخری شعر یہ ہے:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یہ شعر جس کیفیت سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے، وہ ریاض منزل کے قیام میں ممکن نہ تھی، کیونکہ یہ کوٹھی آبادی سے باہر بالکل الگ تھلگ ہے۔ بھوپال کو "مسجدوں کا شہر" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بعض حصّوں میں تو چپے چپے پر مساجد ہیں۔ مثلاً شیش محل کے گرداگرد ایک فرلانگ یا ۱½ فرلانگ کا دائرہ کھینچا جائے تو وہاں کوئی گیارہ بارہ مسجدیں ہیں۔ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں تھا۔ ریاست کے محکمہ مساجد کی جانب سے ہر مسجد میں خوش الحان امام اور مؤذن تھے۔ ویسے بھی یہ علاقہ ہر قسم کے شور و شغب سے پاک تھا۔ پھر صبح کی اذانوں میں ہر مسجد میں فرق بھی ہوتا تھا۔ اس طرح خوش الحان قاریوں کی مسلسل اذانوں سے ایک عجیب روح پرور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جب اس سے ایک عام آدمی متاثر ہو سکتا تھا تو پھر مغرب میں سحر خیزی کے آداب نہ چھوڑنے والے پر جو گزرتی ہوگی اسی سے متاثر ہو کر مندرجہ بالا شعر کہا گیا ہے۔

۴۔ مختلف غیر مطبوعہ خطوط، اشعار اور بعض نادر تصویریں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئیں۔ ان سے بہت سے شخصی پہلو اجاگر ہو گئے۔ انصاری صاحب کی کوئلے سے بنائی ہوئی تصویر سے بھوپال کے کچھ پرانے حضرات تو واقف تھے۔ مگر پاکستان میں تو بہت ہی کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔

۵۔ اقبال کے افکار سے یوں تو پورا برصغیر متاثر ہوا۔ مگر ان کے مختصر سے قیام سے بھوپال کے علمی و ادبی حلقے کیسے متاثر ہوئے، کس طرح سکون و جمود تلاطم خیز موجوں میں تبدیل ہو گیا۔ میرے خیال میں بھوپال میں ۱۹۳۵ء کے بعد غور و فکر کی جو نئی راہیں کھلیں، نظم گوئی کا شدت سے آغاز ہوا، انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی، اقبال لائبریری کا آغاز ہوا۔ ان سب میں غیر شعوری طور پر بھوپال میں علامہ کے قیام کو بڑا دخل رہا ہے۔

صہبا مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے چالیس سال کی کڑیاں ایسی ترتیب، مہارت اور خوبصورتی سے ملائیں کہ اس پر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اس ذیل میں ان کو جو کاوش کرنا پڑی اس کو ان کا دل ہی جانتا ہوگا، مگر یہ کون دیکھتا ہے کہ تاج محل کے لیے پتھر کہاں سے لایا گیا؟ لوگ تو تاج محل کو دیکھ کر انگشت بہ دنداں رہ جاتے ہیں۔ صہبا کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ ان کا ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ ان کا تاج محل کھڑا ہو گیا۔ بلکہ انھوں نے اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے مزید راہیں کھول دیں۔

کتاب کی ترتیب میں صہبا کی دیانت داری نے بھی مجھے کافی متاثر کیا، جو چیز جہاں سے اور جس طرح لی اس کو من و عن بیان کر دیا۔ یہ بھی قابلِ قدر بات ہے۔ ورنہ دوسروں کی باتوں کو اپنے نام سے پیش کر دینا ایک عام بات ہے۔ لوگ تو زندوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔ پھر ان کا تو ذکر ہی کیا جو اب مدافعت کے قابل نہیں رہے۔

آخر میں، میں آپ کی اجازت سے مہمان خصوصی کے ایک چھوٹے سے ذاتی واقعہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ستمبر ۱۹۵۷ء

---

[۵] ملاحظہ ہو دیباچہ طبع ثانی (صہبا)

میں موصوفہ حکومتِ پاکستان کی جانب سے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں پاکستانی وفد کی سربراہ بنا کر بھیجی گئی تھیں۔ غالباً اس وقت ہندوستان کی نمائندگی مسز وجے لکشمی پنڈت کے ذمے تھی۔ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ امریکی پریس نے آپ کے کام کی بڑی تعریف کی۔ امریکہ کے صدر نے ان کو واشنگٹن آنے کی دعوت دی۔ میں اس زمانے میں وہیں تھا اور میں نے ان کو کامیابی پر مبارک باد کا خط بھیجا۔ وفد کے سربراہ کے پاس سکریٹریوں اور اسٹینوز کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی جانب سے کوئی بھی جواب دے سکتا تھا یا یہ لکھوا کر دستخط کر سکتی تھیں مگر بھوپال کے تعلق کی بنا پر انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے اردو میں جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ یہ واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ آخر کس نامور باپ کی بیٹی ہیں اور اسی ناتے آج یہاں موجود ہیں۔

—— محمد احمد سبزواری

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)[1]

کچھ صہبا، کچھ اقبال اور کچھ بھوپال کے بارے میں

صہبا لکھنوی مدیر افکار ہمارے پرانے دوست ہیں، ایسے مرنجانِ مرنج کہ چاہیں بھی تو کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے —— دھان پان ایسے کہ ہوا تیز ہو تو گھر سے نہیں نکلتے کہ اڑتے اڑتے سمندر میں نہ جا پڑیں۔ خشکی کے جانور ہیں، وزن اس عمر میں بھی سو پاؤنڈ سے تھوڑا ہی اوپر ہے، ان کے انگرکھے اور بنیان اور چشمے کا وزن نکال دیا جائے، اور یہ حجامت بھی کرالیں تو شاید سو پونڈ بھی نہ رہے۔ ہمارا یہ وزن اس وقت تھا جب نویں کلاس کے طالب علم تھے۔ صہبا صاحب نے انکسار اور کسر نفسی کی حد کر دی۔

دھان پان ہونے کے باوجود یہ ٹھوس کام بھی کرتے ہیں۔ ایک کتاب بھی لکھی ہے —— 'اقبال اور بھوپال' جسے اقبال اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ چند روز ہوئے اس کتاب کی تکریم میں ایک جلسہ ہوا، لوگوں نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا، اور انھوں نے گلے میں ہار ڈلوا کر خوشی خوشی قبول کیا۔ اچھی اچھی تقریریں ہوئیں۔ جو لوگ کتاب پڑھ کر نہیں آئے انھوں نے بھی اچھے خاصے عمدہ تبصرے کیے، لوگوں کو معلوم نہیں ہونے دیا کہ ہمیں کتاب دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس بھیڑ میں ہم بھی شامل تھے بلکہ اہتمام ہمارے ہی ذمہ تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پروگرام میں نام نہ ہونے کے باوجود ایک پرچہ ہم نے بھی پڑھا جو اس کالم میں چھاپ رہے ہیں۔ دو صاحب مقررین میں ایسے تھے جن کو اس بات پر تعجب ہوا کہ صہبا نے یہ کتاب لکھ کیسے لی۔ پروفیسر انجم اعظمی بھی ان ہی میں سے تھے۔ آخر انھوں نے اپنے آپ کو رشید احمد صدیقی کے قول سے قائل کیا کہ آدمی کیسا بھی ہو۔ ٹھک ٹھک کرتا رہے تو ایک دن کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ انجم صاحب کا تعجب تو خیر اس لیے ہوگا کہ ان کے گمان کے مطابق کوئی شخص باقاعدہ پروفیسر ہوئے بغیر نہ تحقیق کے لائق بن سکتا ہے نہ

---

[1] ماہنامہ افکار۔ کراچی، جولائی ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۳۶ تا ۴۰

کوئی کتاب لکھ سکتا ہے ۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ دیسی جتّے کے ساتھ صہبا نے ایسا بھاری بھرکم کام کیسے کرلیا۔ انھوں نے صہبا صاحب کو آدمی کی بجائے ایک پرچھائیں قرار دیا ــــ لیکن یہ بھول گئے کہ وہ خود تو پرچھائیں کی بھی پرچھائیں ہیں۔ بایں ہمہ اتنی کتابوں کے مصنف ہیں اور ٹھوس باتیں کرتے ہیں ۔ ہمیں ان کی بات پر تعجب ہوا تو شاؔد عارفی مرحوم کا یہ پرانا شعر یاد آیا :

بھلا دیتی ہے فکرِ شعر تو اے شاؔد شاعر کو
بڑھے گی شعر کی طاقت ، یہ جتنا ناتواں ہوگا

اب اس بحث کو ہم چھوڑتے ہیں ۔ آیا اچھی صحت والا یا کوئی گرانڈیل آدمی اچھا ادیب بن سکتا ہے ، کلامِ نرم و نازک کہہ سکتا ہے یا سارا ادبِ عالیہ کراہتے ہوئے ، صاحبِ فراش ہائے ہائے کرتے ہوئے منحنی ادیبوں ہی نے پیدا کیا ہے ۔ ہم نے ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جو ۲۰۰ بیٹھک لگا کر اور سو ڈنڈ پیل کر اور ڈیڑھ سیر دودھ پی کر لکھنے کو بیٹھتے ہیں اور ایسے بھی کہ ایک بادام کی گری اور ایک قوام والا پان ان کے لیے دن بھر کے لیے کافی ہے ۔ اب پڑھیے وہ پرچہ جو ہم نے اس روز پڑھا تھا ۔

صہبا لکھنوی سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے ۔ وہ ہمیں جانتے ہیں ، ہم انھیں جانتے ہیں ۔ ان کی کتاب پر اگر ہم تبصرہ نہ کریں گے تو وہ ناراض ہوں گے ۔ اور اگر کریں گے تو وہ اور ناراض ہوں گے ، کیا کریں ہم لکھتے ہی ایسا ہیں ۔ لہٰذا عالمانہ تبصروں کا کام دوسرے صاحبوں پر چھوڑ کر ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اے صاحب تم نے اس کتاب پر اتنی محنتِ شاقہ کیوں کی ۔ اگر پیسوں کے لیے کی ہے تو واضح ہو کہ آج کل پیسوں کے لیے کسی قسم کی محنت کرنے کا مطلق رواج نہیں ۔ اگر اپنے نام کے لیے کی ہے تو آپ کا نام پہلے ہی سے روشن ہے ۔ اگر اقبال کے نام کے لیے کی ہے تو اقبال کا نام بھی آپ کے نام سے کم مشہور نہیں ۔ بہت سے لوگ جانتے ہیں ۔

صہبا صاحب خود مانتے ہیں کہ جب سے میں نے افکار نکالنا شروع کیا ہے ، افکار میں مبتلا ہوں ۔ بلکہ اس قدر کہ مجھ پر ایک مستقل "فسانۂ مبتلا" لکھا جا سکتا ہے ۔ آج کل اقبال کے خطوط چھاپ کر جو انھوں نے اپنے حکیموں ، ڈاکٹروں کو لکھے تھے اور ان کی وہ نقلیں چھاپ کر اور تبرکاً سر آنکھوں پر رکھ کر ، جن کو وہ رد کر چکے تھے ردّی کی ٹوکری میں پھینک چکے تھے ، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال اتنے بڑے آدمی نہیں تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے ۔ ویسے یہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے ۔ کیوں کہ جس قدر حضرتِ اقبال حرکت و عمل کے پیامبر تھے ، اتنے ہی ان کے عالی عقیدت مند ہمارے اقبالی بھائی جامد اور ٹھس اور بے عمل ہیں ۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں خود علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی تعلیمات کے چنداں قائل نہ تھے ۔ ان کی زندگی میں حرکت اور عمل کا بہت کم گزر تھا ، اور اگر ہم یہ حوالہ دیں کہ وہ چارپائی پر پڑے دُھسّہ اوڑھے لیٹے رہتے تھے تو ہمارے ایک اخباری بھائی شاید پھر ہم پر لعن طعن کریں جیسے پہلے کر چکے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ جس طرح مارکس اپنی زندگی میں مارکسٹ نہیں تھے ، اسی طرح اقبال بھی بہت زیادہ اقبالی نہیں تھے ، ان کی زندگی میں جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا قسم کی کوئی بات آپ کو نہ ملے گی ۔

" اقبال اور بھوپال" میں سب سے پہلا تعلق تو یہی ہے کہ دونوں ہم قافیہ ہیں اور اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے ہم ناموں اور ہم قافیہ لوگوں کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۴ کے شروع میں ۔ اقبال حسین صاحب اے۔ ڈی۔ سی کا بیان ۔ پھر کچھ سلسلہ سر راس مسعود کی ارادت اور نواب صاحب بھوپال کی عنایات کا بھی تھا۔ اس کتاب سے ضمناً بعض باتیں علامہ مرحوم کی سیاسی بصیرت کے متعلق بھی معلوم ہوتیں ۔ مثلاً ان کا یہ فرمانا کہ نواب بھوپال کو ریاست کشمیر دے دینی چاہیے اور مہاراجہ ہری سنگھ کو بھوپال بھیج دینا چاہیے ۔ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کا بھی ذکر ہے ۔ ان کے نام کے خطوط بے شک اقبال نامہ میں شامل ہیں۔ لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ ان میں ایک دو خطوط حقیقی ہیں جن میں لمعہ صاحب کو شاعری سے گریز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، باقی لمعہ صاحب کے اپنے لمعات ہیں یا مشکوک ہیں ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے نام کے ایک خط میں حضرت علامہ اقبال نے دو جگہ " استفادہ حاصل کرنا" لکھا ہے تو ان خطوط کی اصلیت پر ہمارا بھی شبہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

صہبا صاحب نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں اتنی محنت کی ہے کہ واقعی یہ آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے ۔ اس میں نئی تحقیق و تدقیق بھی ہے ۔ غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں بعض امور کی عقدہ کشائی بھی ہے ۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو وظیفہ، ملازمت کے مسائل سے بے جا نفرت نہیں تھی ۔ اس سے پہلے انوار اقبال والے خطوط سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ وہ قلندر آدمی تھے لیکن کتابوں کی رائلٹی ٹھوک بجا کر لیتے تھے ۔ پبلشروں سے بے جا رو رعایت نہ کرتے تھے اور کوئی عقیدت مند بلا اجازت اُن کا کلام چھاپ لے تو خفا بھی ہوتے تھے ۔ اس کی جان نہیں چھوڑتے تھے ۔ ایک صاحب کو تو چھپی چھپائی کتاب کا ڈھیر نذر آتش کرنا پڑا ۔ اچھی کتاب وہ ہوتی ہے جس میں ممدوح کو بے جا طور پر بڑھایا نہ جائے نہ گھٹایا جائے، حقایق بیان کیے جائیں ۔ اس لحاظ سے " اقبال اور بھوپال" اچھی اور قابل قدر کتابوں میں ہے ۔

بعض لوگ اس کتاب کو سطحی نظر سے دیکھ کر شاید یہ کہیں کہ اس میں بعض غیر ضروری باتیں آگئی ہیں ۔ مثلاً حفیظ جالندھری کی نظم یاد آجانے کا کیا موقع ہے ۔ بے شک اس کا تعلق موضوع سے نہیں ۔ تاہم یہ نظم اس کتاب میں محفوظ ہو گئی ہے ۔ ضائع نہیں ہوگی ۔ حفیظ جالندھری صاحب خود بھی ضایع کرنا چاہیں تو نہ ہوگی ۔ اگر اس کتاب میں صرف وہ اشعار شامل کیے جاتے جو علامہ اقبال مرحوم نے دوسروں کو سنائے تھے تو شاید یہ کتاب اتنی مبسوط نہ بنتی ۔ اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال حسین اے ۔ ڈی ۔ سی اور معظم رسول صدیقی مرحوم نے علامہ کو کون کون سی نظمیں سنائی تھیں اور داد پائی تھی ۔ دیوان تو ہر شخص کا نہیں چھپتا ۔ اس بہانے ان بزرگوں کا کلام بھی محفوظ ہو گیا ۔ ان کی لمبی لمبی غزلیں اور نظمیں صہبا صاحب نے بڑی ایمان داری سے پوری پوری دے دی ہیں ۔

ہمیں صہبا صاحب سے صرف ایک شکایت ہے، لیکن وہ شکایت پرانی ہے ۔ اس شکایت کو ہم گزارش بنا کر عرض کریں گے کہ لفظ " اچھوتا" اور " اچھوتی" کا استعمال اتنا زیادہ نہ کریں ۔ اول تو اس دنیا میں اچھوتی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں ۔ یوں بھی تو اردو میں اس لفظ کے مترادفات موجود ہیں ، اور ان مترادفات میں بعض نسبتاً اچھوتے بھی ہیں ——

—— ابن انشاء

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

کتاب کے بارے میں

صدرِ گرامی ـــــــ

معزز خواتین و حضرات ـــــــ

رفیقو اور دوستو! ـــــــ

میری حقیر سی کاوش "اقبال اور بھوپال" کے بارے میں زبان و ادب کی معتبر، معزز اور مقتدر شخصیتوں نے ابھی ابھی جو اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ وہ میرے لیے سرمایۂ صد افتخار ہے۔

یہ کتاب تقریباً بارہ سال کی لگاتار سعی و جہد کے بعد مکمل ہو سکی ہے۔ اس کے محرک جناب ممتاز حسن سابق اعزازی نائب صدر اقبال اکیڈیمی تھے جن کی ذاتی توجہ اور کوشش سے نظر حیدر آبادی مرحوم کی قابلِ قدر کتاب ـــ "اقبال اور حیدر آباد" اقبال اکیڈیمی سے شائع ہوئی۔ یہ ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ ایک ادبی تقریب کے دوران میں نے جناب ممتاز حسن سے عرض کیا کہ "اقبال اور حیدر آباد" کے بعد اگر "اقبال اور بھوپال" پر بھی کچھ کام ہو سکے تو علامہ اقبال کی زندگی کا ایک اہم گوشہ دنیا کے سامنے آ سکے گا اور شاید اقبالیات میں ایک نئے موضوع کا اضافہ بھی ممکن ہو سکے۔

میری اس تجویز پر جناب ممتاز حسن نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا ـــ "تو یہ کام آپ کر ڈالیے"

ممتاز صاحب کے اس مخلصانہ مشورے نے مجھے عجب الجھن میں ڈال دیا۔ کئی دن تک اس کتاب کے بارے میں سوچتا رہا۔ کئی خاکے تیار کیے۔ کئی قریبی دوستوں سے مشورہ کیا۔ سبھی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ بالآخر اللہ کا نام لے کر میں نے اس کتاب پر ۱۹۶۱ء کے آخر میں کام شروع کر دیا۔ اور یوں ۱۲ سال کی دیوانہ وار جستجو، تحقیق اور تلاش کے بعد یہ کتاب مکمل ہو کر آپ کے ہاتھوں تک پہنچ سکی۔

تحقیق و تلاش کے دوران ایک ممتاز محقق اور نقاد کا یہ قول میرے لیے مشعلِ راہ بنا رہا ـــــ

> "تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع بھی ہے اور بسیط بھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے فن میں "حرفِ آخر" ـــ "حرفِ غلط" ہے اور اسی وجہ سے ہمیں جلد بازی میں حکم لگانے اور تاریخ کے تعین میں عجلت نہیں کرنی چاہیے ـــــــ"[۱]

چنانچہ میں نے "اقبال اور بھوپال" کے سلسلے میں نہ جلد بازی سے کام لیا اور نہ تحقیق کے کسی امکان کو نظر انداز کیا۔ کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں مجھ پر جو بیت گئی اس کی تفصیل میں نے "حرفِ آغاز" میں پیش کر دی ہے جو کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ کی نظر سے گزرے گی۔ اس کا اعادہ کر کے آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کا سہرا جناب عبدالواحد معینی، سابق اعزازی نائب صدر اقبال اکیڈیمی ـــ جناب

---

[۱] ماہنامہ افکار، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء، صفحہ ۴۲ تا ۴۴

عبدالحمید کمالی معتمد اقبال اکیڈیمی ـــــ ڈاکٹر نذیر احمد خازن اور مجلس انتظامیہ کے سرکردہ اراکین کے سر ہے، جنھوں نے میری اس کاوش کو پسند فرمایا اور اشاعت کے سلسلے میں ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں ـــــــــــ

میں نیشنل بک سنٹر، پاکستان سنٹر، آرٹ کونسل آف پاکستان اور ادارۂ یادگارِ غالب کا بھی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں جنھوں نے مشترکہ طور پر اس تقریب کا اہتمام کیا اور آپ تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے شرکت فرماکر میری عزت افزائی فرمائی۔

آخر میں شہزادی عابدہ سلطان کا سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اس تقریب کی صدارت قبول فرماکر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

شہزادی صاحبہ اور آپ کے عالی مرتبت والد محترم نواب محمد حمید اللہ خاں نے اقبال شناسی اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں جو تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں کسی دور کا مؤرخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

ـــــــ صہبا لکھنوی

(تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)[۱]

بزمِ کتاب نمبر ۷۳

صہبا لکھنوی نے مطالعۂ اقبال اور اقبالیات کے سلسلے میں ایک لائقِ ستائش تحقیقی کاوش "اقبال اور بھوپال" کے روپ میں پیش کی ہے۔ صہبا لکھنوی نے اس کتاب کے مواد کی جستجو میں کم و بیش گیارہ برس صرف کیے ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" کے مطالعے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی منشیانہ روایت سے الگ ہے۔ اس سے چند خشک اور بے جان کتابوں ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ ایک دور کی تہذیب، اس کا ذہنی و فکری پس منظر اور تہذیب کے پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگا رنگی بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے سے اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی فکری رجحانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس طرح صہبا لکھنوی کی تحقیق بوسیدہ ہڈیوں کو منظرِ عام پر نہیں لاتی۔ ذہن کو زندہ و فعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔ صہبا لکھنوی کی اس کتاب سے چند نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان سے خاص طور پر اس برِعظیم کے مسلمانوں کے اس فکری پس منظر کی تلاش و جستجو کو تحریک ملتی ہے جس نے درۂ خیبر سے لے کر ٹیکناف اور راس کماری تک نئی بیداری کی لہر دوڑانے کے ساتھ بعض تہذیبی نقش قایم کیے تھے اور خطۂ بھوپال نے بھی اس نقش آرائی میں اہم حصہ لیا تھا۔ اس سلسلۂ فکر کا ایک مظہر تحریکِ پاکستان اور مملکتِ پاکستان بھی ہے۔ "اقبال اور بھوپال" میں اقبال کی بعض نظموں اور بعض اشعار کی عقبی زمین اور محرکات اس طرح سامنے آتے ہیں کہ ان نظموں اور ان اشعار کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی "اقبال اور بھوپال" کے مطالعہ سے زندگی کی عظمت و سعادت کا نقش ذہن پر مرتسم ہوتا ہے۔

صہبا لکھنوی کی کتاب "اقبال اور بھوپال" کی تقریب رونمائی شہزادی عابدہ سلطان کی صدارت میں نیشنل بک

---

[۱] ماہنامہ افکار، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۳ء، صفحہ ۴۵۔ ۴۶

سنٹر آف پاکستان کراچی اور اقبال اکیڈیمی نے مل کر کراچی میں ۲۵ مئی کو منائی۔ اس تعارفی تقریب میں حنیف فوق صاحب کے تعارفی کلمات کے بعد پروفیسر مجنوں گورکھپوری، محمد احمد سبزواری، پروفیسر انجم اعظمی، ابنِ انشا نے مقالات پیش کیے۔ آخر میں صاحبِ کتاب نے بھی کتاب کے بارے میں کچھ فرمایا۔ (ادارہ)

مئی کی پچیسویں تاریخ تھی۔ ہم صہبا لکھنوی صاحب کی کتاب "اقبال اور بھوپال" کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے تقریباً پانچ بجے آرٹس کونسل پہنچے۔ ڈائس سجایا جا چکا تھا اور کرسیاں وغیرہ بچھائی جا چکی تھیں۔ چند افراد ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اتنے میں سحر انصاری آ گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ دعوت نامے میں ۵½ بجے کا وقت دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ بک شاپ میں کتابیں دیکھنے لگے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ ابنِ انشا صاحب، صہبا لکھنوی صاحب اور چند مہمان تشریف لا چکے ہیں۔ بک شاپ کے برابر اقبال اکیڈیمی والوں نے اپنی چند کتابوں کا اسٹال لگایا تھا، جن میں "اقبال اور بھوپال" نمایاں اور خاصی تعداد میں رکھی ہوئی تھی۔ اسٹال پر ایک محترمہ تشریف فرما تھیں جو غالباً انچارج تھیں۔ ہم کتابیں دیکھنے لگے۔ جب کتابوں پر ہماری توجہ ان کی عدم توجہی کا شکار ہو گئی تو ہم آگے بڑھ گئے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ بعد دیگرے کاروں اور پیدل آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور نشستیں پُر ہوتی چلی گئیں۔ آنے والوں میں شہر کے معروف و ممتاز شعراء اور ادبا کی خاصی تعداد تھی۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے مہمانِ خصوصی شہزادی عابدہ سلطان تشریف لائیں۔ صہبا صاحب اور دیگر حضرات نے مصافحہ کیا، مختصر تعارفی کلمات ادا ہوئے اور وہ دائیں جانب کی نشست پر بیٹھ گئیں۔ ان کی سادگی ایک خاص وقار و تمکنت لیے ہوئے تھی۔ چہرے پر ماضی کے نقوش نمایاں تھے اور آنکھوں میں عظمتِ رفتہ کی چمک موجود تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ابنِ انشا صاحب نے جو کہ قومی کتاب مرکز کے ڈائرکٹر ہیں، مائیک سنبھالا اور تقریب کا آغاز کرتے ہوئے شہزادی عابدہ سلطان صاحبہ سے ڈائس پر تشریف فرما ہونے کی درخواست کی اور اس کے بعد صاحبِ کتاب صہبا لکھنوی صاحب کو زحمت دی گئی۔ اس وقت تقریباً تین سو نشستیں پُر ہو چکی تھیں اور لوگ جلسہ گاہ کے آخری حصے میں کھڑے ہوئے تھے۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد انشا صاحب نے گل پوشی کے لیے مرزا ظفر الحسن معتمد "ادارۂ یادگارِ غالب" سے درخواست کی۔ مرزا صاحب نے پیکٹوں میں سے ہار برآمد کیے اور لڑیاں سلجھانے کے دوران انھوں نے ابنِ انشا صاحب کو اپنا شریکِ کار بنا لیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ایک ہار شہزادی عابدہ سلطان کو اور ابنِ انشا صاحب نے دوسرا ہار صہبا صاحب کو پہنایا۔ صہبا صاحب نے سرخ کاغذ اور ریشمی ربن میں لپٹی ہوئی اپنی کتاب شہزادی صاحبہ کی خدمت میں پیش کی اور فوٹو گرافروں نے اس یادگار لمحہ کو مقید کر لیا۔

ابنِ انشا صاحب نے انور حارث صاحب کو اظہارِ تہنیت کے لیے بلایا۔ انور حارث صاحب مائیک پر آئے۔ انھوں نے ضربِ کلیم کا اصل انتساب جو کہ علامہ اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال کے نام معنون کیا تھا، پڑھا اور پھر فارسی سے اردو میں اس کا آزاد ترجمہ پیش کیا۔ ان کے بعد قمر ہاشمی صاحب نے بڑی خوب صورت نظم پڑھی جو خلد میں نواب حمید اللہ خاں اور علامہ اقبال کے مکالمے پر مشتمل تھی۔

قمر ہاشمی صاحب کے بعد ڈاکٹر حنیف فوق کو مضمون پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ فوق صاحب اس طرح گویا ہوئے: "اقبال سے تو شاید ہم سب کو برابر کی نسبت رہی ہے لیکن سرزمینِ بھوپال سے تعلق اور رفیقِ دیرینہ صہبا لکھنوی سے تعلقِ خاطر کے جرم میں ماخوذ ہو کر آج آپ کے سامنے پیش ہوا ہوں۔" مضمون کی ابتدا اس انداز سے ہوئی تھی کہ لوگ فوراً

متوجہ ہوگئے اور فوق صاحب بڑی روانی سے اظہارِ خیال کرتے رہے۔ انھوں نے فرمایا "شاید آج تحقیق سے زیادہ کوئی شعبۂ علم تختۂ مشق نہیں بنا ہوا ہے۔ خصوصاً تحقیقِ ادبیات کو ادب کے منشیوں نے نقل، خلاصہ نگاری اور بسیار نویسی کا مترادف اور بہانہ بنالیا ہے۔ محقق ہونے کا آسان ترین نسخہ یہی ہے کہ چند کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے متن کی تفصیلات بتاتے چلے جائیے فوق صاحب نے صہبا صاحب اور "اقبال اور بھوپال" دونوں کے بارے میں چند جملوں میں بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ اپنی تلاش و جستجو میں صہبا لکھنوی نے بعض نئے گوشے دریافت کیے ہیں اور انھیں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ اس طرح تحقیق، سیرت نگاری اور تاریخ میں جو تخلیقی ہم آہنگی قایم ہوئی ہے وہ اس کتاب کا بہت بڑا وصف ہے۔ اس سے ایک عمر کے ادبی انہماک اور لگن کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر حنیف فوق کے بعد انجم اعظمی صاحب کو مضمون پڑھنے کی زحمت دی گئی۔ انجم اعظمی صاحب نے اپنا تنقیدی لہجہ برقرار رکھتے ہوئے نہایت بچے تلے اور کھرے انداز میں کہنا شروع کیا، صہبا لکھنوی کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔ میں انھیں ایک دیانت دار اور محنتی ادبی صحافی سمجھتا تھا۔ لیکن ان سے کسی اہم تحقیقی کام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کتاب کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ میں صہبا کے اتنے قریب رہ کر بھی ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک بات یاد آئی جو وہ اپنے طالب علموں سے گاہے گاہے کہا کرتے تھے کہ آدمی ٹھک ٹھک کرتا رہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہتا ہے۔" انجم صاحب نے کتاب کے بارے میں بتایا کہ یہ کتاب بھوپال سے نکل کر پورے برصغیر کے حالات پر محیط ہے۔ یہ برصغیر کے ادب و ثقافت، معاشرت و تہذیب اور سیاست و تدبر کا آئینہ بن گئی ہے۔ جب وہ مضمون کے اس حصے پر پہنچے "آج جب اس کتاب کا جشن منایا جا رہا ہے تو میرے نزدیک یہ جشنِ اقبال بھی ہے، جشنِ بھوپال بھی ہے اور جشنِ صہبا بھی ہے، تو جلسہ گاہ تالیوں سے گونج اٹھی۔

ابنِ انشا مائیک پر آئے اور کہنے لگے کہ میں نے چند کلمات لکھے تھے لیکن اس پس و پیش میں تھا کہ پیش کروں یا نہیں۔ بہرحال اب کچھ حوصلہ ہوا۔ تو پیش کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا مضمون شروع کر دیا۔ ان کے فقروں کی کاٹ اور جملوں کی تیزی کی زد میں صہبا صاحب بھی تھے۔ کتاب "اقبال اور بھوپال" بھی تھی اور اس کے پڑھنے والے بھی۔ "صہبا لکھنوی سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے وہ ہمیں جانتے ہیں ہم انھیں جانتے ہیں۔ ان کی کتاب پر اگر ہم تبصرہ نہ کریں گے تو وہ ناراض ہوں گے اور اگر کریں گے تو اور بھی ناراض ہوں گے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اے صاحب تم نے اس کتاب پر اتنی محنت شاقہ کیوں کی ہ۔ اگر پیسوں کے لیے کی تو واضح رہے کہ آج کل پیسوں کے لیے محنت کرنے کا مطلق رواج نہیں ہے اور اگر نام کے لیے کی ہے تو اقبال کا نام بھی آپ کے نام سے کم مشہور نہیں ہے۔" محفل زعفران زار بن چکی تھی۔ انشا جی نے اپنے رنگِ خاص میں لکھا ہوا مضمون ختم کیا اور سحر انصاری کو دعوتِ سخن دی۔ سحر انصاری نے علامہ اقبال کا وہ قطعہ جو انھوں نے والیِ بھوپال کی شان میں جشنِ حالی کے موقع پر پڑھا تھا اور اس کا منظوم اردو ترجمہ بھی سنایا۔ ترجمہ اس قدر خوب صورت اور مکمل تھا کہ حاضرین نے بے ساختہ داد دی۔

سحر انصاری کے بعد محمد احمد سبزواری صاحب نے مضمون پیش کیا۔ ان کا مضمون بھوپال کے علمی اور ادبی پس منظر اور اس دور کے عالمی حالات، بالخصوص ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی فضا پر محیط تھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کہا "تحقیق کی راہیں کبھی بند نہیں ہو سکتیں۔ شکسپیئر جو کہ اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا اس کے انتقال کو تقریباً ساڑھے تین سو سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اب بھی ہر سال دو ایک تحقیقی کتابیں اس پر شائع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کو تو ابھی چالیس سال ہی گزرے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مفکرِ مشرق پر کافی تحقیق ہو چکی ہے، یہ رجحان غلط ہے۔" صہبا صاحب کے اندازِ تحقیق کو سراہتے ہوئے انھوں نے

کہا۔"کتاب کی ترتیب میں صہبا کی دیانت داری نے بھی مجھے کافی متاثر کیا ہے جو چیز جہاں سے اور جس طرح لی اس کو من وعن بیان کر دیا ہے، ورنہ دوسروں کی باتوں کو اپنے نام سے بیان کر دینا ایک عام سی بات ہے۔ لوگ تو زندوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے ہیں پھر ان کا تو ذکر ہی کیا جواب مدافعت کے قابل نہیں رہے ہیں۔"!

سبزواری صاحب کے بعد نامور نقاد جناب مجنوں گورکھپوری سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مجنوں صاحب نے اس تقریب کی پہلی تقریر کی۔ انھوں نے کچھ اس طرح آغاز کیا۔"میں صہبا صاحب کو جسمانی طور پر بچھائیں سے زیادہ نہیں سمجھتا (اس جملے پر اہلِ محفل نے اس لیے لطف لیا کہ مجنوں صاحب خود بھی صہبا صاحب کے ہم جثہ ہیں)۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ وہ بھاری بھرکم کام کرڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ بھاری بھرکم کام کی تازہ ترین مثال "اقبال اور بھوپال" ہے۔" مجنوں صاحب نے جشنِ حالی میں اپنی شرکت کا انکشاف فرماکر حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے بتایا کہ پانی پت میں جشنِ حالی کے موقع پر علامہ اقبال سے ملاقات بھی کی تھی اور چند سوالات بھی کیے تھے لیکن چونکہ علامہ گلے کی تکلیف میں مبتلا تھے، ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اس لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش ہوگئے۔ آخر میں مجنوں صاحب نے ان الفاظ میں مبارک باد پیش کی۔"صہبا صاحب نے اپنی تحقیق کو شگفتہ اور لطیف انداز میں پیش کیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔"

صہبا صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنی تحقیق کے بارے میں کچھ فرمائیں۔ صہبا صاحب نے روایتی انداز میں انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنی سعی و تحقیق پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نشست پر واپس چلے گئے۔

ابنِ انشا نے آخر میں اس تقریب کی مہمان خصوصی شہزادی عابدہ سلطان سے درخواست کی کہ وہ خطبۂ صدارت پیش فرمائیں۔

شہزادی عابدہ سلطان گویا ہوئیں۔"سب سے پہلے میں منتظمین کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، میں ممنون کہ انھوں نے اس امتیاز کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔" "اقبال اور بھوپال" پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے انھوں نے کہا۔"میں اس کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں، مجھے قطعی امید نہ تھی کہ کوئی شخص اس نوعیت کی تحقیق و جستجو میں کامیاب ہوسکے گا کیوں کہ ان واقعات کو گزرے زمانہ ہوگیا۔ قیامِ پاکستان کے دوران جو لاکھوں افراد اُدھر سے اِدھر ہوئے، اس میں جان و مال کا نقصان تو ہوا ہی ہوا۔ بہت سے رابطے ٹوٹ گئے۔ قیمتی دستاویزیں، کتابیں، خطوط اس طرح ضائع ہوگئے کہ پھر ان کا پتا ہی نہ مل سکا۔ خود میری کتابوں اور بیشتر کاغذات کا یہی حشر ہوا۔" شہزادی عابدہ سلطان نہایت متانت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک جملہ ادا کر رہی تھیں۔ ان کے ہر فقرے میں کرب پنہاں تھا۔ آج "اقبال اور بھوپال" نے ان کی پرانی یادوں کے زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔ ماضی کے شکوہ کی پرچھائیاں آج بھی ان کی آواز کے زیروبم میں مجسم ہوکر نظر آرہی تھیں۔ وہ فرما رہی تھیں علامہ اور میرے والدین میں جو قدریں مشترک تھیں، ان کی بنیاد جامعہ علی گڑھ تھی۔ عالمِ اسلام کی ترقی اور فلاح و بہبود تھی جو کسی خاص علاقے سے مخصوص نہ تھی، میرے والد اکثر یہ مصرع گنگنایا کرتے تھے:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

انھوں نے فرمایا کہ"آج کی محفل میں مفکر بھی ہیں، مصنف بھی ہیں، شاعر بھی، اہلِ قلم بھی، اقبال کے جانشین بھی ہیں، بھوپال کے وارث بھی۔ آپ کی جانشینی کا حق اسی وقت ادا ہوگا کہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کو آپ اسی طرح جاری رکھیں۔ آج آپ آزاد ہیں اور خود مختار بھی۔ اس وقت آپ کو متعدد قسم کے اختلافات سے سابقہ تھا۔ آج آپ کو صرف اپنے مسلمان بھائیوں کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ محبت اور پیار سے متحد کرنا ہے۔ دلائل کے ذریعے یقین دلانا ہے کہ ہماری سب کی بقا اور ترقی کا راز اتحاد و محبت ہی میں ہے۔"

مہمانِ خصوصی کی تقریر کے بعد ابنِ انشا صاحب نے اعلان کیا کہ چائے اور خورد و نوش کا انتظام لان میں کیا گیا ہے اور یہ انتظام بھی کیا گیا ہے کہ جو صاحب اس وقت "اقبال اور بھوپال" خرید فرمائیں گے ان کی کتاب پر صہبا صاحب آٹوگراف بھی دیں گے۔

کچھ لوگ شہزادی عابدہ سلطان کے جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ اکیڈیمی کے اسٹال سے "اقبال اور بھوپال" خرید کر صہبا صاحب سے دستخط لینے لگے۔ اور بقیہ خواتین و حضرات اس لان کی طرف چل دیے جہاں چائے اور لوازمات کا اہتمام تھا۔ ایک صاحب نے چائے کے دوران بتایا کہ چودہ پندرہ جلدیں فروخت ہو گئیں۔ ہم نے کہا غنیمت ہے ہمیں تو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کی وہ تقریب اب تک یاد ہے جس میں ایک شاعر کی ۵۰ جلدیں رکھی گئی تھیں۔ تقریب کے خاتمے کے بعد حساب لگایا تو پتا چلا ایک جلد فروخت ہوئی اور ایک جلد کسی نے چُرالی۔

——— محسن بھوپالی

(تقریبِ رونمائی کا آنکھوں دیکھا حال[1])

اقبال اور بھوپال

صہبا لکھنوی یوں تو دیکھنے میں دھان پان نظر آتے ہیں، لیکن اس مختصر انسانی جسم کے اندر عزم اور حوصلے کا جو دیو چھپا بیٹھا ہے، اس نے اچھے اچھوں سے اپنا لوہا منوایا ہے، اور اب تو صہبا لکھنوی کو عزم اور حوصلے کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ بات میں نے بلا سوچے سمجھے نہیں لکھی، بلکہ میرے سامنے صہبا لکھنوی کی جد و جہد سے بھرپور زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ "افکار" اور صہبا لکھنوی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ تقریباً رُبع صدی سے افکار باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ پاکستان جیسے ملک میں کوئی ادبی رسالہ نکالنا کتنا مشکل کام ہے، وہی صہبا لکھنوی کی مشکلوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ گزشتہ پچیس برسوں میں بے شمار ادبی رسالے منصۂ شہود پر آئے۔ انھیں بڑے سرمائے اور بلند ارادوں سے نکالا گیا تھا، مگر ان میں سے اکثر بن کھلے مرجھا گئے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کے کئی اسباب ہیں۔ ہمارا ملک صرف سترہ فی صد پڑھے لکھے لوگوں کا ملک ہے، اور ان پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مشکل سے ایک یا دو فی صد لوگ ایسے ہوں گے جن کو ادب سے دلچسپی ہوگی۔ اور پھر ان میں سے ایسے لوگوں کو شمار کیجیے جو ادبی رسائل خریدنے کی استطاعت رکھتے ہوں تو صورتِ حال نہایت حوصلہ شکن نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں صہبا لکھنوی نے "افکار" کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اسے پاکستان کا بہترین ادبی رسالہ بنا دیا اور اب تو یہ واحد رسالہ ہے جو باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے میں صہبا لکھنوی کو بہت سی قربانیاں دینی پڑیں، اور میرے نزدیک سب سے بڑی قربانی یہ دی کہ وہ اپنی شاعری کی طرف سے غافل ہو گئے جو ان کا اصل میدان تھا۔ صہبا لکھنوی ایک اچھے شاعر ہیں، اور ایسے بہت سے شاعروں سے بہتر ہیں جن کو "اچھا" سمجھا جاتا ہے لیکن صہبا نے نشر و اشاعت کے وسائل ہونے کے باوجود، اپنی شاعرانہ شخصیت کو اس طرح اُبھرنے کا موقع نہیں دیا، جس طرح وہ خود دوسروں کی شاعرانہ شخصیتوں کو اُبھارتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ اپنی ادبی حیثیت کو منوانے کے لیے رسالے نکالتے ہوں، وہاں کسی مدیر کا اپنے تخلیقی جوہر سے تغافل برتنا ایک عجیب سی بات ہے لیکن جب میں "افکار" کی خدمات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ

---

[1] ماہنامہ کتاب، لاہور۔ ستمبر ۱۹۷۳ء ۶۔ صفحہ ۱۳ تا ۱۵

جیسے یہ بھی ادیب اور شاعر صہبا لکھنوی کا مسلسل تخلیقی عمل ہے۔ "افکار" کو بنانے اور سنوارنے میں صہبا نے جس طرح اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے، وہ ایک تخلیقی فن کار ہی فن کی تخلیق میں صرف کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام ادبی رسالے "کشکول" اور وہ بھی "کشکولِ گدائی" نظر آتے ہیں، لیکن افکار ایک ایسا مجموعۂ نگارشات ہے جس کا ایک اپنا مزاج ہے، اور جس کے مطالعے سے ہم ادب کی رفتار اور سمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یوں تو ہر رسالہ اپنے ایڈیٹر کے نزدیک ایک تحریک ہوتا ہے، لیکن "افکار" واقعی ایک ادبی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ پچیس ۲۵ برسوں کے بہترین ادب کا بڑا حصہ افکار کے توسط سے منظر عام پر آیا ہے، یہی نہیں بلکہ اس عہد کے متعدد اچھے ادیب بھی ہمارے ادب کو "افکار" ہی کے ذریعے ملے ہیں۔ اس قسم کے کام وہی رسالے انجام دے سکتے ہیں جن کے سامنے کوئی واضح مقصد ہو، غیر ادبی مقصد نہیں خالص ادبی مقصد۔ بلاشبہ "افکار" ایک ایسا ہی رسالہ ہے۔

یہ ساری تمہید لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حال ہی میں صہبا لکھنوی کی ایک اور خوبی کا انکشاف ہوا ہے۔ ایک شاعر اچانک یا اتفاقاً کوئی اچھا ادب پارہ تخلیق کر سکتا ہے، لیکن کسی شاعر یا مدیر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اچانک کوئی بلند پایہ تحقیقی کارنامہ پیش کرے بڑی حد تک نامناسب ہے۔ لیکن صہبا لکھنوی نے "اقبال اور بھوپال" لکھ کر ایک بلند پایہ محقق کا کردار جس خوبی سے ادا کیا ہے، اس پر مسرت بھی ہوتی ہے اور حیرت بھی۔ مسرت اس بات پر کہ انھوں نے موضوع کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا ہے اور حیرت اس بات پر کہ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود وہ اتنا بڑا کام کر گزرے۔

اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر مزید لکھنے کی گنجائش نہیں رہی، لیکن جن لوگوں نے اقبالیات کے ذخیرے کو کھنگالا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ابھی اس موضوع پر لکھنے کی بہت گنجائش ہے۔ اقبال کا بھوپال اور اس ریاست کے حکمراں سے جو تعلق تھا، اس کے بارے میں ذخیرۂ اقبالیات میں چند منتشر اشارے ملتے ہیں یا عبدالقوی دسنوی کا ایک مختصر کتابچہ۔ یہ سب تحریریں پوری طرح موضوع کا حق ادا نہیں کرتیں۔ صہبا لکھنوی نے مواد کی فراہمی میں جس محنت اور مواد کی ترتیب میں جس سلیقے سے کام لیا ہے، اس کی بنا پر ان کی کتاب اپنے موضوع پر پہلی جامع کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

۲۰×۲۶ سائز کے ۲۱۲ صفحات کی یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں اقبال کے بھوپال اور اہلِ بھوپال سے تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے۔

پہلا باب "بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط" ہے۔ اس میں اقبال کے بھوپال سے تعلق کے ابتدائی مراحل کی نشان دہی کی گئی ہے اور اسی ضمن میں علامہ مرحوم کے ایسے خطوط بھی درج کیے ہیں جو اہلِ بھوپال کے نام ہیں یا جن میں بھوپال کا ذکر آتا ہے۔

دوسرا باب اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کے باہمی تعلق سے متعلق ہے۔ اس باب میں اقبال حسین خاں (ندیم خاص نواب بھوپال) کے بیان، مولانا غلام رسول مہر کے خطوط اور نذیر نیازی کی تحریری شہادتوں سے اقبال اور نواب بھوپال کے قریبی اور گہرے روابط کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اقبال حسین کا بیان اور مولانا مہر کے خطوط پہلی مرتبہ اسی جگہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اقبال حسین کی ایک ایسی غزل بھی اس باب میں ہے جس پر علامہ نے اصلاح دی تھی۔

تیسرا باب اقبال کے بھوپال میں پہلے قیام (جنوری۔ مارچ ۳۵ء) کی روداد پر مشتمل ہے۔ اسی باب میں اقبال اور سر راس مسعود کے تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ چوتھا باب ریاستِ بھوپال سے وظیفہ ملنے کے بارے میں ہے۔ پانچویں باب میں اقبال کے دوسری مرتبہ قیامِ بھوپال (جولائی، اگست ۳۵ء) کی تفصیلات ہیں۔ اس کے بعد کے باب میں جشنِ حالی (۱۹۳۵ء) سے بھوپال اور اقبال کے تعلق کی صراحت کی گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر سید عبدالباسط (جو بھوپال میں اقبال کے معالج تھے) کے نام اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط پیش کیے گئے ہیں۔ آٹھواں باب اقبال کے تیسرے قیامِ بھوپال (مارچ، اپریل ۳۶ء) کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ آخری پانچ ابواب۔

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ہیں :

- اقبال، راس مسعود اور ضربِ کلیم
- دار الاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ
- ملفوظاتِ قدسی اور نیاز مندانِ بھوپال
- اقبال کے اثرات
- اقبال اور قرآنِ مجید کے حواشی

یوں تو اس کتاب کا کوئی باب نئی معلومات سے خالی نہیں ہے لیکن ملفوظاتِ قدسی سے متعلق باب بہت اہم ہے۔ اس باب میں حضرت شاہ اسد الرحمٰن قدسی، شہزادی عابدہ سلطان، محمد احمد سبزواری، عبد الحیٔ (ابن ڈاکٹر عبد الباسط)، محمد خلیل اللہ خاں، علی حیدر عباسی، چوہدری خاقان حسین اور مسیح صدیقی کی یادداشتیں، حیاتِ اقبال کے بہت سے نئے گوشوں کو سامنے لائی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صہبا لکھنوی نے اس کتاب کی تدوین میں بے حد محنت کی ہے۔ برسوں وہ اس کے مواد کی فراہمی کے لیے تگ و دَو کرتے رہے، متعدد اشخاص سے انھوں نے ملاقاتیں کیں اور بے شمار کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کی، تب کہیں جا کر یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف ادبی تحقیق کا اعلیٰ معیار ملتا ہے، وہیں دوسری طرف شگفتہ اسلوب بیان بھی نظر آتا ہے۔ صہبا لکھنوی کی نثر تازگی، شگفتگی اور سادگی کی حامل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو اردو کی عام تحقیقی کتابوں کے برعکس، شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔

آخر میں مَیں اس قدر اور عرض کروں گا کہ پاکستان کی یونی ورسٹیوں میں متعدد تحقیقی مقالات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے، اور ان میں سے جو شائع ہوئے ہیں، ان میں دو ایک کے علاوہ مجھے کوئی ایسا تحقیقی مقالہ نظر نہیں آتا جو صہبا لکھنوی کی کتاب کے معیار تک پہنچتا ہو۔ "اقبال اور بھوپال" سے ہمارے اہلِ تحقیق اور خصوصاً یونی ورسٹیوں میں تحقیق کرنے والے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

یہ کتاب اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کی ہے اور قیمت پندرہ روپے ہے۔

——— مشفق خواجہ [1]

فنون - لاہور

اقبال کی وفات کو پینتیس برس ہونے کو آئے مگر حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کا عمل ہنوز جاری ہے۔ یہ اس مبارک عمل کا کرشمہ ہے کہ تقریباً ہر سال اقبال کی زندگی کے کسی نہ کسی دھندلے گوشے کو روشنی میں لانے کی مہم کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے اور یوں اقبالیات میں ایک نئے مقامِ نظر کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کے ریاست بھوپال سے تعلقات بھی حیاتِ اقبال کا ایک نیم تاریک علاقہ تھے۔ نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کے روابط کا پورا سیاق و سباق معلوم نہ ہونے کے باعث بہت سے ناقدانِ فن اقبال کی تعلیمات کے انقلابی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے وقت اقبال پر شاہ پرستی کا الزام عاید کر دیتے تھے۔ اقبال کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور پختہ فکر نقاد عزیز احمد تک نے اقبال عصرِ حاضر کا عظیم انقلابی شاعر ثابت کرنے کے بعد یہ سوال اٹھانا ضروری سمجھا تھا:

---

[1] ماہنامہ قومی زبان، کراچی۔ اگست ۱۹۷۳ء، ۶۔ صفحہ ۱۵ تا ۱۷

”بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی انقلابی تعلیم میں حارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد پیدا ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔“ ”اقبال اور بھوپال“ کی اشاعت کے بعد یہ تضاد دور ہو گیا ہے۔ صہبا لکھنوی نے بارہ برس کی عرق ریزی کے بعد ایسا جامع اور مستند تحقیقی مواد جمع کر دیا ہے جس کے مطالعے سے اقبال کی بھوپال سے وابستگی اپنے حقیقی تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انتہائی تنگدستی اور اپنی رفیقۂ حیات کی شدید علالت کے زمانے میں بھی اقبال نے ریاست حیدر آباد سے وابستگی اور سر آغا خان سے مالی امداد کی پیشکش کو تو ایک قلندرانہ آن کے ساتھ رد کر دیا۔ سر اکبر حیدری اور سر سکندر حیات کی طرف سے مادی سہاروں کی پیشکش کو تو پائے استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا مگر نواب حمید اللہ خاں کا وظیفہ قبول کر لیا اور نہ صرف قبول کیا بلکہ اس نسبت پر بارہا فخر و انبساط کا اظہار کیا —— یہ سوال اقبالیات کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے ایک مدت سے سوہانِ روح تھا۔ وہ والیِ بھوپال سے اقبال کے مراسم کو مذکورہ بالا تضاد سمجھنے پر مجبور تھے۔ صہبا لکھنوی نے ”اقبال اور بھوپال“ کی تصنیف سے اس سوال کا شافی جواب مہیا کر دیا ہے۔ اس کتاب کا کوئی بھی قاری یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بھوپال کی ریاست برصغیر کی دیگر مسلمان ریاستوں کے مقابلے میں عالمِ اسلام اور ہندی مسلمانوں کی انقلابی جد و جہد سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔ وہ پان اسلامزم کی تحریک ہو یا ہندی مسلمانوں کے جداگانہ اور منفرد قومی وجود اور سیاسی تشخص کے منوانے کی جد و جہد ہو —— ریاست بھوپال کے فرماں رواؤں نے اس میں عملی دلچسپی لی۔

ریاست بھوپال کی فرماں روا شاہ جہاں بیگم نے اپنا عقدِ ثانی سید صدیق حسن سے کیا تھا۔ سید صاحب جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ اور سید احمد شہید کے رفقائے خاص میں سے ایک تھے۔ پان اسلامزم کی تحریک مجاہدین سے عملی روابط رکھتے تھے اور اسی بنا پر برطانوی حکومت نے آپ سے نوابی کا خطاب واپس لے لیا تھا اور آپ کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں عوامی اندازِ فکر رکھتے تھے اور مسلمانوں کی آزادی اور ترقی کے نصب العین کو عزیز جانتے تھے اور زندگی کے آخری ایام میں اقبال قرآن کریم کے حواشی جس انقلابی اندازِ نظر سے لکھنا چاہتے تھے، نواب حمید اللہ خاں اس سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے اقبال کو وظیفے کی پیشکش کرتے وقت اقبال کی اس آخری علمی مہم کا ذکر کیا تھا کہ اقبال مادی پریشانیوں سے نجات پا کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ اس سب کے باوجود راس مسعود کی دوستی ریاستِ بھوپال سے اقبال کی مادی وابستگی کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی۔ راس مسعود کی بھوپال میں تقرری کے بعد جب پہلے پہل اقبال بھوپال پہنچے تو نواب حمید اللہ خاں نے انھیں اپنا مہمان بنانے کی سعادت حاصل کرنا چاہی مگر اقبال نے یہ کہہ کر شیش محل جانے سے انکار کر دیا کہ ”میں تو اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔“

اقبال نے ”مسعود مرحوم“ کے عنوان سے راس مسعود کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں سوز و گداز، گہرے خلوص اور حقیقی محبت کے جذبات موجزن ہیں۔ ”اقبال اور بھوپال“ میں راس مسعود اور اقبال کی محبت کی پوری روداد قلمبند کر دی گئی ہے۔ دوستی، محبت اور ایثار کی یہ کہانی دلگداز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کے آخری لمحات میں اقبال کو راس مسعود کے پس ماندگان کی اپنے بچوں سے بھی زیادہ فکر تھی اور راس مسعود مرتے دم تک اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانے میں ہمہ تن محو تھے۔ بھوپال سے اقبال کی مالی امداد کا بندوبست کرنے کے بعد راس مسعود اقبال کو بار بار مجبور کر رہے تھے کہ وہ حیدر آباد اور آغا خان کی پیشکشوں کو نہ ٹھکرائیں اور اقبال بار بار راس مسعود کو بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت تک کسی شخص کی امداد قبول نہیں کر سکتے جب تک ان کے دل میں اس کی کوئی خاص وقعت نہ ہو۔ راس مسعود پھر اقبال کی تنگ دستی کی بحث چھیڑتے اور اقبال پھر کہتے کہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے میری ضروریات کے لیے کافی ہے، اس سے زیادہ کی خواہش کرنا ہوس کاری ہے۔ اقبال کی یہ منطق راس مسعود کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ آخری سانس تک، اقبال کو قائل کر کے اقبال کی مادی پریشانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے منصوبے سوچا کیے۔ صہبا لکھنوی نے اقبال کے بھوپال سے تعلقات کا صحیح تناظر پیش کرنے کی جد و جہد میں

بھوپال کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کی تاریخ بھی قلم بند کردی ہے اور اقبال کی مثنوی " پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق " اور " ضربِ کلیم " کے تخلیقی پس منظر پر بھی نئی روشنی ڈالی ہے ۔ اس کے علاوہ اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط اور قرآن کریم کے حواشی لکھنے کی آخری علمی کاوش کا پورا خاکہ بھی منظر عام پر لے آئے ہیں ۔ یہ کتاب اردو کے تحقیقی ادب اور اقبالیات ـــ ہر دو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ۔ اس کی تصنیف سے ایسا جامع اور قابلِ اعتبار تحقیقی مواد سامنے آگیا ہے جس کی حیاتِ اقبال کے شارحوں کو ضرورت تھی اور جس کے بغیر اقبال شناسی میں ایک گونہ رکاوٹ موجود تھی ۔ " اقبال اور بھوپال " کی اشاعت کے بعد اقبال کی مفصل اور معتبر سوانح لکھنے کا سامان پیدا ہوگیا ہے ۔ نظر حیدر آبادی کی " اقبال اور حیدر آباد "، محمد عبداللہ قریشی کے " مکاتیبِ اقبال " سید نذیر نیازی کی " اقبال کے حضور " کے بعد صہبا لکھنوی کی " اقبال اور بھوپال " کی اشاعت سے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ بزمِ اقبال یا اقبال اکادمی یا دونوں مل کر اقبال کی سوانح حیات مرتب کرنے کا جامع منصوبہ بنائیں ۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس پر عمل شروع ہوگا تو صہبا لکھنوی کی پُرخلوص علمی اور تحقیقی لگن کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیقی دیانت اور بھوپال اور اقبال سے ان کی عقیدت کا اعتراف کرتے ہی بنے گی ۔

ـــــــــــ فتح محمد ملک [۵۱]

افکار ۔ کراچی

میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ صہبا لکھنوی " اقبال اور بھوپال " کے روابط پر اس قدر وقیع مقالہ لکھ لیں گے جو نہ صرف تحقیق کے میدان میں ایک غیر معمولی کارنامہ ہے بلکہ تدقیق کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہم ہے ۔ صہبا صاحب کے بارے میں حیرت کا مقام یہ اس لیے نہیں ہے کہ خدانخواستہ وہ اس کام کے اہل نہیں ، بلکہ اس لیے کہ وہ بے حد عدیم الفرصت آدمی ہیں ۔ " افکار " کے ماہانہ نشر و اشاعت کے کاموں کے علاوہ ضخیم ادبی نمبروں کی ترتیب و تشکیل کا کام بھی انجام دیتے رہتے ہیں ۔ ان مصروفیات کے دوران چپ چاپ تحقیق و تدقیق کا کام بھی جاری رکھنا اور اسے بحسن و خوبی انجام دے دینا میرے نزدیک معجزے سے کم نہیں ۔

مذکورۂ بالا کتاب پر نومبر کے مہینے میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک مختصر تبصرے میں راقم الحروف نے جن باتوں کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرائی تھی ۔ ان میں سے چند کا مختصراً ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ اوّلاً تو یہ کہ تیرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کو " اقبال اور بھوپال " پر جس طرح منطبق کیا گیا ہے اور موضوع سے ہٹ کر حشو و زوائد کو جس طرح ترک کیا گیا ہے ، وہ بجائے خود ایک ہنر ہے ۔ یہ ہنر صہبا صاحب کو افکار کی تیس سالہ ادارت کے تجربے سے حاصل ہوا کہ غیر ضروری اور فالتو چیزوں کو کس طرح ترک کیا جاتا ہے ۔ ثانیاً اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کو مرکزی حیثیت ، اگر موضوع کے لحاظ سے حاصل ہے ، تو مصنف نے اس حیثیت کو نہ صرف یہ کہ اُجاگر رکھا ہے ۔ بلکہ بھوپال کی غیر ضروری بھاری بھرکم شخصیتوں میں دبنے سے بچایا ہے ۔ خصوصاً نواب بھوپال اور سر راس مسعود کے مقابل میں خطرہ تھا کہ مصنف کسی عصبیت کا شکار نہ ہوجائے ۔ لیکن اس بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز پل صراط سے صہبا بخوبی گزرے ہیں ۔ ثالثاً بھوپال کی منفرد حیثیت کو جن عوامل کی مدد سے منفرد ظاہر کیا جاسکتا ہے ۔ ان کے ایک ایک جز کو

---

[۵۱] رسالہ فنون ، لاہور ۔ ستمبر ، اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۹۴ تا ۱۹۶

صہبا نے ملحوظ رکھا ہے۔ رابعاً "اقبال اور بھوپال" کے روابط میں پاکستان کے خاموش خط وخال کو جس طرح ابھارا گیا ہے وہ کسی صاحبِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں، خامساً "اقبال اور بھوپال" کی کہانی، پاکستان کی کہانی ہے، اور یہ مقالہ مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم جز ہے، اس کے ذیل میں تاریخ کے طالب علم کو بہت سی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

صہبا نے "آئینۂ مشاعرہ" نامی ایک مختصر سے رسالہ سے "اقبال اور بھوپال" کے ربط کو ۱۹۱۰ء سے ثابت کیا ہے۔ نواب حمید اللہ خاں سے اقبال کے روابط کا ذکر بھی اسی مقام سے شروع ہوتا ہے اور پھر علامہ اقبال کی بھوپال میں آمد و رفت اور سر راس مسعود سے خصوصی روابط کا آغاز بھی جس طرح ہوتا ہے وہ بجائے خود اہم واقعات ہیں، اقبال کے وظیفے اور اس کے صحیح پس منظر پر پہلی مرتبہ اس قدر مفصل طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دورانِ قیام بھوپال میں علامہ پر جن نظموں کا اجلال ہوا ہے، اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ جشنِ حالی، نواب صاحب کا خطبہ، اقبال کی شرکت، ان سب پر پہلی مرتبہ رائے زنی کی گئی ہے اور مستند حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبد الباسط سے اقبال کی اہم مراسلت، بہت سے ابواب وا کرتی ہے۔ اقبال کی بھوپال میں آمد و رفت، علاج معالجہ، وظیفہ وغیرہ پر روشنی پڑتی ہی ہے۔ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" اور "ضربِ کلیم" کے بارے میں بھی اہم انکشافات یہاں ہوئے ہیں؛ حتٰی کہ اقبال کی وفات اور تعزیت تک کے واقعات، جو بھوپال تک پھیلے ہوئے تھے، صہبا نے انھیں بھی نہ چھوڑا ہے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اقبال قرآن مجید پر جس انداز اور جس نہج پر حواشی لکھنے کا مہتم بالشان کام شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ واقعات اقبالیات میں بلاخوفِ تردید گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صہبا اس امر میں بھی کامیاب و کامران ہوئے ہیں کہ انھوں نے اقبال کے بھوپال سے ذہنی، قلبی اور روحانی تعلق کو ثابت کیا ہے جو مرحوم کو بھوپال سے واقعی تھا۔ چند مشہور و معروف ہستیوں سے اقبال کی مراسلت نہ صرف اس امر کا بیّن ثبوت ہے، بلکہ مراسلت کا مواد "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کا مصداق ہے۔

صہبا نے اقبال کی ایک نادر تصویر جو کسی بھوپالی مصور نے کوئلہ سے بنائی تھی، اس کتاب میں شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ بھوپال کی اہم شخصیتوں اور عمارتوں کی تصویریں بھی اس میں شامل ہیں، جن سے اقبال کا کوئی نہ کوئی علاقہ تھا۔ اقبال اکادمی، ہر طرح لائق مبارک ہے کہ اس نے اتنے اہم کام کے لیے ایک نحیف الجثہ، لیکن قوی العزم شخص کا انتخاب کیا جس نے نہایت اہم دستاویزات اکٹھا کر کے اقبالیات کے سلسلے میں "اقبال اور بھوپال" کو سچ مچ ایک وقیع اضافہ بنا دیا۔ بڑی تقطیع پر ۳۱۲ صفحات کی جلی و خفی حروف میں نفیس کاغذ پر چھپی ہوئی یہ مجلد کتاب، جس میں گرد پوش (DUST COVER) سے اقبال کی ثقاہت کا بھرم بھی قایم ہوتا ہے۔ فی زمانا پندرہ روپے میں مہنگی نہیں، بلکہ طالبانِ علم و ادب کے لیے تو یہ سودا کوڑیوں کے مول ہے۔

تحقیق کا فن میرے نزدیک جس قدر غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ ہے۔ غیر دلچسپ اور خشک طبع محققین اسے اور بھی خشک اور روکھا پھیکا بنا دیتے ہیں۔ لیکن صہبا کا کمال یہ ہے کہ از اول تا آخر زبان و بیان کی شگفتگی قایم رکھی ہے اور تحقیق کو تخلیق بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض عسیر الحصول ماخذوں سے جس طرح مواد حاصل کیا ہے۔ اس پر پیشہ ور محققین کی طرح فخر و مباہات نہ کر کے جس طرح صہبا نے کسرِ نفسی، بلکہ نفی نفسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ ان کی شرافت پر دال ہے۔ تدقیق تحقیق سے بھی آگے کی منزل ہے۔ صہبا اس خارزار میں بھی داخل ہوئے ہیں۔ لیکن اپنی آبلہ پائی کا ذکر کرنے کے بجائے انھوں نے قیمتی مواد سے نتائج کا استنباط و استخراج کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ــــــ ڈینگیں مارنا اور محققانہ تمرد سے کام لینا، صہبا کی منکسر المزاجی کے منافی ہے، چنانچہ جہاں اقبال کے باب میں بعض اہم باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ آپ یہ محسوس بھی نہیں کر سکیں گے کہ یہ بات پہلی

بار معرضِ شہود پر آرہی ہے ——

مذکورہ کتاب نہ صرف موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ بلکہ دو تین سال کی مدت میں اقبال پر جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سے بالموازنہ فائق ہے۔ یہ چند سطریں تو محض طالب علمانہ مطالعہ کا اعتراف ہے ورنہ مذکورہ کتاب کے محاسن صاحبانِ بصیرت اور صاحبانِ نظر پر اس وقت اور زیادہ عیاں ہو سکیں گے جب وہ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اس کتاب کا "اشاریہ" بھی مطالعہ کرنے والوں سے داد و تحسین حاصل کرے گا ——

—— آغا سہیل[۱]

اوراق - لاہور

"اقبال اور بھوپال"۔ ایک ایسے شخص کی تحقیق و تدوین کا شاہ کار ہے جس نے اس خار زار میں۔ پہلے بھولے سے بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ صہبا لکھنوی کسی زمانے میں اردو کے صحت مند شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ پھر انھیں ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے کا سودا ہوا۔ اس لگن میں رسالہ "افکار" جاری کیا۔ آہستہ آہستہ ان کی شاعری اور صحت تو ادارتی بوجھ تلے دب گئی لیکن افکار —— ان کے فکر و عمل کو ہر قدم پر مہمیز لگاتا رہا۔ نتیجہ کبھی فیض نمبر کی صورت میں ظاہر ہوا کبھی حفیظ نمبر کی صورت میں۔ جوبلی نمبر ڈیڑھ ہزار صفحات کا نکال ڈالا تو اڑھائی تین صد صفحات کا مصطفےٰ زیدی نمبر ان کی آنکھوں میں جچا نہیں اور اسے نمبر کی بجائے محض "ایڈیشن" قرار دیا۔ صہبا لکھنوی صاحب کی یہ سب معنوی اولادیں ان کے دھان پان جثے اور کمزور صحت سے زیادہ صحت مند نظر آتی ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ تمام کام انھوں نے اکیلے ہی سر انجام دیے ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" ان کی جستجوئے مسلسل اور عمل پیہم کی مثال ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے موضوع پر جس کی حدود بہت تنگ ہیں صہبا لکھنوی نے پوری کتاب کیسے لکھ ڈالی۔ اس حیرت کو دور کرنے کے لیے میں آپ کو "اقبال اور بھوپال" پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

"اقبال اور بھوپال" کی اہمیت صرف اتنی نہیں کہ یہ دونوں ہم قافیہ ہیں۔ اس کتاب میں علم دوستی، فن شناسی اور ادب نوازی کی وہ درخشندہ روایت اپنی کڑیں مجتمع کر رہی ہے۔ جس کی روشنی پہلے بکھری بکھری تھی۔ اس کا اعتراف اقبال کے خطوط میں تو موجود ہے۔ لیکن اس روایت کی وہ کڑیاں جن کا سلسلہ بھوپال کے فرمانروا اور اس ریاست کے علم دوست اصحاب کے وسیع طبقے تک پھیلا ہوا تھا۔ صہبا لکھنوی کی وساطت سے ہی پہلی دفعہ سامنے آیا ہے۔ انھیں دریافت کرنے اور ان کا سلسلہ جوڑنے میں صہبا صاحب کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا احساس ہر سطر پڑھنے کے بعد ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر خیابانِ پشاور کا اقبال نمبر تلاش کرنے میں انھوں نے جس جاں کاہی سے کام لیا اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو جہاں بھی مواد کی بھنک پڑی وہ وہاں اُڑ کر پہنچے اور مواد حاصل کیے بغیر نہ لوٹے۔ پرانے زمانے میں کوئی بیمار پڑتا تو کوٹھے پر چڑھ کر چلاتا تھا۔ چنانچہ کہیں سے کوئی معالج ضرور میسر آجاتا۔ صہبا صاحب نے بھی اس کتاب کا قیمتی مواد یوں جمع کیا ہے کہ بھوپال سے تعلق رکھنے والے ہر شخص تک اپنی کتاب کی صدا پہنچا دی۔ بھون کے علاقے سے شاہ اسد الرحمٰن قدسی کو، محکمہ سیٹلمنٹ سے عبد الحیٔ صاحب کو ڈھونڈ نکالا اور بقول پروفیسر انجم اعظمی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے یہ کتاب مکمل کر ڈالی۔

---

[۱] ماہنامہ افکار، کراچی۔ جنوری ۱۹۷۴ء، صفحہ ۵ تا ۷

اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے صرف اقبال اور بھوپال کے روابط ہی منظرِ عام پر نہیں آتے بلکہ بھوپال کی تہذیب اور اس تہذیب کو فروغ دینے والی شخصیات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بھوپال کا سیر بین ہے اور صہبا نے بھوپال کے حوالے سے اقبال کو مَس کرنے والی ہر شخصیت کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ کتاب کل تیرہ ابواب پر محیط ہے۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صہبا صاحب "آرٹ آف بک میکنگ" کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہیں۔

کتاب کے ہر صفحے پر صہبا لکھنوی کی ذاتی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ انفرادیت بہت کم کتابوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ ہے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات اور قیمت پندرہ روپے۔

——— انور سدید[۱]

سیپ۔ کراچی

صہبا لکھنوی اب تک ادبی صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، لیکن گزشتہ دنوں انھوں نے اپنے دستار میں ایک اور طرّے کا اضافہ کر لیا ——— یہ طرّہ تحقیق اور اقبال شناسی کا ہے جس نے علمی و ادبی حلقوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور خراج تحسین وصول کیا۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری میں بڑی پہلوداری اور تہہ داری ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان پر اتنا کام ہونے کے باوجود اب بھی بعض مضامین یا کتابیں اقبال کی حیات یا کارناموں کو ایک نئے رُخ سے پیش کر کے ادبی دنیا کو چونکا دیتی ہیں ——— صہبا لکھنوی کی "اقبال اور بھوپال" بھی بلاشبہ ایسی ہی کتابوں میں سے ایک ہے۔

یہ بات تو ادب کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ بھوپال اور والیِ بھوپال سے علامہ اقبال کے خصوصی روابط تھے لیکن اس سلسلے میں ہمیں کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا۔ لے دے کر عبدالقوی دسنوی کا ایک کتابچہ "علامہ اقبال بھوپال میں" اور اختر جمال کا ایک مضمون "اقبال اور بھوپال" تھا جس سے اس سلسلے میں کچھ روشنی حاصل ہوئی تھی۔ صہبا لکھنوی نے بہ ظاہر اس محدود موضوع کو جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے۔

کتاب کے تیرہ ۱۳ ابواب ہیں۔ ۱۔ بھوپال سے علامہ اقبال کے روابط ۔ ۲۔ اقبال اور نواب حمید اللہ خاں ۔ ۳۔ بھوپال کا پہلا قیام ۔ ۴۔ اقبال اور وظیفہ ۔ ۵۔ بھوپال کا دوسرا قیام ۔ ۶۔ جشنِ حالی اور اقبال ۔ ۷۔ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ۸۔ بھوپال کا تیسرا قیام ۔ ۹۔ اقبال، راس مسعود اور ضرب کلیم ۔ ۱۰۔ دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا سوگ ۔ ۱۱۔ ملفوظاتِ قدسی اور نیازمندانِ بھوپال ۔ ۱۲۔ اقبال کے اثرات ۔ ۱۳۔ اقبال اور قرآن مجید کے حواشی ——— کتابیات اور اشاریہ کے حصے اس کے علاوہ ہیں۔

"اقبال اور بھوپال" میں قیاس آرائیوں کو راہ نہیں دی گئی۔ جو بھی واقعہ درج کیا گیا ہے۔ وہ مستند حوالوں کے ساتھ ہے۔ یہ حوالے کہیں کتابوں اور رسالوں کے ہیں اور کہیں معتبر ہستیوں کے بیانات کے۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ کتاب دلچسپ ہے اور اپنے اندر بے پناہ READABLITY رکھتی ہے۔ تحقیقی کتابوں میں یہ خوبی ذرا کم ——— بلکہ خال خال ہی نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب نہ صرف یہ کہ ایک ریاست سے ایک شاعر کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ ایک دَور کے فکری اور

[۱] رسالہ اوراق، لاہور۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۳۲۵ - ۳۲۶

تہذیبی نقوش بھی اُجاگر کرتی ہے۔ اقبال، اردو ادب اور مسلم تہذیب و ثقافت سے شغف رکھنے والے ہر شخص کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

ضخامت ۳۱۲ صفحات اور لکھائی چھپائی صاف ستھری ہے۔

——— علی حیدر ملک[۵۱]

کتاب - لاہور

اقبال کی شخصیت اور اس کے فن کا اتنا عمیق جائزہ لیا جا چکا ہے کہ اب اس پر مزید کچھ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کیونکہ کسی نئے پہلو کی تلاش و جستجو بذات خود ایک جاں گسل عمل ہے۔ تاہم جہاں تک "اقبال اور بھوپال" کا تعلق ہے۔ یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تامل نہیں ہوتا کہ صہبا لکھنوی نے بڑی محنت، کوشش اور شبینہ دیدہ ریزی کے بعد اپنی فکری کاوشوں کو "اقبال اور بھوپال" کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

جناب حنیف فوق کی اس بات سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب تحقیق کی منشیانہ روایت سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ "اقبال اور بھوپال" کے مطالعہ سے صرف چند خشک اور بے جان کتابوں کا علم نہیں ہوتا بلکہ ایک دور کی تہذیب، اس کا ذہنی و فکری پس منظر اور اس تہذیب کے پروردہ افراد کے تعلقات کی رنگا رنگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ پھر اقبال کے واسطے سے اس دور کی اہم شخصیتوں اور اہم سیاسی و فکری رجحانات کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکر سے متاثر فکری لہروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس طرح صہبا لکھنوی کی تحقیق بوسیدہ ہڈیوں کو منظرِ عام پر نہیں لاتی، ذہن کی زندہ و فعال سرگرمیوں کو پیش کرتی ہے۔

صہبا لکھنوی کی اس کتاب سے بے شمار ایسے گوشوں تک ہماری رسائی ممکن ہو گئی ہے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

صہبا نے برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک، حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کی داستان اور ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کے نقوش کو "اقبال اور بھوپال" میں از سرِ نو تازہ کر دیا ہے۔

——— عاصم صحرائی[۵۲]

افکار - کراچی

ماہنامہ "افکار" کے فاضل مدیر صہبا لکھنوی صاحب مدتِ مدید سے گلشنِ ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ اگرچہ وہ خود اسے شوقِ فضول اور باغبانیِ صحرا کے مترادف خیال کرتے ہیں تاہم اب ان کی مساعی کی کیفیت اور کمیت اپنوں اور غیروں سے یکساں طور پر داد پانے لگی ہے اور کم از کم اس امر کا اعتراف سب کرتے ہیں کہ وہ بڑی تن دہی سے ایک ادبی ماہنامے

---

۵۱ رسالہ سیپ، کراچی۔ مارچ اپریل ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۲۹۳

۵۲ ماہنامہ کتاب، لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۱۳۹-۱۴۰

کی بقا کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ہجومِ "افکار" میں گھرے رہنے کے ساتھ ساتھ وہ دس گیارہ سال تک اقبالیات کے ایک اچھوتے اور اہم موضوع پر بھی کام کرتے رہے جو اَب "اقبال اور بھوپال" کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔

علامہ اقبال کو بھوپال، نواب حمید اللہ خاں اور سر راس مسعود سے قلبی لگاؤ تھا، جس کا اظہار انھوں نے جابجا اپنے خطوط اور بعض منظومات میں کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ اقبال ایسے درویش خدامست و خودی مست اور نواب حمید اللہ خاں ایسے والیِ ریاست اور صاحبِ خدم و حشم میں کیا قدر مشترک تھی؟ ان کے روابط اور یگانگت کے کیا رموز و عوامل تھے۔

اقبال نے نواب حمید اللہ خاں کے نام "ضربِ کلیم" کا انتساب کیوں کیا اور اس قسم کے اشعار سے انھیں کیوں متصف کیا:

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو

ز الطاف تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

یہ سوال اپنے پس منظر اور جزئیات کے لحاظ سے حیاتِ اقبال اور فکرِ اقبال کے ایک اہم پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اب تک کوئی سیر حاصل کام سر انجام نہ پا سکا تھا۔ جزوی طور پہ بعض واقعات منتشر حالت میں مل جاتے تھے۔ لیکن ان سب کو باہم مربوط کر کے ایک مکمل عہد کو چشمِ تصور سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی کسی نے نہ کی تھی۔ اس مشکل کام کی تکمیل کا سہرا صہبا لکھنوی کے سر بندھنا تھا سو انھیں "اقبال اور حیدر آباد" کے نام سے "اقبال اور بھوپال" کا خیال پیدا ہوا اور وہ اس کی تکمیل میں جان و تن سے مصروف ہو گئے۔ کسی مکمل کتاب کا لکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پہلے اس کے موضوع اور اور ہیئت کو اس کے تمام تر مضمرات کے ساتھ CONCEIVE کرنا کتاب کی تکمیل کا سب سے اہم مرحلہ ہے۔ پھر اس کے مواد کی فراہمی میں جن مشکلات، مصائب اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے جانبر ہونے کے بعد ہی کتاب کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ "اقبال اور بھوپال" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبا لکھنوی کو بھی دیگر اربابِ فن کی طرح قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے عہد میں بے حسی اور عدم تعاون کا رونا تو ہر شخص روتا ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ کسی علمی و تحقیقی کام کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی صہبا صاحب نے بعض اہم اور ناگزیر شخصیتوں کے تاثرات و خیالات براہِ راست ان سے حاصل کر لیے اور بعض بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے میں پوری استقامت و جانفشانی کا ثبوت دیا۔

تین سو سے زائد صفحات کی اس کتاب کے تیرہ ابواب ہیں۔ اقبال کے بھوپال سے روابط کی ابتدا، نواب حمید اللہ خاں سے ان کے ذاتی روابط، اقبال کے وظیفۂ بھوپال کے محرکات اور ان کا پس منظر، راس مسعود اور اقبال، بھوپال میں اقبال کے تین قیام۔ اہلِ بھوپال پر اقبال کے اثرات اور قرآن مجید کے حواشی سے متعلق اقبال اور نواب حمید اللہ خاں کا منصوبہ جیسے موضوعات کا ان ابواب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں صہبا صاحب نے ۱۹۱۰ء میں اقبال کے بھوپال سے پہلے ربط کا سراغ لگایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ربط و تعلق اقبال کی وفات سے تین دن قبل تک قایم رہا۔ مطبوعہ ماخذ کے ساتھ ساتھ جشنِ حالی کی نظمیں اور خطبات، اقبال کے بعض خطوط، بعض تصاویر اور آٹو گراف پہلی بار — "اقبال اور بھوپال" میں شایع ہوئے ہیں۔ صہبا صاحب نے سارے مواد کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ تاریخی ترتیب و تسلسل برقرار رکھتے ہوئے شگفتہ اور رواں دواں نثر میں پوری تصنیف مکمل کی ہے۔ اقبال کے معمولات، ان کے بعض دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات شعرا کے کلام پر اصلاحیں، مطالعہ اور شعر گوئی کے بعض پہلو پہلی بار سامنے آئے ہیں۔

نواب بھوپال کے ندیم خاص اقبال حسین خاں نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے علامہ کے ارشاد کے مطابق کچھ شعر سنائے۔ میری ایک غزل کا مطلع یہ تھا :

کوئی تمنا بھری نظر سے چھپے بھلا کیوں نقاب کیسا ؟
ضیائے الفت اگر سلامت حجاب کیسا، حجاب کیسا ؟

" علامہ غزل سن کر کچھ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر تک ان پر ایک کیفیت سی طاری رہی پھر فرمایا۔ آپ نے اپنی غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات ادا کی ہے۔ غزل کا مطلع لکھیے۔ میں قلم نکال کر لکھنے پر تیار ہوا تو ارشاد ہوا :

نگاہ ہے پردہ سوز میری نقاب کیسا حجاب کیسا
تمھاری ان پردہ بندیوں کا، ملا ہے تم کو جواب کیسا ؟

میں خوشی کے مارے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا۔"

علامہ مجھے آپ کی خدمت میں اب شرفِ شاگردی حاصل ہو گیا۔ علامہ نے مجھے بڑی پیار کی نظروں سے دیکھا اور مسکرا دیے۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ علامہ کی شفقت مجھ پر اور بڑھ گئی۔

ایک اور واقعہ سے اقبال کے مطالعے کی رفتار یادداشت اور طریق کار کا اندازہ ہوتا ہے :

اقبال کے معالج خاص ڈاکٹر عبدالباسط کے بڑے صاحبزادے عبدالحیٔ کا کہنا ہے کہ :

" دن میں فرصت کے لمحوں میں مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے علامہ کو مطالعہ کا بہت شایق پایا۔ بھوپال کی مشہور حمیدیہ لائبریری سے برابر کتابیں منگواتے رہتے تھے اور ایک دو دن میں انھیں پڑھ کر لوٹا دیتے تھے اور نئی کتابیں حاصل کرتے تھے۔ جب بھی کسی کتاب کے بارے میں میں نے ان سے کچھ سوالات کیے وہ نہایت تفصیل سے اُس کے بارے میں جواب دیتے تھے۔ مجھے ان کی یادداشت پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی جلد ضخیم کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں اور کس طرح اُن کے موضوعات کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ دو کتابیں علی الخصوص ان کے سرہانے میں نے ہمیشہ دیکھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم، اور دوسری کلام عبدالقادر بیدل۔ دریافت پر علامہ نے بتایا کہ یہ دونوں کتابیں سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔"

صہبا صاحب نے ساری کتاب میں یہ التزام باقی رکھا ہے کہ واقعہ مستند حوالے کے بغیر رقم نہ ہو جائے۔ اس سے کتاب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب کے وسط میں اقبال کی بیماری کے احوال سے ایک قسم کی تکرار ضرور پیدا ہو گئی ہے جو شاید ناگزیر بھی تھی۔

کتاب میں جو واقعات مختلف افراد سے حاصل کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا تعارف کرانے کے بعد واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو تشنۂ تحقیق یا ہوائی ہو۔ اقبال کے ضمن میں وظیفۂ بھوپال اور حواشیٔ قرآن مجید کے تعلق سے خاصے متنازعہ مباحث چھیڑے جاتے رہے ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" میں صہبا صاحب نے پہلی بار ان امور کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے اور اعتراضات و تنازعات کا بھرپور اور مدلل جواب متعلقہ مواد کی روشنی میں فراہم کیا ہے۔

نادر و کمیاب تصاویر اور خطوط اقبال کے عکس کے علاوہ کتاب کے آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی شامل ہے جو اپنی ترتیب و کتابت کے لحاظ سے ایک منفرد چیز ہے۔ کتاب کے شروع میں صہبا صاحب نے جو "حرفِ آغاز" لکھا ہے اس سے کتاب

کے آغاز سے انجام تک کے تمام مراحل سامنے آجاتے ہیں اور بے اختیار ان کی محنت اور لگن کی داد دینی پڑتی ہے ــــــ

کسی رسمی انداز بیان کے بغیر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ "اقبال اور بھوپال" سے مدت کے بعد "اقبالیات" کی دنیا میں ایک منفرد، دلچسپ اور مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے ــــــ اس ضمن میں اس کے مصنف صہبا لکھنوی اور ناشر اقبال اکادمی، دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں ــــــ

ــــــ سحر انصاری[۱]

نشری تقریر۔ ریڈیو پشاور

آج کی دوسری زیرِ تبصرہ کتاب صہبا لکھنوی کا ایک تحقیقی کارنامہ "اقبال اور بھوپال" ہے۔ اس کی ضخامت تین سو صفحات۔ طباعت و کتابت اور کاغذ اوسط۔ قیمت پندرہ روپے اور ناشر اقبال اکادمی کراچی ہیں۔ نواب بھوپال نے مئی ۱۹۳۶ء میں علامہ اقبال کا پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ ہماری مردہ پرست قوم میں زندہ مشاہیر کی قدر دانی کی ایسی نادر مثال ہے جس سے اقبال ایسے نباض قوم کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ علاوہ ازیں اقبال بسلسلۂ علاج تین بار بھوپال میں تقریباً سوا سوا مہینے مقیم رہے۔ ان کے دوست اور مزاج دان اور مرتبہ شناس راس مسعود بھی انہی دنوں اس ریاست سے منسلک تھے۔ پھر "ضربِ کلیم" کا انتساب بھی نواب بھوپال کے نام ہے۔ یہ حقایق مدتوں سے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ لیکن صہبا لکھنوی نے نجی خطوط، سرکاری دستاویزات، متعلقہ شخصیتوں کے تاثرات، تاریخی شواہد کے ممکن الحصول ذرائع سے کام لے کر سالہا سال کی محنت سے یہ کتاب اس طرح مرتب کی ہے کہ اس میں ریاستِ بھوپال کی ادبی سرگرمیوں، چھوٹے بڑے شاعروں کی ادبی کاوشوں، نواب حمید اللہ خاں کی سیاسی بصیرت، ملّی غیرت اور جوہر شناسی، راس مسعود کی قد آور شخصیت اور دیگر اقبال فہم حضرات کے سارے کوائف ایک ہی داستان کا حصہ بن گئے ہیں اور اس ضمن میں اقبال کی عادات و اطوار، مراسم و تعلقات، فکر و مطالعہ کے نئے پہلو بھی سامنے آگئے ہیں۔

وظیفہ کے اظہارِ تشکر کے طور پر اقبال نے نجی خطوط میں اور پبلک تحریروں میں جو کچھ لکھا اس پر بعض حضرات معترض ہوئے ہیں کہ مردِ قلندر کو اوّل تو نوابوں سے کچھ تعلق رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اور اگر کسی نے اس کے ساتھ کچھ سلوک کیا تھا تو اس کی اتنی تعریف نہیں کرنی چاہیے تھی جتنی علامہ اقبال نے نواب بھوپال کی تعریف کی۔ صہبا لکھنوی بجا طور پر ان حضرات کے ہم نوا ہیں جو جذبۂ احسان مندی کو عمدہ اخلاق کا حصہ سمجھتے ہیں اور انھیں اس پر بھی اصرار ہے اور اس کے جواز میں انھوں نے خطوط سے اقتباس اور واقعات کے حوالے پیش کیے ہیں کہ نواب بھوپال اور اقبال ہندی مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور تعمیرِ مستقبل کے متعلق ایک ہی انداز سے سوچتے تھے اور یہ نظریاتی ہم آہنگی دونوں کو ۱۹۳۱ء کی دوسری گول میز کانفرنس میں ہی کافی نزدیک لے آئی تھی۔

اقبال کے بعض نادر خطوط کی طرح جو اس کتاب میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان کے بعض اقوال بھی اپنے ناقابلِ فراموش آہنگ کے ساتھ پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں۔ شادی کے متعلق ان کی رائے تھی کہ "شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں نوبل پرائز نہ ملنے کا

---

[۱] ماہنامہ افکار، کراچی۔ جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۷۸ تا ۸۰

سبب ان کے نزدیک یہ تھا کہ "میرے یہاں سب کچھ مغرب کے خلاف ہے اس لیے وہ مجھے نوبل پرائز کیسے دے سکتے ہیں۔" اس کے علاوہ کتاب بعض یادگار تصاویر سے بھی آراستہ ہے اور اقبال سے دور یا نزدیک کے تعلق کی وجہ سے ایسے بہت سے حضرات کے قلمی خاکے اور تخلیقات اس کتاب میں محفوظ ہوگئی ہیں جو دست بُردِ زمانہ سے کسی اور شکل میں محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ بہرحال یہ کتاب "اقبالیات" میں ایک دلچسپ اضافہ ہے اور اقبال کی بعض نظموں کے پس منظر اور خود ان کی فکر کے گوشوں پر بالکل نئی روشنی ڈالتی ہے۔

——— پروفیسر محمد احمد شمسی[۵۱]

اخبار خواتین۔ کراچی

آقبال اور بھوپال کا مسودہ صہبا لکھنوی (یا صہبا بھوپالی) کے طویل مطالعہ اور تحقیق کا حاصل ہے۔ بھوپال کو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کی پذیرائی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس ریاست نے اردو زبان و ادب کی اور تحریکِ پاکستان کی جس قدر خدمت کی ہے وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے، علامہ اقبال نے والیِ بھوپال نواب حمید اللہ خاں کو ضربِ کلیم کے ابتدائیہ میں درج ذیل خراج تحسین پیش کیا تھا:

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من!!
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

اس کتاب میں صہبا صاحب نے نایاب دستاویزات، خطوط، قلمی نسخے اور تصاویر یک جا کی ہیں۔ جن سے علامہ اقبال کے قیامِ بھوپال کی تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔

"بھوپال سے علامہ اقبال مرحوم کے روابط کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا اور یہ روابط وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک برابر قایم رہے" اس طرح صہبا صاحب نے ۳۵ سال کے واقعات کی چھان بین کی ہے اور جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے چھ غیر مطبوعہ خطوط، چار ایسے خط جو مکتوبات کے کسی مسودے میں نہیں چھپے، دو غیر مطبوعہ مرثیے جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے اور کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے اقتباس جمع کر کے اقبال کے شارحین اور محققین کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

آخری اوراق میں کتابیات کے تحت تقریباً چالیس حوالے کی کتب کے نام درج ہیں، ان کے علاوہ اشاریہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ مرحوم کی حیات اور شاعری کے موضوعات پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت ناکافی ہے۔ زیرِ نظر تصنیف علامہ مرحوم کی زندگی کے ایک اہم تعلق پر قابلِ قدر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتابت، طباعت مناسب اور قیمت واجبی ہے[۵۲]

---

[۵۱] پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، پشاور کی نشری تقریر۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۷۳ء
[۵۲] ہفت روزہ "اخبار خواتین"۔ کراچی۔ ۳۰ر جون تا ۶ر جولائی ۱۹۷۳ء

حریت - کراچی

علامہ اقبال کو ان کی فکر اور حیات کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی ہر نئی کوشش ہمارے قومی ادب میں عمومی طور پر اور "اقبالیات" میں خصوصی طور پر ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شہرت و اہمیت جس منزل میں ہے وہاں رسمی آرا اور طے شدہ خیالات کی فراوانی، تازگی پسند ذہنوں کو کھلنے لگی ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ بنے بنائے سانچوں اور سنی سنائی باتوں کو دُہرانے کی بجائے مختلف جہات میں تازہ کاری کی مثالیں قایم کی جائیں۔ مشہور ادبی ماہنامے "افکار" کے مدیر صہبا لکھنوی نے حیاتِ اقبال کی بعض گم شدہ کڑیوں کو بڑے حسن و خوبی سے یک جا کیا ہے۔ ان کا تازہ ترین تحقیقی کارنامہ "اقبال اور بھوپال" دس گیارہ سال کی محنت و جاں فشانی کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔

نواب بھوپال حمید اللہ خان کو اقبال سے اور اقبال کو نواب صاحب سے جو لگاؤ تھا وہ اہلِ علم و ادب سے پوشیدہ نہیں ہے، ان دونوں میں ایک اہم رابطے کی حیثیت سر راس مسعود کو حاصل تھی۔ صہبا لکھنوی نے اقبال کے بھوپال سے روابط کی گم شدہ کڑیاں تلاش کی ہیں اور بڑے مدلل انداز میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اقبال بھوپال کو "دار الاقبال" کیوں لکھتے اور کہتے تھے۔

صہبا صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۹۱۰ء میں بھوپال سے اقبال کا پہلا رابطہ ہوا۔ یہ ربط و تعلق ان کی وفات سے تین دن پہلے تک قایم رہا۔ اس داستان کو مربوط اور مستند بنانے کے لیے صہبا صاحب نے بلاشبہ بڑی محنت کی ہے۔ کتابوں، رسالوں اور دیگر ماخذِ اقبالیات سے قطع نظر انھوں نے متعدد ایسی شخصیات کے انٹرویو لیے جو اقبال کے قیامِ بھوپال کے واقعات اور تجربات ذاتی حیثیت سے بیان کر سکتے تھے۔ اس طرح خود اقبال کی شخصیت، معمولات، اندازِ فکر اور اسلوبِ سخن کے بہت سے گوشے پہلی بار ایک مختلف تناظر میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں اقبال کے قیامِ بھوپال اور بھوپال کے اہلِ علم و ادب پر اقبال کے اثرات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بقول مصنف "اس کتاب میں حسبِ ذیل نئی چیزیں شامل ہیں۔ چھ غیر مطبوعہ خطوط، چار ایسے خط جو مکتوبات کے کسی مجموعے میں نہیں چھپے، دو غیر مطبوعہ مرثیے جو علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے، کئی نادر و نایاب کتابیں جو علامہ کی شاعری، سیاست اور ان کی فکر کے وسیع گوشوں پر محیط تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ صہبا لکھنوی نے تیس پینتیس سال پہلے کے صحیح واقعات کی چھان بین کے صبر آزما مرحلے کو بڑے سلیقے سے طے کیا ہے، انھوں نے کوئی واقعہ بغیر مستند حوالے کے طے نہیں کیا ہے، ساتھ ہی اندازِ بیان بڑا شگفتہ اور رواں رکھا ہے جو تحقیقی کتابوں میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔

عنوان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس پر محض ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے، لیکن صہبا صاحب نے بڑے سائز کی تین سو سے زائد صفحات کی کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر ذرہ صحرا دست گاہ ہے، بشرطیکہ اس کے امکانات کا سراغ لگانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے۔

متعدد کم یاب و اہم تصاویر کے علاوہ کتاب کے آخر میں ایک جامع و مفید اشاریہ بھی شامل ہے، اس قسم کے اشاریے جدید تحقیقی کتابوں کے لیے ناگزیر ہیں۔ "اقبال اور بھوپال" کا یہ اشاریہ اپنی ترتیب و کتابت کے اعتبار سے ایک منفرد چیز ہے۔

"اقبال اور بھوپال" میں صہبا صاحب نے ماضی کے ایک پورے عہد کو تازہ اور ایک تہذیبی تجربے کو زندہ کر دیا ہے۔ ان کی یہ کتاب "اقبالیات" میں ایک منفرد، دل چسپ اور مفید اضافہ ہے، ہمیں امید ہے کہ اقبال شناس اور ادب دوست اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے[۵]

---

۵ روزنامہ "حریت"، سنڈے ایڈیشن - ۲۷ مئی ۱۹۷۳ء

کتابیات

کتب

۱۔ آندھی میں چراغ ——— خواجہ غلام السیدین
۲۔ آئینۂ مشاعرہ ——— (مرتبہ) سرور قادری
۳۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ ——— ڈاکٹر سلیم حامد رضوی
۴۔ اقبال اور حیدرآباد ——— نظر حیدرآبادی
۵۔ اقبال۔ خواتین کی نظر میں ——— (مرتبہ) یکتا امروہوی
۶۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ——— محمد احمد خاں
۷۔ اقبال کی کہانی۔ کچھ میری کچھ اُن کی زبانی ——— ڈاکٹر ظہیرالدین احمد الجامعی
۸۔ اقبال نامہ۔ جلد اول و جلد دوم ——— (مرتبہ) شیخ عطاءاللہ
۹۔ انوار اقبال ——— (مرتبہ) بشیر احمد ڈار
۱۰۔ اوراق گم گشتہ ——— (مرتبہ) رحیم بخش شاہین
۱۱۔ بانگ درا ——— اقبال
۱۲۔ تصورات اقبال ——— شاغل فخری
۱۳۔ خد و خال اقبال (غیر مطبوعہ مسودہ) ——— محمد امین زبیری
۱۴۔ خیابان مسعود ——— (مرتبہ) جلیل قدوائی
۱۵۔ ذکر اقبال ——— مولانا عبدالمجید سالک
۱۶۔ روزگار فقیر۔ جلد اول و جلد دوم ——— فقیر سید وحیدالدین
۱۷۔ شرح ضرب کلیم ——— (مؤلفہ) پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۱۸۔ ضرب کلیم ——— اقبال
۱۹۔ علامہ اقبال بھوپال میں ——— عبدالقوی دسنوی
۲۰۔ علی گڑھ ——— محمد امین زبیری
۲۱۔ گنج ہائے گراں مایہ ——— پروفیسر رشید احمد صدیقی
۲۲۔ گفتار اقبال ——— (مرتبہ) محمد رفیق افضل
۲۳۔ مرقع مسعود ——— (مرتبہ) جلیل قدوائی
۲۴۔ مقالات اسلم ——— مولانا اسلم جیراج پوری
۲۵۔ مکتوبات اقبال ——— سید نذیر نیازی
۲۶۔ ملفوظات اقبال ——— (مرتبہ) محمود نظامی
۲۷۔ مئے لالہ فام ——— ڈاکٹر جاوید اقبال
۲۸۔ نوازش نامے ——— (مرتبہ) سید انیس شاہ جیلانی
۲۹۔ THUS CONFERRED SATAN ——— محمد اشرف

رسائل و جرائد

۱ — ہفت روزہ توحید - میرٹھ (۲۴ر جولائی) ———— سنہ ۱۹۱۳ء
۲ — زمانہ - کانپور (دسمبر) ———— سنہ ۱۹۳۵ء
۳ — رسالہ اردو - دہلی (مسعود نمبر) ———— سنہ ۱۹۳۶ء
۴ — رسالہ اردو - دہلی (اقبال نمبر) ———— سنہ ۱۹۳۸ء
۵ — ماہنامہ سب رس - حیدرآباد دکن (اقبال نمبر - جون) ———— سنہ ۱۹۳۹ء
۶ — رسالہ جوہر - دہلی (اقبال نمبر) ———— سنہ ۱۹۳۸ء
۷ — روزنامہ آفاق - لاہور (۱۴ر ستمبر) ———— سنہ ۱۹۵۱ء
۸ — خیابان - پشاور (اقبال نمبر) ———— سنہ ۱۹۶۲ء
۹ — ماہنامہ افکار - کراچی (اپریل) ———— سنہ ۱۹۶۲ء
۱۰ — گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین - بھوپال ———— سنہ ۱۹۶۲ء
۱۱ — ماہنامہ نگار - رام پور (اپریل) ———— سنہ ۱۹۶۳ء
۱۲ — ماہنامہ ادبی دنیا - لاہور (مئی) ———— سنہ ۱۹۶۵ء
۱۳ — ماہنامہ فاران - کراچی (اکتوبر) ———— سنہ ۱۹۶۸ء
۱۴ — ماہنامہ قومی زبان - کراچی (ستمبر) ———— سنہ ۱۹۶۹ء
۱۵ — رسالہ فنون - لاہور (مئی - جون) ———— سنہ ۱۹۷۰ء
۱۶ — رسالہ فنون - لاہور (جون - جولائی) ———— سنہ ۱۹۷۱ء
۱۷ — رسالہ العلم - کراچی (جولائی تا ستمبر) ———— سنہ ۱۹۷۲ء
۱۸ — روزنامہ حریت - کراچی (۲۷ر مئی) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۱۹ — ماہنامہ افکار - کراچی (جون) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۰ — روزنامہ مشرق - لاہور (۱۰ر جون) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۱ — ہفت روزہ اخبار خواتین - کراچی (۳۰ر جون تا ۶ر جولائی) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۲ — ماہنامہ افکار - کراچی (جولائی) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۳ — ماہنامہ کتاب - لاہور (جولائی - اگست - ستمبر) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۴ — روزنامہ پاکستان ٹائمز - لاہور (۵ر اگست) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۵ — ماہنامہ قومی زبان - کراچی (اگست) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۶ — رسالہ اوراق - لاہور (ستمبر - اکتوبر) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۷ — رسالہ فنون - لاہور (ستمبر - اکتوبر) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۸ — ماہنامہ افکار - کراچی (نومبر) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۲۹ — روزنامہ جنگ - کراچی (۱۴ر نومبر) ———— سنہ ۱۹۷۳ء
۳۰ — ماہنامہ افکار - کراچی (جنوری) ———— سنہ ۱۹۷۴ء
۳۱ — اقبال ریویو (جنوری) ———— سنہ ۱۹۷۴ء
۳۲ — رسالہ سیپ - کراچی (مارچ - اپریل) ———— سنہ ۱۹۷۴ء
۳۳ — ماہنامہ قومی زبان - کراچی (اپریل) ———— سنہ ۱۹۷۵ء
۳۴ — ماہنامہ قومی زبان - کراچی (مارچ) ———— سنہ ۱۹۷۶ء
۳۵ — ماہنامہ قومی زبان - کراچی (اپریل) ———— سنہ ۱۹۷۶ء
۳۶ — ماہنامہ سب رس - کراچی (جنوری) ———— سنہ ۱۹۷۸ء

اشاریہ

آبشار بھد بھدا - ۲۷۶،
آثار اقبال - ۳۱۸،
آرٹس کونسل آف پاکستان - ۳۵۵، ۳۷۵، ۳۷۶،
آرنلڈ (پروفیسر) ۳۹،
آزاد - ۳۱۲،
آزاد (مولانا ابوالکلام) ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۷، ۲۷۵، ۳۲۲،
آزاد (پروفیسر) ۲۵۵،
آستانۂ قدسی - ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۷،
آصف شاہمیری - ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۲، ۳۳۶،
آغا افتخار حسین (ڈاکٹر) ۵۵،
آغا خاں (سر) ۷۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۵۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۳، ۲۵۱، ۲۹۶، ۳۶۰، ۳۸۲،
آغا سہیل (ڈاکٹر) ۳۸۵،
آفاق - ۳۵۴،
آفاق احمد - ۳۲۲، ۳۳۹،
آفاق حسین - ۲۵۳،
آفتاب احمد خاں (صاحبزادہ) ۳۰۹،
آفتاب الدین (سید) ۳۱۸،
آفتاب نسواں - ۵۹،
آفٹر ٹو ہنڈریڈ ایرز - ۳۵۱،
آکسفورڈ - ۹۴،
آل احمد سرور (پروفیسر) ۱۶۵،
آل ارل میجین ریلیجنز - ۳۵۲،
آل انڈیا ریڈیو - ۹۴،
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس - ۱۸۲،
آندھی میں چراغ - ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۴۰،
آئن اسٹائن - ۲۸۳،
آئینہ مشاعرہ - ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۲۹۵، ۳۸۴،
آیات قدسی - ۶۶،

ابر (حکیم علی محسن خاں) ۶۱،
ابراہیم بن محمد - ۱۴۶،
ابراہیم علی خاں (نواب) ۲۷۵،
ابراہیم یوسف - ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۲۲، ۳۳۹،
ابر لکھنوی - ۶۲،
ابن ابی شیبہ - ۱۴۵، ۱۴۶،
ابن انشا - ۳۷۳، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹،
ابن حزم - ۱۵۲،
ابن خلدون - ۳۵۰، ۳۵۲،
ابن علی عالی - ۶۳،
ابن ماجہ - ۱۴۶،
ابوسعید بزمی - ۵۹، ۳۲۴، ۳۳۹،
ابوشیبہ ابراہیم - ۱۴۶،
ابومحمد سحر (ڈاکٹر) ۳۳۹،
ابوالنصر احمد الحسینی - ۳۰۴
احتشام حسین (پروفیسر سید) ۳۲۰، ۳۲۲،
احسان رسول (مولانا) ۲۵۴،
احسن دہلوی (سید معین الدین حسن) ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۳،
احسن علی خاں - ۲۵، ۵۵، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۶۳، ۳۱۲، ۳۳۸، ۳۳۹،
احسن مارہروی (مولوی سید علی) ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۱۶۵،
احمد آباد پیلیس - ۹۶،
احمد الدین (مولوی) ۳۱۹،
احمد رضا خاں (منشی) ۶۳،
احمد شاہ ابدالی - ۱۸۶، ۱۸۷،
احمد علی جاوید - ۳۳۸،
احمد علی شوق قدوائی - ۵۸،
احمد طاہر - ۵۵،
احمد مصطفےٰ - ۳۱۸،
احمد مکی - ۳۳۹،
اخبار خواتین - ۳۹۱،
اختر جمال - ۵۵، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۶، ۳۳۹، ۳۸۶،
اختر سعید خاں - ۲۲، ۲۵، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۶۴، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۳۹،
ادارہ ادب و تنقید - ۳۶۸،
ادارہ یادگار غالب - ۳۵۵، ۳۷۵، ۳۷۶،
ادارہ مصنفین پاکستان - ۴۸،
ادبی دنیا - ۱۰۵،
ادیب - ۵۹،
ارجمند محمد خاں (میاں) ۵۹،
اردو - ۱۰۵، ۲۴۶، ۳۴۳، ۳۴۴،
اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ - ۲۵۹، ۲۶۰، ۳۲۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۶۸،
ارشد تھانوی (مولانا رشید احمد) ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۳، ۹۹، ۱۵۱، ۲۵۳، ۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۵، ۳۳۸، ۳۳۹،

ارمغان اقبال - ۳۵۷،
ارمغان حجاز - ۱۰۴، ۱۴۰، ۲۳۶، ۲۴۶، ۳۱۸،
ارمغان عزیز - ۲۹،
اسپنگلر - ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲،
اسٹالن - ۲۸۳،
اسٹیمپن - ۸۱، ۱۲۰،
اسدالرحمٰن قدسی (حضرت شاہ) ۳۷، ۳۸، ۵۰،
۵۴، ۵۵، ۵۹، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۷۴،
۷۷، ۱۱۹، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳،
۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۳۳۹، ۳۶۶، ۳۶۹،
۳۸۱، ۳۸۵،
اسد بھوپالی - ۳۳۸،
اسرار و رموز - ۳۱۸،
اسلام اور احمدیت - ۲۲۸،
اسلام ایٹ دی کراس روڈ - ۳۵،
اسلام کے سیاسی تصورات - ۳۱۸،
اسلام نگر - ۲۹۰،
اسلم جیراج پوری (مولانا - علامہ) ۵۷، ۵۸، ۲۰۷، ۳۳۹،
اسمٰعیل - ۱۶۱،
اشتیاق عارف - ۳۳۹،
اشفاق حسین - ۳۱۹،
اصلاحات اقبال - ۳۱۹،
اطمینان قلب - ۶۶،
اظہر سعید خاں - ۴۳، ۴۶، ۵۵، ۲۵۶، ۳۳۸،
۳۳۹،
افتخار عالم مارہروی (منشی - مولوی) ۵۸، ۵۹، ۶۱،
افسر سیمابی - ۳۲۲،
افسوں بھوپالی - ۳۳۸،
افغان کونسل خانہ - ۵۱،
افکار - ۲۱، ۲۶، ۴۹، ۵۲، ۵۵، ۵۹، ۱۲۴، ۲۱۷،
۲۱۹، ۲۲۲، ۲۵۶، ۳۰۸، ۳۱۱،
۳۳۰، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۵۷، ۳۶۱، ۳۶۳، ۳۶۵، ۳۶۷،
۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۸۵،
۳۸۷، ۳۸۸، ۳۹۰، ۳۹۲،
افکار حالی - ۳۷،
اقبال (شاعر مشرق - حکیم الامت - علامہ - ڈاکٹر سر - شیخ - محمد)
۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۲،
۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳،
۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵،
۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹،
۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰،
۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۲،
۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴،
۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۵،
۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵،
۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴،
۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳،
۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱،
۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹،
۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰،
۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۹۳، ۱۹۴،
۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳،
۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲،
۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰،
۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸،
۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶،
۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴،
۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲،
۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱،
۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰،
۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸،
۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷،
۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶،
۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵،
۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴،
۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴،
۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲،
۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹،
۳۵۴، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲،
۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰،
۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷،
۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴،
۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱،
۳۹۲،
اقبال احمد صدیقی - ۲۲، ۲۳،
اقبال - اس کی شاعری اور پیغام - ۳۱۹،
اقبال اکیڈمی - ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۴۷، ۴۹، ۵۲، ۱۹۴،
۲۶۶، ۲۸۶، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۵۵، ۳۵۸،
۳۶۵، ۳۷۱، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۹، ۳۸۱،
۳۸۳، ۳۸۴، ۳۹۰،
اقبال - امام ادب - ۳۱۹،
اقبال اور بھوپال - ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۶،
۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۱،
۴۳، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲،
۲۶۹، ۲۷۰، ۳۰۳، ۳۲۶، ۳۵۵، ۳۵۸،
۳۵۹، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵،
۳۶۶، ۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶،
۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳،

۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰،
۳۹۱، ۳۹۲،
اقبال اور ٹیگور ـ ۳۱۹،
اقبال اور حیدرآباد ـ ۲۴، ۷۴، ۷۸، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۲۲،
۱۲۳، ۱۳۸، ۲۳۹، ۲۵۱، ۳۷۴، ۳۸۲، ۳۸۸،
اقبال اور سیاست ملی ـ ۲۸۶،
اقبال اور نونہال ـ ۳۱۸،
اقبال پر ایک نظر ـ ۳۱۸،
اقبال حسین خاں ـ ۵۰، ۵۳، ۵۵، ۷۴، ۷۷،
۷۸، ۸۰، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۱۲۱، ۲۷۶،
۳۳۶، ۳۷۳، ۳۸۰، ۳۸۹،
اقبال ـ خواتین کی نظر میں ـ ۶۵، ۶۶،
اقبال ریویو ـ ۲۳، ۲۴، ۳۱۰،
اقبال سینٹینری ـ ۷۴،
اقبال ـ قرآن حکیم کی روشنی میں ـ ۳۱۹،
اقبال کا سیاسی کارنامہ ـ ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۳۳۰،
اقبال کا نظریۂ فن ـ ۳۱۹،
اقبال کی شاعری ـ ۳۱۹،
اقبال کی کہانی ـ کچھ میری کچھ ان کی زبانی ـ ۱۰۷،
اقبال کے حضور ـ ۳۸۳،
اقبال لائبریری ـ ۴۱، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰،
۳۲۱، ۳۲۲، ۳۳۰، ۳۷۰،
اقبال محمد خاں (کرنل) ۹۲، ۹۳، ۲۷۳، ۳۱۳،
اقبال نامہ (خطوط اقبال) ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷،
۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۴۹، ۶۵،
۶۷، ۷۵، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۲،
۱۲۳، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۱،
۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳،
۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۹۸،
۲۰۰، ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶،
۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷،
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴،
۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۲،
۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۳، ۴۳۳،
اقبال ـ نئی تشکیل ـ ۸، ۱۳۸، ۲۸۵،
اکبر اعظم ـ ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۸۷، ۳۶۷، ۳۷۷،
اکبر الہ آبادی ـ ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۸۴،
۲۹۵،
اکبر حیدری (سر) ـ ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۱۲۲، ۱۳۹،
۲۲۲، ۲۳۸، ۳۸۲،
اکبر علی خاں (عرشی زادہ) ۳۳۸،
اکبر مسعود ـ ۲۴۵، ۲۴۶،
اکرام احمد لطف (منشی) ۶۱،
اکریما ـ ۴۶،

اکیڈمی برائے ترقی دیہات ـ ۲۸۰،
البرامکہ ـ ۵۸، ۲۵۳، ۳۰۰، ۳۶۸،
الجیب ـ ۶۶،
الحجاب ـ ۵۸، ۵۹، ۶۳،
السیف المسلول علی شاتم الرسول ـ ۱۴۵،
الشرق ـ ۵۹،
العصر ـ ۵۹،
العلم ـ ۱۹۲،
الکلام ـ ۶۷،
الگزینڈرا جہانگیریہ ہائی اسکول ـ ۲۸۰، ۳۰۸،
الناظر ـ ۵۹،
الندوہ ـ ۳۴۵
الیاس برنی (پروفیسر ـ مولانا ـ صلاح الدین ـ محمد)
۲۱۳، ۲۳۱، ۳۲۲،
امام غزالی ـ ۱۰۶،
امان اللہ خاں ـ ۱۳۸،
امانت خاں ـ ۲۷۳،
امجد علی اشہری ـ امجد (سید) ۵۸،
امجد علی (سید) ـ ۳۹،
امیر بدایونی (امیر احمد) ۶۰، ۶۳،
امیر حسن دلیر (سید) ۶۱،
امیر مینائی ـ ۵۸، ۵۹، ۲۳۴،
انتخاب دیوان اقبال ـ ۳۱۸،
انجم سلیمانی ـ ۳۳۹،
انجم اعظمی ـ ۲۱، ۵۵، ۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۶،
۳۷۷، ۳۸۵،
انجمن اردو ـ ۲۶۰،
انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ ـ ۲۲۲،
انجمن ترقی اردو ـ ۳۷، ۲۱۴، ۲۶۰، ۲۸۱، ۳۱۹،
۳۳۰، ۳۶۸،
انجمن ترقی پسند مصنفین ـ ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰،
۳۷۰،
انجمن حمایت اسلام ـ ۳۷، ۱۱۴، ۱۱۵، ۲۰۷،
۲۲۴، ۲۷۴،
انصار ناصری ـ ۱۶۵،
انعام الدین ـ ۳۱۸،
انقلاب ـ ۲۵، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۳۲۲،
انوار اقبال ـ ۳۴۸، ۳۷۳،
انوار الحق (مفتی) ۳۴، ۴۴، ۳۲۶، ۳۳۷،
۳۳۹،
انور جہاں ـ ۵۹،
انور حارث ـ ۵۵، ۳۵۸، ۳۷۶،
انور سدید ـ ۳۸۶،
انور صابری ـ ۳۲۱،

انور علی انور (منشی) ۵۹،
انور مسعود — ۱۱۶، ۱۲۴، ۱۳۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰،
انیس — ۱۰۳،
انیس شاہ جیلانی (سید) ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۴،
اوراق — ۳۸۵، ۳۸۶،
اوراق گم گشتہ — ۲۲۰، ۲۲۱،
اورینٹل کالج — ۳۹،
ایم-اے-او- کالج — ۶۸،
ایم- عرفان — ۳۲۲، ۳۳۹،
ایوان رفعت — ۳۳۲،
ایوب — ۱۷۰،
المقتطف — ۳۰۴،

بابر — ۱۸۷،
باسط بھوپالی — ۲۵، ۵۹، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۶۶، ۳۲۲، ۳۳۸، ۳۳۹،
باغ جناح میوزیم — ۹۱،
باغ عامہ — ۲۵۱،
باقیات اقبال — ۴۴، ۱۷۲، ۳۱۸،
بال جبریل — ۱۰۰، ۲۶۱، ۲۷۸، ۲۸۶، ۳۱۸، ۳۲۸،
بانگ درا — ۶۵، ۱۶۶، ۲۶۱، ۲۷۸، ۲۸۶، ۳۱۸، ۳۲۸، ۳۲۹،
بانز — ۶۵،
بدور البازغہ — ۲۲۶،
برٹرینڈ رسل — ۲۸۳،
برکت اللہ (مولوی) ۳۱۲،
برگ گل — ۲۸۴،
بڑا تالاب — ۹۳، ۲۹۱، ۲۹۸، ۳۱۴، ۳۱۵،
بڑودہ کالج — ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۱،
بزم اکبر آبادی (مرزا عاشق حسین) ۶۱،
بزم فنون — ۳۱۱،
بخاری — ۱۴۶، ۳۵۴،
بشیر الحق دسنوی — ۳۱۹،
بلال حبشی رض — ۲۶۱،
بلبل اکیڈیمی — ۳۱۱،
بو علی قلندر (حضرت شاہ) ۱۶۰، ۱۶۹،
بولان ہوٹل — ۲۶۷،
بہادر شاہ کا مقدمہ — ۱۲۱،
بہاری چرن صادق — ۳۳۸،
بہاء الدین کالج — ۳۲۱،
بھوپال کانفرنس — ۲۵،
بیاض سحر — ۲۵۹،
بیگم بھوپال (ہر ہائینس- نواب میمونہ سلطانہ معروف
بہ شاہ بانو بیگم) ۲۲، ۵۹، ۱۵۴، ۱۵۵، ۲۵۶، ۳۳۳،
بیگم راس مسعود (لیڈی- امۃ الرشید- امت المسعود بیگم
راحت چھتاری) ۲۵، ۳۲، ۳۶، ۴۰، ۴۱، ۹۳، ۹۵،
۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۸،
۱۱۹، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۰،
۱۴۱، ۱۴۲، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۰۸،
۲۱۳، ۲۱۴، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۹۷،
۲۹۹، ۳۰۸، ۳۶۶،
بیگم فرحت نور خاں — ۲۲،
بیگم محمد علی — ۴۰،
بی اماں — ۳۵۹،

پاکھڑے لڑ پاکستان — ۲۷۹،
پاک پبلشرز لمیٹڈ — ۳۶۸،
پاکستان نیشنل سنٹر — ۳۵۵،
پاکستان کونسل — ۳۱۱،
پرنس آف ویلز اسپتال — ۹۸،
پرنس آف ویلز — ۳۵،
پروفیسر ابو ساقی — ۳۰۳،
پروفیسر سید نواب علی — ۲۵، ۵۹، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹،
۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۲، ۲۹۰، ۲۹۴،
۲۹۷، ۳۳۰، ۳۶۶،
پروفیسر شجاع — ۱۴۴، ۱۴۷،
پروفیسر محمد احمد شمسی — ۳۹۱،
پروفیسر محمد یوسف — ۳۱۹،
پروین رشدی — ۳۳۹،
پس چہ باید کرد اے اقوام شرق — ۵۴، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۶،
۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۳۴، ۲۶۱، ۲۷۸،
۲۸۰، ۳۳۴، ۳۸۳، ۳۸۴،
پنجاب ریویو — ۵۹،
پنجاب یونیورسٹی — ۲۴۷، ۲۷۲،
پنڈت جواہر لال نہرو — ۲۷، ۲۰۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷،
۲۲۸، ۲۳۳، ۲۵۱، ۳۲۲، ۳۵۹،
پنڈت سندر لال — ۳۴۰،
پنڈت لچھمن آیاجی — ۲۵۳، ۲۸۹،
پشاور یونیورسٹی — ۲۸۱،
پیام مشرق — ۲۶۱، ۳۱۱، ۳۱۸، ۳۲۷،

تاج آفس — ۳۱۸، ۳۱۹،
تاج المساجد — ۲۷۶، —— تاج محل — ۲۷۰،
تاریخ الامت — ۵۷،
تاریخ اندلس — ۲۹۵،
تاریخ بھوپال — ۶۲،

تاریخ صحف سماوی - ۲۱۹، ۲۷۲،
تاریخ طلسم بکاولی - ۶۲،
ترجمئی سرِ شاد - ۳۲۲، ۳۳۸،
ترمذی - ۱۴۶،
تذکرۃ المصطفیٰ - ۲۱۹،
تذکرۂ حالی - ۱۶۵،
تذکرۂ غوثیہ - ۲۷۴،
تصدق احمد خاں شروانی - ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۵،
تصورات اقبال - ۱۴، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۷، ۳۲۸،
۳۲۹، ۳۳۰،
تصوف اقبال - ۳۱۹،
تکملۂ مجمع البحار - ۱۴۵،
تمدن - ۵۹، — توحید - ۳۲۰، ۳۲۱
تنویر - ۵۹،
توشہ خانہ حضور نظام - ۱۳۹،
تہذیب نسواں - ۵۹،
تھامس مین - ۲۸۳
تھیوسوفیکل ہال - ۱۷۳،
تیج بہادر سپرو (سر) ۲۲۲، ۲۷۸، ۳۲۲،

ٹراٹسکی - ۲۸۳،
ٹرائل آف بہادر شاہ، ۱۲،
ٹیگور - (ڈاکٹر رابندر ناتھ) ۷۱، ۱۱۰، ۲۲۲، ۲۵۱، ۳۰۵،
ٹینی سن - ۳۶۷،

ثاقب بدایونی (مولوی احسن اللہ) ۵۸،
ثاقب لکھنوی (مرزا ذاکر حسین) ۵۸،
ثمرستان عبید - ۲۶۷، ۲۷۰،
جادہ - ۲۵۶،
جامع امویہ - ۱۰۶،
جامع مسجد - ۲۷۶، ۲۹۴، ۳۱۴،
جامعہ ازہر - ۴۵،
جامعہ عثمانیہ - ۴۲، ۱۰۵، ۱۲۲، ۲۸۰،
جامعہ ملیہ اسلامیہ - ۴۵، ۷۳، ۹۲، ۱۵۰، ۱۶۹،
جان سٹورٹ مل - ۶۴،
جاں نثار اختر - ۵۹، ۱۶۵، ۳۲۱، ۳۴۰،
جاوید اقبال (ڈاکٹر) ۳۱، ۳۴، ۵۰، ۹۸، ۱۱۳، ۱۲۸،
۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۸، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹،
۱۶۰، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۲۶، ۲۳۰،
۲۳۵، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۷، ۲۹۲، ۲۹۹،
۳۰۲، ۳۴۷، ۳۴۸،
جاوید منزل - ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۵۹، ۲۵۲،
جاوید نامہ - ۳۱۸، ۳۴۸،
جائزہ - ۳۱۱،

جشن محمود - ۱۸۴، ۲۳۷، ۲۴۶،
جسیم حیدر - ۳۰۵،
جشن حالی (صدسالہ، پانی پت) ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۳۷،
۵۰، ۵۳، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۷، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴،
۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۹، ۱۹۸، ۳۳۴، ۳۶۲، ۳۶۹، ۳۷۸،
۳۸۰، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۸،
جشید پانی پتی (حسین احمد خاں) ۱۸۲، ۱۸۳،
جگر مرادآبادی - ۵۹، ۲۵۸، ۲۷۰،
جگن ناتھ آزاد - ۳۶۹،
جلیل قدوائی - ۲۵، ۴۰، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۶۲،
۱۸۷، ۱۸۸،
جمال الدین افغانی (علامہ) ۵۷، ۳۱۲، ۳۸۲،
جمیل الدین عالی - ۱۸۳،
جمیل سہوانی (جمیل احمد) ۵۸،
جمیل نقوی - ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۳۹، ۵۵،
۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۹،
جنگ - ۴۲،
جوش ملیح آبادی - ۲۵۸، ۲۸۹، ۳۰۸، ۳۳۱، ۳۴۰،
جوہر - ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۶۰، ۲۶۱،
جوہر قریشی - ۳۳۹،
جہاں قدر چغتائی - ۳۳۸،
جہانگیر - ۳۶۷، ۳۷۷،
جہانگیریہ اسکول - ۲۵۳،
جیمز ہیئیبٹ نفیس - ۵۸،

چاسر - ۳۶۷،
چنگیز خاں - ۳۰۴،
چودھری خاقان حسین - ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۶، ۵۵،
۷۲، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۸۱،
چودھری خلیق الزماں - ۷۲، ۲۷۹، ۳۴۰،
چودھری رحمت علی - ۳۳۳،
چودھری محمد اظہر - ۲۵۳،
چودھری نیاز علی خاں - ۲۷۷،
چھوٹا تالاب - ۲۹۱،

حافظ - ۱۰۳، ۲۸۶،
حافظ سلیمان خالص - ۶۱، ۶۳،
حالی (مولانا خواجہ الطاف حسین) ۳۶، ۳۷، ۱۰۳، ۱۴۹،
۱۵۰، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵،
۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷،
۱۷۸، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، —
۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۱۸، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۸۵، ۳۲۸،
۳۳۴، ۳۵۷، ۳۶۹،
حالی بک ڈپو - ۱۶۴،

حالی میموریل مسلم ہائی اسکول - ۳۵، ۱۴۹، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۸، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۸۹،
حامد جعفری (سید) ۳۱۸،
حامد حسین (ڈاکٹر) ۳۲۲ - ۳۲۹،
حامد رضوی (مولانا سید) ۵۹، ۳۲۴، ۳۳۰، ۳۳۴، ۳۳۹، ۳۶۸،
حامد سعید خاں حامد - ۵۹، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۸۹، ۳۲۰، ۳۳۸،
حبیب الحسن قادری - ۲۵۶،
حبیب الرحمٰن (مولانا) ۲۶۷، ۲۷۴،
حبیب النسا بیگم - ۳۱۹،
حبیب بھوپالی - ۲۶۲ - ۲۶۳،
حبیب تنویر - ۳۲۱،
حبیب فخری - ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۲۲، ۳۳۸،
حجج الکرامہ فی آثار القیامہ - ۱۴۶،
حسرت موہانی - ۷۱، ۷۲،
حریت - ۳۹۲،
حسن - ۴۶،
حسن بصریؒ - ۲۶۱،
حسن عزیز جاوید - ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۲۰۹، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۸۰،
حسن محمد حیات - ۷۲، ۲۵۲، ۲۷۸،
حسن نظامی (خواجہ) ۲۵، ۷۱، ۱۲۰، ۲۲۰، ۲۷۰،
حضرت عائشہؓ - ۱۴۵،
حضور احمد حضور نعیمی - ۵۹،
حفظ البحر - ۶۶،
حفیظ جالندھری (ابوالاثر) ۲۵، ۳۶، ۵۹، ۱۲۳، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۷۰، ۳۷۳،
حکیم اجمل خاں (مسیح الملک) ۷۱، ۲۳۳، ۲۷۸،
حکیم اولاد حسین - ۳۰۵،
حکیم سلطان محمود - ۹۵، ۲۹۴،
حکیم سید ضیاء الحسن - ۹۵، ۲۷۸، ۲۹۴، ۳۲۲،
حکیم علی محسن خاں - ۶۱،
حکیم محمد حسین عرشی - ۱۱۴،
حکیم نابینا (عبدالوہاب انصاری) ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۳، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۷۱، ۱۹۸، ۲۱۳، ۲۲۸، ۲۳۶، ۲۳۷،
حلاج - ۲۳۳،
حلیم کالج - ۳۱۱،
حمید الدین شاہد - ۳۰۴،
حمید اللہ خاں (نواب اعلیٰ حضرت - فرماں روائے ریاست بھوپال) ۲۳، ۲۵، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۵۰، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۹، ۶۸، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۸، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۸، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۹، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۰، ۳۲۴، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۱، ۳۴۴، ۳۴۷، ۳۴۹، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۶، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۳، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲،
حمیدیہ اسپتال - ۸۹، ۹۰، ۹۵، ۱۴۳، ۱۹۴، ۲۰۸،
حمیدیہ جہانگیریہ ہائی اسکول - ۲۸۰، ۳۰۸،
حمیدیہ کالج - ۲۳۱، ۳۴۰،
حمیدیہ لائبریری - ۵۸، ۱۴۹، ۲۹۲، ۳۰۴، ۳۸۹،
حنیف فوق - (ڈاکٹر) ۲۱، ۵۵، ۳۱۱، ۳۳۹، ۳۶۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۸۷،
حیات اقبال - ۳۱۹،
حیات النذیر - ۵۸،
حیات شبلی - ۳۳۱، ۳۴۵،
حیات صدیقی - ۳۱۸،
حیات نو - ۱۷۲، ۱۸۲،
حیدر آباد ٹرسٹ - ۴۲،
حیدر عباسی (علی) ۳۲، ۳۳، ۴۰، ۵۵، ۹۸، ۹۹، ۲۰۰، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۷۸، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۴۴، ۳۸۱،

خاتون ارشد - ۵۴، ۶۵، ۳۳۹، ۳۶۹،
خالدہ ادیبہ خانم - ۹۱، ۹۲،
خالدہ شعیب - ۲۷۹،
خان محمد خاں شہیر - ۵۸،
خدو خال اقبال - ۳۳، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۴۶،
خطبات اقبال - ۴۱، ۳۱۸، ۳۳۰،
خلیفہ عبدالحکیم - ۸۶، ۱۱۸،
خلیل بدر - ۳۳۹،

خلیل عرب (علامہ) ۵۹،
خواجہ آشکار حسین - ۵۵،
خواجہ سجاد حسین - ۱۴۹، ۱۵۷، ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۸۴،
خواجہ غلام الحسنین - ۱۸۴،
خواجہ قمرالدین خاں راقم - ۲۹۵،
خواجہ کمال الدین - ۷۱،
خواجہ لطیف حسن - ۱۷۸،
خواجہ عنبر - ۲۲۱،
خیابان - ۲۸۱، ۲۸۸، ۳۸۵،
خیابان اقبال - ۲۸۸،
خیابان مسعود - ۱۲۵،
خیام - ۲۷۲

دارالاقامہ - ۱۷۲،
دارالترجمہ - ۶۸،
دارالمصنفین - ۵۸، ۳۴۵،
داغ - ۵۹، ۲۳۴-۲۵۵،
داس - ۲۳۳،
دانتے - ۳۰۴،
در منشور جلد پنجم - ۱۴۶،
دس کنفرڈ ستیان - ۳۰۳،
دل گداز - ۲۱۹،
دکن ریویو - ۵۹،
دی آؤٹ لائن آف ہسٹری - ۲۸۳،
دیا نرائن نگم - ۲۶۰،
دی ڈیولز کانفرنس - ۳۰۳،
دی کولمبیا وائکنگ ڈیسک انسائیکلوپیڈیا - ۲۸۳،
دیوان غالب - ۲۸، ۲۹، ۹۳،
دیو بند - ۵۸، ۳۶۸،

ڈارلنگ (ایم-ایل-اے) ۲۴۷،
ڈاروِن - ۳۰۴،
ڈاکٹر احسان رشید - ۱۱۶ - ۲۹۷،
ڈاکٹر احمد بخش (خان بہادر) ۹۵، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲، ۲۴۹،
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری - ۳۶، ۳۷، ۱۶۵،
ڈاکٹر اخلاق اختر - ۴۷،
ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) ۳۶، ۷۱، ۷۲، ۷۵، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۹۱، ۹۲، ۱۶۰، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۷۴، ۲۷۸، ۲۹۶، ۳۶۰،

ڈاکٹر بوس - ۹۵، ۲۷۸،
ڈاکٹر تاثیر - ۲۵، ۱۴۳،
ڈاکٹر جانسن - ۱۰۰،
ڈاکٹر ذاکر حسین - ۲۵، ۴۳، ۴۴، ۱۶۵، ۱۶۷، ۲۲۲،
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی - ۳۰۳،
ڈاکٹر سعید احمد بریلوی - ۲۶۰،
ڈاکٹر سلطان - ۹۵، ۲۷۸، ۲۸۹، ۲۹۴،
ڈاکٹر سلیم حامد رضوی - ۴۱، ۲۱۲، ۲۵۹، ۳۲۲، ۳۳۹،
ڈاکٹر سید عابد حسین - ۵۹، ۱۶۵، ۲۶۰، ۳۳۹،
ڈاکٹر سید عبدالباسط - ۲۴، ۵۰، ۵۳، ۵۴، ۹۹، ۶۵، ۱۴۳، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۲۶، ۲۴۹، ۲۷۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۴، ۲۹۶، ۳۱۸، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۴، ۳۸۹،
ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن - ۷۲، ۹۵، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۸، ۲۲۱، ۲۴۹، ۲۷۸، ۲۹۴، ۲۹۶، ۳۲۲،
ڈاکٹر ظفر الحسن - ۲۴۹، ۲۵۰،
ڈاکٹر ظہیرالدین احمد (الجامعی) ۱۰۵، ۱۰۷،
ڈاکٹر عبدالوہاب عزام - ۲۶۰،
ڈاکٹر محمود الٰہی - ۶۸،
ڈاکٹر مظفر علی - ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۳،
ڈکنس - ۳۵۱،
ڈھاکہ یونیورسٹی - ۳۱۱،
ڈیوک آف ونڈسر - ۷۲،

ذکر اقبال - ۲۲۵، ۲۴۴، ۲۷۷، ۳۴۶،
ذکر شبلی - ۳۳۱،
ذکی وارثی (محمد کریم) ۵۹، ۹۹، ۱۵۱، ۲۵۹، ۲۸۹، ۲۹۴، ۳۳۸،
ذکیہ بیگم - ۱۹۳،
ذوق - ۵۸-
راج گوپال اچاریہ - ۳۲۲،
راجندر پرشاد (ڈاکٹر) ۳۲۲،
راجہ اودھ نرائن بسریا - ۲۱۹، ۲۲۱،
راجہ حسن اختر - ۱۶۰، ۱۷۱، ۲۰۴،
راجہ محمود آباد - ۳۸، ۲۹۸،

راحت سعید چھتاری - (نواب زادہ) ۹۹،
راحت منزل - ۵۰، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۹۵، ۳۰۸،
راس مسعود (سر سید) ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۱،
۳۲، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲،
۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۵۴، ۵۹، ۶۹، ۸۸، ۸۹،
۹۰، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۳،
۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶،
۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷،
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۶،
۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۴۹،
۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۲، ۱۶۳،
۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴،
۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶،
۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵،
۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲،
۲۱۴، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹،
۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶،
۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰،
۲۵۱، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۸،
۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸،
۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۰،
۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵،
۳۴۱، ۳۴۴، ۳۴۷، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۴، ۳۶۶،
۳۷۳، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۹۰،
راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچرل سوسائٹی آف پاکستان - ۴۷،
۱۶۲،

راغب احسن (مولانا) ۱۱۲،
رائٹ آف وومن - ۶۴،
رائے زادہ آفتاب - ۳۱۵،
رباعیات سرمد شہید - ۲۷۲،
رباعیات عمر خیام - ۲۷۲،
رباعیات قدسی - ۲۷۲،
رحم حسین (منشی) ۲۵۴،
رحیم بخش شاہین - ۲۲،
رخت سفر - ۶۴،
رشدی - (اے۔آر۔) ۴۹، ۵۵، ۵۹، ۳۰۸،
۳۳۹، ۳۴۰،
رشید احمد صدیقی (پروفیسر) ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۲۶، ۱۶۵،
۲۶۰، ۲۹۷، ۳۶۵، ۳۷۱، ۳۷۶،
رشید الظفر خاں (نواب زادہ) ۹۵، ۲۲۶، ۲۶۷،
۲۷۰، ۲۷۳،
رشید انجم - ۳۱۸،
رضا شاہ اول - ۲۸۲، ۲۸۳،

رضیہ فرحت بانو - ۱۴۱، ۳۱۸، ۳۳۲، ۳۳۹،
رعنا لکھنوی (سید بادشاہ حسین) ۶۱، ۶۳،
رفعت الحسینی - ۳۳۸،
رقیہ خلیل عرب - ۳۳۹،
رمزی ترمذی (محمد اسمٰعیل) ۵۹، ۳۳۸،
رموز اقبال - ۳۱۹،
رموز بے خودی - ۲۶۱،
روح اقبال - ۳۱۹،
روزگار فقیر - ۴۹، ۶۴، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲،
۱۰۵، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۳۱،
۲۳۷، ۳۱۳،
رومی (مولانا روم - پیر) ۶۸، ۷۰، ۱۱۰، ۱۶۳،
۲۱۷، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۹۷، ۳۸۹،
رونق دہلوی (منشی پیارے لال) ۶۱،
رئیس احمد جعفری - ۲۹۶، ۳۱۹، ۳۳۱،
ریاض خیرآبادی (سید ریاض احمد) ۶۱، ۶۳،
ریاض رضوان - ۶۸،
ریاض منزل - ۵۰، ۵۴، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶،
۹۰، ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۷،
۱۰۸، ۱۳۰، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۵۱، ۱۵۵، ۲۰۸، ۲۴۶، ۲۸۱،
۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹،
۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۳۴، ۳۷۰،
ریڈی نار - ۲۸۳،
ریڈیو پاکستان - ۲۱، ۲۹۵، ۳۸۳، ۳۹۰، ۳۹۱،

زبور عجم - ۱۴۹، ۳۱۸، ۳۲۸،
زبیر احمد صدیقی (پروفیسر) ۳۳۶،
زرنگار - ۵۹،
زمانہ - ۲۶۰، ۲۶۱،
زمیندار - ۸۰، ۲۴۲، ۲۷۵،
زہرہ جمال - ۳۲۲، ۳۳۹،

ساجد علی (سید) ۳۱۸،
ساغر نظامی - ۲۷۰،
سائل دہلوی (نواب سراج الدین احمد خاں
۶۱،

سب رس - ۳۰۴،
سبعہ سیارہ - ۵۹، ۲۹۴،
سترو بن نامہ - ۶۶،
سجاد ظہیر - ۳۲۰،
سحر انصاری - ۵۵، ۳۵۷، ۳۶۷، ۳۷۷،
۳۷۹، ۳۹۰،
سحر بھوپالی (سراج میر خاں) ۵۹، ۲۵۹،
سردار جعفری (علی) ۳۲۰، ۳۲۲،

سردار صلاح الدین سلجوقی - ۹۲، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۴۰، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۲۲، ۲۴۳،
سر شفیع - ۷۹، ۸۱، ۸۳، ۸۵،
سرگزشت - ۱۶۵،
سر لیاقت علی - ۱۵۱،
سرمد شہید - ۲۷۲،
سروجنی نائیڈو - (مسز) ۷۱، ۷۵، ۸۳، ۱۵۵، ۲۵۱، ۲۹۵، ۳۵۹،
سرود رفتہ - ۶۴،
سرور جہاں - ۵۹،
سرور قادری بدایونی (عبدالصمد) ۵۹، ۶۰، ۶۳،
سعدی - ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۴۶، ۲۸۵،
سعید اکبر آبادی (مولانا) ۲۶۱،
سعید الظفر خاں (نواب زادہ) ۹۵، ۱۲۰، ۲۲۶، ۲۶۷، ۲۷۱، ۲۷۳،
سعید رزمی - ۲۵۳،
سعیدہ بانو - ۳۳۸،
سکندر بیگم (نواب بھوپال) ۶۲، ۶۸، ۳۶۸،
سکندر حیات - ۳۸۲،
سلام الدین خاں - ۲۵۳، ۲۷۸،
سلامت اللہ شاہ (سید) ۱۴۸، ۲۱۰، ۲۱۱،
سلطان جہاں بیگم (نواب بھوپال) ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۲، ۶۴، ۷۱، ۷۲، ۱۷۸، ۲۱۹، ۲۴۰، ۲۷۳، ۲۷۸، ۳۳۰، ۳۴۵، ۳۶۸،
سلطان عالم (شہزادہ) ۶۳،
سلطانیہ گرلس اسکول - ۲۹۹،
سلمان الارشد - ۳۳۹،
سلیمان خاں خالص (حافظ) ۵۹،
سلیمان محمد خاں آرزو (ماسٹر) ۲۵۴،
سلیمان ندوی (علامہ سید) ۵۹، ۷۱، ۹۰، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۹، ۱۵۳، ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۶۰، ۲۷۰، ۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۲۲، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۵،
سلیمان نقوی - ۳۱۸،
سم سیکریٹ میجنگز - ۳۵۱،
سمرسٹ ماہم - ۲۸۳،
سنگباد - ۳۱۲،
سنٹرل جیل ملتان - ۳۲۹،
سودے - ۳۶۷،
سورج کلا سرور - ۳۲۲، ۳۳۸،
سومنات - ۳۱۲،
سول اینڈ ملٹری گزٹ - ۲۴۲،
سہا مجددی (مولانا ممتاز احمد) ۵۹، ۹۹، ۱۵۱، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۴، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۳۸، ۳۳۹،
سہیل - ۳۰۹،
سیٹھ وٹھل داس - ۲۸۹،
سیپ - ۳۸۶، ۳۸۷،
سید احمد - ۳۵۲،
سید احسان حسین (ماسٹر) ۳۰۸،
سید احمد خاں (سر) ۵۸، ۱۳۶، ۱۷۴، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۱، ۱۹۳، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۳۶، ۲۸۴،
سید احمد دہلوی (شمس العلماء) ۲۷۱، ۲۷۳،
سید احمد سبزواری (مولوی) ۲۸۹،
سید احمد شہید - ۵۷، ۳۸۲،
سید احمد عباس - ۲۱۱،
سید احمد علی - ۵۵، ۲۹۷،
سید حامد رضوی - ۲۵۳، ۲۸۹،
سید حسن سید - ۶۳، ۲۵۴، ۲۸۹، ۳۳۹،
سید زاہد علی جعفری - ۳۰۳، ۳۰۴،
سید شوکت علی - ۳۱۸،
سید عبداللہ (ڈاکٹر) ۳۱۱،
سید عبدالغفور - ۱۹۳، ۱۹۴،
سید فیضی - ۵۵،
سید لطف علی (منشی) ۲۵۴، ۲۸۹،
سید محب الحق (شمس العلما - حافظ) ۲۷۵،
سید محمد شاہ - ۳۱۸،
سید محمد علی - ۲۱۸، ۲۱۹،
سید محمد یوسف (ڈاکٹر) ۵۵، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۳۹،
سید محمد یوسف قیصر بھوپالی - ۵۵، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۳، ۹۹، ۱۵۱، ۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۵، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۳،
سید وحید الحسن - ۲۱۹،
سیرت اقبال - ۳۱۹،
سیرۃ النبیؐ - ۵۸، ۲۱۹، ۳۶۸،
سیرت رسولؐ اللہ - ۲۱۹،
سیفیہ کالج - ۵۰، ۵۱، ۳۳۵،
سیلون یونیورسٹی - ۳۰۸،
سیماب - ۲۵۸، ۲۷۰،

شاد عارفی - ۳۷۲،
شاد عظیم آبادی - ۲۷۶،
شاغل فخری - ۲۱، ۵۹، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۹،
شاہجہاں بیگم شیریں و تاجور (نواب بھوپال) ۵۷، ۵۸، ۲۱۸، ۳۶۸، ۳۸۲،
شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول - ۳۱۱،
شاہد احمد دہلوی - ۴۸، ۱۶۵،
شاہد لطیف - ۳۴۰،

شاہ سعود اول - ۵۷،
شاہ سلیمان پھلواری - ۲۷۴،
شاہ عبدالعزیز دہلوی - ۳۶۸،
شاہ میر راہی - ۳۳۹،
شاہنامہ اسلام - ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۸،
شبلی (علامہ) ۳۳، ۵۸، ۵۹، ۶۸، ۷۱، ۱۶۷، ۲۱۸، ۲۱۹،
۲۷۵، ۳۳۱، ۳۴۵، ۳۶۴، ۳۶۶، ۳۶۸،
شبیر اقبال - ۲۳۱،
شبیر علی کاظمی (سید) ۳۷،
شبیر حسن (منشی) ۲۵۴،
شرح اسرار خودی - ۳۱۹،
شرح ضرب کلیم - ۲۳۱،
شریف الدین پیرزادہ - ۵۵،
شریف محمد خان فکری - ۵۹، ۳۳۸،
شعر العجم - ۱۶۷، ۱۶۹،
شعری بھوپالی - ۴۶، ۵۹، ۲۵۹، ۳۰۲، ۳۲۲، ۳۳۸،
شعیب قریشی (محمد) ۴۰، ۵۰، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۴، ۷۹، ۸۰، ۸۲،
۸۵، ۱۳۰، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۵، ۲۰۷، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۶،
۲۴۷، ۲۴۹، ۲۷۸، ۲۷۹، ۳۰۰، ۳۵۹، ۳۶۰،
شفا گوالیاری - ۳۳۸،
شفق عماد پوری - ۲۲۱،
شفیقہ فرحت - ۳۳۹،
شکنتلا - ۳۰۵،
شمبھو دیال سخن - ۵۹، ۲۳۷، ۳۳۸،
شملہ پہاڑی - ۹۵، ۲۰۸، ۲۷۶،
شملہ کوٹھی - ۲۶۷، ۲۹۱، ۲۹۸،
شمیم احمد - ۴۹، ۵۵، ۱۶۱، ۳۰۲، ۳۳۹،
شوکت علی (مولانا) ۷۱، ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۵، ۲۷۸، ۳۵۹،
شہاب اشرف - ۳۳۸،
شہزادہ برار - ۲۵۱،
شہید ٹونکی - ۲۵۸،
شیخ اعجاز احمد - ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۴،
۳۷، ۳۸، ۶۴، ۲۱۶، ۲۳۹،
شیخ عبدالقادر (سر) ۳۵، ۳۸، ۳۰۳،
شیخ عطاء اللہ - ۲۴، ۲۶، ۲۹، ۴۹، ۱۶۸، ۲۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۳۴،
شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی - ۵۵، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۸۴،
شیخ محمد اشرف - ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۵،
شیخ محمد بدر الاسلام فضلی - ۱۶۲، ۱۶۶،
شیدا دہلوی (منشی چندی پرشاد) ۶۱،
شیریں - ۲۸۵،
شیش محل - ۴۶، ۴۷، ۵۰، ۵۴، ۹۵، ۱۳۳، ۱۴۴، ۱۴۵،
۱۴۷، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۹۳، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹،
۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۸، ۲۳۴، ۲۶۲، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۸،
۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۹،
۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۳۳، ۳۴۴، ۳۷۰، ۳۸۲،
شیکسپیر - ۳۶۷، ۳۷۷،

صالحہ خانم عاجز - ۵۹،
صحیح بخاری - ۳۵، ۵۸،
صد منزل - ۹۵، ۲۵۸،
صدی ایڈیشن - ۱۶۴، ۱۶۷،
صدیق حسن توفیق (نواب مولوی) الشیخ صدیق القنوجی
البخاری) ۵۷، ۵۸، ۱۲، ۱۳۶، ۳۸۲،
صرف خاص - ۲۷۹،
صفیہ اختر - ۳۴۰،
صفیہ بیگم - ۱۹۳،
صور اسرافیل - ۱۴۸،
صوفی خدا بخش - ۳۷، ۳۸، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۶،
صبا لکھنوی - ۲۶، ۲۷، ۳۴، ۴۷، ۵۱، ۵۵، ۵۹، ۱۶۴،
۲۱۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۶، ۲۹۵، ۳۰۲، ۳۱۷، ۳۳۶، ۳۳۹،
۳۴۳، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۱، ۳۶۲،
۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲،
۳۷۳، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱،
۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸،
۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲،
صہیب - ۲۶۱،

ضرب کلیم - ۳۵، ۴۱، ۵۴، ۸۶، ۹۹، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۵۱،
۱۵۲، ۱۵۳، ۱۹۴، ۲۱۴، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰،
۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۶۱، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۹۰، ۳۰۲،
۳۰۸، ۳۱۱، ۳۱۸، ۳۳۴، ۳۳۹، ۳۵۷، ۳۷۶، ۳۸۱،
۳۸۲، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۹۰، ۳۹۱،

طاہر الدین (شیخ) ۲۳۹،
طلوع اسلام - ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۶۰، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۸۶،

ظاہر شاہ - ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰،
ظفر - ۱۹۰،
ظفر الحسن (ڈاکٹر سید) ۳۱۶، ۳۷۶،
ظفر الحسن (مرزا) ۳۶۸،
ظفر علی خاں (مولانا) ۲۱۹، ۲۷۴، ۳۱۸،
ظفر قریشی - ۱۶۵،
ظل السلطان - ۵۸، ۶۴، ۲۵۶، ۳۳۰،
ظہور الحسن (منشی) ۲۵۴،
ظہیر دہلوی (سید ظہیر الدین) ۵۸، ۶۱، ۶۳،

عابدہ سلطان (شہزادی ولی عہدہ ریاست بھوپال)
۲۱، ۳۳، ۳۶، ۵۰، ۵۵، ۲۰۹، ۲۲۶، ۲۷۷، ۲۷۸،

۲۸۰، ۳۴۴، ۳۵۵، ۳۶۱، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۱،
عادل رشید - ۳۲۰،
عارف بٹالوی - ۳۱۹،
عالی صفی پوری (سید ابن علی) ۶۱،
عبادت بریلوی (ڈاکٹر) ۵۵،
عبدالاحد خاں مخلص - ۳۳۹،
عبدالباسط - ۳۱۸،
عبدالحق (بابائے اردو - ڈاکٹر - مولوی) ۳۶، ۳۷، ۷۱، ۱۲۳، ۱۴۹، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۲۲، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۸۱، ۲۸۴، ۳۰۰، ۳۲۲، ۳۳۰، ۳۳۲،
عبدالحکیم صدیقی ذکا بھوپالی - ۵۸، ۵۹،
عبدالحلیم انصاری (آرٹسٹ) ۵۹، ۲۸۹، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۸، ۳۲۲، ۳۳۵، ۳۳۹،
عبدالحلیم شرر (مولانا) ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰،
عبدالحمید انصاری - ۳۲۲،
عبدالحمید کمالی - ۵۵، ۳۷۵،
عبدالحئی (سید) ۴۶، ۵۵، ۱۵۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۸، ۲۲۶، ۲۴۷، ۲۹۰، ۲۹۲، ۳۸۱، ۳۸۵، ۳۸۹،
عبدالرحمٰن بجنوری (ڈاکٹر) ۵۹، ۷۱، ۲۰۷، ۲۱۹، ۳۳۷، ۳۳۹، ۳۶۸،
عبدالرحمٰن الداخل - ۳۱۰
عبدالرحمٰن چغتائی - ۲۵، ۳۵،
عبدالرحیم قلندر (شاہ) ۲۷۴،
عبدالرزاق (مولوی) ۵۸، ۵۹، ۲۵۳، ۲۸۹، ۳۰۰، ۳۳۹،
عبدالشکور اخلاص - ۵۹،
عبدالعزیز خاں (منشی) ۶۰،
عبدالعلی - ۱۵۰،
عبدالغنی - ۳۱، ۳۲، ۲۳۹،
عبدالقادر بیدل - ۳۸۹،
عبدالقدیر آزاد (منشی) ۵۹،
عبدالقوی دسنوی - ۴۱، ۵۰، ۵۱، ۲۱۲، ۲۵۶، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۲، ۳۳۰، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۶۵، ۳۸۰، ۳۸۶،
عبدالقیوم (مولوی) ۲۵۴،
عبداللطیف خاں - ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹،
عبدالماجد دریابادی (مولانا) ۲۰۲،
عبدالمالک - ۳۱۹،
عبدالمتعال (حافظ) ۲۷۳، ۲۷۵،
عبدالمتین (کامدار) ۵۹،
عبدالمجید سالک (مولانا) ۲۲۵، ۲۷۷، ۳۴۴، ۳۴۶، ۳۵۴،
عبدالواحد معینی - ۳۲، ۵۲، ۵۵، ۱۷۲، ۳۷۴،
عبدالوہاب بابی - ۳۵۳،
عبداللہ قریشی (محمد) ۵۵، ۱۰۵، ۱۷۲، ۳۸۳،
عبیداللہ خاں (نواب - کرنل - حافظ) ۷۱،
عتیق احمد صدیقی - ۳۱۸،

عرفی - ۳۵۷،
عرش ملسیانی - ۳۲۱،
عرشی بھوپالی - ۳۳۸،
عزیز احمد - ۴۵، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۸۵، ۳۱۹، ۳۸۱،
عزیز الدین (سید) ۳۱۸،
عزیز لکھنوی (مولوی مرزا ہادی) ۶۱،
عشرت قادری - ۳۳۸،
عاصم صحرائی - ۳۸۷،
عصمت اللہ بیگ دہلوی - ۵۹،
عصمت چغتائی - ۳۴۰،
عطا بدایونی - ۶۳،
عطا محمد عطا (بابو) ۶۱، ۶۳،
عطیہ فیضی (بیگم) ۷۱، ۲۱۸، ۳۳۲، ۳۳۳،
عظیم بیگ - ۳۱۹،
علامہ اقبال بھوپال میں - ۲۱۲، ۲۵۶،
علی اکبر - ۳۱۹،
علی امام (سر) ۱۲۱،
علی بخش - ۹۳، ۱۰۴، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۸، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۱، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۱۴، ۲۲۶، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۸، ۳۱۴، ۳۴۲، ۳۴۸،
علی حیدر ملک - ۳۸۷،
عمر انصاری (حافظ - محمد) ۳۱۸،
عمران انصاری - ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۹، ۳۳۸، ۳۳۹،
عمر بن خطاب - ۱۴۶،
عنبر چغتائی - ۳۳۹،
عیدگاہ کوٹھی - ۹۵، ۲۵۴،
عیسیٰ (حضرت مسیح) ۱۴۶، ۱۵۳، ۳۵۰،
عیش بھوپالی (سید امراؤ علی) ۵۹، ۶۱،

غازی رؤف بے - ۸۰، ۸۵،
غالب (نواب مرزا اسد اللہ خاں نجم الدولہ دبیر الملک) ۵۳، ۶۰، ۶۱، ۶۴، ۷۱، ۲۳۴، ۲۹۵، ۳۲۸، ۳۳۶، ۳۶۷، ۳۶۸
غدر دہلی کے اخبار نویس - ۱۲۰،
غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط - ۱۲۰،
غنچہ - ۳۲۳، ۳۲۴،
غوث علی شاہ قلندر - ۶۷، ۲۷۴،
غلام احمد قادیانی (مرزا) ۱۴۴،
غلام السیدین (خواجہ) ۴۵، ۱۰۲، ۱۳۹، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۶۰،
غلام بھیک نیرنگ (میر سید) ۶۱، ۶۳، ۶۷، ۳۱۳،
غلام دستگیر - ۳۱۸،
غلام رسول مہر (مولانا) ۵۱، ۵۲، ۵۵، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۳۸۰،
غلام قادر گرامی (مولانا) ۲۲۱،

فاران - ۳۴۵،
فانی - ۲۵۸،
فتح الباری - ۵۸،
فتح محمد ملک - ۳۸۳،
فراق - ۲۵۸،
فرگوہرسن (مس) ۱۲۴، ۱۲۵،
فرانسس نظرت (حکیم) ۵۸،
فرہاد - ۲۸۵،
فضل حق قریشی - ۱۶۵،
فضل علی سرور - ۳۳۸،
فقیر وحید الدین - ۳۹، ۶۴، ۹۹، ۱۰۵، ۲۰۱، ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۳۶،
۲۳۷،
فکر اقبال - ۳۱۸،
فلسفۂ عجم - ۳۱۸،
فنون - ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۸۱، ۳۸۳،
فوجدار محمد خاں (نواب) ۳۳۷، ۳۶۸،
فواد یونیورسٹی - ۳۰۹،
فہیم رضا - ۲۶۲،
فیروز خاں نون - ۷۲،
فیروز سنز - ۲۸۴،
فیضی - ۱۶۷،

قاضی تلمذ حسین - ۶۸، ۶۹،
قاضی ولی محمد (ماسٹر) ۵۹، ۹۹، ۱۵۱، ۲۱۹، ۲۷۸، ۲۸۹، ۲۹۵، ۳۳۹،
قائد اعظم (محمد علی جناح) ۷۲، ۷۵، ۸۳، ۲۰۹، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۷۸،
۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۳، ۳۰۹، ۳۲۲، ۳۴۹، ۳۵۴، ۳۵۹، ۳۶۰،
قدسیہ منزل (محل) ۹۵، ۱۴۲، ۱۵۵، ۱۹۳، ۲۹۰،
قدوس صہبائی - ۵۹، ۳۳۹،
قرآن (مجید - پاک - حکیم) ۲۵، ۲۹، ۳۳، ۳۵، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۶۴،
۱۰۲، ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۷، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۹۳،
۲۹۷، ۳۲۶، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۵۰،
۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۶۹، ۳۷۶، ۳۸۱، ۳۸۲،
۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۸۹،
قصر سلطانی - ۹۴، ۹۵،
قطب مینار - ۱۵۵،
قمر جمالی - ۳۳۹،
قمر الحسن (حکیم سید) ۳۰۵، ۳۲۱، ۳۳۶، ۳۳۹،
قمر ہاشمی - ۳۵۷، ۳۷۶،
قومی زبان - ۱۱۹، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۱۴، ۳۸۱،
قومی کتاب مرکز - ۳۷۶،
کاروانِ ادب - ۳۳۰،
کاروانِ غزل - ۲۶۲،
کالیداس - ۳۰۵،
کامتا پرشاد - ۳۲۲،
کتاب - ۳۷۹، ۳۸۷،
کرک ہال - ۴۸،
کراچی یونیورسٹی - ۲۹۷، ۳۰۸،
کردار - ۲۵۶،
کرشن چندر - ۳۴۰،
کرنل رابنسن - ۲۱۲،
کرنل عبد الرشید خاں ۱۴۱، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۹۷،
کشکول قلندری - ۶۶،
کلام عبد القادر بیدل - ۲۹۲،

کلیات اقبال - ۳۱۸،
کلیات صائب - ۱۳۵،
کمال اتاترک - ۲۸۲، ۲۸۳،
کمال لکھنوی (حکیم سید مہدی حسن) ۶۱، ۶۳،
کملاپتی پارک - ۲۰۸، ۳۰۲،
کوثر چاند پوری (حکیم - علی) ۵۹، ۲۸۹، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۳۹،
کوکب جمیل - ۳۳۹،
کوئن وکٹوریہ - ۱۷۶،
کیف بھوپالی - ۳۳۸، ۳۳۹،
کیفی اعظمی - ۳۲۰،
کیمبرج - ۳۵، ۹۴،
کیننگ کالج - ۲۱۸،
گارڈن سٹی بک نیوز - ۲۸۳،
گاندھی (مہاتما) ۷۲، ۸۲، ۸۳، ۲۰۹، ۲۲۲، ۲۷۲، ۲۷۸،
۲۷۹، ۳۲۲، ۳۷۰،
گفتار اقبال - ۸۰،
گل حسن شاہ قلندر - ۶۷، ۲۶۸، ۲۷۴، ۲۷۵،
گلنار بیگم (بی بی) ۳۰،
گنج ہائے گراں مایہ - ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۳۶، ۳۱۳،
گوبند پرشاد آفتاب - ۵۹، ۲۸۹،
گوپی کرشن شوق - ۳۳۸،
گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین - ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۴،
گوہر تاج (بیگم صاحبہ - ولی عہد) ۲۸۰،
گوہر جلالی - ۳۲۲، ۳۳۸،
گوہر محل - ۶۶، ۹۵،
گوئٹے - ۳۵، ۳۶، ۲۵۵، ۳۰۴،
گہوارۂ ادب - ۲۸۰،
گیان چند (ڈاکٹر) ۳۳۹،

لارڈ لوڈین - ۳۵، ۱۴۰،
لارڈ ولینگڈن - ۱۴۰،
لال قلعہ - ۱۲۰، ۱۵۵،
لالہ ملک راج - ۳۲۲،
لچھمی نرائن (افسر منشی) ۵۹،
لسان العصر - ۶۸،
لطف اللہ خاں نظمی - ۳۳۹،
لکھنؤ یونیورسٹی - ۳۱۱،
لمعہ (ڈاکٹر محمد عباس علی خاں) ۲۴، ۲۵، ۲۸، ۳۹، ۵۵،
۸۹، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۳۷۳،
لندن یونیورسٹی - ۳۹،
لیاقت علی خاں (نواب زادہ) ۱۸۴، ۲۱۹، ۲۲۱، ۳۰۰،
لینن - ۲۸۳،

مارجیمین - ۳۵۱،
مارکس - ۳۷۳،
مانی جائسی (کلب احمد) ۵۸،
مالوہ ریویو - ۵۹، ۶۳،
مائل نقوی (عبد الجلیل) ۵۹، ۹۹، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۰،
۲۸۹، ۳۱۶، ۳۳۸،
متین سروش (مرزا) ۳۳۸،
مثنوی مولانا روم - ۹۳، ۱۱۰، ۲۷۲، ۲۹۲،
مجنوں گورکھپوری (پروفیسر) ۲۱، ۱۶۵، ۳۱۹، ۳۶۳، ۳۶۲،
۳۶۷، ۳۶۸،

محسن الملک ۔ ۵۹، ۲۵۸،
محسن بھوپالی ۔ ۵۵، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۷۹،
محشر لکھنوی (سید کاظم حسین) ۶۱،
محفوظ علی بدایونی (سید) ۱۵۹،
محمدؐ (حضور نبی کریم ۔ رسالت مآب ۔ رسول اللہ صلعم) ۲۶، ۴۳، ۸۶، ۱۳۴،
۱۳۵، ۱۳۶، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۱، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۴،
۲۱۵، ۲۸۴، ۳۲۲، ۳۴۳، ۳۴۵،
محمد ابراہیم (مولوی) ۳۲۲،
محمد احمد خاں ۔ ۱۴، ۲۴، ۴۳، ۴۴، ۲۷۸، ۳۳۰،
محمد احمد سبزواری (سید) ۲۱، ۲۲، ۵۵، ۵۹، ۱۵۱، ۲۵۳، ۲۵۵،
۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۸، ۳۰۴، ۳۱۶، ۳۲۲،
۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۱،
محمد اسد (ڈاکٹر لیوپولڈ ویس) ۳۵،
محمد اسمٰعیل دسنوی (مولوی) ۶۲،
محمد اسمٰعیل ہاتف (منشی) ۲۵۴، ۳۳۸،
محمد اقبال سلیم گاہندری ۔ ۳۲۳، ۳۲۴،
محمد اکرام (شیخ) ۲۸۴،
محمد امین زبیری (مولوی) ۳۳، ۳۴، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۵۴، ۵۸، ۵۹، ۶۴،
۸۶، ۱۲۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴،
۳۳۹، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶،
محمد انس خاں ۔ ۳۱۸،
محمد انصاری ۔ ۳۱۸،
محمد حامد علی ۔ ۶۸،
محمد حسین تاج ۔ ۳۱۸،
محمد حسین خاں ۔ ۳۱۹،
محمد حیات ۔ ۴۵، ۲۱۹، ۲۲۱،
محمد خالد ۔ ۳۱۸،
محمد خلیل اللہ خاں ۔ ۴۶، ۵۵، ۵۱، ۲۷۸، ۲۸۹، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۱۸،
محمد رفیق افضل ۔ ۸۰،
محمد زبیر صدیقی (پروفیسر) ۳۰۵،
محمد طاہر فاروقی (ڈاکٹر) ۲۸۱،
محمد عالم خنجر (سید) ۶۱،
محمد علی خاں میکش ۔ ۳۰۴،
محمد عباس رفعت ۔ ۵۸،
محمد علی تاج ۔ ۳۳۸،
محمد علی جوہر (مولانا) ۲۵، ۴۰، ۷۱، ۷۲، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۳۳،
۲۷۸، ۲۸۳، ۳۵۹،
محمد علی صدیقی ۔ ۵۵،
محمد عمر دراز خاں ۔ ۱۲۰،
محمد مجیب (پروفیسر) ۴۵، ۱۶۵، ۲۶۰،
محمد مہدی (مولوی) ۵۸، ۵۹،
محمد میاں شہیر (سید) ۵۹،
محمد نعیم ندوی ۔ ۳۴۴،
محمد وکیل صدیقی ۔ ۳۳۹،
محمد ہادی رسوا (مرزا) ۵۸، ۶۱،
محمد ہادی مرزا (مرزا) ۶۱،
محمد یوسف ۔ ۳۱۹،
محمود اعظم فہمی (سید) ۵۹، ۳۳۸، ۳۳۹،
محمود الحسن صدیقی ۔ ۵۹، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۹، ۳۰۲، ۳۱۳،
۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۳۹،
محمود الحسینی ۔ ۳۳۹،
محمود علی (منشی) ۶۳،
محمود نظامی ۔ ۳۱۹،
محوی صدیقی لکھنوی (علامہ مولانا محمد حسین) ۵۸، ۵۹، ۲۵۶، ۳۳۸،
۳۳۹،
محی الدین قادری زور (ڈاکٹر) ۳۰۴،
مختار مسعود ۔ ۲۶، ۲۹،
مخمور بھوپالی ۔ ۳۳۸،
مدرسۃ العلوم ۔ ۲۱۸،
مدرسہ صولتیہ ۔ ۵۸، ۳۶۸،
مدینہ ۔ ۳۲۳، ۳۲۴،
مراۃ المثنوی ۔ ۶۸، ۶۹،
مرزا ابراہیم بیگ ۔ ۱۶۵،
مرزا جلال الدین ۔ ۲۷۷،
مرزا شاغل فخری ۔ ۵۸،
مرزا فرحت اللہ بیگ ۔ ۵۹،
مرزا مظفر سیفی ۔ ۲۵۴، ۲۵۵،
مرقع مسعود ۔ ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۲۰۶، ۲۶۰،
مسجد شاہجہانی ۔ ۱۰۵،
مسجد شہید گنج ۔ ۱۴۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۴۸،
مسجد قرطبہ ۔ ۳۱۰،
مسجد وزیر خاں ۔ ۲۷۳،
مسدس حالی ۔ ۳۵، ۱۴۳، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۵، ۲۸۵،
مسعود احمد برکاتی ۔ ۵۵،
مسعود اکیڈیمی ۔ ۱۶۲،
مسعود علی (سید) ۳۱۸،
مسعود علی وارثی ۔ ۲۷۲،
مسلم ضیائی ۔ ۴۳، ۴۸، ۵۵،
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ ۴۲، ۵۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۷۴، ۱۸۵، ۲۹۳،
۲۹۷، ۳۰۴، ۳۰۹، ۳۱۳، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۸، ۳۷۸،
مسند احمد ۔ ۱۳۶،
مسولینی ۔ ۲۳۲، ۲۸۲، ۲۸۳،
مسیح الدین ۔ ۵۵، ۱۵۱، ۲۹۳، ۲۹۴،
مسیح صدیقی (قریشی) ۵۵، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۸۱،
مشفق خواجہ ۔ ۳۸۱،
مصباح الدین احمد ۔ ۲۵۴،
مصطفےٰ الراغی ۔ ۴۵،
مصطفےٰ علی بریلوی (سید) ۱۸۴،
مضامین اقبال ۔ ۳۱۸،
مضطر خیرآبادی ۔ ۵۹، ۲۷۰،
مطلوب عالم فاروقی (منشی) ۲۵۴،
مظفر شاہجہاں پوری ۔ ۳۲۲،
معارج الدین ۔ ۲۱۹، ۲۷۲،
معاشیات ۔ ۲۸۱،
معشوق علی خاں جوہر (حکیم) ۵۸،
مظہر احمد ادہمی (مولوی) ۵۹،
معظم رسول صدیقی ۔ ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۷۳،
مفتی عبدہٗ ۔ ۳۸۲، —— مقالات اسلم ۔ ۵۷،
مقام اقبال ۔ ۳۱۹،
مقبول حسن قریشی (کرنل) ۷۰،
مقدمۃ القرآن ۔ ۲۵، ۳۴۷، ۳۴۸،
مقدمہ شعر و شاعری ۔ ۱۷۵،
مقصود عرفانی ۔ ۳۳۸،
مقصود عمرانی ۔ ۳۲۲، ۳۳۸،
مکاتیب شبلی بنام عطیہ ۔ ۳۳۱،
مکتبۂ افکار ۔ ۲۶۲، ۲۹۵،
مکتبہ الخانجی ۔ ۲۲۷،

مکتبہ جامعہ - ۲۶۰،
مکتوبات اقبال - ۳۹، ۴۳، ۸۰، ۸۸، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۶، ۹۷، ۹۸،
۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۴،
۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۹، ۱۷۳، ۱۹۷، ۲۰۴، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱،
۲۱۲، ۲۲۸، ۲۷۶، ۳۰۱، ۳۴۳، ۳۸۳،
مکہ معظمہ - ۳۶۸،
ملا رموزی - ۵۹، ۲۵۴، ۲۸۹، ۲۹۴، ۳۳۸، ۳۳۹،
ملا علی قادری - ۱۴۶، ____ ملٹن - ۳۸،
ملفوظات اقبال - ۳۱۹، ____ ملک محمد اشرف - ۳۰۳، ۳۰۴،
ممتاز حسن (ڈاکٹر) ۲۱، ۳۸، ۳۹، ۳۴۲، ۳۷۴،
ممنون حسن خان - ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۳۸،
۴۰، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۵۴، ۹۲، ۹۳، ۹۹، ۱۳۵، ۱۳۱،
۱۴۳، ۱۵۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۲۰۷، ۲۲۴، ۲۳۴، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳،
۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۲، ۲۸۹، ۲۹۳،
۳۰۵، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۷، ۳۶۶،
منادی - ۲۷۰، ____ منشی حسین خان - ۲۶۷،
منشی عبدالحئی - ۶۳، ____ منشی طاہر دین (شیخ) ۳۱، ۲۲۵،
منصب علی (مولوی - ماسٹر) ۲۱۹، ۲۲۱،
منوا بھانڈ - ۳۸، ۲۶۷، ____ منیر احمد شیخ - ۵۳،
منیر بھوپالی (منیر الدین) ۵۹، ۳۳۸،
منیرہ - ۳۱، ۳۴، ۱۱۳، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۵۴، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۳۸،
۲۳۹، ۲۴۰، ۳۴۸،
موتی محل - ۹۵، ____ موتی مسجد - ۵۰، ۱۳۳، ۲۷۶، ۲۹۴، ۳۱۵،
موج کوثر - ۲۸۴، ____ موسیٰ جار اللہ - ۲۲۷، ۳۰۳، ۳۰۴،
مولانا شفیع داؤدی - ۸۰، ۸۵،
مولوی احسن اللہ خان - ۵۸، ____ مولوی بشیر الدین - ۱۶۵،
مولوی شکر اللہ سہیل - ۵۸، ۹۹، ۱۵۱، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۷۸،
مولوی غلام محی الدین - ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۶۵،
مولوی محمد صالح - ۷۵، ۸۰، ____ مومن - ۳۲۸، ۳۶۸،
مہاراجہ بڑودہ (گیکواڑ) ۲۱۸، ۲۲۰،
مہاراجہ کشمیر (ہری سنگھ) ۷۸، ۷۹، ۸۴، ۱۲۱، ۲۳۳، ۳۷۳،
مہاراجہ کشن پرشاد - ۱۲۲، ۱۲۳، ۲۷۰، ۳۳۳،
مہ جبین حجاز - ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۳۸،
مہدی الافادی - ۲۹۵، ____ مہدی حسن احسن (سید) ۶۱،
مہر دہلوی (خورشید علی) ۵۹، ____ مہندر ناتھ - ۳۰۴،
میاں اسد اللہ خان - ۳۳۷، ____ میاں امیر الدین - ۳۲، ۲۲۹،
میاں خالد (علامہ) ۵۹، ۳۳۹،
میاں محمد شفیع - ۲۸، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۵۴، ۳۶۵،
میٹی نین - ۳۵۲، ____ میڈرڈ یونیورسٹی - ۳۹،
میر - ۱۰۳، ۳۲۸، ____ میر ولی الدین (ڈاکٹر) ۳۱۹،
میگھ دوت - ۳۰۵، ____ مے لالہ فام - ۱۵۵،
میوزیم ہال - ۱۰۷،

نادر شاہ - ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۸۳،
نادرہ مسعود - ۱۰۴، ۱۰۵، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۵، ۲۹۷،
ناصر علی ناصر آبادی (ماسٹر) ۲۵۴، ۲۸۸،
نامہ قدسی - ۶۶، ____ ندوہ - ۵۸،
ندوۃ العلماء - ۸۶،
ندیم - ۴۹، ۵۹، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۷۶، ۲۸۹، ۲۹۵، ۲۹۹،
۳۰۵، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۱، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۴۹، ۳۸۹،
نذیر احمد (ڈپٹی مولوی) ۸۴، ۳۷۵،
نذیر نیازی (سید) ۳۲، ۳۸، ۳۹، ۴۹، ۵۵، ۷۳، ۷۴، ۸۲، ۸۸،
۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۳، ۱۳۳،
۱۳۵، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۵۹،
۱۶۰، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲،
۲۱۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۵۴، ۲۸۰، ۲۸۳،
نسخۂ حمیدیہ - ۱۷۱، ۳۳۷، ۳۶۸،
نسخۂ عرشی زادہ - ۳۳۷، ۳۶۸،
نصر اللہ خان (نواب) ۱۷۱، ____ نظام الدین اولیا - ۱۵۵،
نظام حیدر آباد - ۱۷، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۸، ۲۹۷، ____ نظامی بدایونی - ۲۷۰،
نظر حیدر آبادی - ۴۷، ۴۸، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۳۸، ۳۳۸، ۳۷۴، ۳۸۳،
نغمات - ۷۶، ____ نغمات قدسی - ۲۷۲،
نفیس احمد فاروقی - ۲۵۴، ____ نقش چغتائی - ۲۵، ۳۵،
نقوش ماضی - ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۵،
نگار - ۵۹، ۶۰، ۶۹، ۷۰، ۲۵۶، ۳۱۱،
نواب بہاولپور - ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۳۱، ____ نواب پٹودی - ۴۲،
نواب ٹونک (ابراہیم علی خان) ۴۷،
نواب حسن (منشی) ۲۵۴، ____ نواب خسرو یار جنگ - ۲۷۳،
نواب عبد الحفیظ خان - ۲۷۲، ۲۷۳، ____ نواب عزیز یار جنگ - ۲۹،
نواب کرنال - ۱۶۵، ۱۶۶، ____ نواب محمد اسمٰعیل خان - ۸۱، ۸۳،
نوازش نامے - ۳۴۳، ۳۳۱، ۳۳۴، ____ نوائے سفینہ - ۳۳۵،
نوائے فردا - ۱۷۱، ____ نور خان (ایئر مارشل) ۲۲،
نورس - ۲۸۰، ____ نوری - ۱۴۶،
نیاز فتح پوری (علامہ) ۵۸، ۵۹، ۲۵۸، ۲۹۵، ۳۳۹،
نیرنگ خیال - ۲۵۲، ۳۱۹،
نیشنل بک سنٹر - ۳۵۵، ۳۶۵، ۳۷۵، ۳۷۶،
نیشنل بنک آف پاکستان - ۲۹۷،
نیو تاج آفس - ۱۳۸، ____ نیو کالج - ۲۴۹، ۲۵۰،

واحد علی - ۳۱۸، ____ وادی ایمن - ۲۷۰،
وارث علی شاہ - ۲۶۷، ____ والدۂ جاوید (اہلیہ علامہ اقبال) ۹۷، ۹۸،
۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۵۴،
والدۂ راس مسعود - ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۸،
وائسرائے ہند - ۲۴۹، ۲۵۰، ____ وائی کنگ پریس نیو یارک - ۲۸۳،
وجدی الحسینی (مولانا) ۳۲۲، ۳۳۰، ۳۳۶، ____ وجے لکشمی پنڈت - ۳۷۱،
ورڈز ورتھ - ۳۶۷، ____ وریو تھلی - ۳۶۷،
وزیر علی (سید) ۷۲، ____ وفا صدیقی - ۳۳۸،
ونسٹن چرچل (سر) ۲۸۳،
وڈ کنگ مسجد شاہجہانی - ۵۸، ____ ویلز (ایچ۔جی) ۲۸۳،

ہاشمی فرید آبادی (سید) ۱۶۵، ۱۶۸،
ہٹلر - ۲۸۲، ____ ہمارا قائد - ۴۲،
ہمارے بنک - ۲۸۱، ____ ہمارے نبی - ۳۱۹،
ہمایوں منزل - ۲۴، ۳۴، ____ ہمدرد - ۳۱۹
ہندوستان کا قومی فریضہ اور جنگ - ۴۲،
ہندوستان کی معیشت اور جنگ - ۴۲،
ہندوستان کے زرپر جنگ کے اثرات - ۴۲،
ہوا محل - ۹۵، ____ ہیری ہیگ (سر) ۲۴۹، ۲۵۰،

یاٹ کلب - ۲۹۱، ۲۹۸، ۳۰۸،
یادگار اقبال - ۱۷۱، ____ یادگار شاہجہانی - ۲۰۸،
یادگار غالب - ۱۷۵، ____ یکتا امروہوی - ۶۵،
یکتا حقانی - ۳۱۹، ____ ینگ انڈیا - ۷۲،
یوسف النساء بیگم - ۳۱۹،
یوسف حسن (حکیم) ۲۵۲،
یوسف حسین خان (ڈاکٹر) ۳۱۹،
یوسف سلیم چشتی (پروفیسر) ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳،

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور